مکتوباتِ امیر مینائی کا تحقیقی جائزہ

مقالہ برائے

پی، ایچ، ڈی

مقالہ نگار

سیّد جاوید اقبال

نگراں

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں

پروفیسر ایمرٹس، سندھ یونی ورسٹی

شریک نگراں

پروفیسر فہمیدہ شیخ

صدر شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی

سندھ یونی ورسٹی، جام شورو

۲۰۰۲ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ اللّٰہَ علیٰ کُلِّ شَیٍٔ قَدِیر•

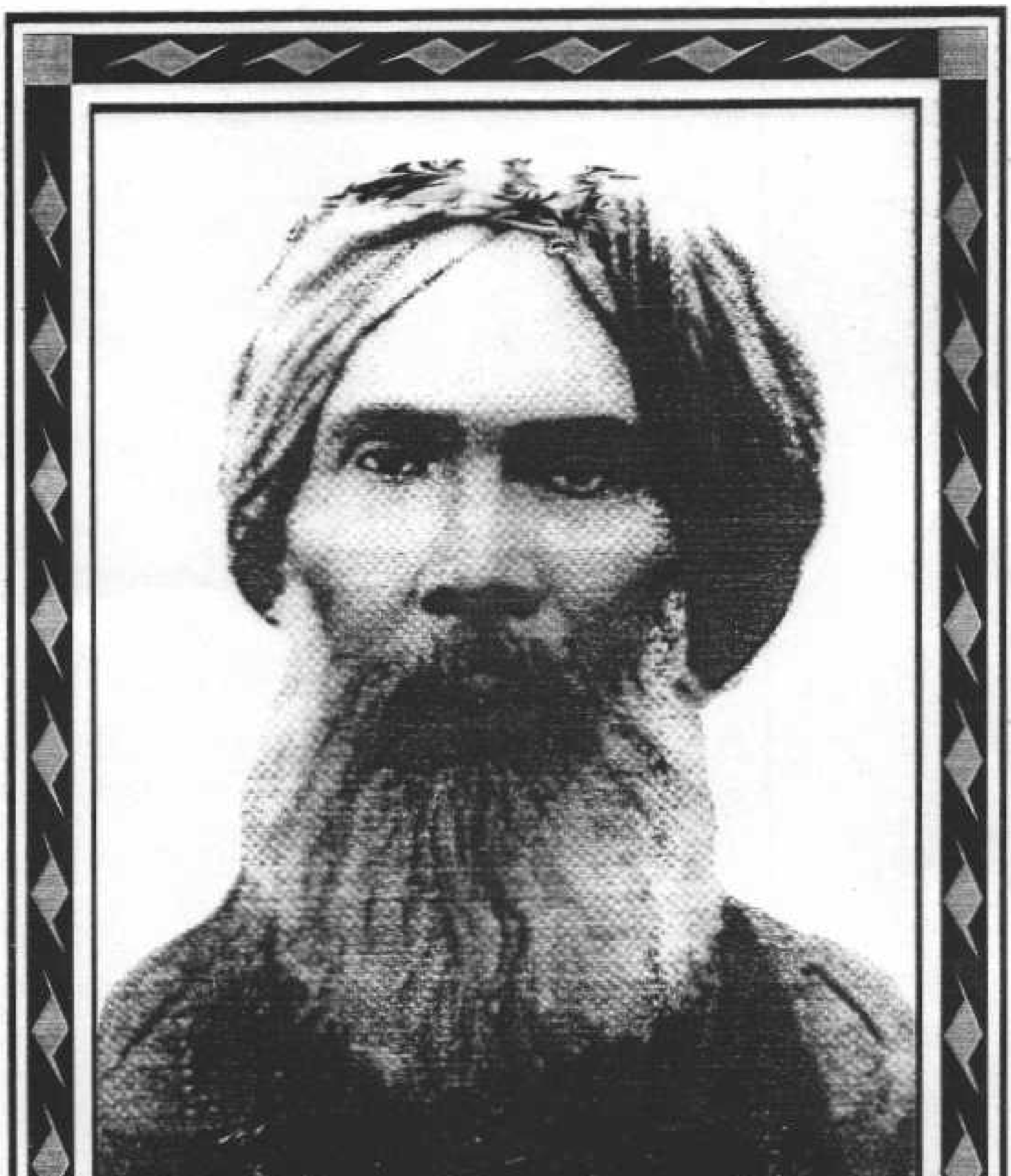
بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

CERTIFICATE

Certified that ***Mr: Sayyed Jawed Iqbal*** *S/o Habib Husain has carried out research on the topic:* مکتوباتِ امیر مینائی کا تحقیقی جائزہ *under my supervision and that his work is original and distinct and his dissertation is worthy of presentation to the University of Sindh for the award of the Degree* ***Doctor of Philosophy*** *in Urdu.*

Supervisior

DR: GHULAM MUSTAFA KHAN



امیر احمد امیر مینائی

(۱۸۲۹ء ۱۹۰۰ء)

ترتیب

مقدمہ

امیرؔ مینائی اردو ادب کا ایک تابناک باب ہیں۔ ان کے بغیر اردو شاعری، مکتوب نگاری، تذکرہ نگاری اور لغت نویسی کی تاریخ ادھوری قرار پاتی ہے۔

(۱)

امیر احمد، مینائی ۲۲؍فروری ۱۸۲۹ء مطابق ۱۶؍شعبان ۱۲۴۴ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ کرم محمد مینائی کا تعلق لکھنؤ کے مشائخ سے تھا۔ جنھوں نے امیر کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔ والد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری بڑے بھائی طالب حسن مینائی نے پوری کی۔ اسی توجہ کی وجہ سے امیر نے اپنے دور کے نامور اور قابلِ ذکر اساتذہ سے فارسی، عربی، فلسفہ، منطق، فقہ اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ دورانِ تعلیم جب ان کی عمر لگ بھگ نو سال کی تھی تو انھوں نے پہلا شعر کہا۔ یوں تحصیل علم کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کی طرف بھی توجہ ہوگئی۔ چودہ سال کی عمر سے امیر باقاعدگی کے ساتھ لکھنو کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور پندرہویں سال کے آخر رجب ۱۲۵۹ھ مطابق جولائی ۱۸۴۳ء میں انھیں اسیر لکھنوی (۱۸۱۴ھ؍۱۸۸۲ء) سے تلمذ حاصل ہوا۔ اسیر ہی کے توسط سے امیر لگ بھگ پچیس سال کی عمر میں نواب واجد علی شاہ کے دربار میں (۱۲۶۸ھ؍مطابق ۱۸۵۱ء) باریاب ہوئے اور ''مثنوی کبوتر نامہ'' پیش کی۔ اس کے بعد امیر نے شہزادہ نادر میرزا کے لیے ''انشاء نادری'' اور بادشاہ کی کتاب ''صوم المبارک'' کی شرح ''نغمہ قدسی'' کے نام سے لکھی۔ پھر بادشاہ کے حکم کے مطابق ان کی دو کتابوں ''ارشاد السلطان'' اور ''ہدایت السلطان'' کی تدوین کی۔ کچھ ہی عرصے بعد بساط الٹ دی گئی۔ اور (۷؍فروری ۱۸۵۶ھ۔ مطابق جمادی الاول ۱۲۷۲ھ) کو واجد علی شاہ کی حکومت ختم ہوگئی۔ اس سیاسی صورتِ حال کے باعث امیر، مئی ۱۸۵۷ء میں کاکور چلے گئے۔ جہاں ان کا قیام ایک اہم واقعہ ہے۔ یہاں امیر کی ملاقات محسن کاکوروی (۱۸۲۶ء۔۱۹۰۵ء) سے ہوئی۔ جن کی صحبت کا فیض تھا کہ امیر نعت گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ کاکور میں امیر کا قیام لگ بھگ ایک سال رہا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد وہ لکھنؤ آئے لیکن یہاں ان کا گھر اور محلہ سب انگریزوں کی شدید گولہ باری کے باعث کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ امیر ایک رباعی میں اس صورتِ حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

> گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے
> روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
> یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر
> یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

اس بربادی میں ان کا پہلا دیوان ''غیرت بہارستان'' بھی ضائع ہوگیا۔ جس کا انھیں عمر بھر دکھ رہا۔ امیر تقریباً ایک سال تک اودھ کے مختلف اضلاع میں تلاشِ معاش کے لیے سرگرداں رہے۔ بالآخر مارچ ۱۸۵۹ء مطابق رمضان المبارک ۱۲۷۵ھ کے آخر میں نواب یوسف علی خاں ناظم (۵؍مارچ ۱۸۱۶ء۔ ۲۱؍اپریل ۱۸۶۵ء) نے انھیں طلب کیا اور مفتی عدالت دیوانی کے عہدے پر مقرر کیا۔ دربار رام پور میں باریابی کے ساتھ ہی ان کی ادبی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل وہ لکھنو اور کاکور میں ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہو چکے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ لکھنو میں بیس بائیس شعراء اپنے کلام پر امیر سے اصلاح بھی لیتے تھے۔

قیام لکھنو کے دوران امیر کو بے فکری کی زندگی میسر آئی۔ اس عرصے میں انھوں نے شاعری پر خصوصی توجہ دینے کے ساتھ ساتھ اخبار ''سحر سامری''

کی ادارت بھی کی اور اردو و فارسی کے لغات بھی اپنے ذوق کے مطابق ترتیب دیے۔ جو تمام کے تمام ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہیں۔ قیام لکھنؤ کے زمانے میں لغت نویسی کا جو شوق امیر کو ہوا، اس کی تکمیل رام پور میں ہوئی۔ یہاں وہ نواب یوسف ناظم اور نواب کلب علی خاں (۱۹/اپریل ۱۸۳۵ء۔ ۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء) کے استاد بھی رہے۔ یہ زمانہ امیر کی ادبی زندگی کے عروج کا تھا۔ لیکن مالی خستہ حالی کے باعث ان کی نجی زندگی تباہ ہوگئی۔ چناں چہ تنگ آ کر نواب حامد علی خاں (۱۸۷۵ء۔ ۱۹۳۰ء) کے زمانے میں، جولائی ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد دکن ہجرت کر گئے۔ جہاں ۱۳/اکتوبر ۱۹۰۰ء کو وہ اس دیار فانی سے رخصت ہو گئے۔

(۲)

امیر کا دور سیاسی اعتبار سے نہایت پرآشوب قرار دیا جاسکتا ہے۔ انگریز جو ایک عرصے سے اودھ پر نظریں لگائے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابتدائی فتح ۱۸۶۴ء میں نواب شجاع الاولہ کو بکسر کی لڑائی میں شکست دے کر حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مکمل فتح فروری ۱۸۵۶ء میں نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے، اودھ کو اپنے قبضے میں لے کر حاصل کی۔ امیر، نصیر الدین حیدر کے دور (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۷ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کا دور دیکھا یہ تمام زمانہ بظاہر لکھنوی مسلمانوں کی عیش و عشرت اور فنونِ لطیفہ کی ترقی کا نظر آتا ہے۔ لیکن اصل میں زوال کے منطقی انجام کا ہے۔ یوں امیر زوال پذیر دور میں پیدا ہوئے، پرورش پائی، جوان ہوئے اور اپنے زمانے کو کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ رام پور گئے، تو ابتدائی عرصہ پرسکون گزرا، لیکن نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد جب نواب مشتاق علی خاں (۲۲/اپریل ۱۸۵۷ء۔ ۲۵/فروری ۱۸۸۹ء) مسند آراء ہوئے، تو امیر ایک بار پھر زندگی کے ایک مشکل امتحان سے دوچار ہوئے، ریاست کا نظام بدل گیا۔ جنرل اعظم الدین خاں، وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ متعدد اہلِ کمال کو نوکریوں سے فارغ کردیا گیا۔ جو باقی بچے ان کی تنخواہوں میں کمی کردی گئی۔ لیکن والیانِ رام پور کی عیش و عشرت وہی رہی۔ (جس کی ایک جھلک عبدالحلیم شرر کی کتاب ''رام پور حرام پور'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)۔

والیانِ رام پور کی ریاست سے عدم دلچسپی کے باعث وہ بھرم ٹوٹ گیا، جو ۱۸۵۷ء کے بعد ریاست رام پور کو حاصل ہوا تھا۔ لکھنو اور دہلی کی تباہی کی باعث علوم و فنون کے باکمال شخصیات رام پور میں جمع ہوگئی تھیں۔ نواب یوسف علی خاں نے ان کی عزت افزائی اور قدر دانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ رام پور میں مختلف علوم و فنون کے کاملین کی فہرست خاصی طویل ہے۔ نواب کلب علی خاں تک ان کی قدر دانی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن نواب حامد علی خاں کے آتے آتے وہی کاملین پھر ہجرت کرنے لگے۔ انھیں میں امیر مینائی بھی تھے۔ جو نواب رام پور کی عدم توجہ کی وجہ سے موت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ بالآخر چھپ کر رام پور سے فرار ہوئے اور حیدرآباد دکن پہنچے۔ لیکن جب تک ان کے قوی اتنے مضمحل ہو چکے تھے کہ وہ کچھ ہی عرصے بعد زندگی ہار گئے۔

(۳)

والیانِ رام پور میں نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں کو شعر و سخن سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ جس کے باعث دہلی اور لکھنو کے باکمال لوگ یہاں جمع ہوگئے تھے۔ ان میں اسیر، منیر، جلال، بحر، تسلیم، ذکی، قلق، جان صاحب، حیا، داغ، ظہیر، راسخ کے علاوہ امیر بھی شامل تھے۔ دہلی اور لکھنو کے شعراء کا یہ مجمع دربار رام پور میں اردو شاعری کا ایک نیا باب رقم کر رہا تھا۔ نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں نے ان شعراء کی خدمات کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا۔ رام پور کی ادبی تاریخ میں نواب کلب علی خاں نے خاص کردار ادا کیا۔ انھیں زبان و بیان، اصلاحِ سخن، تذکیر و تانیث وغیرہ سے

خاص دل چسپی تھی۔ انھی کی توجہ سے ''مصاحب منزل'' میں شعروسخن سے متعلق بحث ومباحثے کا سلسلہ جاری رہتا۔ کیوں کہ یہاں دہلی اور لکھنو کے شعراء موجود تھے۔ اس لیے زیادہ تر اختلافات دونوں دبستانوں کے حوالے سے معرضِ بحث میں آتے۔

لکھنوی شاعری کا جو دور ناسخ سے شروع ہوا تھا۔ وہ جلال اور امیر پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اردو ادب میں زبان اور اس کے قواعد کے لحاظ سے یہ دور نہایت اہم رہا۔ زبان وبیان، شعروسخن، متروکات، تذکیروتانیث اور لغوی مسائل سے متعلق مباحث اس دور میں زیادہ نمایاں ہوئے۔ لہٰذا ان سے متعلق بہت سے قاعدے بھی اس زمانے میں بنے۔ لکھنوی شعراء کے بحث ومباحثے سے دہلوی شعراء بھی متاثر ہوئے۔ ان میں خاص کر داغ نے لسانی وعروضی مسائل پر اپنی توجہ مبذول کی اور اپنے تلامذہ کو قواعد وضوابط کا پابند کیا۔

رام پور کے اس علمی وادبی ماحول کی تاریخ اس لحاظ سے بھی بصیرت افروز ہے کہ اس دور میں متعدد لغات لکھے گئے۔ متروکات، تذکیروتانیث وغیرہ سے متعلق بہ کثرت رسالے تحریر کیے گئے۔ بعد ازاں آہستہ آہستہ رام پور کے یہ ادبی اثرات حیدرآباد دکن پہنچے اور اس نوعیت کے رسائل مذکورہ مباحث کے پس منظر میں یہاں بھی لکھے گئے۔ یہ سب اردو کی لسانی اور عروضی تاریخ کی اہم دستاویز قرار دی جاتی ہیں۔ رام پور کے اس علمی وادبی ماحول میں امیر مینائی نے بھی قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔ رام پور کی اس علمی وادبی صورتِ حال کی تفصیل حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری کی کتاب ''تاریخ کتاب خانہ رضا'' میں کسی حد تک ملتی ہے۔

(۴)

امیر کو، دربار رام پور میں اپنی اعلیٰ علمی وادبی صلاحیتوں کی وجہ سے دہلی ولکھنو کے شعراء میں برتری حاصل تھی۔ داغ (۲۵رمئی ۱۸۳۱ء۔ مطابق ۱۲رذی الحج ۱۲۴۶ھ۔ ۱۴رفروری ۱۹۰۵ء مطابق ۷رمحرم ۱۳۲۳ھ) اور جلال (۱۸۴۳ء بمطابق ۱۲۵۰ھ/۱۸۰۹ء مطابق ۱۳۲۴ھ) کو امیر کے اہم معاصرین میں خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں شعراء کو امیر کی طرح فصاحت وبلاغت، زبان وبیان اور عروضی مسائل سے گہری دلچسپی تھی۔ امیر طرح دونوں شعراء نے لغت نویسی کی طرف توجہ کی۔ دونوں ہی کے تلامذہ اور شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ امیر کی طرح ان دونوں قابلِ اساتذہ نے غزل گوئی، تاریخ وقطعات اور قصیدہ گوئی کی طرف توجہ کی اور اپنے دور میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

داغ اور جلال کے بعد امیر کے دو اور قابلِ ذکر معاصر شعراء میں منیر (۲۲نومبر ۱۸۱۸ء مطابق ۹رذی الحج ۱۲۲۹ھ/۹راگست ۱۸۸۰ء مطابق ۴ررمضان ۱۲۹۷ھ) اور تسلیم (۱۸۱۹ء مطابق ۱۲۳۴ھ/۲۸رمئی ۱۹۱۱ء مطابق ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۳۹ھ) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں شعراء رام پور میں امیر کے ساتھ رہے۔ امیر کی طرح دونوں کو تمام اصنافِ شاعری پر قدرت حاصل تھی۔

امیر کو اپنے ان چاروں معاصرین پر جو فوقیت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ درج ذیل فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو امیر کے علمی وادبی کارناموں پر مشتمل ہے۔

نظم اردو

۱۔ غیرت بہارستان:۔ پہلا دیوان جو غدر سے پہلے مرتب ہوا اور غدر میں تلف ہو گیا۔ اس میں غزلوں کے علاوہ واجد علی شاہ کی مدح میں قصائد اور دیگر منظومات تھے۔

۲۔ مثنوی کبوتر نامہ:۔ غیر مطبوعہ۔ واجد علی شاہ کے کبوتروں کی تعریف میں دو سو شعار کی مثنوی۔ نایاب

۳۔ مخمس نعتیہ:۔ محسن کاکوری کے نعتیہ قصیدے کی تضمین۔ مصنفہ ۱۲۷۵ھ مطبوعہ مطبع شام اودھ (مع قصیدۂ محسن) سال طباعت ندارد۔

۴۔ مضامین دل آشوب:۔ چھے داسوخت مرتبہ ۱۲۸۴ھ۔ شعلہ جوالہ جلد اول مطبوعہ ۱۲۸۵ھ میں شائع ہوئے ۱۹۲۱ء میں مینائے سخن کے نام سے طبع ہوئے۔ ساتواں داسوخت جو اس مجموعے سے الگ اور غیر مطبوعہ تھا اردو، کراچی۔ جنوری ۵۸ء میں شائع ہوا۔

۵۔ دیوان گوہر انتخاب:۔ غیر مطبوعہ۔ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کی غزلوں کا منتخب دیوان۔ مرتبہ ۱۲۸۵ھ (رضا لائبریری۔ رام پور)

۶۔ محامد خاتم النبیین:۔ نعتیہ دیوان۔ مرتبہ ۱۲۸۷ھ مطبوعہ ۱۲۸۹ھ۔

۷۔ مرآۃ الغیب:۔ پہلا مطبوعہ دیوان۔ مرتبہ ۱۲۸۴ھ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ۔

۸۔ گوہر انتخاب:۔ مفردات کا پہلا مجموعہ۔ مرتبہ ۱۲۸۵ء۔ مطبوعہ ۱۲۹۰ء۔

۹۔ مثنوی کارنامہ عشرت:۔ نواب کلب علی خاں کے بڑے صاحبزادے سید ذوالفقار علی خاں کی شادی کے بیان میں ۱۲۸۷ھ میں لکھی گئی۔ قلمی نسخہ مملوکہ صولت پبلک لائبریری۔ رام پور۔ مطبوعہ اردو، کراچی، اپریل ۱۹۵۶ء۔

۱۰۔ مثنوی نور تجلی:۔ درمیان ولادت پیغمبر اسلام بطرز نور نامہ۔ مطبوعہ ۱۲۹۲ھ

۱۱۔ مثنوی ابر کرم:۔ مذہبی حکایات۔ مطبوعہ ۱۲۹۴ھ۔

۱۲۔ مثنوی عاشقانہ:۔ شہزادہ ماہ پیکر و شہزادی زہرہ جبیں کی داستانِ عشق۔ نواب کلب علی خاں کے عہد میں لکھی گئی۔ مطبوعہ اردو کراچی۔ جولائی اکتوبر ۱۹۶۰ء۔

۱۳۔ ذکر شاہ انبیاء:۔ مسدس در بیان ولادت و معراج و وفات پیغمبر اسلام۔ مرتبہ ۱۲۹۰ھ۔ مطبوعہ ۱۲۹۳ھ۔

۱۴۔ صبح ازل:۔ مسدس در بیان ولادت پیغمبر اسلام۔ مطبوعہ ۱۲۹۴ھ۔

۱۵۔ شام ابد:۔ مسدس در بیان وفات پیغمبر اسلام۔ مطبوعہ ۱۲۹۸ھ۔

۱۶۔ لیلۃ القدر:۔ مسدس درمیان معراج پیغمبر اسلام۔ مطبوعہ ۱۲۹۸ھ۔

۱۷۔ مثنوی حکایت اویس قرنی:۔ غیر مطبوعہ مکتوبہ ۱۳۰۸ھ عشق رسول کی مختصر حکایت (کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ)۔

۱۸۔ قصائد امیر:۔ غیر مطبوعہ۔ نواب مشتاق علی خان اور نواب حامد علی خاں کی مدح کے قصائد اور دیگر مدحیات مرتبہ بہ عہد نواب حامد علی خاں۔ (رضا لائبریری۔ رام پور)۔

۲۰۔ مجموعہ سہرا:۔ غیر مطبوعہ نواب حامد علی خاں کی شادی کے سہرے۔ مرتبہ ۱۸۹۴ء۔ یہ سہرے قصائد امیر میں بھی شامل ہیں۔ (رضا لائبریری رام پور)

۲۱۔ صنم خانہ عشق:۔ دوسرا اور آخری مطبوعہ دیوان۔ مرتبہ ۱۳۰۶ھ مطبوعہ ۱۳۱۸ھ

۲۲۔ جوہر انتخاب:۔ مفردات کا دوسرا اور آخری مجموعہ۔ مجموعہ مفردات گوہر انتخاب کے ساتھ صنم خانہ عشق میں بطور ضمیمہ شائع ہوا۔

نظم فارسی

۱۔ دیوانِ فارسی:۔ غیر مطبوعہ (مملوکہ اسرائیل احمد صاحب مینائی نبیرہ امیر مینائی)

نثر اردو

۱۔ نثر در تعریف قیصر باغ:۔ غیر مطبوعہ۔ غدر سے پہلے لکھی گئی۔ (رضا لائبریری۔ رام پور)

۲۔ خیابان آفرینش:۔ میلاد شریف۔ مصنفہ ۱۳۰۵ھ۔ مطبوعہ ۱۳۰۶ھ۔

۳۔ انتخاب یادگار:۔ ریاست رام پور کے متوطن و متوسل اردو فارسی، عربی اور ہندی شعراء کا تذکرہ مرتبہ ۱۲۹۰ھ مطبوعہ ۱۲۹۷ھ

۴۔ زاد الامیر:۔ دعاؤں کا مجموعہ۔ مرتبہ ۱۳۱۰ھ۔ غالباً اسی سال طبع ہوا۔

۵۔ نماز کے اسرار:۔ ارکان نماز سے متعلق رسالہ۔ مطبوعہ ۱۳۱۱ھ۔

۶۔ وظیفہ جلیلہ:۔ صبح شام پڑھنے کا وظیفہ۔ مطبوعہ ۱۳۱۲ھ۔

۷۔ نمونہ امیر اللغات:۔ مطبوعہ ۱۸۸۶ء۔

۸۔ امیر اللغات حصہ اول:۔ (الف ممدودہ)۔ مطبوعہ ۱۸۹۱ء۔

ایضاً، حصہ دوم:۔ (الف مقصودہ)۔ مطبوعہ ۱۸۹۳ء۔

ایضاً، حصہ سوم:۔ غیر مطبوعہ۔ (بائے عربی) مرتبہ ۱۸۹۵ء کو مملوکہ اسرائیل احمد صاحب مینائی۔

۹۔ جان تاریخ:۔ غیر مطبوعہ۔ عربی، فارسی اور اردو کے ہم عدد الفاظ کا مجموعہ نایاب۔

۱۰۔ گنجینہ قوافی:۔ غیر مطبوعہ۔ الف سے ی تک قوافی کا مجموعہ۔ نایاب۔

۱۱۔ محاورات مصادر اردو:۔ غیر مطبوعہ۔ ان محاورات کا مجموعہ جو اردو کے مصادر سے نکلتے ہیں۔ نایاب۔

۱۲۔ ست سہا بہاری:۔ غیر مطبوعہ۔ بہاری کے سات سو دوہوں کا ترجمہ۔ نایاب۔

نثر فارسی

۱۔ نغمہ قدسی:۔ غیر مطبوعہ۔ واجد علی شاہ کی کتاب صورت المبارک کی شرح۔ غدر سے پہلے لکھی گئی۔ نایاب۔

۲۔ شرح ہدایت السلطان:۔ مطبوعہ واجد علی شاہ کے عربی متن "ہدایت السلطان" کی شرح ۱۲۶۸ھ میں لکھی گئی۔ مملوکہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب۔ لکھنو۔

۳۔ شرح ارشاد السلطان:۔ مطبوعہ۔ واجد علی شاہ کے ایک اور عربی متن ارشاد السلطان کی شرح۔ نایاب۔

۴۔ سرمہ بصیرت یا معیار الاغلاط:۔ غیر مطبوعہ۔ عربی و فارسی کے ان الفاظ کا لغت جو اردو میں مستعمل ہیں۔ (رضا لائبریری رام پور)۔

۵۔ بہار ہند:۔ غیر مطبوعہ۔ اردو کا لغت۔ فارسی زبان میں۔ نایاب۔

۶۔ رموز غیبیہ:۔ غیر مطبوعہ۔ علم جفر میں ایک رسالہ۔ مصنفہ ۱۲۸۰ء۔ نایاب۔

۷۔ رمز الغیب:۔ غیر مطبوعہ۔ علم جفر میں دوسرا رسالہ۔ مصنفہ ۱۲۹۰ھ۔ (رضا لائبریری۔ رام پور)

۸۔ رسالہ بحث اعداد و حروف تہجی۔ غیر مطبوعہ مختلف فیہ اعداد و حروف تہجی کی تحقیق۔

(یہ فہرست ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مقالے مطالعہ امیر سے نقل کی گئی ہے)۔

(۵)

امیر کو اپنے چاروں معاصرین پر جو فوقیت حاصل ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ امیر کے معاصرین میں سے کسی نے ''نعت'' کی طرف خصوصی توجہ نہیں کی۔ جب کہ امیر صاحب دیوان نعت گو شاعر ہیں۔

۲۔ امیر کے معاصرین میں سے کسی نے ''تذکرہ نگاری'' نہیں کی۔ جب کہ امیر نے رام پور کے معروف و غیر معروف شعراء کا اہم تذکرہ لکھا، جسے حکیم نجم الغنی کی ''اخبار الصنادید'' کے بعد رام پور کی اہم علمی و ادبی اور تاریخی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔

۳۔ امیر کے کسی معاصر نے فارسی نظم و نثر کا قابلِ ذکر ذخیرہ نہیں دیا اس کے مقابلے میں امیر نے فارسی نثر، فارسی اردو لغات کے علاوہ ایک فارسی دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔

۴۔ امیر کے کسی معاصر نے اردو کا کوئی اہم لغت مرتب نہیں کیا۔ جب کہ اردو لغت نویسی کے باب میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ امیر جدید اردو لغت نویسی کے بانی ہیں انھوں نے پہلی مرتبہ اردو لغت کو سائنٹیفک نظام سے روشناس کرایا اور ایک منظم لائحہ عمل کے تحت ''امیر اللغات'' کی بنیاد ڈالی۔

۵۔ امیر نے اساتذۂ اردو کے متعدد دواوین کی ترتیب و تدوین اور تحشیہ کا کام انجام دیا۔ یہ اعزاز کسی معاصر کو حاصل نہیں۔

۶۔ امیر متعدد گلدستوں اور ایک اخبار ''سحر سامری'' کے مدیر رہے۔ امیر کے کسی معاصر کی ایسی کوئی خدمات ابھی تک سامنے نہیں آئیں۔

۷۔ امیر کے مقابلے میں کسی معاصر نے ''واسوخت نگاری'' پر توجہ نہیں کی جب کہ امیر کے یہاں ایک مجموعے کے علاوہ کئی بہترین واسوخت ملتے ہیں۔

۸۔ امیر نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مثنویات اور قصائد تحریر کیے۔

۹۔ تلامذہ کے طریقہ اصلاح میں جو معیار امیر نے متعارف کرایا وہ ان کا کوئی معاصر پیش نہیں کرسکا۔

۱۰۔ دینی ادب اپنے معاصرین میں صرف امیر نے لکھا۔

۱۱۔ مکاتیب کا جتنا بڑا ذخیرہ امیر نے فراہم کیا۔اس کا کسی سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

۱۲۔ علمِ جعفر و رمل سے متعلق رسائل صرف امیر نے تحریر کیے۔

۱۳۔ امیر اپنے دور کے بڑے شاعر اور نثار تھے۔ یہ اعزاز ان کے کسی اور معاصر کو حاصل نہیں۔

۱۴۔ علمی و ادبی قابلیت کے علاوہ کردار کا جو بڑا پن امیر کے یہاں ہے وہ ان کے معاصرین کے ہاں مفقود ہے۔

امیر کا اپنے معاصرین سے یہ ایک سرسری موازنہ ہے۔ جس سے ان کی برتری ثابت ہے۔افسوس کے صرف تیں فی صد علمی و ادبی کارنامے منظرِ عام پر آسکے۔ امیر کا بہت سا کام ضائع ہوگیا اور بہت سا اشاعت کا منتظر ہے۔ان میں صرف مکتوبات ہمیں حاصل ہوسکے ہیں۔ جن کی اہمیت و افادیت اس مقالے میں پیش کی گئی ہے۔

(۶)

امیر کے مکتوبات پر ڈاکٹر کریم الدین احمد اور ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے اپنے تحقیقی مقالات میں اظہار خیال کیا ہے۔ جس سے اردو ادب میں ان مکاتیب کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ان کے علاوہ ہمارے بعض ناقدین نے بھی اس طرف توجہ کی ہے۔ جن میں خواجہ احمد فاروقی، کسریٰ منہاس اور رشید

حسن خاں نمایاں ہیں۔(ان کے کام کی تفصیل باب اول کے آخر میں شامل کی گئی ہے۔لیکن یہ تمام کام مطبوعہ خطوط کے حوالے سے ہے۔امیر کے غیر مطبوعہ خطوط بھی اس پائے کے ہیں کہ وہ اردو کی ادبی لسانی اور عروضی تاریخ پر اثر انداز ہونے کی قوت رکھتے ہیں۔

امیر کے مکاتیب سے متعلق ایک اعتراض سامنے آتا ہے۔وہ یہ کہ ان میں امیر کے ذاتی زندگی اور خیالات و افکار تو ملتے ہیں۔لیکن ان کے دور کی بابت قابلِ ذکر مواد نہیں ملتا۔جیسا کہ غالب ،سرسید، حالی شبلی اور اکبر کے مکاتیب میں ہے۔یہ اعتراض اپنی جگہ بالکل درست ہے۔اور مکاتیب ہی کیا امیر کی شاعری کا بھی یہی حال ہے۔شاعری میں صرف وہ رباعی ہے۔جو گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر، درباری اور اپنی گھریلو زندگی میں اس حد تک مصروف تھے کہ انھیں باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھ سکے۔اس بات کو ہمارے ناقدین بھی تسلیم کرتے ہیں۔امیر کے متعلق یہ ایک عمومی رائے ہے کہ انھیں درباری زندگی نے تباہ کیا۔ورنہ وہ اردو ادب کو اور بہت کچھ دے جاتے۔امیر کی زندگی کا ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔وہ یہ کہ امیر کی زندگی اور ان کے کارناموں سے متعلق ہماری رائے ان کی شاعری اور مکتوبات کے دستیاب ذخیرے کے مطالعے کی بنیاد پر ہے۔اگر امیر کے یہ خطوط بھی میسر نہ آتے تو ہم کبھی بھی ان کی زندگی کے بارے میں جتنا کچھ جانتے ہیں۔اتنا بھی نہ جانتے تھے۔ہمیں امیر کے ۱۸۸۰ء سے مکاتیب ملتے ہیں۔اس سے پہلے کی زندگی سے متعلق سوالات کے جوابات پردہ اخفا میں ہیں۔یہی حال امیر کی شاعری کا ہے کہ ان کا پہلا دیوان لکھنؤ پر انگریزوں کے غاصبانہ قبضے کے دوران ضائع ہو گیا۔جب کہ آخری دیوان منظرِ عام پر نہیں آیا۔اور فارسی کلام تو دیکھنے کو نہیں ملتا۔حالاں کہ فارسی دیوان امیر نے اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا،لیکن افسوس اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔یہ ہیں وہ وجوہات جن کے باعث امیر کی شاعری اور،زندگی کے بعض پہلو تشنہ رہ گئے۔

(۷)

ہمیں امیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکاتیب کا جو ذخیرہ حاصل ہوا ہے۔وہ نہایت اہم اور مفید ہے۔چناں چہ اس کی افادیت کے پیشِ نظر ''امیر کے مکتوبات کا تحقیقی جائزہ'' نو ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔تا کہ ان کے علمی کارناموں کے ساتھ ان کی نجی زندگی کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہو سکیں۔اس سے یقیناً مطالعہ امیر دلچسپ اور مفید تر ہوگا۔

مقالے کا خاکہ:

باب اول:۔	مکتوبات امیر کا دستیاب ذخیرہ
	الف۔مطبوعہ مکتوبات کا تعارف و تجزیہ
	ب۔غیر مطبوعہ مکتوبات کا اجمالی تعارف
باب دوم:۔	مکتوباتِ امیر میں لسانی تصریحات
باب سوم:۔	مکتوباتِ امیر میں عروضی تصریحات
باب چہارم:۔	مکتوباتِ امیر میں نظام لغت نویسی
باب پنجم:۔	مکتوباتِ امیر میں معاصرانہ چشمکوں کی حقیقت
باب ششم:۔	تلامذہ امیر مکتوبات کے حوالے سے

باب ہفتم:۔ مکتوباتِ امیر کی سوانحی اہمیت

باب ہشتم:۔ مکتوباتِ امیر اور داغ کا تقابلی مطالعہ

باب نہم:۔ مکتوباتی ادب میں امیر کا مقام

اب تمام ابواب کی بابت اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔

باب اول

اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔(۱) امیر کے مطبوعہ مکتوبات کا تعارف و تجزیہ (۲) امیر کے غیر مطبوعہ مکتوبات کا اجمالی تعارف۔ پہلے حصے میں اردو مکتوباتی ادب کی روایت کو تمہید کے طور پر پیش کرنے کے بعد امیر کی مکتوب نگاری کے آغاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد امیر کے اس ذخیرہ مکاتیب کی نشان دہی کی گئی ہے جو ضائع ہوگیا۔ پھر امیر کے پہلے مطبوعہ خط کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد اب تک جو خطوط مختلف جگہوں پر شائع ہوئے ہیں انھیں زمانی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اسی حصے میں ان خطوط کے اختلاف کو بھی سامنے لایا گیا ہے۔ یہ فرق کہیں عبارت کا ہے۔ کہیں ماہ و سال کا اور کہیں کتابت کی غلطیاں ہیں۔ اس کے علاوہ بعض جگہ خطوط نامکمل شائع ہوئے ہیں اور بعض جگہ، ایک خط کی عبارت، غلطی سے دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی ہے۔

امیر مینائی کے خطوط اس صدی کی تقریباً ہر دہائی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ صراحت نہیں کی جاتی تھی کہ مکاتیب کہاں سے حاصل کیے گئے۔ بلکہ خطوط جب شائع ہوئے، غیر مطبوعہ ہی ظاہر کیے گئے۔ حالاں کہ متعدد خطوط مطبوعہ ہوتے تھے۔ چناں چہ اس صورت حال کے پیش نظر اس باب کے آخر میں ایک جدول (چارٹ) دی گئی ہے۔ جس میں یہ نشان دہی کی گئی ہے کہ امیر کے خطوط کس سنہ میں کہاں کہاں شائع ہوئے۔ ان کی تعداد کتنی ہے۔ اس کے بعد ایک فہرست ہے۔ جس سے یہ نشان دہی ہوتی ہے کہ کس مکتوب الیہ کے نام کتنے خطوط ہیں۔

اب ہم اس باب کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں جو غیر مطبوعہ مکتوبات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ یہ ذخیرہ راقم ناچیز کو اسمٰعیل احمد مینائی مرحوم (نبیرہ امیر مینائی) نے سات رجسٹروں کی فوٹو کاپی کی صورت میں مرحمت فرمایا تھا۔ ان رجسٹروں میں کل ۱۸۱۳ صفحات ہیں۔ جس میں اندازاً ۱۷۰۰ مکتوبات ہیں۔ ان میں بڑی تعداد مطبوعہ خطوط کی بھی ہے۔ ہم نے تمام رجسٹروں کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔

اس ذخیرے میں وہ خطوط جو امیر کے ہیں، لیکن کاتب کوئی دوسرا ہے۔ ان کے بارے میں وضاحتیں امیر کے بہت سے خطوط میں ملتی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر اپنی بیماریوں اور لغت کی مصروفیات کے باعث اپنے ہاتھ سے خط نہیں لکھ پاتے تھے۔ لیکن اکثر شاگردوں کی خواہش ہوتی تھی کہ امیر خود اپنے ہاتھ سے خط تحریر کیا کریں۔ چناں چہ وہ شاگردوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مختصر خط لکھ دیا کرتے تھے۔ امیر تفصیلی خط عموماً ان شاگردوں یا اہلِ علم کو تحریر کرتے تھے۔ جن سے کوئی اہم نجی کام ہوتا، یا علمی بحث مقصود ہوتی۔ اس باب کے آخر میں امیر کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم

اس باب میں لسانی مسائل سے متعلق امیر کے خیالات، تذکیر و تانیث اصلاحِ سخن، لغت کے مسائل اور علمِ بلاغت کے عنوانات کے تحت پیش کیے گئے ہیں۔ امیر کے ان خیالات کا دیگر لغات اور کتب و رسائل میں ملنے والے فضلاء کے بیانات سے تقابل بھی کیا گیا ہے۔ جس کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔

''مہیں''

(مہیں۔ میں ہی کی جگہ بول چال میں چاہے آ جاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گزرا'')۔

ضامن علی جلال لکھنوی نے ''سرمایہ زبان اردو میں امیر کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''مہیں، تحتانی معروف واخفانون کے ساتھ اک کلمہ ہے کہ فائدہ اپنی ذات کے حصہ کے معنی کا دیتا ہے اور جو اس لفظ کو'' میں ہی'' پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں، مولف ہیچمدان ان کے عندیے میں غلط ہے''۔

جلال کے اس بیان پر وجاہت جھنجھانوی ''اختلاف اللسان'' میں لکھتے ہیں:

''جناب جلال کا یہ اجتہاد باقدہ ضرور ہے کیوں کہ جب تم ہی کو تمہیں کنا چاہیے۔ مگر تمھیں اور ہمیں کے مقابلے میں یہ لفظ نہایت غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ شاید اجنبیت کی وجہ سے اور سچ پوچھیے تو یہ اجتہاد ایسا ہے جیسے کوئی یہاں وہاں کے قیاس پر کہ ان کا مخفف یاں واں آتا ہے۔ کہاں کا مخفف کاں کرنا چاہیے شعرائے دہلی و لکھنو میں سے اور کوئی اس کا عامل نہیں پایا جاتا صرف جناب جلال اور ان کے شاگرد لکھتے ہیں''۔

جلال نے امیر کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے جو توجیح پیش کی ہے۔ وہ وزن نہیں رکھتی، اگر جلال اس حوالے سے اسناد پیش کرتے تو اچھا ہوتا لہٰذا ''مہیں'' کی بابت امیر کے بعد وجاہت کے بیان کو درست ماننا چاہیے۔

باب سوم

جس طرح باب دوم میں لسانی مسائل، تذکیر و تانیث، لغت کے مسائل اور باغت کے حوالے سے مکتوبات امیر کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ اس باب میں اسی انداز سے علم العروض سے متعلق نکات کو، نکات سخن، علم القوانی اور تاریخ گوئی کے تحت استفادے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ اور آخر میں معاصرین کی کتب سے ان نکات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔

باب چہارم

اس باب میں ''امیر اللغات'' کی تالیف کے پس منظر، ''دفتر امیر اللغات'' کے قیام، انتظامی معملات سے متعلق کمیٹیوں کے قیام اور تالیفِ لغت کے طریقہ کار پر تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ امیر کی مرتب کردہ دیگر غیر مطبوعہ لغات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جو ہندوستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اسی ذیل میں ''امیر اللغات'' کے کتنے حصے تالیف ہوئے۔ کتنے حصے کب اور کہاں شائع کرائے گئے۔ کتنے غیر مطبوعہ رہ گئے؟ اور اب وہ ہندوستان اور پاکستان میں کہاں کہاں محفوظ ہیں۔ جو جلدیں شائع نہیں ہوئیں ان کی وجوہات کیا تھیں۔ امیر نے انھیں شائع کرانے کے لیے کیا کیا جتن کیے۔ ان تمام امور سے متعلق تفصیلی معلومات، امیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکاتیب کی مدد سے پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ''امیر اللغات'' کی فروخت کے طریقہ کار اور شرائط کو بھی ضمناً شامل کیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک جدت یہ بھی کی گئی ہے کہ ''دفتر امیر اللغات'' سے جو لوگ وابستہ تھے (معتمدین، محررین، اور دیگر کمیٹیوں سے وابستہ، ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ لوگ) ان سب کے متعلق معلومات حواشی میں دی گئی ہیں۔ اس طرح باب چہارم میں اہلِ علم کا ایک چھوٹا سا تذکرہ شامل ہو گیا ہے۔ آخر میں اس باب کے آخر میں ''امیر اللغات'' کا تقابلی مطالعہ دیگر لغات سے کیا گیا ہے۔

باب پنجم

مختلف ادبی تاریخوں اور مضامین میں امیر کے داغ دہلوی، جلال لکھنوی اور سید احمد دہلوی سے اختلافات کے بارے میں بیانات ملتے ہیں۔ اس حوالے سے اس باب میں امیر کے اپنے معاصرین کے ساتھ تعلقات کی بابت معلومات مطبوعہ وغیر مطبوعہ خطوط کی مدد سے پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں امیر کے ساتھ داغ کے رویوں کو داغ کے خطوط کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔

باب ششم

امیر مینائی کے شاگردوں کا شمار آسان کام نہیں یہ خود ایک بہت بڑا موضوع ہے جس پر علیحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ راقم نے اس باب میں امیر کے ۳۱۵ شاگردوں کی ایک فہرست شامل کی ہے۔ اس کے بعد درج ذیل عنوان کے تحت مکتوبات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔

امیر کا طریقہ اصلاح، بیرونی شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا انداز، اصلاح کے نمونے، شدید مصروفیات کے باعث شاگردوں کے کلام پر اصلاح دینے میں دشواریاں، شاگردوں کو علمی کاموں میں مصروف رکھنا، شاگردوں سے لاڈ و پیار، امیر کے طریقہ اصلاح کے اجزائے ترکیبی، کلام پر اصلاح کے دوران لکھے گئے حواشی اور ان کی تشریحات، تلامذہ سے محبت وانسیت، مذاق کرنے کا انداز، شکوے شکایت ضرورت کی چیزوں کی فرمائش کرنا اور ادائیگی رقم پر زور دینا، شاگردوں کو خاص کر مشاعرے کے لیے کلام لکھ کر دینا۔ شاگردوں کے کتب کی خبر گیری کرنا، کتابوں کی بابت شاگردوں سے رائے لینا۔ کلام کی تنقید میں احتیاط کی بار بار تنبیہ کرنا اور آخر میں امیر کی شخصیت اور علمیت کے اس رخ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

باب ہفتم

اس باب میں امیر کی خارجی اور داخلی زندگی کو خطوط کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں خانگی مسائل، فکرِ روزگار، اسفار، علمی وادبی مشاغل، عادات واطوار، فطری خوبیاں اور کمزوریاں، اہلِ خانہ واحباب کے ساتھ رویے، مذہبی رجحانات، وغیرہم پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ امیر کا اسلوبِ تحریر ان کے مزاج کے مطابق ہے۔ اور امیر اپنی عادت واطوار اور دینی و دنیاوی رویوں سے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان دونوں بیانات کو بنیاد بنا کر امیر کی سیرت پر اظہار اور معاصرین سے تقابل کیا گیا ہے۔

باب ہشتم

یہ اس مقالے کا آخری باب ہے۔ جس میں امیر کی مکتوب نگاری کا تقابلی مطالعہ ان کے اہم معاصر اور دوست داغ دہلوی کی مکتوب نگاری سے کیا گیا ہے۔

باب نہم

اس باب میں امیر کا دیگر مشاہیر کی مکتوبات نگاری سے تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد میں اردو کے مکتوباتی ادب میں امیر کا مقام متعین کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے انیسویں اور بیسویں صدی کے نمایاں مشاہیر کی مکتوب نگاری ہمارے پیش نظر رہی ہے۔ ان میں مرزا رجب علی بیگ سرور، غلام غوث بے خبر، غلام امام شہید، غالب، سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، اکبر الہ آبادی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مہدی افادی، ریاض خیر آبادی، مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالماجد دریابادی، سعادت حسن منٹو، اقبال، سجاد ظہیر، نیاز فتح پوری، اختر شیرانی، مولوی عبدالحق، جگر، امام احمد رضا خان بریلوی، مولانا مودودی، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی، فیض احمد فیض، بہادر یار جنگ، جاں نثار اختر، شورش کاشمیری، ابنِ انشاء، جوش ملسیانی، قدرت اللہ شہاب اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں وغیرہم شامل ہیں۔

خلاصہ تحقیق

تمام ابواب کے بعد ان کا خلاصہ اردو اور انگریزی میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تمام تر کوشش کی گئی ہے کہ مقالے سے حاصل ہونے والے ممکنہ نتائج بہتر طور پر آ جائیں۔ اسی حصے میں موجودہ کام کے نتیجے میں امیر مینائی پر ہونے والے مزید کاموں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں حواشی ہر باب کے آخر میں شامل کیے گئے ہیں۔ البتہ کتابیات تمام ابواب کے بعد دی گئی ہے۔

(۸)

اس مقالے کا عنوان استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر نجم الاسلام (سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ سندھ) نے تجویز کیا تھا۔ وہی اس کام کے نگراں بھی تھے۔ آپ کی دیرینہ خواہش تھی کہ امیر کے غیر مطبوعہ کام بالخصوص مکاتیب اور لغات کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ یہ آپ ہی کی خواہش تھی کہ میں اپنی زندگی اس کام کے لیے وقف کر دوں۔ چناں چہ ۱۹۸۸ء سے اب تک اس مقالے کے علاوہ دس (۱۰) طویل و مختصر مضامین امیر کے حوالے سے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تمام مضامین ڈاکٹر صاحب کی تحریک اور مرضی و منشاء کے مطابق لکھے گئے۔

یہ مقالہ آخری مراحل میں تھا۔ دو مدافعتی لیکچر ڈاکٹر قاضی خادم صاحب ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی زیرِ صدارت کامیابی کے ساتھ ہو چکے تھے کہ ڈاکٹر نجم الاسلام ۱۳ر فروری ۲۰۰۱ء کو اچانک دیارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اناللہ وانا علیہ راجعون۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بیماری، کمزوری اور نقاہت کے باوجود وفات سے ایک دن قبل شام کو مقالے کے بقیہ کام اور جو ہو چکا تھا اس پر ازسرِنو نظرِ ثانی کی بابت ہدایتیں دیں۔ اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا یہ ڈاکٹر صاحب سے ان کی حیات میں آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر نجم الاسلام نہایت شفیق، ایمان دار، معاملہ فہم، اعلیٰ پائے کے منتظم، مردم شناس، ذمہ دار اور کم گو انسان تھے۔ وہ بہترین نثر نگار، اعلیٰ مترجم، قابل ترین استاد، باسلیقہ مدیر، پرخلوص نگراں اور اردو تحقیق کی باکمال شخصیت تھے۔ وہ علم کا سمندر تھے جس سے ہر مکتبۂ فکر کے افراد مستفید ہوتے تھے۔ اس حقیر پر بھی استاد محترم کے بہت احسانات ہیں۔

اگر بوسیدہ گردد استخوانم
نگردد مہرت از جانم فراموش

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب کی وفات کے بعد نگراں استاذی پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب اور پروفیسر فہمیدہ شیخ صاحبہ شریک نگراں مقرر ہوئیں۔ محترم قبلہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب نے اپنی کہنہ سالی اور مصروفیات کے باوجود میرے اس کام کو مکمل کرایا میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں یہ میری خوش نصیبی ہے کہ ڈاکٹر نجم الاسلام کے بعد ان کے استاد اور برصغیر کی نامور شخصیت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب سے بھی علمی فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔

استاد محترم پروفیسر فہمیدہ شیخ صاحبہ (صدر شعبہ اردو) کا بھی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے ڈاکٹر نجم الاسلام کی وفات کے بعد مجھے حوصلہ دیا۔ آپ کی شفقت محبت اور خلوص کا نتیجہ ہے کہ میں نے ایک بار پھر نئے عزم کے ساتھ کام شروع کیا۔ جسے میرے رب نے اختتام تک پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر قاضی خادم صاحب نے بھی ہر مشکل وقت میں مجھے حوصلہ دیا اور عملی طور پر مدد بھی کی۔ میں آپ کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔

اس مقالے کی تیاری میں پروفیسر حبیب ارشد صاحب اور عزیز ترین دوست محمد انیس خاں کا بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ ان دونوں صاحبان نے مقالے کی بابت مفید مشورے دیے اور مبیضہ تیار کرنے میں معاونت کی۔ میں تمام صاحبان کا بے حد ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے میں سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

سید جاوید اقبال
شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جامشورو

باب اوّل

مکتوباتِ امیر کا دستیاب ذخیرہ

الف : مطبوعہ مکتوبات کا تعارف و تجزیہ

ب : غیر مطبوعہ مکتوبات کا اجمالی تعارف

مطبوعہ مکتوبات کا تعارف و تجزیہ

اُردو میں مکتوباتی ادب کی مستحکم روایت موجود ہے۔اس کی ابتداء مرزا رجب علی بیگ سرور کے رقعوں سے ہوئی(۱)۔ پھر غلام غوث بے خبر، مولوی غلام امام شہید، واجد علی شاہ، مرزا غالب، سر سید احمد خان، محسن الملک، امیر مینائی، داغ دہلوی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی، الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، مہدی افادی، ریاض خیر آبادی، ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، علامہ اقبال، سجاد ظہیر، نیاز فتح پوری، سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مودودی، جگر مراد آبادی، محمد علی ردولوی، ابن انشاء، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی، فیض احمد فیض اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں وغیرہم نے حیرت انگیز اضافہ کیا۔ یہ تو وہ نام ہیں جو فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اب تک سو سے زیادہ مجموعے تو منظر عام پر آچکے ہیں۔اور ہزار ہا مکتوبات رسائل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ بعض رسائل نے مکاتیب نمبر بھی شائع کیے ہیں۔

مکتوب نگاری ایک دل چسپ آرٹ ہے۔ یہ خود کلامی بھی ہے اور خبر رسانی بھی۔ علم و ادب کے فروغ کا ذریعہ بھی ہے، اور تاریخ و سوانح کا اہم ماخذ بھی اس میں وعظ و نصیحت بھی ہے اور لطافت و ظرافت بھی۔ یہ قومی اصلاح کی تحریک بھی ہے اور فطرت نگاری کا مرقع بھی۔ اس میں طنز بھی ہے اور شوخی و شگفتگی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی دنیا ہے جو اپنی تاریخ خود رقم کرتی ہے۔ ہمیں مکتوبات کے جو بھی مجموعے میسر آئے وہ اپنی شناخت اور پہچان رکھتے ہیں، یہ اپنے اسلوب علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حوالے سے ادب میں زندہ ہیں۔

غالب، شبلی، داغ، ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، اقبال، مولوی عبدالحق اور جانے کتنے مکتوب نویس ایسے ہیں جو اردو ادب کی تاریخ اور مکتوباتی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب میں اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر ان میں سے بیش تر پر جامعات اور جامعات سے باہر تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں۔ بہت سے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین نام ور شخصیات کی مکتوب نویسی پر قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ متعدد پر لکھنا باقی ہے۔ انھی شخصیات میں امیر احمد امیر مینائی بھی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی اپنے ایک مضمون "اردو کے مکتوباتی ادب پر ایک نظر" میں امیر کی مکتوب نگاری پر اہم رائے دیتے ہیں۔

> "امیر مینائی کی حیثیت غالب اور سر سید کے درمیان برزخ کی سی ہے۔ ... یہ خطوط لفظی دقائق، عروضی نکات اور لغوی و لسانی مباحث سے بھرے ہوئے ہیں" (۲)۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ :۔

> • "یہ خط محاسن انشا پردازی کے لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ... امیر زبان داں بھی تھے اور اہلِ زبان بھی ان کی تحریریں اس اعتبار سے بھی دیدنی ہیں کہ ان میں تو لعۂ زبان و بیان پر کام کرنے والوں کے لیے خاصا مسالا ملتا ہے (۳)۔

مکتوباتِ امیر کا سرسری مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ چناں چہ پہلے مرحلے پر امیر کے مکتوبات کو یک جا صورت میں لایا جانا

چاہیے۔اس لیے اس باب میں ہم امیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکتوبات کا جائزہ پیش کریں گے۔جس کے لیے یہ باب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے میں امیر کی مکتوب نگاری کی ابتداء اور مطبوعہ خطوط کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جائے گا۔جب کہ دوسرے حصے میں غیر مطبوعہ مکتوبات کا تعارف ہو گا۔

(۱)

امیر کی مکتوب نگاری کا آغاز کب سے ہوتا ہے؟۔ سر دست یہ کہنا مشکل ہے۔البتہ امیر کے ایک خط سے یہ شہادت ملتی ہے کہ ان کے ایک شاگرد نے مکتوبات جمع کیے تھے لیکن اس کا انتقال ہو گیا۔اس کے بعد اس ذخیرے کا کچھ پتا نہیں چلا اسی خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امیر کو مکتوب نگاری کا شوق تھا اور وہ اس پر خاص توجہ دیا کرتے تھے :

"خطوط جب میں فکر سے اچھے لکھتا تھا وہ ذخیرہ ایک سوئی جزو کا میرے ایک شاگرد نے جمع کیا تھا۔
سولہا برس ہوئے کہ وہ بے چارہ مر گیا اور اس ذخیرہ کا پتانہ لگا پھر کسی نے جمع نہیں کیا"(۴)۔

زاہد حسین زاہد کے نام یہ خط ۷ راپریل ۱۸۹۱ء کا تحریر کردہ ہے۔ سولہ سال پہلے انتقال کرنے سے مراد، انتقال کا سال ۱۸۷۵ء ہوا۔اس وقت تک خطوط کا ایک قابلِ لحاظ ذخیرہ جمع کر لیا گیا تھا۔یقیناً خطوط کو ذخیرہ کرنے میں کئی سال ضرور لگے ہوں گے۔اگر ہم ایک اندازہ قائم کر کے امیر کی مکتوب نگاری کے باقاعدہ آغاز کا سال ۱۸۷۰ء قرار دیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

اس خط کے مطابق امیر کے مکتوبات کا ایک ذخیرہ تھا جو ضائع ہو گیا۔ایک اور ذخیرے کے ضائع ہونے کی اطلاع زاہد حسین زاہد اپنے ایک خط میں دیتے ہیں۔یہ خط احسن اللہ ثاقب کے نام ہے :۔

"میرا وہ بکس جس میں ضروری کاغذات رہا کرتے تھے۔چوری ہو گیا تھا اس میں ۱۸۸۷ء کے قبل
کے اکثر خطوط تھے"(۵)۔

"خطوط منشی امیر احمد" میں زاہد حسین زاہد کے پچاسی (۸۵) مکاتیب ہیں جو انھوں نے اصل سے نقل کر کے احسن اللہ ثاقب کو ارسال کیے۔ان کے علاوہ بھی زاہد حسین زاہد کے پاس امیر کے خطوط تھے جو انھوں نے نہیں دیے۔اس کی بابت رقم طراز ہیں کہ :۔

"بعض خطوط اس لیے نقل نہیں کر سکا کہ جناب مرحوم نے ان کو نظر اغیار سے محفوظ رکھنے اور کسی کو
نہ دکھلانے کی تاکید اکید کر دی تھی"(۶)۔

اس طرح امیر کے کچھ اور اہم خطوط بھی ضائع ہو گئے۔ ممتاز علی آہ نے بھی "سوانح امیر مینائی" میں کئی خط گم ہونے کی اطلاع دی ہے (۷)۔اسرائیل احمد مینائی (نبیرہ امیر مینائی) نے راقم کو بتایا کہ امیر کی ایک صاحبزادی کی شادی حیدر آباد دکن میں ہوئی تھی۔انھیں امیر بہت عزیز رکھتے تھے۔اور پابندی سے اپنے ہاتھ سے خط لکھا کرتے تھے۔یہ تمام خطوط یکجا صورت میں بہت عرصے تک ہمارے پاس محفوظ تھے۔لیکن مکانات کی یکے بعد دیگرے تبدیلی کے باعث کہیں گم ہو گئے۔

امیر مینائی کی خواہش تھی کہ ان کے مکاتیب کا مجموعہ شائع ہو۔اس لیے وہ اپنے شاگردوں کو خطوط جمع کرنے کی تاکید بھی کرتے تھے۔

وسیم خیر آبادی کو ۱۳ر دسمبر ۱۸۸۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"اس رقعہ کو ضائع نہ کرنا یا واپس کر دینا یا احتیاط سے رکھنا" (۸)۔

زاہد حسین زاہد کے نام تحریر کردہ ایک خط سے جو ۷ر اپریل ۱۸۹۱ء کا تحریر کیا ہوا ہے امیر کی اس خواہش کا پتا چلتا ہے :۔

"تین چار شاگردوں نے کبھی کبھی کچھ خطوں کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں وہ جا بجا ہیں، بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کرلی ہیں۔ اور جب سے دفتر امیر اللغات کھولا گیا ہے۔ محرران دفتر بعض مکاتبات لکھ لیتے ہیں۔ یہ سب بھی اگر جمع ہوں تو ایک مجموعہ ہو سکتا ہے مگر کون یہ کام کرے۔ اس قدر ضرور ہے کہ کوئی خوش سلیقہ، فہمیدہ و سنجیدہ آدمی ترتیب دے کر ان کو یکجا لکھ دے اور میں ایک نظر دیکھ کر جو مطالب شائع کرنے کے نہ ہوں ان کو نکال ڈالوں تو بنے مگر اس کی فرصت ہی نہیں" (۹)۔

الغرض امیر کی زندگی میں ان کے خطوط کی اشاعت ممکن نہیں ہو سکی البتہ وفات کے سات سال بعد "اردوے معلیٰ"، علی گڑھ میں پہلی مرتبہ ان کے مکاتیب شائع ہوئے (۱۰)۔ اسی میں ان کا پہلا مطبوعہ خط یکم جولائی ۱۸۸۰ء کا ملتا ہے۔ جو حکیم کوثر خیر آبادی کے نام ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کا یہ کہنا درست نہیں کہ "امیر کا پہلا مطبوعہ خط ثاقب کے نام ۱۶ر شوال ۱۲۹۷ھ مطابق ۲۱ر ستمبر ۱۸۸۰ء کا لکھا ہوا ہے" (۱۱)۔ "اردوے معلیٰ"، علی گڑھ میں خطوط کی اشاعت کے بعد وقتاً فوقتاً امیر کے اور بھی مکاتیب شائع ہوئے ہیں جن کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں!

(۲)

ا۔ اُردوے معلیٰ علی گڑھ (۱۲)

امیر مینائی کے "اُردوے معلیٰ"، علی گڑھ میں شائع ہونے والے خطوط کی تعداد پانچ ہے۔ جس میں چار اُردو اور ایک فارسی میں ہے۔ یہ تمام مکاتیب کوثر خیر آبادی کے نام ہیں۔ جن کی مختصر تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

ذیل کی تفصیل میں پہلے شمار نمبر پھر تاریخ و سنہ اس کے بعد پہلی سطر میں خط کے ابتدائی الفاظ اور دوسری سطر میں اختتامی الفاظ درج کیے گئے ہیں۔

شمار نمبر	تاریخ و سنہ	خط کا آغاز و اختتام
ا۔	۲۳ر فروری ۱۸۸۲ء	خط کا آغاز : حضرت کوثر! میں ڈیڑھ مہینے سے بیمار خط کا اختتام : قابل معلوم ہوتے ہیں یا نہیں۔
۲۔	۹ر محرم الحرام ۱۲۹۸ھ	خط کا آغاز : حضرت کوثر سقاکم اللہ، حوض الکوثر خط کا اختتام :بذریعہ منی آرڈر پہنچے گی۔

۳۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : گرامی گوہر! معنی پرور! اعلی اللہ شانکم خط کا اختتام : خداوند تعالیٰ کوئی صورت جمیعت خاطر کی نکالے
۴۔	یکم جولائی ۱۸۸۰ء	خط کا آغاز : عرق عرق تشویر حقیر کسیر فقیر امیر خط کا اختتام : تحریک میں کمی نہیں ہوتی اتمام مہتمم حقیقی کے ہاتھ ہے۔
۵۔	ہفتدہم رجب ۱۲۹۶ھ (فارسی خط)	خط کا آغاز : خدمت کوثر کے لطافت و نظامت زبان و بیان خط کا اختتام : آثم حقیر فقیر امیر

۲۔ خطوط منشی امیر احمد (۱۳)

اس مجموعہ مکاتیب کو احسن اللہ ثاقب نے مرتب کیا تھا۔ جس میں امیر مینائی کے دو سو چونتیس (۲۳۴) مکاتیب پیش کیے گئے ہیں جو حکیم برہم گورکھپوری، حکیم عابد علی کوثر خیر آبادی، زاہد حسین زاہد، احسن اللہ ثاقب، سید محمد نوح، نور الحسن، داغ دہلوی، حبیب الرحمٰن شروانی، نعیم الحق آزاد، منشی جمیل احمد شاداں، قاضی عبد الجمیل، قاضی محمد خلیل حیراں، منشی امتیاز احمد خاں راز، حافظ غلام احمد فروغی، طاہر فرخ آبادی، مولوی محمد اعجاز حسن خاں، محمد عمر ریاض حسن خاں خیال، مولوی مہدی حسن خاں شاداب اور صفیر بلگرامی کے نام ہیں۔ اس مجموعے کی اجمالی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

حکیم برہم گورکھپوری کے نام مکتوبات

۱۔	۶ر محرم ۱۳۰۷ھ	خط کا آغاز : السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ خط کا اختتام : اس لیے لکھا کہ نگرانی رفع ہو۔
۲۔	۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء	خط کا آغاز : پیارے برہم! لکھ کر پچھتا رہا ہوں خط کا اختتام : محمد احمد تسلیم گزار ہیں۔
۳۔	۷ر جون ۱۸۹۱ء	خط کا آغاز : پیارے برہم دعائیں لو خط کا اختتام : سال بھر کے بعد ان کا ایک خط آیا
۴۔	۱۵ر جون ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز : پیارے برہم مدت کے بعد داغ کا مرہم آیا خط کا اختتام : تمھاری محبت کا منت پذیر
۵۔	۸ر اکتوبر ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز : پیارے برہم، غصے میں ترے میں نے عجب لطف اٹھایا خط کا اختتام : بشرط آنکہ با ما یار باشی
۶۔	۶ر نومبر ۱۸۹۲ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے برہم۔ خدا تم کو تمھاری آرزوؤں میں خط کا اختتام : میں ان کو بھی زیادہ سمجھتا ہوں۔ فقط

۷۔	۲؍مارچ ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز : مجی بر ہم کو بعد دعا کے معلوم ہو خط کا اختتام : نہ لکھتا یہ تعمیل نہ کرتا۔ فقط
۸۔	۲۳؍اگست، ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے بر ہم! تم میرے زخم جگر کے مرہم خط کا اختتام : تسلیم بالوف التکریم والتجیل کہتے ہیں۔
۹۔	۲۲؍نومبر، ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز : مجی سلام و دعا انضام خط کا اختتام : علیل سلام عرض کرتے ہیں۔
۱۰۔	۱۶؍جون ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : دل نواز احباب، سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون خط کا اختتام : عزیزان واحباب کو نام بنام دعا سلام کہیے۔
۱۱۔	۱۵؍جولائی ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : دل نواز۔ سلام مسنون خط کا اختتام : سب کی طرف سے ماوجب فقط
۱۲۔	۵؍ستمبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے بر ہم، سلام و دعا خط کا اختتام : کچی بات لکھی ہے۔ بر ہم نہ ہو جانا
۱۳۔	۸؍ستمبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے بر ہم، اسوقت سلام و دعا خط کا اختتام : رسید کا انتظار ہے۔
۱۴۔	۱۴؍اکتوبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : مجی بر ہم، دعا کے بعد مدعا یہ ہے خط کا اختتام : سب کی طرف سے سلام و مزاج پرسی
۱۵۔	۱۴؍نومبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبِ دل نواز۔ سلام مسنون، دعا مشحون خط کا اختتام : جلیل حسن کی طرف سے مزاج پرسی
۱۶۔	۵؍ذیقعد ۱۳۱۶ھ	خط کا آغاز : پیارے بر ہم، اندھا جب پیتا ئے کہ خط کا اختتام : در خانہ اگر کس ست، یک حرف بس ست
۱۷۔	۷؍جنوری ۱۸۹۸ء	خط کا آغاز : سلام و دعا۔ محبت نامہ آیا خط کا اختتام : مختصر نگاری معاف ہو، فقط
۱۸۔	۱۲؍دسمبر ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے بر ہم، تمھارا خط آیا خط کا اختتام : تم کس کام پر ہو۔ ضرور لکھو۔ فقط
۱۹۔	۳؍اکتوبر ۱۹۰۰ء (حیدر آباد، دکن)	خط کا آغاز : داغ دل کے مرہم پیارے بر ہم خط کا اختتام : میں بھی انھی تارکین میں ہوں۔

۲۰۔	۲۶/اگست (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے برہم، سلام و دعا، پھر مدعا خط کا اختتام: سب جگہ امن چین ہو جائے۔
۲۱۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: پیارے برہم دوبارہ پان بھیجنے کا شکریہ خط کا اختتام: خیریت سے ہمیشہ مسرور کرتے رہو۔ والسلام

حکیم عابد علی کوثر خیر آبادی کے نام مکتوبات۔

ا۔	۳۱/مارچ ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز: میرے پیارے کوثر۔ میں نے کسی خط کا جواب قلم انداز نہیں کیا۔ خط کا اختتام: خدا خوش رکھے اور توفیقات نیک دے، آمین
۲۔	۵/فروری ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: پیارے کوثر۔ ملفوف کاغذ میں لکھوا کر خط کا اختتام: دو سطریں بطور رسید لکھ دیں۔ فقط
۳۔	۲۶/مئی ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: پیارے کوثر، ارحم الراحمین بہ طفیل ساقی خط کا اختتام: جلیل تسلیم عرض کرتے ہیں۔
۴۔	۶/اگست ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: پیارے کوثر! مجھے بیماریاں و بیمارداریاں خط کا اختتام: تمھاری سچی محبت کا منت پذیر
۵۔	۲۴/اگست ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: پیارے کوثر، کئی روز ہوئے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ خط کا اختتام: جلیل وآہ۔ تسلیم رساں ہیں۔
۶۔	۲۵/ستمبر ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: حکیم صاحب۔ عجیب کیفیت میں ہوں خط کا اختتام: چند شعر پیام یار کو بھیجے دیتا ہوں۔
۷۔	۲۹/اکتوبر ۱۸۹۲ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے کوثر! سلام و دعا کے بعد مدعا نگار ہوں خط کا اختتام: اکبر و اصغر ماوجب گزار ہیں۔ فقط
۸۔	۱۱/دسمبر ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: پیارے عابد۔ سلام و دعا کے بعد معلوم ہو۔ خط کا اختتام: سب احباب کو مالیتق
۹۔	۱۰/فروری ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: پیارے کوثر، میں آپ کو خیر آباد خط لکھ کر خط کا اختتام: رسید ضرور لکھیے گا۔
۱۰۔	۱۲/اپریل ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: محبی و شفیقی زاد عنایتکم۔ سلام مسنون خط کا اختتام: سب اطفال ماوجب رساں ہیں۔

۱۱۔	۱۹؍ مئی ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبی و مشفقی زاد لطفکم۔ بعد سلام مسنون خط کا اختتام : اپنی خیریت بہت جلد لکھیے گا۔
۱۲۔	۹؍ اگست ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبی و مشفقی زاد عنایتکم۔ سلام مسنون خط کا اختتام : میری حال کی شاعری ہے۔
۱۳۔	۳؍ نومبر ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبی و مشفقی زاد عنایتکم۔ سلام مسنون خط کا اختتام : جلیل و آہ تسلیم رساں ہیں۔
۱۴۔	۲۰؍ اکتوبر ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے کوثر! اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں برکت دے۔ خط کا اختتام : دختر بالکل ابتر ہے۔ فقط
۱۵۔	۴؍ جنوری ۱۹۹۶ء	خط کا آغاز : حکیم صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خط کا اختتام : جلیل بصد شوق تسلیم عرض کرتے ہیں۔
۱۶۔	۸؍ مارچ ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبی حکیم صاحب! سلام مسنون دعا مخشون خط کا اختتام : تسلیم گزار و سپاس گزار ہیں۔
۱۷۔	۱۳؍ ستمبر	خط کا آغاز : پیارے کوثر۔ ترکیب استعمال دوا کی خط کا اختتام : سب اعزہ و احباب تسلیم رساں ہیں۔
۱۸۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : محبی و مکرمی، سلام و شوق و اخلاص و نیاز خط کا اختتام : انتخاب الانتخاب بھیجیے گا۔
۱۹۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : حکیم صاحب! پرسوں حبس بول کا دورہ پڑا تھا۔ خط کا اختتام : مگر خیر بند نہیں ہے۔ فقط
۲۰۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : پیارے کوثر! محبت نامہ آیا ممنون فرمایا خط کا اختتام : سب عزیز و اطفال ماوجب رساں ہیں۔
۲۱۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : پیارے کوثر! میں اس زمانے میں اپنے امراض خط کا اختتام : جواب رہ گیا ہو تو معاف کیجیے گا۔
۲۲۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : حکیم صاحب۔ محبی و مکرمی سید طفیل احمد صاحب خط کا اختتام : اللہ تعالیٰ ان کے انفاس میں برکت دے۔
۲۳۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : محب سامی۔ کوثر سلامت خط کا اختتام : منشی صاحب قبلہ بھی سلام و دعا فرماتے ہیں۔

۲۴۔ تاریخ درج نہیں — خط کا آغاز : پیارے کوثر۔ محبت نامہ آیا
خط کا اختتام : غزل منتخب کر کے گلدستے میں دیجیے گا۔

سید زاہد حسین زاہد رئیس سہارن پور کے نام مکتوبات

۱۔	۱۱؍ اکتوبر ۱۸۸۷ء	خط کا آغاز : مکرما! سلام مسنون۔ محبت نامہ آیا۔
	(رام پور)	خط کا اختتام : کیا کروں کہ مجبور معذور ہوں۔
۲۔	۸؍ نومبر ۱۸۸۷ء	خط کا آغاز : محبی سلام، غزل کئی دن ہوئے بھیج دی ہے۔
	(رام پور)	خط کا اختتام : اب پہنچ گئی ہو گی۔ والسلام
۳۔	۱۲؍ جنوری ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
	(رام پور)	خط کا اختتام : مطمئن ہو جاؤں کہ معذرت نامہ پہنچ گیا۔
۴۔	۲؍ جولائی ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،
	(رام پور)	خط کا اختتام : فرصت کہاں جو نظر ثانی کروں۔
۵۔	۱۹؍ جولائی ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : شفیقا۔ سلام مسنون۔ ایک مختصر پرچہ
	(رام پور)	خط کا اختتام : ردو قدح میں طول ممل ہو گا۔
۶۔	۲۸؍ اگست ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : دل نواز۔ سلام شوق، سلام میں نے نہیں کہے۔
	(رام پور)	خط کا اختتام : سفر کا عزم ہے تو کدھر۔
۷۔	۵؍ نومبر ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : مکرمی و محبی۔ سلام مسنون۔ محبت نامہ آیا۔
	(رام پور)	خط کا اختتام : ماوجب رساں ہیں۔
۸۔	۱۰؍ فروری ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز : یاد آور کرم گستر سلامت، کارڈ آیا
	(رام پور)	خط کا اختتام : خدمت میں بکمال اخلاص تسلیم
۹۔	۲۶؍ ذی الحج ۱۳۰۶ھ	خط کا آغاز : میرے عنایت فرمائے قدیم سلامت
	(رام پور)	خط کا اختتام : اور اپنی منیات میں کامیاب
۱۰۔	۸؍ ستمبر ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز : السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
		خط کا اختتام : فرزند ہے یا نہیں ضرور لکھیے گا
۱۱۔	۱۲؍ نومبر ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز : میرے دل نواز مجھ سے زیادہ مجھ پر مہربان
		خط کا اختتام : آپ بنتی فاطمہؓ ہیں۔

۱۲۔	۳۰ربیع الآخر ۱۳۰۶ھ	خط کا آغاز : سید صاحب مہربان و کرم فرمائے مخلصان سلامت خط کا اختتام : فی نفسہ مافی الکتاب کے حسن پر نظر رہے۔ (آخر میں قطعہ تاریخ ہے)۔
۱۳۔	۳۱/مارچ ۱۸۹۰ء	خط کا آغاز : محبا۔ سلام مسنون، اخلاص مشحون خط کا اختتام : اپنے خط خیریت نمط سے مسرور کرتے رہا کیجیے۔
۱۴۔	۷/اپریل ۱۸۹۰ء	خط کا آغاز : میری قدر کر کے میرا دل بڑھانے والے خط کا اختتام : اطفال ماوجب گزار ہیں۔
۱۵۔	۲۰/اپریل ۱۸۹۰ء (رام پور)	خط کا آغاز : سید صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خط کا اختتام : محمد احمد تسلیم عرض کرتے ہیں۔
۱۶۔	۱۵/جولائی ۱۸۹۰ء (رام پور)	خط کا آغاز : دل نواز سلام مسنون اخلاص مشحون خط کا اختتام : اطمینان کے ساتھ ملاقات ہو۔
۱۷۔	۱۳/اپریل ۱۸۹۱ء	خط کا آغاز : حضرت زاہد ریلے لوکاٹ پہنچے خط کا اختتام : سب بندہ زادے سلام کہتے ہیں۔
۱۸۔	۲۶/جولائی ۱۸۹۱ء (رام پور)	خط کا آغاز : دل نواز! سلام و نیاز کے بعد التماس ہے خط کا اختتام : لکھیے تو یہاں سے بھیج دوں۔
۱۹۔	۳۰/جولائی ۱۸۹۱ء (رام پور)	خط کا آغاز : حضرت زاہد کو ایک رند آلودہ گناہ کا سلام خط کا اختتام : محمد احمد تسلیم گزار ہیں۔
۲۰۔	۲۶/ستمبر ۱۸۹۱ء	خط کا آغاز : محب دل نواز۔ سلام ودعا۔ محبت نامہ خط کا اختتام : ملک وزبان کی ضرورت کو پورا کرتا ہوا پہنچا۔
۲۱۔	۱۳/جنوری ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز : پیارے زاہد دعائیں لو۔ تمھاری غزل پس خط کا اختتام : اخوان بھی اظہار شوق کرتے ہیں۔
۲۲۔	۲۰/جنوری ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز : پیارے زاہد، زہد مشرب، جام شراب خط کا اختتام : ما وجب گزار ہیں۔
۲۳۔	۹/مئی ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز : محب عزیز من۔ دعائیں لو۔ خط پہنچا۔ خط کا اختتام : آپ اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کیجیے۔
۲۴۔	۱۷/جون ۱۸۹۲ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد آلہی تم ہو خط کا اختتام : آپ کی سچی محبت کا منت پذیر

۲۵۔	۱۹/ جون ۱۸۹۲ء (رام پور)	خط کا آغاز: مجی سلام مسنون دعا مشحون۔ محبت نامہ آیا۔ خط کا اختتام: تمھاری سعادت و محبت واعانت کا بہت ممنون ہوں۔
۲۶۔	۳/ اگست ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: مجی سلام و دعا۔ کارڈ پہنچا خط کا اختتام: خدا آپ کی عمر دراز کرے۔
۲۷۔	۲۷/ ستمبر ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: سعیدو رشید دارین عزیزی سید زاہد حسین خط کا اختتام: اربابِ دفتر سلام نیاز کہتے ہیں۔
۲۸۔	۲/ نومبر ۱۸۹۲ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ میں تم سے اس قدر محجوب ہوں۔ خط کا اختتام: زیادہ دعا کے سوا کیا لکھوں۔
۲۹۔	۱۴/ دسمبر ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: پیارے زاہد، عرصہ ہوا کہ میں نے ایک معذرت خط کا اختتام: لغات کا دوسرا حصہ چھپ رہا ہے۔
۳۰۔	۲۷/ جنوری ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ شافی مطلق تم کو شفائے کامل خط کا اختتام: ایک کارڈ لکھوادیا کرو۔
۳۱۔	۱۲/ فروری ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: الٰہی پیارے زاہد کو مکروہات سے محفوظ خط کا اختتام: محمد احمد مع اخوان ماوجب رساں ہیں۔
۳۲۔	۹/ اپریل ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: محبِ دل نواز سلمکم اللہ تعالیٰ سلام مسنون خط کا اختتام: تکلیف پر تکلیف نہ دینا۔
۳۳۔	۱۹/ مئی ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: مجی زاد اخلاقکم۔ سلام مسنون خط کا اختتام: آپ کی سعی واعانت سے خالی نہ ہو۔
۳۴۔	۲۷/ مئی ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: سعید کونین زاہد حسین کو دعائیں۔ خط کا اختتام: آپ نے مطلع و مطمئن نہیں کیا۔
۳۵۔	۲۴/ جون ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: پیارے زاہد! پہلے تمھارا بھیجا میرا نایاب تحفہ خط کا اختتام: شعر سے نفرت ہو گئی ہے۔
۳۶۔	۳۰/ جون ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ سہارن پوری میووں کی پٹاری پہنچی۔ خط کا اختتام: محمد احمد اور ممتاز علی تسلیم گزار ہیں۔
۳۷۔	۸/ اگست ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: مجی سلام و دعا! آپ کا کارڈ خط کا اختتام: محمد احمد مع اخوان ماوجب رساں ہیں۔

۳۸۔	۲۵/ اگست ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: مجی سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام: سب عزیز واحباب وجب رساں ہیں۔
۳۹۔	۱۳/ ستمبر ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: مجی سلام مسنون دعا مشحون خط کا اختتام: فرزندان واحباب فقیر ماوجب رساں ہیں
۴۰۔	۴/ نومبر ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ اللہ تعالیٰ عمر واقبال میں برکت دے۔ خط کا اختتام: عزیزی ممتاز علی تسلیم رساں ہیں۔
۴۱۔	۹/ دسمبر ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: محب دل نواز۔ سلام ودعا خط کا اختتام: ممتاز علی تسلیم رساں ہیں
۴۲۔	۲۰/ فروری ۱۸۹۴ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد، خدا تم کو دونوں جہاں خط کا اختتام: ہمیشہ مطلع ومسرور کرتے رہو گے۔
۴۳۔	۱۳/ مارچ ۱۸۹۴ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ حضور پرنور کی شادی خط کا اختتام: باقی سوائے دعا کے کیا لکھوں۔ اس خط کے آخر میں ایک طویل قصیدہ اور ایک سہرا بھی شامل ہے)۔
۴۴۔	۲۳/ جون ۱۸۹۴ء	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ شعرا کے مشرب میں زاہد کی صفت خط کا اختتام: اہلِ دفتر سلام شوق کہتے ہیں۔
۴۵۔	۳۰/ ستمبر ۱۸۹۴ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد! دعا وسلام۔ عین انتظار خط کا اختتام: ابر کی بوند مستعمل نہیں۔ (اس خط کے آخر میں فارسی زبان میں دق کے لیے ایک نسخہ بھی تحریر ہے)
۴۶۔	۱۲/ جنوری ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ امیر فقیر کی دعائیں لو خط کا اختتام: ایں دعا واز من واز جملہ جہاں آمیں باد۔
۴۷۔	۳۰/ مارچ ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز: محب اعزہ زاد اقبالکم۔ دعاے صلاح وفلاح خط کا اختتام: ہر تردد وکلفت سے محفوظ ومطمئن رکھے۔
۴۸۔	۱۶/ اپریل ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز: پیارے زاہد سلمکم اللہ تعالیٰ۔ خط کا اختتام: ضرورت کے واسطے ملفوف ہے۔ آپ کا دعا گو۔
۴۹۔	۲۸/ اپریل ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ اللہ تم کو خوش رکھے۔ خط کا اختتام: سب عزیز سلام ودعا کہتے ہیں۔

۵۰۔	۳؍جون ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز : پیارے زاہد۔ تمھارا خط نہ آنے سے پہلے ہی میرا جی دھڑ کتا تھا۔ خط کا اختتام : تمھاری خوشی میری عین خوشی ہے۔
۵۱۔	۳؍جون ۱۸۹۵ء دو شنبہ (رام پور)	خط کا آغاز : وبشر الصابرین الذین اذا اصابتہم خط کا اختتام : تحریر کو اسی مطلب پر تمام کیا۔
۵۲۔	۶؍جون ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز : پیارے زاہد۔ دو پٹاریاں آکو اور شفتالو کی آئیں خط کا اختتام : پہلے تم راضی ہو جاؤ پھر سب کچھ آسان ہے۔
۵۳۔	۶؍ستمبر ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد۔ خدا کرے تم خوش ہو۔ خط کا اختتام : منتظر مژدۂ خیر وعافیت ہیں۔
۵۴۔	۱۹؍ستمبر ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد، اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ خط کا اختتام : جس وقت حسبِ دلخواہ ہو گی فوراً بھیج دوں گا۔
۵۵۔	۱۲؍اکتوبر ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد، اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ خط کا اختتام : سب عزیز واحباب ماوجب گزار ہیں۔ (اس خط کے آخر میں ایک قطعہ تاریخ ہے)
۵۶۔	۲۰؍نومبر ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز : محبی وسعیدی! دعائے صلاح وفلاح دارین خط کا اختتام : اب کے چھپ ہی کے رہے گا۔
۵۷۔	۴؍جنوری ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد، سلامت۔ بخیر وعافیت ہو۔ خط کا اختتام : سب چھوٹے بڑے ماوجب رساں ہیں۔
۵۸۔	۴؍مارچ ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد۔ اللہ تعالیٰ تم کو خوش رکھے۔ خط کا اختتام : کسی قصے سے متعلق ہو گا جو مجھے معلوم نہیں۔
۵۹۔	۱۹؍اپریل ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد، اللہ تعالیٰ تم کو خوش کرے۔ خط کا اختتام : مجھے ضرور آگاہ کیجیے۔
۶۰۔	۲۵؍جون ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد۔ امیر فقیر کی دعائیں لو خط کا اختتام : سب عزیز واحباب سلام کہتے ہیں۔
۶۱۔	۱۲؍ستمبر ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبی وسعیدی سلام مسنون ودعا مشحون خط کا اختتام : آپ سے بھی دعائے عافیت کی امید ہے۔
۶۲۔	۲۶؍ستمبر ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبی وسعیدی۔ سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام : جلیل حسن سلام عرض کرتے ہیں۔

۶۳۔	۳۰؍ستمبر ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز : پیارے زاہد سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام : اس کا مدعی خطا پر ہے۔ زیادہ دعا۔
۶۴۔	۳۰؍اکتوبر ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام : اطفال ماوجب گزار ہیں۔
۶۵۔	۶؍دسمبر ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد۔ دعائے صلاح وفلاح دارین خط کا اختتام : اطفال عقیدت خصال ماوجب گزار ہیں۔
۶۶۔	۱۰؍اپریل ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : سعید ورشید کونین مجی سید زاہد حسین خط کا اختتام : کلام بہت جلد عنایت کیجیے۔ منتظر ہوں۔ فقط آپ کا دائی خیر۔
۶۷۔	۴؍جولائی ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد، روحی فداک سلام مسنون خط کا اختتام : اطفال فقیر ماوجب رساں ہیں۔
۶۸۔	۱۴؍جولائی ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : پیارے زاہد تم ہو اور دونوں جہاں کا عیش خط کا اختتام : بارک اللہ خوب کہا ہے۔ (اس خط کے آخر میں زاہد حسین زاہد کا ایک شعر اور میر کا ایک قطعہ شامل ہے)
۶۹۔	۱۱؍اگست ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبّ دل نواز سلام ودعا۔ بہت چاہتا ہوں۔ خط کا اختتام : پیار بروزن فاع ہے۔
۷۰۔	۸؍ستمبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبّ دل نواز سلام ودعا۔ میرے خط کا جواب خط کا اختتام : جلیل حسن سلام نیاز عرض کرتے ہیں۔
۷۱۔	۱۹؍ستمبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : عین الانسان وانسان العین پیارے زاہد حسین خط کا اختتام : کسی جگہ یونہی نکالہذا اطلاعاً لکھا گیا۔
۷۲۔	۲۶؍اکتوبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبّ دل نواز۔ سلام ودعا خط کا اختتام : وہی ایک ایک دو دو ورق
۷۳۔	۵؍دسمبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبّ دل نواز سلام ودعا انضمام خط کا اختتام : میں بھی انشاء اللہ دیکھوں گا۔
۷۴۔	۱۳؍دسمبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : میرے دل نواز میرے قدر شناس، سید صاحب خط کا اختتام : محمد احمد مع اخوان ماوجب رساں ہیں فقط۔

۷۵۔	۳۰؍دسمبر ۱۸۹۷ء (رام پور)	خط کا آغاز: رشید وسعید کونین مجی سید زاہد حسین خط کا اختتام: حافظ جلیل حسن ماوجب گزار ہیں۔
۷۶۔	۲۶؍مارچ ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز: مجی وسعیدی زاد عمر کم واقبالکم، سلام مسنون خط کا اختتام: جلیل حسن باتخصیص تسلیم گزار ہیں۔
۷۷۔	۲۶؍جنوری ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز: سعید ورشید کونین مجی سید زاہد حسین خط کا اختتام: تکلیف دہی بار خاطر نہ ہوگی، زیادہ دعا۔
۷۸۔	۸؍جولائی ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز: محب دلنواز۔ سلام ودعا۔ آم پہنچے خط کا اختتام: جلیل حسن سلام سپاس انضمام عرض کرتے ہیں۔
۷۹۔	۲۴؍نومبر ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز: دل نواز ارباب نیاز۔ سلام مسنون خط کا اختتام: اطفال واحباب ماوجب رساں ہیں۔
۸۰۔	۲۲؍مارچ ۱۸۹۹ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد، سلام ودعا۔ مدت کے بعد خط کا اختتام: اللہ کا شکر ہے، زیادہ کیا لکھوں۔
۸۱۔	۴؍اپریل ۱۸۹۹ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ دعا مدعا۔ مادہ تاریخ میں خط کا اختتام: ایک بڑی جگہ سے امید بھی ہے۔ باقی خیریت ہے۔
۸۲۔	۴؍اپریل ۱۸۹۹ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد۔ دعا مدعا۔ مادہ تاریخ میں خط کا اختتام: اللہ کا شکر ہے۔ زیادہ کیا لکھوں۔
۸۳۔	۱۶؍اپریل ۱۸۹۹ء (رام پور)	خط کا آغاز: محب دل نواز، سلام ودعا، نامہ سعادت خط کا اختتام: جلیل حسن سلام وسپاس عرض کرتے ہیں۔
۸۴۔	یکم اکتوبر ۱۸۹۹ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد مدت کے بعد محبت نامہ آیا خط کا اختتام: حال ایں غمزدہ اے یار ہمانست کہ بود
۸۵۔	۱۷؍فروری ۱۹۰۰ء	خط کا آغاز: میرے پیارے زاہد نے مدت کے بعد مجھ کو یاد کیا خط کا اختتام: رسید ضرور لکھیے گا تاکہ پہنچنے سے اطمینان ہو جائے۔
۸۶۔	۴؍مارچ ۱۹۰۰ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے زاہد، تمھاری تحریر سعادت خمیر سرور خط کا اختتام: عقیدت خصال سب تسلیم گزار ہیں۔

احسن اللہ ثاقب کے نام مکتوبات

۱۔	۲۶؍شوال ۱۲۹۷ھ	خط کا اختتام: آئینہ جمال فتوت جمال آئینہ مروت خط کا اختتام: اگر کبھی واقع ہو تو عفو فرمایئے

۲۔	۱۸؍ نومبر ۱۸۸۰ء	خط کا آغاز: گرامی گوہر۔ نامہ دل نواز آیا خط کا اختتام: روز افزوں ترقیاں پائیں۔
۳۔	۳؍ جنوری ۱۸۸۱ء	خط کا آغاز: کرم گسترا معنی پرور۔ تسلیم خط کا اختتام: نہ تقریظ لکھی نہ تاریخ
۴۔	۲؍ فروری ۱۸۸۱ء	خط کا آغاز: مخدومی حضرت ثاقب سلمہ اللہ الوالحب خط کا اختتام: اللہما غفر ذنوبی واستر عیوبی
۵۔	دہم فروری ۱۸۸۱ء (رام پور)	خط کا آغاز: بندہ نواز! نوازش نامہ آیا خط کا اختتام: محمد احمد قمر تسلیم عرض کرتا ہے۔
۶۔	۱۳؍ جولائی ۱۸۸۱ء	خط کا آغاز: مخدوما و مکرما دام الطافکم۔ بعد سلام خط کا اختتام: کبھی یاد فرمایا کیجیے۔
۷۔	۲۹؍ نومبر ۱۸۸۱ء	خط کا آغاز: احسن الاخبار مولوی احسن اللہ خاں ثاقب خط کا اختتام: زیادہ کیا لکھوں۔ نور چشم محمد احمد قمر تسلیم رساں ہیں۔
۸۔	یکم ربیع الاوّل ۱۲۹۹ھ (رام پور)	خط کا آغاز: بندہ نواز تسلیم۔ ۱۹؍ دسمبر کا پوسٹ کارڈ خط کا اختتام: دل کو چین آئے۔
۹۔	۷؍ محرم ۱۳۰۰ء	خط کا آغاز: مخدوم گرامناقب مکرمی حضرت ثاقب نیاز مند کی طرف سے تسلیم کہہ دیجیے۔ (اس خط کے آخر میں قطعہ تاریخ ہے)۔
۱۰۔	۳؍ مارچ ۱۸۸۳ء	خط کا آغاز: فقیر نواز کہوں یا امیر نواز کہوں خط کا اختتام: بے ربطی اور بد خطی کا عذر قبول ہو۔
۱۱۔	۷؍ جنوری ۱۸۸۵ء	خط کا آغاز: گرامی گوہرا سلام مسنون۔ خلعت مشحون خط کا اختتام: جواب لطف ہو۔
۱۲۔	۱۴؍ مئی ۱۸۸۵ء روز پنجشبہ (لکھنو)	خط کا آغاز: مکرم دلنواز سلام مسنون اخلاص مشحون خط کا اختتام: وہ ویران پڑا ہے۔
۱۳۔	۳؍ ستمبر ۱۸۸۵ء (لکھنو)	خط کا آغاز: یاد آورم۔ کرم گستر۔ سلام نیاز خط کا اختتام: دہلی گئے ہیں زیادہ کیا لکھوں
۱۴۔	۱۲؍ رمضان ۱۳۰۴ھ	خط کا آغاز: سلام نیاز! کارڈ آیا۔ سر فراز فرمایا خط کا اختتام: آپ کی دل پرسی کا نہایت ممنون ہوں۔

۱۵۔	۱۱؍ مئی ۱۸۸۷ء (رام پور)	خط کا آغاز : سلام مسنون، اخلاص و سپاس مشحون خط کا اختتام : آگے کا حال معلوم نہیں۔
۱۶۔	۱۲؍ مارچ ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : میرے دل نواز مجھے آپ سے مطلق شکایت خط کا اختتام : عرفت : ربی بفسخ العزائم
۱۷۔	۱۴؍ مارچ ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : مکرماز او عنایتم۔ اشعار مشکوک خط کا اختتام : ملنے کا مزہ نہیں ہے۔
۱۸۔	۷؍ اگست ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : روحی فداک۔ ایک پیٹھے کی مجھے ضرورت خط کا اختتام : سوا سیر پیٹھے
۱۹۔	۱۴؍ اپریل ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز : محبی و مکرمی۔ سلام مسنون دعا و اخلاص مشحون خط کا اختتام : عندالضرورۃ پھر منگوائے جائیں۔
۲۰۔	۱۵؍ شعبان ۱۳۰۶ھ (۱۷؍ اپریل ۱۸۸۹ء)	خط کا آغاز : روحی فداک۔ سلام مسنون دعا و اخلاص خط کا اختتام : سرکہ مقدار میں معتدبہ پہنچے گا تو مزید منت کا باعث ہوگا۔
۲۱۔	۱۹؍ اپریل ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز : روحی فداک۔ چاول آئے ممنون کیا۔ خط کا اختتام : پلٹ کر وصول ہوا۔
۲۲۔	۲۱؍ اپریل ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز : مکرما! روحی فداک سلام مسنون و دعا خط کا اختتام : مزدوری کنار کی دے دی گئی۔
۲۳۔	۲۹؍ اپریل ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز : روحی فداک۔ سلام مسنون دعا مشحون خط کا اختتام : اخوان ماوجب رساں ہیں۔
۲۴۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : ملاذا بھینس کی زیادہ قدر رمضان میں ہے۔ خط کا اختتام : گھوسی دودھ کر چلا جاتا ہے۔
۲۵۔	۲۲؍ صفر ۱۳۰۷ھ	خط کا آغاز : گرامی گوہرا۔ مجھے اس وقت آپ کے والد ماجد خط کا اختتام : اہل دفتر ماوجب گزار ہیں۔
۲۶۔	۱۵؍ دسمبر ۱۸۹۰ء	خط کا آغاز : عنایت فرمائے من۔ سلام مسنون خط کا اختتام : آپ کے اخوان کو ماوجب
۲۷۔	تاریخ تحریر نہیں۔	خط کا آغاز : مجھ سے زیادہ مجھ پر مہربان قدردان سلامت خط کا اختتام : ان کا تو نہ چھپنا ہی اچھا ہے۔

۲۸۔ ۷ فروری ۱۸۹۱ء
خط کا آغاز: اعلیٰ اللہ شانکم۔ پوسٹ کارڈ کے جواب
خط کا اختتام: خدا جانے پہنچایا نہیں۔

۲۹۔ تاریخ تحریر نہیں
خط کا آغاز: میری کوتاہ قلمی پر نظر نہ کیا کیجیے
خط کا اختتام: حضرت استاد مغفور ملفوف ہے۔

مولوی سید محمد نوح رئیس مچھلی شہر ضلع جونپور کے نام مکتوبات

۱۔ ۵/ اپریل سن ندارد (رام پور)
خط کا آغاز: دل نواز امیر فقیر محبی شہیر۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔
خط کا اختتام: محمد احمد بہ خیریت ہیں۔ سلام عرض کرتے ہیں۔

۲۔ تاریخ درج نہیں
خط کا آغاز: محبی حضرت شہیر سلمہ اللہ القدیر
خط کا اختتام: بالتفصیل اطلاع بخشیے۔

۳۔ تاریخ درج نہیں
خط کا آغاز: دل نواز امیر فقیر۔ سلام مسنون۔ اخلاص مشحون
خط کا اختتام: آپ کی زبانی نہ سنا و والدعا

۴۔ تاریخ درج نہیں
خط کا آغاز: محبی و شفیقی حضرت شہیر۔ خدا آپ کو
خط کا اختتام: اب بھی محروم نہ رہے گا۔

۵۔ ۱۹/ اپریل ۱۸۹۴ء (رام پور)
خط کا آغاز: دل نواز میر فقیر حضرت شہیر سلمکم اللہ القدیر
خط کا اختتام: آپ کا منت پذیر حسرت خمیر و یاس تصویر

۶۔ ۴/ جنوری ۱۸۹۸ء (رام پور)
خط کا آغاز: دل نواز اقدر دان فقیر امیر حضرت شہیر
خط کا اختتام: اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ والسلام

مولوی نور الحسن کے نام مکتوب

۱۔ ۸/ اگست ۱۸۹۱ء (رام پور)
خط کا آغاز: سراپا رشد و سعادت مجسم علم و لیاقت
خط کا اختتام: مسالا مسل گیا

منشی ولایت علی خاں صفی پوری کے نام مکتوبات

۱۔ تاریخ درج نہیں
خط کا آغاز: عزیز از جان اقبال نشان سخن آفرین
خط کا اختتام: مطبوعہ کی فہرست مفصل ضرور بھیجو

۲۔ ۸/ رمضان المبارک ۱۳ھ روز پنجشبہ
خط کا آغاز: گرامی گوہر معنی پرور سلمکم اللہ الاکبر
خط کا اختتام: اس سے بھی زیادہ لذت اٹھاؤں گا۔

۳۔	۱۸/ اگست ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز: سعید و رشید ازلی سلمکم اللہ الولی خط کا اختتام: وہ آپ کو پہنچایا نہیں۔

داغ دہلوی کے نام مکتوبات

۱۔	۲۶/ جولائی ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: میرے پرانے یار پرانے غم گسار خط کا اختتام: حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے۔
۲۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: روحی فداک! نوازش نامہ آیا خط کا اختتام: امیر دل گیر حسرت خمیر یاس تصویر
۳۔	۲۶/ جولائی ۱۸۹۰ء	خط کا آغاز: میرے یار پرانے یار غم گسار حضرت داغ سلامت خط کا اختتام: تیسرا زیرِ تالیف ہے
۴۔	۵/ جون ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: بندہ نواز میری ناتوانی خط کا اختتام: بات ہے زیادہ کیا لکھوں
۵۔	یکم اگست ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: بندہ نواز سلام نیاز ایک تحریر آپ کی خط کا اختتام: احباب تسلیم گزار ہیں۔ فقط
۶۔	۲۰/ اکتوبر ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز: حضرت داغ نازک دماغ خط کا اختتام: جواب باصواب کا منتظر، سراپا تقصیر امیر فقیر
۷۔	۲۱/ نومبر ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز: معظم و محترم دام بالعنایۃ و الکرام خط کا اختتام: شدت علالت سے رہتا ہے۔
۸۔	۲۳/ ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ	خط کا آغاز: دل نواز امیر فقیر سلمکم اللہ القدیر و صححکم خط کا اختتام: ہمراہی ماوجب رساں ہیں۔ والسلام

محمد حبیب الرحمٰن خاں حسرت شیروانی کے نام مکتوبات

۱۔	۹/ دسمبر ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز: سخنور گرامی گہر۔ سلام مسنون اخلاص و سپاس خط کا اختتام: والسلام با اکرام، سراپا تقصیر
۲۔	۱۹/ دسمبر ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز: گرامی گوہر۔ سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون خط کا اختتام: میرا سلام کہیں والدعا
۳۔	۱۹/ اپریل ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز: میرے قدر دان میرے مہربان سلام مسنون خط کا اختتام: صحیح نسخہ ہو تو ضرورت ہے۔

۴۔	۳/اپریل ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز: دل نواز روحی فداک، محبت نامہ آیا۔ خط کا اختتام: رسید ضرور ملے۔
۵۔	۱۲/جون ۱۸۸۹ء	خط کا آغاز: روحی فداک۔ سلام ودعا۔ عین انتظار خط کا اختتام: دشوار ہے یا آسان
۶۔	۱۸/جنوری ۱۸۹۰ء	خط کا آغاز: بندہ نواز غزل کی نقل اس لیے خط کا اختتام: ہمیشہ خیریت سے مسرور کیا کیجیے۔
۷۔	۱۱/دسمبر ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز: یاد آور مخلصاں۔ سلام مسنون اخلاص مشحون خط کا اختتام: یہ خط دوسرے سے لکھوالیا گیا
۸۔	۲۰/دسمبر ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز: مکرم دوستاں۔ سلام مسنون اخلاص مشحون خط کا اختتام: شعر تو بہت اچھے کہے ہیں۔ بارک اللہ
۹۔	۱۲/محرم ۱۳۰۷ھ	خط کا آغاز: بارک اللہ فی عمرکم وعلمکم وعملکم واقبالکم خط کا اختتام: خواجی تاشی سلام شوق کہتے ہیں۔

منشی نعیم الحق آزاد شیخ پوری کے نام مکتوبات

۱۔	۱۴/نومبر ۱۸۹۱ء	خط کا آغاز: محبی غزلیں آئیں۔ ہماری اور ہماروں خط کا اختتام: ان کے خطوط اکثر آتے رہتے ہیں
۲۔	۹/دسمبر ۱۸۹۱ء	خط کا آغاز: محبی سلام مسنون، مہربانی نامہ غزل خط کا اختتام: فکر کرنے میں دریغ نہ ہوگا۔
۳۔	۷/نومبر ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: دل نواز امیر فقیر محمد نعیم الحق صاحب آزاد خط کا اختتام: احتیاطاً یہ مضمون آپ کو لکھ دیا
۴۔	۹/فروری ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: محبی سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام: مسرور فرماتے رہیے۔
۵۔	۲۱/اپریل ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: محبی زاد لطفکم۔ سلام مسنون سیر خلوت خط کا اختتام: اس کو پسند نہیں کرتا۔
۶۔	۳۱/دسمبر ۱۸۹۴ء	خط کا آغاز: محب دل نواز من السلام علیکم ورحمۃ اللہ خط کا اختتام: زیادہ دعا کے سوا کیا لکھوں

۷۔	۲۸؍ فروری ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز: محبی سلام مسنون اخلاص مشحون۔ اپنی مثنوی
	(رام پور)	خط کا اختتام: دل سوز کو لکھنے کی حاجت نہیں۔
۸۔	۱۳؍ جنوری ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز: محبی کارڈ پہنچا۔
	(رام پور)	خط کا اختتام: تاریخ تالیف کی نکلی ہے۔ بھیجتا ہوں۔

منشی جمیل احمد شاداں کے نام مکتوبات

۱۔	۱۷؍ نومبر ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: محبی سلمکم اللہ تعالیٰ سلام مسنون
		خط کا اختتام: وقت صحت دیکھی جائے گی۔
۲۔	۱۱؍ ربیع الآخر ۱۳۰۹ھ	خط کا آغاز: محبی دعا و السلام میں آج کل مریض ہوں
		خط کا اختتام: غزل وقت صحت دیکھی جائے گی۔

قاضی عبدالجمیل کے نام مکتوبات

۱۔	۱۷؍ شوال ۱۵۰۰ھ	خط کا آغاز: مکرم و محترم مجمع الطاف اتم دام بالمجد والکرم
		خط کا اختتام: ممکن ہے کہ تعمیل کی جائے۔
۲۔	۲۴؍ جولائی ۱۸۹۲ء	خط کا آغاز: مخدوم و مکرم معظم و محترم جناب قاضی صاحب
	رام پور	خط کا اختتام: اطفال تسلیم گزار ہیں۔ آپ کا منت پذیر
۳۔	۱۹؍ اگست ۱۸۹۳ء روز شنبہ	خط کا آغاز: مکرم و محترم جناب قاضی عبدالجمیل
	(رام پور)	خط کا اختتام: جواب سے جلد مطمئن فرمایا جاؤں۔
۴۔	۱۵؍ ستمبر ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: مکرم و محترم جناب قاضی صاحب زادت مکارمکم
	(رام پور)	خط کا اختتام: نشان تسلیم رساں ہیں۔
۵۔	۳۰؍ ستمبر ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: مجمع اخلاق و مکرم جناب قاضی صاحب
	(رام پور)	خط کا اختتام: ع جز آنکہ بصدق دل دعاے بحتد
۶۔	۲۸؍ دسمبر ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز: جناب قاضی صاحب مجمع مکارم فراوان
	(رام پور)	خط کا اختتام: عقیدت خصال تسلیم گزار ہیں۔
۷۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: ملاذا جس طرح میں نے بنظر
		خط کا اختتام: اطفال عقیدت خصال تسلیم گزار ہیں۔

قاضی محمد خلیل حیراں کے نام مکتوبات

ا۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: سعید سرمد خلیلی قاضی محمد خلیل خط کا اختتام: میری طرف سے تسلیم
۲۔	۲۲؍ محرم ۱۵ھ	خط کا آغاز: انا للہ وانا الیہ راجعون خط کا اختتام: کچھ لکھنے نہیں دیتی۔

منشی امتیاز احمد خاں راز

ا۔	یکم جون ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے راز عمر دراز نامہ سعادت خط کا اختتام: گرہ کشائی معلوم نہیں ہوتی۔
۲۔	۱۴؍ اکتوبر ۱۸۹۶ء (رام پور)	خط کا آغاز: پیارے خدا کرے تمھاری طبیعت اچھی ہو۔ خط کا اختتام: دوستانہ شکایت کرو۔
۳۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: پیارے راز، عمر دراز، اب تو تمھاری تحریر بھی خط کا اختتام: خلقت تباہ ہو رہی ہے۔ اللہ رحم کرے
۴۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: پیارے راز، سلام و دعا، عقل و شعور خط کا اختتام: اور سپاس گزاری۔

حافظ غلام احمد فروغی کے نام مکتوبات

ا۔	۶؍ نومبر ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: دل نواز! سلام مسنون اخلاص مشحون خط کا اختتام: مجھ کو معاف فرمائیں گے۔
۲۔	۲۰؍ نومبر ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز: دل نواز دوستاں زادت اخلاقکم۔ سلام مسنون خط کا اختتام: فرزندان احباب فقیر ماوجب گزار ہیں۔

طاہر فرخ آبادی کے نام مکتوب

ا۔	۲؍ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ ۸؍ جنوری ۱۸۸۵ء لکھنؤ	خط کا آغاز: شفیق یاد آور مخلصان سلامت خط کا اختتام: آثم امیر احمد عفی عنہ محمد احمد تسلیم گزار ہیں۔

مولوی محمد اعجاز حسن خاں کے نام مکتوبات

۱۔	۱۵/ جولائی ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز : عزیزی و سعیدی زاد عمر کم صلاح و فلاح خط کا اختتام : مفصل طور پر مطلع کیجیے گا۔
۲۔	۱۵/ ستمبر ۱۸۹۵ء (رام پور)	خط کا آغاز : سعید سرمد رشید ابد سلمکم اللہ الصمد خط کا اختتام : آپ کا داعی خیر
۳۔	۳۱/ اکتوبر ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز : عزیز از جان اقبال نشان سلمکم اللہ خط کا اختتام : نام بنام دعا و سلام۔ فقط
۴۔	۲۸/ مارچ ۱۹۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : عزیز از جان سعادت نشان خط کا اختتام : ان کا نکلنا دشوار ہے۔
۵۔	۲۴/ رمضان ۱۴۰۰ھ (رام پور)	خط کا آغاز : سعید کونین سلمکم اللہ تعالیٰ خط کا اختتام : محمد ابو الحسن خاں کو دعائیں
۶۔	۱۷/ اپریل ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : گرامی شان اقبال نشان زاد عمر کم خط کا اختتام : ان سے ہی خصوصیت کے ساتھ شکایت ہے۔ (اس خط کے آخر میں امیر کی اہم غزل بھی منقول ہے)۔
۷۔	۲۱/ اپریل ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : گرامی شان اقبال نشان زاد عمر کم خط کا اختتام : بھائیوں کو میری طرف سے دعا پہنچاؤ
۸۔	۲۴/ نومبر ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : عزیز از جان گرامی، شان اقبال خط کا اختتام : سلمہ اللہ تعالیٰ کو دعائیں۔ فقط
۹۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : عزیز از جان گرامی شان اقبال خط کا اختتام : سب عزیزوں کو ما وجب
۱۰۔	۲۸/ ستمبر ۱۸۹۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : عزیز از جان اقبال نشان زاد عمر کم خط کا اختتام : اپنے ہاتھ سے لکھ کر مسرور کریں۔ فقط
۱۱۔	۱۰/ نومبر ۱۸۹۸ء	خط کا آغاز : عزیز از جان من منشی محمد اعجاز حسن خط کا اختتام : محمد ریاض حسن خاں کو دعائیں۔ فقط
۱۲۔	۲۷/ جنوری ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز : جان سے پیارے میرے اعجاز تمہارا اقبال خط کا اختتام : سب عزیزوں کو حسبِ مراتب ما وجب

۱۳۔	۱۵/ مارچ ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز : عزیز از جان سعادت و اقبال نشان خط کا اختتام : بہت بہت دعا کہو۔ فقط
۱۴۔	یکم اپریل ۱۸۹۹ء (رام پور)	خط کا آغاز : گرامی شان اقبال نشان اعلیٰ اللہ شانکم خط کا اختتام : ریاض حسن کو بہت بہت دعائیں۔
۱۵۔	۳۰/ مئی ۱۸۹۹ء (رام پور)	خط کا آغاز : گرامی شان اقبال نشان زاد عمر ہم خط کا اختتام : سب عزیزوں کو ماوجب
۱۶۔	۲۶/ جون ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز : گرامی شان سعادت و اقبال خط کا اختتام : رسید اور شکریہ سمجھیے۔
۱۷۔	۲۰/ جنوری	خط کا آغاز : عزیز من سلام لو دعا لو اور اپنے محبت خط کا اختتام : میری طرف سے ماوجب کہو خوش رہو

مولوی محمد ریاض حسن خاں خیالؔ کے نام مکتوبات

۱۔	۷/ نومبر ۱۸۹۳ء (رام پور)	خط کا آغاز : عزیز از جان سعادت و اقبال نشان خط کا اختتام : محمد اعجاز حسن خان کو ماوجب
۲۔	۱۶/ اکتوبر ۱۸۹۸ء	خط کا آغاز : عزیز از جان اقبال نشان زاد عمر کم خط کا اختتام : سلام و دعا بوحدت مضمون

مولوی محمد مہدی حسن خاں شادابؔ کے نام مکتوبات

۱۔	۳/ جنوری ۱۸۸۷ء	خط کا آغاز : میرے قدر افزا دلنوازی میں یکتا خط کا اختتام : اطفال تسلیم گزار ہیں۔
۲۔	۱۹/ ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ بروز جمعہ	خط کا آغاز : قدرداں، امیر فقیر سلامت تسلیم و تکریم خط کا اختتام : تغافل نہ فرمایا جائے۔
۳۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : مخدوم مخلص نواز سلامت خط کا اختتام : جواب جلد لطف ہو۔
۴۔	۱۹/ جولائی ۱۸۸۸ء (رام پور)	خط کا آغاز : ع چہ می پرسی زاحوال غمدیدہ ام چوں شد خط کا اختتام : اسے دیکھوں گا۔ والسلام خیر ختام۔

صفیر بلگرامی کے نام مکتوب

۱۔	۹/ دسمبر ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : بلبل شیراز و طوطی ہند کے ہمصفیر سلامت خط کا اختتام : زیادہ حاجت تصدیق نہیں۔

۳۔ مرقع ادب، جلد اوّل (۱۴)

یہ باون [۵۲] اشخاص کے منتخب مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب صفدر مرزاپوری ہیں۔ اس مجموعے کے توسط سے امیر احمد امیر مینائی کے تئیس [۲۳] خطوط پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ مکتوبات بشیر ملیح آبادی، شاد عظیم آبادی، احمد حسین خاں مذاق، جلال لکھنوی اور مظہر الاسلام کے نام ہیں۔ ذیل میں ان کے مختصر کوائف درج کیے جاتے ہیں۔

بشیر ملیح آبادی کے نام مکتوبات

۱۔	۲۸ر فروری ۱۸۹۴ء	خط کا آغاز: پیارے بشیر۔ ایک نظر تمھارے دیدار فرحت خط کا اختتام: بجمال شوق سلام و نیاز کہتے ہیں۔
۲۔	۲ر جولائی ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز: سعید سرمد محبی بشیر احمد خان، سلمکم اللہ خط کا اختتام: دعائے بیقیاس کیا لکھوں
۳۔	۱۹ر جون ۱۸۹۴ء	خط کا آغاز: دلنواز! سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون خط کا اختتام: میاں مسعود احمد سلمہم اللہ الصمد بھی ماہ وجب گزار ہیں۔
۴۔	تاریخ درج نہیں۔	خط کا آغاز: محبی۔ سلام مسنون، دعا مشحون۔ دو عنایت نامے خط کا اختتام: امید کہ اس کی رسید سے مطمئن فرمایئے۔
۵۔	یکم ستمبر ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز: محبی و سعیدی سلمہم اللہ تعالیٰ۔ سلام مسنون خط کا اختتام: بحمد اللہ کہ اب ان شدائد میں تخفیف ہے۔
۶۔	۲۶ر جون ۱۸۹۳ء	خط کا آغاز: سعید رشید سرمد سلمکم اللہ الصمد خط کا اختتام: اللہ تعالیٰ کا ہر حال میں شکر ہے۔
۷۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: دلنواز امیر فقیر محبی بشیر احمد خان صاحب خط کا اختتام: جلیل حسن ماوجب گزار ہیں۔
۸۔	۱۱ر مارچ ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز: محبی و شفیقی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، خط کا اختتام: میں ہوں آپ کا قدیمی دعا گو
۹۔	۲۳ر جنوری ۱۹۰۰ء	خط کا آغاز: محب دل نواز، سلام مسنون، اخلاص خط کا اختتام: سب اطفال عقیدت خصال ماوجب گزار ہیں۔
۱۰۔	۲۲ر جون ۱۸۹۸ء	خط کا آغاز: محبی دل نواز! سعید و رشید ابد محمد بشیر احمد خط کا اختتام: کمال خلوص خصوصی کے ساتھ تسلیم گزار ہیں۔
۱۱۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز: حبیبی و لبیبی ادھر امسال آم بہت کم ہیں۔ خط کا اختتام: جواب باصواب، مفصل جلد آئے۔

۱۲۔	۲۹، ۱۸۹۷ء	خط کا آغاز :دل نواز امیر فقیر سلمکم اللہ القدیر خط کا اختتام :اللہ تعالیٰ آپ کو حسب دل خواہ کامیاب فرمائے۔
۱۳۔	۸/مارچ ۱۸۹۷ء	خط کا آغاز : محبی، سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام : آپ کو مطلع کروں گا۔ جلیل تسلیم گزار ہیں۔
۱۴۔	۲۰/جولائی ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز :دل نواز امیر فقیر سلمکم القدیر۔ خط کا اختتام : جلیل حسن بعد سلام مزاج پرسی کرتے ہیں۔
۱۵۔	۲۲/دسمبر ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز : محبی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خط کا اختتام :امید کہ جواب ضرور لطف ہو۔
۱۶۔	۱۲/جون ۱۸۹۷ء	خط کا آغاز : مجمع اخلاق بے حد شفیقی ومحبی بشیر احمد خط کا اختتام : مکان خواجہ کاظم صاحب وکیل
۱۷۔	۴/جون ۱۸۹۴ء	خط کا آغاز : سرمایہ محبت واخلاص سلمکم اللہ تعالیٰ خط کا اختتام : سراپا برکت میں سلام ونیاز قبول ہو۔
۱۸۔	۱۴/اگست ۱۸۹۴ء	خط کا آغاز :یاد آور امیر فقیر سلمکم اللہ القدیر خط کا اختتام : عقیدت خصال ماوجب رساں ہیں
۱۹۔	۲۳/جون ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز : محبِ دل نواز۔ سلام مسنون دعا مشحون خط کا اختتام :اختر خلیل بصد شوق تسلیم رساں ہیں۔

مکتوب بنام سید علی محمد شاد عظیم آبادی

۲۰۔	۱۳/نومبر ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز : معظم ومحترم وام ما لمجد والکرم، سلام سپاس خط کا اختتام :اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

مکتوب بنام احمد حسین خاں مذاق

۲۱۔	۱۵/دسمبر، ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز : کریم الاخلاق پیارے مذاق خط کا اختتام : عمر اقبال میں برکت دے۔

مکتوب بنام جلال لکھنوی

۲۲۔	۲۸/دسمبر ۱۸۹۹ء رام پور	خط کا آغاز : شفیق حال من شکستہ بال سلمکم اللہ تعالیٰ خط کا اختتام :اطفالِ عقیدت خصالِ ماوجب گزار ہیں۔

۲۳۔ ۲؍ فروری ۱۹۰۰ء خط کا آغاز: گرامی شان اقبال نشان محبی مظہر الاسلام
خط کا اختتام: سب اطفال و احباب ماہ وجب گزار ہیں۔

۴۔ مکاتیب امیر مینائی (۱۵)

احسن اللہ ثاقب نے امیر کے خطوط کا مجموعہ دوسری مرتبہ اضافے اور نظر ثانی کے بعد "مکاتیبِ امیر مینائی" کے نام سے شائع کیا۔

طبع اوّل کے دو سو چونتیس [۲۳۴] مکتوبات کے ساتھ "مرقع ادب" جلد اوّل میں شامل امیر کے تئیس [۲۳] خطوط بھی اس مجموعے میں شامل کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ زاہد حسین زاہد کا ایک خط جو طبع اول میں ایک خط کی صورت میں شائع ہوا تھا، طبع دوم میں دو خطوط کی صورت میں شامل کیا گیا ہے۔ یہی صورتِ حال حبیب الرحمٰن خاں حسرت شروانی کے مکتوب کے ساتھ پیش آئی ہے۔ اس طرح "مکاتیب امیر مینائی" میں خطوط کی تعداد دو سو ستاون [۲۵۷] بنتی ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے "مطالعۂ امیر" میں کسی غلط فہمی کی بناء پر "مکاتیب امیر مینائی" میں شامل خطوط کی تعداد دو سو تینتیس [۲۳۳] بتائی ہے (۱۶)۔ یہی تعداد رشید حسن خاں نے بھی تحریر کی ہے (۱۷)۔ جو کہ درست نہیں۔

امیر مینائی کے ان دونوں مجموعہ مکاتیب میں متعدد جگہ متن اور تاریخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں سب سے پہلے زاہد حسین زاہد اور حبیب الرحمٰن خاں حسرت شروانی کے مکتوبات کی بابت صراحت کی جاتی ہے۔ پھر دیگر اختلاف کی نشان دہی کی جائے گی۔

☆ طبع اوّل (ص ۲۳۶) میں زاہد حسین زاہد کے ۲۹؍ اپریل ۱۸۸۹ء والے خط کے مکمل ہونے کے بعد ایک عبارت اس طرح درج ہے۔

> "ملا ذا بھینس کی زیادہ قدر رمضان میں ہے اگر جلد دو تین دن میں مل جائے تو بہتر ہے ورنہ پھر زیادہ توجہ نہ کی جائے اس لیے کے بعد رمضان برسات میں استعمال دودھ کا کم کر دیا جاتا ہے۔ اور آخر برشگال تک میری مملوکہ بھینس بچہ دے گی نئی خریدنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مکرر یہ کہ دوہنے کو میرے یہاں بھی گھوسی آتا ہے۔ یہ گمان نہ ہو کہ مامائیں دوہتی ہیں البتہ اور سب خدمتیں شبانہ روز مامائیں کرتی ہیں۔ گھوسی دودھ دہو کر چلا جاتا ہے۔ فقط"۔

طبع دوّم (ص ۲۶۰) میں یہ عبارت علاحدہ خط (خط نمبر ۱۵۵) کی صورت میں پیش کی گئی ہے۔ اس پر سنہ اور تاریخ بھی درج نہیں۔ ہماری رائے میں یہ عبارت علاحدہ خط نہیں بلکہ گزشتہ خط کا حصہ ہے۔ جو، کچھ یاد آجانے کی صورت میں تحریر کر دیا گیا ہے۔ یہ بات اس لیے بھی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس عبارت سے پہلے والے خط میں بھی ساری گفتگو بھینس اور اس کے مزاج سے متعلق ہے۔ گویا دونوں خط کے مضمون کا مفہوم ایک ہی یا متعلق ہے۔

☆ طبع اوّل میں حبیب الرحمٰن خاں حسرت شیروانی کا ۱۸؍ جنوری ۱۸۹۰ء کا مکتوب (ص ۲۶۴) طبع دوّم میں خط نمبر ۱۸۵ (۱۸؍ جنوری ۱۸۹۰ء، ص ۲۹۲) اور خط نمبر ۱۸۸ (سنہ و تاریخ درج نہیں، ص ۲۹۳) کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے

خیال میں طبع اوّل میں یہ خط جس طرح شائع ہوا ہے وہ درست ہے اس لیے کہ خط نمبر ۱۸۵اور ۱۸۸ مفہوم اور مضمون کے اعتبار سے ایک ہی ہیں اس کے علاوہ خط نمبر ۱۸۵ میں سنہ اور تاریخ ہے یہی خط، خط کا ابتدائی حصہ بھی ہے۔ جب کہ خط نمبر ۱۸۸ میں سنہ اور تاریخ بھی درج نہیں اور یہ خط کے ابتدائی حصے کے بجائے آخری حصہ محسوس ہوتا ہے۔

اب دیگر مکاتیب کے متن اور تاریخوں کے اختلاف کی نشان دہی کی جاتی ہے :

مکتوبات بنام حکیم برہم گورکھپوری

طبع اوّل (ص ۱۰۴) میں "ڈائریکٹر ریاست رام پور" شائع ہوا ہے جب کہ طبع دوّم (ص ۱۰۸) میں "ڈاکٹر ریاست رام پور" شائع ہو گیا ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۱۰۵) میں ۷ار جنوری ۱۸۹۸ء مطابق ۵ ررمضان ۱۳۱۶ھ درج ہے۔ جب کہ طبع دوّم میں (ص ۱۲۰) ۷ر جنوری ۱۸۹۸ء مطابق ۵ ررمضان ۱۳۱۶ھ ہے۔

مکتوبات بنام کوثر خیر آبادی

☆ طبع اوّل (ص ۱۱۹) میں "دل نوازا" ہے جب کہ طبع دوّم (ص ۱۲۶) میں "دل نواز" شائع ہوا ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۱۲۷) میں تحریر ہے کہ :

"انکھڑیاں، چشمِ معشوق کے لیے مخصوص ہے۔ اور یہ لفظ مجھے پسند ہے"۔

طبع دوّم (ص ۱۴۲) میں "یہ لفظ مجھے پسند نہیں" شائع ہوا ہے۔

ہمارے خیال میں طبع اول کی عبارت درست ہے۔ دلیل اس امر کی یہ ہے کہ امیر نے اپنے ایک شعر میں یہ لفظ استعمال بھی کیا ہے، جو اس طرح ہے۔

کاجل یہ نہیں ہے انکھڑیوں کا

اٹھا ہے دھواں تیری مسی کا

☆ طبع اوّل (ص ۱۴۰) میں کوثر خیر آبادی کے نام ایک خط ہے جو ۲۶ر ذی الحج ۱۳۰۶ھ کا ہے طبع دوّم (ص ۱۵۹) میں خط کے درمیان کی عبارت کتابت کی غلطی سے تبدیل ہو گئی ہے۔ طبع اوّل میں یہ عبارت ہے۔

"حکیم نعیم الزماں خلف اکبر جناب مولوی محمد وجیہ الزماں خاں اسی مرض وبائی میں مبتلا ہو کر قضا کر گئے۔ ان کے اس واقعے سے جو قلق ہے۔ وہ بیان نہیں ہو سکتا دل مٹی ہو رہا ہے۔ کیا لکھا جائے۔ اللہ صبر دے میرے دل سوز قدیم حضرت سوزاں وہاں ہوں تو سلام نیاز کہیے۔ اور جب خط لکھا کیجیے تو معزالیہ کی خیریت اور کیفیت ضرور لکھا کیجیے۔ مجھے حضرت موصوف کے ساتھ بدستور نیاز باقی ہے۔ گو ان کی طرف سے التفات نہیں خیر خوش رہیں اور منیات میں کام یاب......"۔

طبع دوّم میں مذکورہ عبارت کی جگہ یہ عبارت مرقوم ہے۔

"حکیم نعیم الزماں اور وسیم وسلمہ اصرار والتزام سے جو میں چند غزلیں روز وشب کو سن لیتا تھا وہ شغل بھی چھوٹ گیا اب چھپنے میں ذرا دیر ہو گی۔ تاریخیں آپ کی انشاء اللہ ضرور چھپیں گی۔ محمد احمد تسلیم رساں ہیں۔ حضرت سوزاں مرحوم کی رحلت کا صدمہ سخت روح فرسا ہوا ہے۔ کیا آدمی تھے خدا بخشے انا اللہ کے سوا اس کا مرہم کہاں اللہ تعالیٰ توفیق صبر دے۔ ان کے اقارب میں جوان کا جانشین ہو وہ کون ہے کوئی لایق فرزند ہے یا نہیں ضرور لکھیے گا۔ فقط

خلاصہ یہ ہے کہ طبع اوّل میں شامل خط کی عبارت طبع دوّم میں خط نمبر ۷۵ (ص ۱۶۱) کے آخر میں اور اس خط (۷۵) کی عبارت خط نمبر ۵۴ (۲۶ ذی الحج ۱۳۰۶ھ) کے آخر میں شامل ہو گئی ہے۔

مکتوبات بنام زاہد حسین زاہد

☆ طبع اوّل (ص ۱۴۵) ۷ر اپریل ۱۸۹۰ء ہے۔
طبع دوّم (ص ۱۶۴) میں ۱۸۹۱ء ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۱۴۷) ۳ر اپریل ۱۸۹۱ء ہے۔
طبع دوّم (ص ۱۶۶) میں ۱۳ر اپریل ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۱۵۳) ۲۰ر جنوری ۱۸۹۲ء ہے۔
طبع دوّم (ص ۱۷۱) ۳۰ر جنوری ۱۸۹۲ء ہے۔

☆ طبع اول (ص ۱۷۶) ۲۳ر جون ۱۸۹۴ء ہے۔
طبع دوّم (ص ۱۹۷) ۱۳ر جون ہے۔
طبع اوّل (ص ۲۱۲)

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا
روح القدس ہے نام میرے ہم صفیر کیا

طبع دوّم (ص ۲۳۴) "ہم صفیر کا" تحریر ہے۔ جو درست ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۲۱۳) ع
بلبل ہوں بوستانِ الخ جہاں

☆ طبع دوّم (۲۳۵) ع
بلبل ہوں بوستانِ جناب ِ امیر کا

مکتوبات بنام احسن اللہ ثاقب

☆ طبع اوّل (ص ۲۲۴) ۲۶ ر شوال ۱۲۹۷ھ ہے
طبع دوّم (ص ۲۴۰) ۱۶ ر شوال ۱۲۹۷ھ ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۲۴۴) میں خط "زیادہ کیا لکھوں" پر ختم ہو جاتا ہے۔ جب کہ طبع دوّم (ص ۲۴۶) میں یہ عبارت مزید ہے۔ "نورِ چشم محمد احمد قمر تسلیم رساں ہیں"۔

☆ طبع اوّل (ص ۲۳۲) ۱۲ ر مارچ ۱۸۸۸ء ہے۔
طبع دوّم (ص ۲۵۴) ۱۴ ر مارچ ۱۸۸۸ء ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۲۳۵) خط اس جملے پر ختم ہوتا ہے۔

"۴ ر بار برداری کے دیے گئے، چاول وزن میں پورے اترے ۳ ر روپے پلٹ کر وصول ہوا"۔

طبع دوّم (ص ۲۵۸) میں اس خط کے آخر میں یہ عبارت شامل نہیں کی گئی۔

☆ طبع دوّم (ص ۲۳۴) میں خط کا آخری فقرہ یہ ہے۔

"مزدوری کنثار کی دے دی گئی"۔

طبع دوّم (ص ۲۵۹) میں یہ عبارت شامل نہیں ہے۔

مکتوب بنام مولوی نورالحسن

☆ طبع اوّل (ص ۲۴۴) میں خط کی دوسری سطر میں "آج آزاد آیا" شائع ہوا ہے۔
طبع دوّم میں (ص ۲۶۹) "آج اخبار آیا ہے"۔ طبع ہوا ہے۔

مکتوبات بنام داغ دہلوی

☆ طبع اوّل (ص ۲۶۰) خط کی تاریخ ۲۰ ر اکتوبر ۱۸۹۵ء ہے۔
طبع دوّم (ص ۲۸۵) میں ۲۵ ر اکتوبر ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۲۵۵) خط کی تاریخ ۲۶ ر جولائی ۱۸۹۰ء ہے۔
طبع دوّم (ص ۲۷۵) میں اس خط کی تاریخ ۱۸۹۲ء ہے۔

بنام مولوی محمد اعجاز حسین خاں

☆ طبع اوّل (ص ۲۹۷) میں خط کا آخری فقرہ یہ ہے۔
"اپنے ہاتھ سے لکھ کر مسرور کریں۔ فقط۔

طبع دوم (ص ۳۲۰) میں اس خط کے مذکورہ فقرے کے بعد یہ اضافہ ملتا ہے۔
"فقیر احمد مینائی بقلم یکے از اہل دفتر"

مکتوب بنام مہدی حسن خاں شاداب

☆ طبع اوّل (ص ۳۰۸) میں صرف عیسوی تاریخ درج ہے۔ جب کہ طبع دوم میں ہجری تاریخ ۷ / ۲ شوال ۱۳۰۸ھ بھی ہے۔ گویا دونوں طرح سے تاریخیں لکھنے کا رجحان ملتا ہے۔

مکتوبات بنام بشیر ملیح آبادی

☆ طبع دوم (ص ۳۴۳) میں "مجھے بیماریوں سے بھی اب تک نجات نہیں ہے" شائع ہوا ہے۔ جب کہ "مرقع ادب" جلد اوّل (ص ۲۴) میں "تیمارداریوں" ہے۔

☆ طبع دوم (ص ۳۴۶) میں "غریب اسیر کے اختیار میں" شائع ہوا ہے جب کہ "مرقع ادب" جلد دوم (ص ۲۷) میں "غریب امیر" ہے۔

☆ طبع اوّل (ص ۳۵۳) میں "خیریت سے مسرور کیا کیجیے" تحریر ہے جب کہ "مرقع ادب" جلد دوم (ص ۲۵) میں "اخیریت" شائع ہوا ہے۔

مکتوبات بنام جلال لکھنوی

☆ طبع دوم (ص ۳۵۷) میں "نہایت اثر جار" شائع ہوا ہے جب کہ "مرقع ادب" جلد دوم (ص ۳۱) "اشتہار ہوا" طبع ہوا ہے۔

گزشتہ صفحات میں احسن اللہ ثاقب کے مرتب کردہ مکتوبات کے دو مجموعوں کے اختلافات کو پیش کیا گیا ہے۔ زیادہ تر اختلاف سنہ اور تاریخ کا ہے۔ صحیح تاریخ کیا ہے؟ وہ اسی صورت میں معلوم ہو سکتی ہے کہ جب اصل مکتوبات سامنے ہوں۔ بصورتِ دیگر یہ اختلاف اتنے معمولی اور ملتے جلتے ہیں کہ انھیں پروف خوانی کا نقص ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

۵۔ مرقع ادب، جلد دوم (۱۸)

صفدر مرزاپوری نے اس مجموعے میں امیر مینائی سمیت متعدد اہم اشخاص کے مکاتیب یکجا کیے ہیں۔ اس مرتبہ امیر کے دس [۱۰] خطوط شامل کیے گئے۔ جو دل شاہجہاں پوری کے نام ہیں یہ تمام مکتوبات پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ ذیل میں ان کے مختصر کوائف پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔	۲ / مئی ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز : مجی! اسلام مسنون۔ دعا مشحون خط کا اختتام : اب ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اطلاعاً آپ کو لکھا
۲۔	۶ / نومبر	خط کا آغاز : محب من السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خط کا اختتام : مجھے اپنا دعاگو سمجھیے۔

۳۔	۲۱؍ دسمبر	خط کا آغاز : محبی! سلام مسنون آپ کے اکثر مہربانی نامے آئے۔ خط کا اختتام : بے التفاتی پر محمول نہ کریں۔
۴۔	۲۹؍ جولائی۔	خط کا آغاز : محبی و مشفقی! سلام مسنون۔ مدت کے بعد آج خط کا اختتام : وہ کسی طرح ناخوش نہ ہوں
۵۔	۱۵؍ ستمبر	خط کا آغاز : محبی۔ سلام مسنون، دعا مشحون۔ خط کا اختتام : جلیل تسلیم رساں ہیں۔
۶۔	۲۲؍ ستمبر	خط کا آغاز : محبی سلام مسنون۔ غزل آپ کی دیکھ کر خط کا اختتام : بقدر حاجت بھیجنے کی آپ کو تکلیف دی جائے۔
۷۔	۲۱؍ مارچ ۱۸۹۹ء	خط کا آغاز : سعادت ضمیر۔ پیارے ضمیر خط کا اختتام : اپنی خیریت سے جلد جلد مطمئن کیا کرو۔ والسلام
۸۔	۴؍ جولائی ۱۸۹۷ء	خط کا آغاز : محبی ضمیر سلمکم اللہ القدیر پندرہ بیس روز ہوئے خط کا اختتام : میری طرف سے سلام مسنون
۹۔	۲۱؍ اکتوبر ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز : عزیز جانِ من منشی ضمیر حسن سلمکم اللہ تعالیٰ خط کا اختتام : سلام مسنون و اخلاص مشحون پہنچے۔
۱۰۔	۱۹؍ ستمبر ۱۸۹۵ء	خط کا آغاز : محبِ دل نواز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، خط کا اختتام : حافظ جلیل حسن ماوجب رساں ہیں۔

۶۔ نیرنگ، دہلی کا امیر نمبر (۱۹)

اس خاص نمبر میں امیر کے چار غیر مطبوعہ مکاتیب شائع کیے گئے ہیں (۲۰) جس میں سے ایک خط جو داغ دہلوی کے نام ہے حامد حسن قادری نے "داستانِ تاریخ اردو" میں شامل کیا ہے (۲۱)۔ "داستانِ تاریخ اردو" میں شامل دوسرا خط جو حکیم عابد علی کوثر خیر آبادی کے نام ہے۔ "خطوط منشی امیر احمد" از احسن اللہ ثاقب سے لیا گیا ہے۔ (۲۲) امیر نمبر میں شامل خطوط کے مختصر کوائف درج ذیل ہیں۔

مکتوب بنام داغ دہلوی

۱۔	۳۱؍ مارچ ۱۸۹۱ء	خط کا آغاز : مصدر لطف اتم قدیمی مکرم سلامت خط کا اختتام : گمان فاسد نہ کیا کرو۔ زیادہ کیا لکھوں

مکاتیب بنام مولوی احمد خاں صوفی مالک مطبع مفید عام آگرہ کے نام

۲۔	تاریخ درج نہیں	خط کا آغاز : مخلص نواز۔ سلسلہ نیاز نواز ش نامہ آیا۔ خط کا اختتام : خصوصیاتِ قدیمہ کو نباہ دینے کی التجائیں۔

۳۔ ۲۰؍اکتوبر ۱۸۹۰ء خط کا آغاز : مخدوم و کرم نیازکیشاں، تسلیم نیاز۔
خط کا اختتام : اور جناب موصوف کی طرف سے دعائیں۔

مکتوب بنام جنرل عظیم الدین خاں بہادر، مدار المہام ریاست رام پور

۴۔ ۱۸؍مارچ ۱۸۹۱ء خط کا آغاز : عالی جاہ عظمت و حشمت پناہ قدر دان
خط کا اختتام : جو ہز آنر کے حضور پیش ہوں گے۔

۷۔امیر مینائی (۲۳)

یہ کتاب شاہ محمد ممتاز علی آہ کی تحریر کردہ امیر کی سوانح عمری ہے۔اس میں شامل امیر کے دس مکاتیب جو ممتاز علی آہ کے نام اور ایک ان کے والد منشی سخاوت علی کے نام ہے۔یہ پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ "آہ نے ۰۰۰ صرف آٹھ خط درج کیے ہیں" (۲۴)۔غالباً سہواً ایسا لکھا ہے۔اس لیے کہ کتابت شدہ آٹھ مکاتیب کے ساتھ ایک خط کا عکس بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ منشی سخاوت کے نام خط صفحہ ۳۵۔۳۶ پر ہے۔امیر کا آہ کے نام دسواں خط صفحہ نمبر ۱۲۹ پر ہے اس پر تاریخ درج نہیں ہے آہ نے اسے رواں عبارت میں شامل کیا ہے۔امیر نے یہ خط سفرِ بھوپال کے دوران تحریر کیا تھا۔یہ بات ۱۸۹۷ء کی ہے۔چناں چہ یہ خط ۱۸۹۷ء کی کسی تاریخ کا ہے۔ذیل میں ان خطوط کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

۱۔ یکم دسمبر ۱۸۹۰ء خط کا آغاز : پیارے ممتاز۔خدا تمھاری عمر دراز کرے
خط کا اختتام : سب عزیزوں کو ماوجب

۲۔ ۳؍دسمبر ۱۸۹۰ء خط کا آغاز : میاں ممتاز۔کیا لاڑھے سیفو کی دکان
خط کا اختتام : فقط سب کو دعائیں، سب کو سلام

۳۔ ۶؍دسمبر ۱۸۹۰ء خط کا آغاز : پیارے ممتاز! الحمد للہ یہاں خیریت ہے۔
خط کا اختتام : وہاں سب عزیزوں کو ماوجب

۴۔ ۱۴؍دسمبر ۱۸۹۰ء خط کا آغاز : پیارے ممتاز۔دعائیں لو
خط کا اختتام : تلافی مافات ہو جائے۔فقط

۵۔ ۴؍جنوری ۱۸۹۳ء خط کا آغاز : پیارے ممتاز۔دونوں جہاں میں ممتاز رہو
خط کا اختتام : سب ماوجب گزار ہیں۔

۶۔ تاریخ ندارد، دسمبر ۱۸۹۴ء خط کا آغاز : ممتاز میاں۔جدائی کے دن پہاڑ تو ہوتے ہیں۔
خط کا اختتام : سب عزیزوں کو ماوجب

۷۔ ۲۳؍دسمبر ۱۸۹۴ء خط کا آغاز : عزیز از جانِ ممتاز۔عمر دراز
خط کا اختتام : انضمام عافیت انجام قبول ہو۔

۸۔ ۳ر جولائی ۱۸۹۵ء
خط کا آغاز: سرمایہ ناز۔ پیارے ممتاز، عمر دراز
خط کا اختتام: تمھارا کارڈ بھی سرور موخور کا باعث ہوا۔

۹۔ ۱۶ر دسمبر ۱۸۹۰ء
خط کا آغاز: پیارے ممتاز تم ہو اور دین ودنیا کی
خط کا اختتام: یا تم ہی کہو زیادہ کیا لکھوں
(اصل خط کا عکس)

۱۰۔ تاریخ درج نہیں
خط کا آغاز: بحرکت اضطراری یہ مجبوری و ناچاری
خط کا اختتام: یہاں سب لوہا مانے ہوئے ہیں۔

مکتوب بنام منشی سخاوت علی

۱۱۔ تاریخ درج نہیں
خط کا آغاز: آپ نے میرے پیارے نور چشم ممتاز کو مجھ سے چھڑانے کی
خط کا اختتام: اس رائے کی پسند و ناپسند میں آپ کو اختیار ہے۔

۸۔ ماہ نامہ "فاران"، کراچی (۲۵)

امیر کا ایک خط داغ دہلوی کے پانچ خطوط کے ساتھ ماہنامہ "فاران" کراچی میں شائع ہوا۔ بعد میں یہی مکاتیب "داغ وامیر کے غیر مطبوعہ خطوط" کے عنوان سے ماہ نامہ "نگار"، پاکستان میں شائع ہوئے (۲۶)۔ پھر یہ تمام مکتوبات "زبانِ داغ" میں بھی شامل کیے گئے (۲۷)۔ امیر کا یہ خط پہلی مرتبہ "فاران" میں اسرائیل احمد مینائی (نبیرہ امیر مینائی) کے توسط سے شائع ہوا۔

۱۔ ۷ر جنوری ۱۸۹٦ء روز شنبہ
خط کا آغاز: مکرم قدیم۔ سلام مسنون۔ نوازش نامہ آیا
خط کا اختتام: بچہ بر آرد پر د بال عنقا گردد

امیر مینائی کے غیر مطبوعہ خطوط کا جو ذخیرہ راقم کے پاس محفوظ ہے اس میں مذکورہ خط کی تاریخ ۷ جولائی ۱۸۹۴ء درج ہے۔

۹۔ "نقوش" مکاتیب نمبر (۲۸)

مذکورہ خاص نمبر میں امیر کے چودہ (۱۴) مکاتیب شائع ہوئے۔ اس میں شامل داغ دہلوی کے نام خط پہلے "نیرنگ"، دہلی کے "امیر نمبر" اور پھر "داستان تاریخ اردو" میں شائع ہو چکا ہے۔ جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آٹھ [۸] خطوط دل شاہجہان پوری کے نام ہیں۔ یہ تمام خطوط "مرقع ادب جلد دوم" میں شائع ہو چکے ہیں (۲۹)۔ ان میں سے تین مکاتیب فرق کے ساتھ ہیں۔

☆ اس خاص نمبر میں شامل خط نمبر ۱۱ "مرقع ادب" جلد دوم میں ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۵ء والے خط کا آخری حصہ ہے۔ یہاں اس خط پر سنہ اور تاریخ درج نہیں ہے۔

"صہبائے مینائی" میں اس خط کا آخر سے پہلے کا حصہ شائع ہوا ہے (۳۰)۔ اسی کا عکس " نقوش خطوط نمبر " میں شائع ہوا (۳۱)۔ یہ عکس مکمل معلوم ہوتا ہے۔ ایسا کوئی عندیہ نہیں ملتا کہ خط میں کوئی کاٹ چھانٹ ہوئی ہے۔ پھر "مرقع ادب" میں شامل اسی خط کے آخر میں اضافی عبارت کا شامل ہونا اور یہی اضافی عبارت ایک علاحدہ خط کی صورت میں سنہ اور تاریخ کے بغیر " نقوش، مکاتیب نمبر میں" شائع ہونا توجہ طلب ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ۱۹/ ستمبر ۱۸۹۵ء کا خط جتنا عکس میں ہے اتنا ہی ہے۔ یہ اضافی عبارت سنہ اور تاریخ کے بغیر لکھا گیا کوئی اور خط ہے۔ لیکن ہے دل شاہجہاں پوری کے نام۔ ہمارے خیال میں جب صفدر مرزاپوری نے "مرقع ادب" شائع کرنے کے لیے دل شاہجہاں پوری سے رابطہ کیا تو انھوں نے خط کی جو نقول ارسال کیں اس میں دونوں کو یکجا کر دیا۔ اس بات پر زور اس لیے بھی دیا جا رہا ہے کہ اس خط کا عکس " نقوش خطوط نمبر" میں شائع ہو چکا ہے لہذا شک وشبہہ کی گنجائش اب نہیں رہتی۔ اور " نقوش" میں شامل اس مختصر عبارت والے خط کو ہم مطبوعہ ہی تصور کرتے ہیں۔

☆ خط نمبر ۱۴/ کا آخری فقرہ "مرقع ادب" میں شامل نہیں۔

"مجی وعزیزی حافظ جلیل حسن اور سعید قرۃالعین مسعود ما وجب رساں ہیں"۔

☆ خط نمبر ۴/ پر تاریخ ۶/ نومبر ۱۸۹۳ء درج ہے۔ جب کہ "مرقع ادب" (ص ۲۷) میں اس خط پر صرف "۲۱/ دسمبر ہے"۔

اب ذیل میں ان مکاتیب کے کوائف درج کیے جاتے ہیں۔ جو پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔

مکتوبات بنام منشی محمد عسکری وسیم ترمذی خیر آبادی۔

۱۔	۱۲/ جنوری ۱۸۸۲ء	خط کا آغاز : نورِ چشم میں کل قطعات تاریخ بھیج چکا خط کا اختتام : راقم آثم امیر احمد از رام پور
۲۔	۳۱/ دسمبر ۱۸۸۸ء	خط کا آغاز : میاں وسیم۔ تمھاری پریشانی سے مجھ کو بھی خط کا اختتام : اس رقعہ کو ضائع نہ کرنا واپس کر دینا۔

مکتوبات بنام منشی امتیاز احمد خاں راز

۱۔	۲۴/ ستمبر ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز : پیارے راز عمر دراز، خزانہ خالی خط کا اختتام : ع ممکن ہی نہیں کہ ہو خزانہ خالی
۲۔	۲۱/ دسمبر ۱۸۹۷ء	خط کا آغاز : پیارے راز۔ اک مطلع تھر تھرائے ہوئے دل خط کا اختتام : ع نہ کھورا ہے۔ نہ کنڈے، نہ سیٹے ہیں نہ کونکے ہیں

مکتوب بنام احسن مارہروی

ا۔	۲۳ر جون ۱۸۹۸ء	خط کا آغاز: دل نواز فن سید علی احسن صاحب خط کا اختتام: جلیل کی طرف سے سلام و نیاز

۱۰۔ صہبائے مینائی (۳۲)

یہ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی تحریر کردہ امیر مینائی کی ایک منفرد سوانح عمری ہے۔ جس میں امیر کی مکتوب نگاری کے ذیل میں آٹھ [۸] خطوط پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے تین [۳] خط جو دل شاہجہاں پوری کے نام ہیں "مرقع ادب" جلد دوم میں شامل ہیں۔ اس میں سے ایک خط (خط نمبر ۳) کے متعلق وضاحت گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے اب اس کتاب کے توسط سے پہلی بار منظر عام پر آنے والے خطوط کے بارے میں درج کیا جاتا ہے۔

بنام مہدی حسن شاداب

ا۔	۱۲ر اپریل ۱۸۸۵ء	خط کا آغاز: سرمایۂ ناز اہلِ نیاز سلامت نامۂ نیاز پہنچ گیا۔

مکتوبات بنام عنایت اللہ روشن بدایونی

ا۔	۲ر نومبر ۱۸۹۷ء	خط کا آغاز: محب دل نواز سلام مسنون آپ کا کارڈ خط کا اختتام: اسے تلاش کر کے نکالوں

مکتوبات بنام: نام درج نہیں

ا۔	۸ر اگست ۱۸۹۶ء	خط کا آغاز: محبی سلام مسنون! نامہ دل نواز خط کا اختتام: زیادہ میں کیا لکھوں
۲۔	۱۹ر اکتوبر ۱۸۹۸ء	خط کا آغاز: محبِ دل نواز، سلام مسنون اخلاص مشحون خط کا اختتام: دولت سرا کی جگہ دولت کدہ مناسب ہے۔
۳۔	۲۵ر نومبر ۱۸۹۸ء	خط کا آغاز: محبی سلام مسنون دعا مشحون خط کا اختتام: ع لطفِ سخن یہی ہے کہ ہو بات بات میں

۱۱۔ "نقوش" ادب عالیہ نمبر (۳۳)

اس شمارے میں امیر کے دو خطوط شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ایک داغ دہلوی اور دوسرا وسیم خیر آبادی کے نام ہے۔ یہ دونوں مکتوب "نقوش" کے "مکاتیب نمبر" میں شائع ہو چکے ہیں۔

سہ ماہی "اردو ادب"، علی گڑھ (۳۴)

نام سیتاپوری نے اپنے ایک مضمون بعنوان "شعلہ جوالہ" : اردو کے واسوخت نگار شعراء کا ایک تذکرہ" میں امیر کے ایک معاصر شیخ فدا علی عیش لکھنوی کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی موقع پر انھوں نے امیر کا ایک تعزیتی خط بھی شامل کیا ہے۔ جو عیش لکھنوی کے صاحبزادے کے نام ہے۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن امیر نے عیش کے لیے جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اس سے سال ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۹ء) نکلتا ہے۔ گویا یہ ۱۸۹۹ء کی کسی تاریخ کا خط ہے۔

۱۔ تاریخ درج نہیں — خط کا آغاز : واقعہ ردات عیش مغفور سے جو صدمہ
خط کا اختتام : خلد کیا اچھا عیش کا گھر ہے

۱۲۔ ہفت روزہ "ہماری زبان" علی گڑھ (۳۵)۔

اس رسالے میں حفیظ جون پوری کے نام امیر کے تین خطوط شائع ہوئے ہیں۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ : "رسالہ اصلاح سخن"، لاہور میں امیر کے تین خط شائع ہوئے تھے۔ "ہماری زبان" ... میں سلطان اشرف صاحب نے ان خطوط کو وہیں سے نقل کر کے شائع کرادیا ہے" (۳۶)۔ حفیظ جون پوری کے نام یہ مکاتیب پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں۔ ذیل میں ان کے کوائف پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ۲۲ر جولائی ۱۸۹۴ء رام پور — خط کا آغاز : مجی سلام مسنون! مہربانی نامہ آیا۔
خط کا اختتام : منشی طفیل احمد صاحب جہاں ہوں۔

۲۔ ۲۱ر ستمبر ۱۸۹۵ء رام پور — خط کا آغاز : مجی سلام مسنون! اخلاص مشحون
خط کا اختتام : جلیل بہت بہت سلام کہتے ہیں۔

۳۔ ۳۰ر ستمبر ۱۸۹۵ء رام پور — خط کا آغاز : مجی سلام ودعا! غزل کے ساتھ نامہ دل
خط کا اختتام : زیادہ دعا کے سوا کیا لکھوں

۱۳۔ "نقوش خطوط نمبر" (۳۷)۔

اس خاص نمبر میں امیر کے آٹھ (۸) خطوط شائع ہوئے ہیں۔ جس میں ایک خط کا عکس بھی شامل ہے۔ یہ خط دل شاہجہاں پوری کے نام ہے۔ جو اس سے پہلے "مرقع ادب" جلد دوم، اور "صہبائے مینائی" میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ گذشتہ صفحات میں اس خط سے متعلق وضاحت "نقوش مکاتیب نمبر" کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہے۔

مذکورہ خط کے علاوہ چار[۴] خطوط نعیم الحق آزاد شیخ پوری کے نام ہیں ان میں سے تین "خطوط منشی امیر احمد" میں شائع ہو چکے ہیں(۳۸) لیکن ان میں بعض مقامات پر فرق ملتا ہے۔

☆ خط نمبر 1 کے شروع میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"بنام خاک پائے استاد احقر العباد۔بندہ عجز نہاد محمد نعیم الحق صاحب آزاد شیخ پوری"۔

"خطوط امیر مینائی" میں یہ عبارت شامل نہیں(ص ۲۶۹)۔

اسی خط میں ہے کہ "سن بمعنی سال کہیں نہیں مل سکتا"۔جب کہ "خطوط منشی امیر احمد" میں ہے۔"سن بمعنی سال نہیں نکلتا"(ص ۲۶۹)

☆ خط نمبر 4 ر میں عبارت اس طرح شائع ہوئی ہے۔

"اگر آپ کو صنفِ شاعری میں یہ مشرب پسند آئے تو•••"۔

"خطوط امیر مینائی" میں یہی عبارت معمولی فرق کے ساتھ اس طرح ہے۔

"اگر آپ کو یہ مشرب پسند آئے تو•••"۔

اس خط کے آخر میں "نیاز مند ممتاز علی آہ تسلیم عرض کرتا ہے"۔بھی درج ہے جب کہ "خطوط منشی امیر احمد" میں نہیں ہے۔

"نقوش خطوط نمبر" میں آٹھ میں سے تین مکاتیب ایسے ہیں جو پہلی مرتبہ شائع ہوئے۔ذیل میں ان کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

مکتوبات بنام مختار شاہجہاں پوری

۱۔	۴ر جون ۱۹۰۰ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبی سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام : سپاس نامہ جداگانہ لکھوں گا
۲۔	۱۵ر جون ۱۹۰۰ء (رام پور)	خط کا آغاز : محبِ دل نواز۔ سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون خط کا اختتام : سب عزیزان واحباب ماوجب گزار ہیں۔

مکتوب بنام صفی لکھنوی

۱۔	۱۹ر دسمبر ۱۸۹۵ء رام پور	خط کا آغاز : محبِ دل نواز السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ خط کا اختتام : خیریت سے خیر طلب کو ہمیشہ مسرور کیا کیجیے۔

۱۴۔ حیات الشعراء(۳۹)

یہ محمد نعیم الحق آزاد کی تصنیف ہے۔اس کتاب میں لسانی وعروضی مسائل کے علاوہ امیر کے سولہ(۱۶) مکاتیب بھی شامل ہیں۔ان میں داغ کے نام جو سات(۷) خطوط ہیں وہ تمام "خطوط منشی امیر احمد" میں شامل ہیں(ص ۲۵۰ تا ص ۲۶۳)۔لیکن کئی مواقع پر معمولی فرق

پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آٹھ (۸) خط محمد نعیم الحق آزاد شیخ پوری کے نام ہیں۔ ان میں سے خط نمبر ۹۔ ۱۰۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶ (ص ۲۶۹ تا ۲۷۴) خطوط منشی امیر احمد" میں اور خط نمبر ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۳" نقوش خطوط نمبر" (ص ۴۲۳ تا ۴۲۵) میں شامل ہیں۔

اب پہلے داغ اور پھر نعیم الحق آزاد کے مکاتیب کے تسامحات کو پیش کیا جاتا ہے۔

☆ خط نمبر ۱ / پر تاریخ ۳ / نومبر ۱۸۸۷ء شائع ہوئی ہے۔ جب کہ "خطوط منشی امیر احمد" میں شامل اس خط پر تاریخ درج نہیں۔

☆ خط نمبر ۱ / میں "پانسو روپے ماہوار کا خرچ اور "سو کی آمدنی"۔

"خطوط منشی امیر احمد" میں ہے۔ "پانسو روپے ماہوار کا خرچ اور "دو سو کی آمدنی۔

☆ خط نمبر ۱ / میں ہے۔ "سات مہینے میں"۔

"خطوط منشی امیر احمد" میں "انہیں سات مہینے میں"۔

☆ خط نمبر ۱ / میں مصرع ہے۔

ع اوست سلطان ہرچہ خواہد او کند

خطوط منشی امیر احمد میں مصرع یوں ہے۔

ع اوست سلطان ہرچہ خواہد آں کند

☆ خط نمبر ۲ / پر تاریخ ۳۰ / جولائی ۱۸۹۲ء ہے۔ جب کہ "خطوط منشی امیر احمد" میں ۲۶ / جولائی ۱۸۹۰ء درج ہے۔ تاریخ کے فرق کے ساتھ یہ خط مکمل طور پر دونوں کتابوں میں ہے۔ لیکن اس کا کچھ حصہ "خطوط منشی امیر احمد" میں علاحدہ خط کی صورت میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ (ص ۲۵۲ تا ۲۵۴) اور اس پر تاریخ ۲۶ / جولائی ۱۸۹۲ء درج ہے۔ یہی صورتِ حال "مکاتیب امیر مینائی" میں بھی ہے۔ (ص ۲۵۰)۔

☆ خط نمبر ۶ / میں عبارت ہے کہ "ہم غریبوں کو بھی کہنے کی ..." جب کہ "خطوط منشی امیر احمد" میں معمولی اضافے کے ساتھ عبارت اس طرح ملتی ہے۔

"ہم سے غریبوں کو بھی کہنے کی ..." (ص ۲۷۵)

آزاد کے مکاتیب "خطوط منشی امیر احمد" اور "نقوش" کے خطوط نمبر میں بھی ہیں۔ سنہ و تاریخ اور متن کا فرق تینوں جگہ ہے۔ گو بعض کی نشان دہی "نقوش" کے خطوط نمبر کو متعارف کراتے وقت کی گئی ہے لیکن کسی بڑی غلطی سے بچنے کے لیے ایک بار پھر تفصیلی صراحت کی جاتی ہے۔

☆ خط نمبر ۱۰ / کے شروع میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"بنام خاک پائے استاد احقر العباد بندہ عجز نہاد محمد نعیم الحق آزاد شیخ پوری"۔

یہ عبارت "خطوط منشی امیر احمد" میں شامل نہیں ہے البتہ "نقوش"، خطوط نمبر میں موجود ہے۔

☆ اسی خط میں ہے کہ "سن بمعنی سال کہیں نہیں نکلتا" خطوط منشی امیر احمد میں بھی اسی طرح ہے۔ البتہ "نقوش" میں ہے کہ "سن بمعنی سال کہیں نہیں مل سکتا"۔

☆ خط نمبر ۱۱ر میں امیر کی تاریخ وفات ۱۰ر ربیع الاوّل شائع ہوئی ہے جب کہ "نقوش" میں ۷ ار ربیع الاوّل ہے۔

☆ اسی خط میں "نئی غزل گلدستوں سے چھنے کہاں پاتی ہے"۔ شائع ہوئی ہے جب کہ "نقوش" میں "غزل" کے بجائے "غزلیں" ہے۔

☆ خط نمبر ۱۲ر کا ابتدائی حصہ حیات الشعراء میں نہیں خطوط منشی امیر احمد میں ہے (ص ۲۷۳)

"مجی سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون۔ محبت نامہ مدت کے بعد آیا ممنون و مسرور یاد آوری کیا۔ آپ اپنا تخلص صفیر کی جگہ آزاد قرار دیتے ہیں میں بھی پسند کرتا ہوں واقعی صفیر بلگرامی ایک مشہور شخص تھے"۔

☆ خط نمبر ۱۳ر میں ہے کہ "اگر آپ کو یہ مشرب پسند آئے" خطوط منشی احمد میں بھی اسی طرح ہے۔ البتہ نقوش میں صنفِ شاعری میں" کے اضافے کے ساتھ ہے۔

☆ اسی خط کے آخر میں "نیاز مند ممتاز علی آہ تسلیم عرض کرتا ہے"۔ شائع ہوا ہے۔ "نقوش" میں بھی یہ عبارت ہے لیکن خطوط منشی امیر احمد میں نہیں ہے۔ اس کتاب کے توسط سے ایک خط منظر عام پر آیا ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

بنام آغا مرزا شاغل

۱۔ ۲۲ر جنوری ۱۸۹۲ء خط کا آغاز : قدیمی دل نواز مجی آغا مرزا صاحب
خط کا اختتام : احباب دست بہ دعا صحت ہیں۔ فقط

۱۵۔ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ (۴۰)۔

یہ ڈاکٹر کریم الدین احمد (پی۔ ایچ۔ ڈی) کا مقالہ ہے۔ آپ نے باب سوم میں امیر کے حالات زندگی ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط کی مدد سے ترتیب دیے ہیں (۴۱)۔ وہ یہ اطلاع بھی دیتے ہیں کہ "خطوط کی بیاض جس میں فارسی اور اردو خطوط ہیں ان کے پوتے اسرائیل احمد مینائی سے ملی ہے" (۴۲)۔ جس میں اردو کے ۱۴۰ر فارسی کے ۸۰ر خطوط ہیں۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد نے امیر کے غیر مطبوعہ مکاتیب سے اقتباس حسبِ ضرورت درج کیے ہیں۔ مکمل مکتوبات ابھی تک پردہ اخفا ہیں۔ ذیل میں اقتباسات سے متعلق ضروری معلومات درج کی جاتی ہیں۔ جو بہت حد تک امیر کی مکتوب نگاری کی تاریخ مکمل کرتی ہیں۔

۱۔	بنام : سعد اللہ خاں گور کھپوری	۱۸۸۲ء (۱۳ر ربیع الآخر ۱۳۰۰ھ)
۲۔	بنام : منشی محمد حسن	۱۵ر جمادی الاوّل ۱۳۰۰ھ
۳۔	بنام : خسرو آراء بیگم	۱۶ر جمادی الآخر ۱۳۰۰ھ
۴۔	بنام : مولوی عطاءاللہ خاں	۲۵ر فروری ۱۸۸۳ء
۵۔	بنام : حبیب الدین سوزاںؔ	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۳ء بربنائے تسلسل
۶۔	بنام : باسط علی خاں	= = = =

۷۔	بنام: حسیب الدین سوزاںؔ	= = = =
۸۔	بنام: = =	= = = =
۹۔	بنام: عبد الجلیل	۱۴؍ اپریل ۱۸۸۳ء
۱۰۔	بنام: مالک شوخ اودھ منشی تصور حسین	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۳ء
۱۱۔	بنام: مولانا علی عبد القادر	۱۹؍ اپریل ۱۸۸۳ء
۱۲۔	بنام: ارشد گورگانوی	۱۳؍ مئی ۱۸۸۳ء
۱۳۔	= = =	۱۶؍ مئی ۱۸۸۳ء
۱۴۔	بنام: مولوی عبد الحئی	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۳ء
۱۵۔	= = = =	= = = =
۱۶۔	بنام منشی واحد علی	۱۰؍ ذیقعد ۱۳۰۰ھ
۱۷۔	نام درج نہیں	تاریخ درج نہیں
۱۸۔	= = = =	= = = =
۱۹۔	= = = =	۲۱؍ ستمبر ۱۸۸۳ء
۲۰۔	بنام: مولوی حبیب اللہ خاں	۲۱؍ ذیقعد ۱۳۰۰ھ
۲۱۔	بنام: منشی تصور حسین	مکمل درج نہیں
۲۲۔	بنام: میر مجاور علی	سنہ و تاریخ درج نہیں۔
۲۳۔	بنام: مولانا عبد القادر شمس القادری	۱۶؍ محرم ۱۳۰۱ھ
۲۴۔	بنام: سید علی قادری	۲۵؍ محرم ۱۳۰۱ھ
۲۵۔	بنام: سید علی قادری	۲۸؍ نومبر ۱۸۸۳ء
۲۶۔	بنام: رضوان علی خان	۸؍ ستمبر ۱۸۸۳ء
۲۷۔	نام درج نہیں	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۳ء
۲۸۔	بنام: میر مجاور علی	۴؍ جنوری ۱۸۸۴ء
۲۹۔	بنام: میر مجاوی علی	۱۴؍ جنوری ۱۸۸۴ء
۳۰۔	بنام: میر مجاور علی	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۴ء
۳۱۔	بنام: حسیب الدین سوزاں	۲۷؍ جنوری ۱۸۸۴ء
۳۲۔	نفیس	۲۵؍ فروری ۱۸۸۴ء

۳۳۔	غافل	یکم اپریل ۱۸۸۴ء
۳۴۔	کلب علی خان	۴؍اپریل ۱۸۸۴ء
۳۵۔	نام درج نہیں	۱۵؍اپریل ۱۸۸۴ء
۳۶۔	مہدی حسن خاں شاداب	۲۷؍اپریل ۱۸۸۴ء
۳۷۔	احسن اللہ ثاقب	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۴ء
۳۸۔	میر مجاور علی	۱۲؍اگست ۱۸۸۴ء
۳۹۔	بنام: حکیم نصرت خاں	۲۸؍اگست ۱۸۸۴ء
۴۰۔	بنام: میر مجاور علی	۶؍اکتوبر ۱۸۸۴ء
۴۱۔	بنام: میر مجاور علی	۱۰؍اکتوبر ۱۸۸۴ء
۴۲۔	بنام: میر مجاور علی	۸؍دسمبر ۱۸۸۴ء
۴۳۔	بنام: میاں کبیر احمد	۹؍ستمبر ۱۸۸۴ء
۴۴۔	بنام: میر مجاور علی	۲۴؍اکتوبر ۱۸۸۴ء
۴۵۔	بنام: میر مجاور علی	۸؍دسمبر ۱۸۸۴ء
۴۶۔	مرزا محمد شیرازی (فارسی خط)	۱۴؍جنوری ۱۸۸۴ء
۴۷۔	نواب علاؤالدین خاں لوہار (فارسی خط)	۳؍شوال ۱۳۰۱ھ
۴۸۔	پنڈت ہری چند کشمیری (فارسی خط)	۱۵؍جنوری ۱۸۸۴ء
۴۹۔	پنڈت ہری چند کشمیری (فارسی خط)	۱۵؍اکتوبر ۱۸۸۴ء
۵۰۔	نواب کلب علی خان	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۵ء
۵۱۔	مہدی حسن خاں شاداب	۱۲؍اپریل ۱۸۸۵ء
۵۲۔	مولوی مظہر الاسلام	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۵ء
۵۳۔	مہدی حسن خاں شاداب	۷؍جون ۱۸۸۵ء
۵۴۔	حاجی کلب حسن	۷؍جون ۱۸۸۵ء
۵۵۔	نواب کلب علی خان	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۵ء
۵۶۔	مہدی علی خان	۴؍دسمبر ۱۸۸۵ء
۵۷۔	محمد صادق (فارسی خط)	تاریخ درج نہیں ۱۸۸۶ء
۵۸۔	سید محمد نوح شبیر	۲۸؍ستمبر ۱۸۸۷ء
۵۹۔	نام نہیں معلوم	۱۳؍رجب ۱۲۸۹ھ

۱۶۔ عین المعارف (۴۳)

"عین المعارف"، آسی غازی پوری (نام عبد العلیم تاریخی نام ظہور الحق) کی شعری کاوشوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں امیر کا ایک خط عکسی صورت میں ملتا ہے۔ جو مولوی عبد الصمد کے نام ہے۔

مکتوب بنام مولوی عبد الصمد

۱۔ سن و تاریخ ندارد — خط کا آغاز : حسن کچھ اس کا نام نہیں

خط کا اختتام : نواب کلب علی خاں بہادر، ساکن لکھنؤ

۱۷۔ تحقیق (۴۴)

راقم الحروف نے مکتوباتِ امیر کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ "افاداتِ امیر" کے نام سے اس رسالے میں متعارف کرایا ہے۔ "افاداتِ امیر" میں ایک خط سید سطرِ رسول کے نام بھی شامل ہے۔ یہ اصل خط کا عکس ہے اور بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے باقی اکتیس غیر مطبوعہ خطوط سے علمی و ادبی نکات اقتباس کیے گئے ہیں مکمل مکتوبات راقم کے پاس محفوظ ہیں۔ جن کی نشان دہی ذیل میں کی جاتی ہے :

۱۔	بنام پنڈت رتن ناتھ سرشار	جولائی ۱۸۹۰ء
۲۔	بنام حافظ سید محمد حسین بسمل	۱۷؍ اگست ۱۸۹۰ء
۳۔	بنام نواب عالم گیر	۲۴؍ اگست ۱۸۹۰ء
۴۔	بنام حافظ سید محمد حسن بسملؔ	۱۰؍ ستمبر ۱۸۹۰ء
۵۔	بنام احمد علی شوق	۲۵؍ ستمبر ۱۸۹۰ء
۶۔	بنام منشی جوالا پرشاد، جوق	یکم اکتوبر ۱۸۹۰ء
۷۔	بنام قاضی ممتاز حسین	۹؍ ذی الحج ۱۳۰۸ھ
۸۔	بنام ممتاز حسین وکیل	۱۴؍ جنوری ۱۸۹۱ء
۹۔	بنام مولانا مولوی حفیظ اللہ	۱۰؍ مئی ۱۸۹۱ء
۱۰۔	بنام محمد عمر جنون	۲۰؍ جون ۱۸۹۱ء
۱۱۔	بنام احمد حسین خان مذاق	۴؍ دسمبر ۱۸۹۱ء
۱۲۔	بنام منشی جمیل احمد ضیاء	۵؍ دسمبر ۱۸۹۱ء
۱۳۔	بنام سید محمد مرتضٰی	۳۰؍ دسمبر ۱۸۹۱ء
۱۴۔	بنام میر باقر حسین	۱۸؍ ذی القعدہ ۱۳۰۹ھ
۱۵۔	بنام سید مرتضٰی	۵؍ جنوری ۱۸۹۲ء
۱۶۔	بنام منشی عبد الحئی، بے چین، بدایونی	۷؍ فروری ۱۸۹۲ء

۱۷۔	بنام نام معلوم نہیں	۹/ فروری ۱۸۹۲ء
۱۸۔	بنام حکیم محمد قیام الدین نیر	۲۲/ فروری ۱۸۹۲ء
۱۹۔	بنام منشی محمد عمر	۱۹/ اپریل ۱۸۹۲ء
۲۰۔	بنام محمد بقاء اللہ	۲۸/ اپریل ۱۸۹۲ء
۲۱۔	بنام میر باقر	۱۲/ جولائی ۱۸۹۲ء
۲۲۔	بنام منشی سید احمد حسین	۱۲/ مئی ۱۸۹۲ء
۲۳۔	بنام منشی عبداللطیف	۴/ جون ۱۸۹۲ء
۲۴۔	بنام حکیم محمد جعفر بہار	۶/ جون ۱۸۹۲ء
۲۵۔	بنام بشیر احمد خاں ملیح آبادی	۱۷/ جون ۱۸۹۲ء
۲۶۔	بنام سید اظہر علی	جولائی ۱۸۹۲ء
۲۷۔	بنام خان بہادر شیخ محمد حسین	۲۶/ جولائی ۱۸۹۲ء
۲۸۔	بنام محمد رفیع	۲۱/ اگست ۱۸۹۲ء
۲۹۔	بنام حافظ سید مختار احمد	۲۲/ اپریل ۱۹۰۰ء
۳۰۔	بنام نواب عالم گیر محمد خان	۲۸/ ذی الحج ۱۳۱۷ھ
۳۱۔	بنام سید علی حسین نجم	۲/ مئی ۱۹۰۰ء

۱۸۔ تحقیق (۴۵)

اس شمارے میں راقم الحروف نے "معتمدین دفتر اللغات کے مکتوبات" کے عنوان سے ایک مضمون پیش کیا ہے جس میں معتمدین یا تلامذہ امیر کے غیر مطبوعہ خطوط ہیں۔ اس مضمون کے ضمیمہ اول میں امیر کا ایک غیر مطبوعہ خط بھی شامل ہے۔ جو اپنے مضمون کے اعتبار سے اہم ہے۔ ذیل میں اس کے بارے میں صراحت کی جاتی ہے۔

مکتوب بنام محمد عبدالاحد

۳۰/ اپریل ۱۸۹۱ء

خط کا آغاز : قدر شناس علم و ہنر سلمکم اللہ الاکبر

خط کا اختتام : زیادہ التماس کی حاجت نہیں۔

۱۹/ ارمغان امیر (۴۶)

یہ مجلّہ امیر کی صد سالہ برسی (۱۳/ اکتوبر، ۲۰۰۰ء) کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اسرائیل احمد مینائی (نبیرہ امیر مینائی) نے امیر کے دو نئے خطوط متعارف کرائے ہیں۔)

مکتوب بنام سید وسیم خیر آبادی

۱۔ ۹؍ فروری ۱۸۸۷ء خط کا آغاز: نور چشم بہت دنوں سے تمھاری خیریت نہیں آئی۔
خط کا اختتام: سب اعزاء واحباب سلام کہتے ہیں۔

مکتوب بنام فصیح الزماں

سنہ اور تاریخ درج نہیں خط کا آغاز: میاں فصیح پیارے، خدا تم کو زندہ اور صحیح رکھے۔
خط کا اختتام: انشاء اللہ پھر ان سے اور ہم سب سے ملو گے دل قوی رکھو۔

گزشتہ صفحات میں امیر مینائی کے مطبوعہ خطوط کی تفصیل ان کا تجزیہ اور اس سے متعلق تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خلاصہ بھی تحریر کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ امیر کے مکاتیب پہلی مرتبہ کب اور کہاں شائع ہوئے اور اب تک کتنی جگہوں پر شائع ہو چکے ہیں، ان کی کل تعداد کتنی ہے۔ اس کے علاوہ ایک حتمی فہرست بھی سامنے لائی جائے تاکہ یہ علم ہو سکے کہ اب تک کن کن اشخاص کے نام کتنے خطوط منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ذیل میں ایک جدول دی جا رہی ہے جس سے یہ پتا چل جائے گا کہ امیر کے خطوط کس سنہ میں کہاں کہاں شائع ہوئے، ان کی تعداد کتنی ہے۔ اس کے بعد ایک فہرست ہے جس سے یہ نشان دہی ہوتی ہے کہ کس مکتوب علیہ کے نام کتنے خطوط ہیں۔

امیر مینائی کے خطوط تقریباً ہر دہائی میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن شائع کرنے والے یہ صراحت نہیں کرتے تھے کہ یہ مکاتیب انھوں نے کہاں سے حاصل کیے بلکہ یہ جب شائع ہوئے غیر مطبوعہ ہی ظاہر کیے گئے حالاں کہ متعدد خطوط مطبوعہ ہوتے تھے۔ ذیل کی جدول میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکاتیب کی واضح نشان دہی بھی ہوتی رہے۔

شمار	کتاب ؍ رسائل	سنہ	کل خطوط	پہلی مرتبہ	دیگر
۱	اردوئے معلی، علی گڑھ	مارچ ۱۹۰۷ء	۰۵	۰۵	ایک خط فارسی کا ہے۔
۲	خطوط منشی امیر احمد	نومبر ۱۹۱۰ء	۲۳۴	۲۳۴	
۳	مرقع ادب جلد اوّل	۱۹۲۰ء	۲۳	۲۳	
۴	مکاتیب امیر مینائی	۱۹۲۴ء	۲۵۷	---	
۵	مرقع ادب جلد دوّم	۱۹۲۷ء	۱۰	۱۰	
۶	نیرنگ دہلی	۱۹۳۰ء	۰۴	۰۴	
۷	امیر مینائی (سوانح)	۱۹۴۱ء	۱۱	۱۱	
۸	ماہنامہ ''فاران''	اگست ۱۹۵۰ء	۰۱	۱۰	
۹	''نگار'' پاکستان	نومبر ۱۹۵۰ء	۱	---	

۱۰	زبانِ داغ	سنہ ندارد	۰۱	---	
۱۱	نقوشِ مکاتیب نمبر	نومبر ۱۹۵۷ء	۱۴	۰۵	
۱۲	صہبائے مینائی	۱۹۵۸ء	۰۸	۰۵	
۱۳	"نقوش" ادب عالیہ نمبر	اکتوبر ۱۹۶۰ء	۰۲	---	
۱۴	ہماری زبان، علی گڑھ	یکم نومبر ۱۹۶۳ء	۰۳	۰۳	
۱۵	سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ	شمارہ ۴، ۱۹۶۲ء	۰۱	---	
۱۶	نقوش خطوط نمبر	اپریل رمئی ۱۹۶۸ء	۰۸	۰۳	
۱۷	حیات الشعراء	۱۹۶۹ء	۱۶	۰۵	
۱۸	امیر مینائی اور ان کے تلامذہ	۱۹۸۲ء	۵۹	۵۹	۵۸ خطوط کے اقتباسات ہیں۔ مکمل خط شائع نہیں کیے گئے۔ جب کہ ایک خط کا مکمل عکس شائع کیا گیا ہے۔
۱۹	عین المعارف	۱۹۸۸ء	۰۱	۰۱	
۲۰	تحقیق شمارہ ۳	۱۹۸۹ء	۳۲	۳۲	۳۱ خطوط کے اقتباس ہیں اور ایک خط کا عکس شامل کیا گیا ہے۔
۲۱	تحقیق شمارہ ۵	۱۹۹۱ء	۰۱	۰۱	
۲۲	ارمغانِ امیر	اکتوبر ۲۰۰۰ء	۰۲	۰۲	ایک خط کا عکس شامل کیا گیا ہے۔

اب ذیل میں ایک فہرست دی جاتی ہے۔ جس میں یہ نشان دہی کی جارہی ہے کہ کس مکتوب علیہ کے نام کتنے خطوط شائع ہوئے۔ یہ فہرست الفبائی طریقے پر مرتب کی گئی ہے۔

۱۔	آزاد، محمد نعیم الحق، شیخ پوری	۰۸
۲۔	عظیم الدین خاں، جنرل	۰۱
۳۔	آغا، مرزا شاغل	۰۱
۴۔	آہ، ممتاز علی	۰۹
۵۔	احمد حسین، منشی سید	۰۱
۶۔	اظہر علی، سید	۰۱
۷۔	برق، جوالا پرشاد، منشی	۰۱

۸۔	برہم گورکھپوری، حکیم	۲۱
۹۔	بسمل، محمد حسین سید، حافظ	۰۲
۱۰۔	بشیر احمد خاں ملیح آبادی	۲۰
۱۱۔	بے چین، منشی عبدالحیٔ	۰۱
۱۲۔	بیمار، محمد جعفر، حکیم	۰۱
۱۳۔	تصور حسین، منشی	۰۲
۱۴۔	ثاقب، احسن اللہ	۳۰
۱۵۔	جلال لکھنوی	۰۱
۱۶۔	جمیل احمد ضیاء، منشی	۰۱
۱۷۔	جنوں، محمد عمر	۰۱
۱۸۔	حبیب اللہ خاں، مولوی	۰۱
۱۹۔	حبیب الرحمٰن خاں شیروانی	۰۹
۲۰۔	حفیظ اللہ، مولانا، مولوی	۰۱
۲۱۔	حفیظ جون پوری	۰۳
۲۲۔	حیراں محمد خلیل، قاضی	۰۱
۲۳۔	خسرو آراء بیگم	۰۱
۲۴۔	خیال محمد ریاض حسن خاں، مولوی	۰۱
۲۵۔	داغ دہلوی	۰۹
۲۶۔	دل شاہجہاں پوری	۱۰
۲۷۔	رضوان علی خاں	۰۱
۲۸۔	روشن عنایت اللہ بدایونی	۰۱
۲۹۔	راز، امتیاز احمد خاں، منشی	۰۶
۳۰۔	زاہد حسین زاہد، سید	۸۵
۳۱۔	سبطِ رسول، سید	۰۱
۳۲۔	سخاوت علی منشی،	۰۱
۳۳۔	سرشار، رتن ناتھ پنڈت	۰۱

۳۴۔	سعد اللہ خاں گورکھپوری	۰۱
۳۵۔	سوزاں حبیب الدین	۰۳
۳۶۔	شاداب محمد مہدی حسن خاں مولوی	۰۶
۳۷۔	شاداب، مہدی حسن خاں	۰۲
۳۸۔	شاداں، جمیل احمد منشی	۰۲
۳۹۔	شوق، احمد علی	۰۱
۴۰۔	صفی لکھنوی	۰۱
۴۱۔	صفیر بلگرامی	۰۱
۴۲۔	صوفی احمد خاں، مولوی	۰۲
۴۳۔	طاہر فرخ آبادی	۰۱
۴۴۔	عابد علی کوثر خیر آبادی، حکیم	۲۹
۴۵۔	عالم گیر محمد خان، نواب	۰۲
۴۶۔	عبدالجلیل	۰۱
۴۷۔	عبدالجمیل، قاضی	۰۱
۴۸۔	عبدالاحد	۰۱
۴۹۔	عبداللطیف، منشی	۰۱
۵۰۔	عبدالحئ، مولوی	۰۲
۵۱۔	عبدالصمد، مولوی	۰۱
۵۲۔	عبدالقادر شمس القادری، مولانا	۰۱
۵۳۔	عطاء اللہ خاں، مولوی	۰۱
۵۴۔	علاؤالدین خاں، لوہارو نواب	۰۱ (فارسی خط)
۵۵۔	علی قادری، سید	۰۲
۵۶۔	علی احسن مارہروی، سید	۰۱
۵۷۔	علی عبدالقادر، ارشد، گورگانوی، مولانا	۰۲
۵۸۔	علی محمد شاہ عظیم آبادی، سید	۰۱
۵۹۔	غافل	۰۱

۶۰۔	فروغی، غلام احمد حافظ	۰۲
۶۱۔	فصیح الزماں	۰۱
۶۲۔	کلب علی خاں، نواب	۰۳
۶۳۔	کلب حسن، حاجی	۰۱
۶۴۔	محمد اعجاز حسن خاں، مولوی	۱۷
۶۵۔	محمد بقاللہ	۰۱
۶۶۔	محمد حسن، منشی	۰۱
۶۷۔	محمد حسین شیخ، خاں، بہادر	۰۱
۶۸۔	محمد رفیع	۰۱
۶۹۔	محمد شیرازی، مرزا	۰۱ (فارسی خط)
۷۰۔	محمد صادق	۰۱ (فارسی خط)
۷۱۔	محمد عبدالاحد	۰۱
۷۲۔	محمد عمر، منشی	۰۱
۷۳۔	محمد مرتضٰی، سید	۰۱
۷۴۔	محمد نوح، سید، مولوی	۰۴
۷۵۔	محمد نوح، بشیر، سید	۰۱
۷۶۔	مختار احمد، سید، حافظ	۰۱
۷۷۔	مختار شاہجہاں پوری	۰۲
۷۸۔	مرتضٰی سید	۰۱
۷۹۔	مذاق، احمد حسن خاں	۰۲
۸۰۔	مظہر الاسلام، مولوی	۰۲
۸۱۔	ممتاز حسین، قاضی	۰۲
۸۲۔	میاں بشیر احمد	۰۱
۸۳۔	مہدی علی خاں	۰۱
۸۴۔	میر باقر حسین	۲
۸۵۔	میر مجاور علی	۰۸

۸۶۔	نجم، علی حسین، سید	۰۱
۸۷۔	نصرت خاں، حکیم	۰۱
۸۸۔	نفیس	۰۱
۸۹۔	نورالحسن	۰۱
۹۰۔	نیر محمد قیام الدین حکیم	۰۱
۹۱۔	واحد علی، منشی	۰۱
۹۲۔	وسیم، محمد عسکری خیر آبادی، منشی	۰۳
۹۳۔	ولایت علی صفی پوری، منشی	۰۲ (فارسی خط)
۹۴۔	ہری چند کشمیری، پنڈت	۰۲ (فارسی خط)
۹۵۔	نام درج نہیں (نامعلوم)	۱۲

(اب تک بائیس مختلف جگہوں پر کل سات سودو [۷۰۲] مکاتیب منظر عام پر آئے ہیں۔ لیکن اصل میں اب تک منظر عام پر آنے والے کل غیر مطبوعہ خطوط چار سوپانچ [۴۰۵] ہیں جن میں چار فارسی خطوط بھی شامل ہیں۔ جو چھیانوے [۹۶] اشخاص کے نام ہیں۔ دل چسپ صورتِ حال یہ سامنے آئی ہے کہ اس صدی میں ستر کی دہائی چھوڑ کر ہر دہائی میں امیر کے مکاتیب شائع ہوئے اور علم وادب کا حوالے بنتے رہے۔ بہت ممکن ہے ستر کی دہائی میں بھی مکاتیب شائع ہوئے ہوں یا ان کے علاوہ بھی کیوں کہ یہ تفصیل ہمارے علم میں آنے والے خطوط کی ہے۔

غیر مطبوعہ مکتوبات کا اجمالی تعارف

امیر کے غیر مطبوعہ مکتوبات کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے اخلاف کے پاس محفوظ ہے۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے میں ایک بیاض کا ذکر کیا ہے۔ جو اسرائیل احمد مینائی (نبیرہ امیر مینائی) کے پاس محفوظ ہے۔ اس بیاض میں ایک سو چالیس [۱۴۰] اردو اور اسی [۸۰] خطوط فارسی کے ہیں (۷۴)۔ ڈاکٹر کریم الدین نے اپنے مقالے میں انسٹھ [۵۹] مکاتیب سے اقتباس پیش کیے ہیں۔ بقیہ خطوط ابھی تک پردہ اخفا پر ہیں۔ اس بیاض کے علاوہ اسمٰعیل احمد مینائی مرحوم (نبیرہ امیر مینائی، مدیر فاران کراچی) نے راقم ناچیز کو امیر کے غیر مطبوعہ مکتوبات کے ذخیرے میں سے سات رجسٹر کی عکسی نقول مرحمت فرمائی تھیں۔ اس نادر اور اہم ذخیرے کا اجمالی تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

رجسٹر نمبر۱ صفحات کی تعداد ۱۷۷۔ **کیفیت اور زمانہ تحریر:**
پہلا خط فارسی میں پنڈت ہری چند، ساکن کہوٹہ، ضلع راول پنڈی کے نام ہے۔

		یہ خط ۲۰/ مارچ ۱۸۰۱ء کا تحریر کردہ ہے۔ رجسٹر نمبر ا میں اردو کا پہلا خط ۱۲/ اپریل ۱۸۰۱ء کا ہے۔ جو شمع بزم سخن ورلی مشتری کے نام ہے۔ جب کہ آخری خط ۱۴/ نومبر ۱۸۸۱ء کا مرقوم ہے۔ یہ شیخ زین العابدین کے نام ہے۔
رجسٹر نمبر	صفحات کی تعداد ۳۳۲۔	پہلا خط فارسی میں ہے۔ یہ محمد میرزا انس، لکھنو کے نام ہے۔ یہ ۲/ فروری ۱۸۸۳ء کا تحریر کیا ہوا ہے۔ جب کہ دوسرا خط ابوالحامد سلطان محمود الجبلی کے نام ہے۔ یہ ۲۲/ فروری ۱۸۸۳ء کا ہے اس رجسٹر کا آخری خط بھی فارسی میں ہے۔ جو ۲۲/ مارچ ۱۸۸۳ء کا ہے۔
رجسٹر نمبر ۳۔	صفحات کی تعداد ۲۵۰۔	پہلا خط منشی طفیل احمد کے نام ہے۔ جو یکم جنوری ۱۸۹۱ء کا ہے جب کہ آخری خط منشی نثار حسین کے نام ہے۔ اس پر تاریخ درج نہیں البتہ اس سے پہلے والے خط پر ۳۰/ اگست ۱۸۹۲ء تحریر ہے۔
رجسٹر نمبر ۴۔	صفحات کی تعداد ۴۰۵	پہلا مکتوب حاجی پیر علی، حیدر آباد، دکن کے نام ہے اس خط پر تاریخ نہیں ہے۔ البتہ دوسرے پر ۷/ ستمبر ۱۸۹۲ء درج ہے۔ اس رجسٹر کا آخری خط منشی اظہر علی، لکھنو کے نام ہے۔ جو ۸/ فروری ۱۸۹۶ء کا تحریر کردہ ہے۔
رجسٹر نمبر ۵۔	صفحات کی تعداد ۲۵۳۔	پہلا خط پنڈت رتن ناتھ سرشار کے نام ہے یہ ۷/ فروری ۱۸۹۶ء کا ہے۔ جب کہ آخری خط ۴/ جمادی الآخر ۱۳۱۴ھ کا ہے۔ یہ حضرت شاہ محمد معصوم نقشبندی مجددی کے نام ہے۔
رجسٹر نمبر ۶۔	صفحات کی تعداد ۲۰۰۔	اس رجسٹر میں پہلا مکتوب یکم جنوری ۱۸۹۷ء کا تحریر کیا ہوا ہے۔ یہ خط منشی عبد الجبار صدیقی، حیدر آباد دکن کے نام ہے۔ جب کہ آخری مکتوب ۱۵/ نومبر ۱۸۹۸ء کا ہے۔ یہ منشی عنایت اللہ روشن بدایونی کے نام ہے۔
رجسٹر نمبر ۷	صفحات کی تعداد ۱۹۶۔	پہلا خط ۳/ جمادی الاوّل ۱۳۱۷ھ کا ہے یہ حاجی محمد عبد الجبار

خاں، بھوپال کے نام ہے۔ جب کہ آخری مکتوب عبدالجبار
خاں، حیدر آباد دکن کے نام ہے۔ یہ خط ۲۰ر جولائی ۱۹۰۰ء کا
تحریر کردہ ہے۔

۱۸۱۳ صفحات میں اندازاً سترہ سو [۱۷۰۰] مکتوبات ہیں ان میں بڑی تعداد مطبوعہ خطوط کی بھی ہے۔ اس ذخیرے میں امیر کے فارسی مکتوبات بھی خاصی تعداد میں ہیں اور ایک قابلِ لحاظ تعداد تلامذہ کے مکتوبات کی بھی ہے۔ یہ تلامذہ دفترِ امیر اللغات میں مختلف حیثیتوں میں کام انجام دیا کرتے تھے۔ یہ خط یکے بعد دیگرے تحریر ہیں اور جگہ جگہ نقل کی صراحت ہے۔ کہیں کہیں کاتب کا نام بھی ملتا ہے۔

راقم ناچیز کو اسمعیل احمد مینائی (نبیرہ امیر مینائی) مرحوم نے دورانِ گفتگو بتایا تھا کہ "ایک زمانے میں امیر مینائی نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو خطوط ارسال کیے جائیں ان کی نقل رکھی جائے چناں چہ یہ مکتوبات ایک رجسٹر میں یکے بعد دیگر تحریر کیے جاتے تھے۔ ہمارے خاندان میں تقریباً تمام رجسٹر محفوظ ہیں۔ اسمعیل احمد مینائی کے اس بیان کی شہادت امیر کے متعدد خطوط سے بھی ملتی ہے۔

امیر ۱۸۹۱ء کے ایک خط میں زاہد حسین کو لکھتے ہیں :

"جب سے دفترِ امیر اللغات کھولا گیا ہے۔ محررانِ دفتر بعض مکاتبات لکھ لیتے ہیں" (۴۸)۔

مذکورہ ذخیرے میں بہت سے مکاتیب مختلف شاگردوں کے ہاتھ سے تحریر ہوئے ہیں۔ امیر مذکورہ مکتوب کی ابتداء میں لکھتے ہیں۔

" تین چار شاگردوں نے کبھی کبھی خطوط کی نقلیں اپنی پسند کے موافق لکھ لیں وہ جا بجا ہیں۔ بعض تحریروں کی نقلیں لڑکوں نے کرلی ہیں" (۴۹)۔

امیر اپنی بیماری اور مصروفیات کے باعث بھی خطوط اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتے تھے۔ جس کا ذکر ان کے مکاتیب میں جا بجا ہے۔

۶ر اگست ۱۸۹۲ء کے ایک مکتوب میں کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ :

"اب دو سطریں لکھیں اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں، کڑوانے لگیں، بصارت بھی کم ہونے لگی" (۵۰)۔

۱۲ر فروری ۱۸۹۳ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں :

"میں ہاتھ کے مرتعش ہونے سے اب اپنے ہاتھ سے کم لکھتا ہوں دست و قلم کے قابو میں نہ ہونے سے لکھنے میں دیر بھی ہوتی ہے۔ اور خط بھی بدنما ہوتا ہے۔ جی بھی گھبراتا ہے یہی وجہ ہے کہ جلیل و آہ سلمہا اللہ سے لکھوا دیا کرتا ہوں کلام بھی انھیں لوگوں سے سنتا ہوں اور جو کچھ بتاتا ہوں یہی لوگ لکھ دیتے ہیں" (۵۱)۔

(ممتاز علی آہ)

زاہد حسین زاہد کے نام ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۵ء کے خط میں اسی قسم کی معذوری لکھتے ہیں :

"بسببِ پیرانہ سالی میرے ہاتھ میں رعشہ ہو گیا ہے۔ جس سے لکھنا مجھ سے چھوٹ گیا ہے۔ بہ مجبوری دوسرے کے قلم سے لکھواتا ہوں۔ اگرچہ قلم میرا نہیں ہوتا مگر زبان میری ہوتی ہے" (۵۲)۔

امیر کے تلامذہ کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ امیر اپنے ہاتھ سے انھیں خط لکھیں لیکن لغت کے کام اور بیماری کے باعث ان سے معذرت کر لیا کرتے تھے۔ یا پھر بے حد اصرار پر چند سطور اپنے ہاتھ سے لکھ دیا کرتے تھے۔ بشیر ملیح آبادی کے نام خط میں اسی قسم کی صورتِ حال کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ ۱۹ر جون ۱۸۹۴ء کے خط میں رقم طراز ہیں :

"میرا خود جی چاہا کرتا ہے کہ آپ کو بالتخصیص اپنے ہاتھ سے خط لکھا کروں مگر رعشے نے مجبور کر دیا ہے۔ چار سطر بھی لکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اب آپ نے بنظر قدردانی فرمائش کی ہے تو انشاء اللہ کسی دن قصد کروں گا اور ممکن ہوا تو چند سطر ضرور لکھوں گا" (۵۳)۔

الغرض امیر اپنے مکتوبات میں متعدد جگہ اپنی بیماری کے باعث اپنے ہاتھ سے خط نہ لکھنے کی وضاحت کرتے ہیں (۵۴)۔ شاید اسی لیے امیر تفصیلی خطوط لکھنے سے گریز کیا کرتے تھے اگر کسی سے ضروری کام نکلوانا مقصود ہو یا شاگرد بے حد اصرار کرتے تو چند سطور یا کبھی کبھی طویل خط بھی لکھ دیا کرتے تھے ورنہ تفصیلی خط عموماً ان کے صاحبزادے محمد احمد مینائی، لطیف احمد مینائی یا پھر ان کے تلامذہ ممتاز علی آہ اور جلیل مانک پوری لکھا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان چاروں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بکثرت خطوط اس ذخیرے میں موجود ہیں۔ مولوی محمد حسن خاں شاداب کو ۱۹ر ربیع الآخر ۱۳۰۹ھ کے مکتوب میں ایک داخلی شہادت مذکورہ گفتگو کے حوالے سے ملتی ہے۔

"کم فرصتی میں یہ چند سطریں لکھیں اور مکرمت نامہ عالی محمد احمد کو دے دیا غالباً وہ کچھ لکھیں گے" (۵۴)۔

مولوی محمد اعجاز حسین خاں کو ۱۵ر جولائی ۱۸۹۳ء کے مکتوبات میں لکھتے ہیں "اور باتوں کا جواب نورِ چشم ممتاز علی دیں گے" (۵۵)۔

اسی نوعیت کی معلومات امیر کے متعدد مکاتیب میں ملتی ہیں (۵۶)۔

اس نادر ذخیرے میں بہت سے خطوط نامکمل ہیں۔ اس طرح بہت سے مکاتیب کے عکس انتہائی ناقص ہیں پھر ایک ستم یہ ہوا کہ مکاتیب کو اسپائرل جلد کے ذریعے یک جا کیا گیا ہے۔ جس کے لیے کاغذ کے ایک طرف سوراخ کیے گئے ہیں۔ جن میں احتیاط نہیں برتی گئی۔ اور کاغذ کے کنارے کی عبارت سوراخ ہو جانے کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔ صفحات کی بے ترتیبی کا مسئلہ اس کے علاوہ ہے۔ مکاتیب کے ان رجسٹروں میں متعدد جگہ زمانی تسلسل ٹوٹا ہوا ہے۔ درمیانی عرصے کے مکتوبات کے بارے میں قیاس ہے کہ اخلاف کے پاس محفوظ ہیں۔ اس بات کی قوی امید ہے کہ ان شاء اللہ جلد مل جائیں گے۔

امیر کے یہ مکتوبات تلامذہ، نوابین، معروف علماء و فضلاء اور قابلِ ذکر شعراء وغیرہم کے نام ہیں۔ خاص کر جلال لکھنوی، داغ دہلوی، رتن ناتھ سرشار، صفی لکھنوی، صفیر بلگرامی، نواب عالم گیر محمد خان، نواب علاؤالدین خاں لوہارو، احسن مارہروی، شاد عظیم آبادی، نواب کلب علی خاں، وسیم خیر آبادی، ریاض خیر آبادی، ممتاز علی آہ اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی تو بہت نمایاں ہیں۔

امیر کے یہ مکاتیب اردو زبان و ادب کی تاریخ کا اہم سرمایہ اور امیر کی شخصیت کا آئینہ ہیں جن میں ان کی زندگی کا ایک مربوط زمانی تسلسل ملتا ہے۔ ان کے اسفار، خاندان کے حالات، دوستوں سے تعلقات، معاصرین سے روابط، تلامذہ سے سلوک، والیانِ رام پور سے مراسم، ذاتی تصانیف کی روداد، امیر اللغات کے سلسلے میں پریشانیوں، احباب سے شکوے و شکایت کا احوال اور معاصرانہ چشمکوں کی بصیرت افروز صورتِ حال ملتی ہے۔ ان کے یہ خطوط انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ فنِ عروض اور قواعد، زبان و معانی وغیرہ پر کام کرنے

والوں کے لیے بھی قابلِ لحاظ مواد فراہم کرتے ہیں۔

امیر کے ان مکتوبات کی اہمیت کے پیشِ نظر ہمارے علماء اور فضلا نے نہایت عالمانہ مضامین و مقالات قلم بند کئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے خواجہ احمد فاروقی کا نام آتا ہے۔ جن کا پہلا مضمون رسالہ "اردو"، جنوری ۱۹۴۷ء میں جب کہ دوسرا ماہ نامہ "آج کل"، دہلی، اپریل ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ ان مضامین میں حیاتِ امیر کے متعدد گوشوں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ مکاتیبِ امیر کے خاص علمی و ادبی رنگ کو پیش کیا گیا ہے۔

۱۹۶۳ء میں کسریٰ منہاس کا مضمون "نقوش" لاہور میں شائع ہوا۔ فاضل مضمون نگار نے جس تحقیقی اور تنقیدی انداز سے امیر کے خطوط پیش کیے ہیں اس سے ادب میں امیر کے مکاتیب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف امیر کے لسانی شعور کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے بلکہ مکتوبات کو نئے انداز سے تحقیق کے عمل سے گزار کر پیش کرنے کا شعور بھی ملتا ہے۔

اس کے بعد موجودہ دور کے نامور محقق اور نقاد رشید حسن خاں کا نام آتا ہے۔ آپ کا عالمانہ مضمون ۱۹۶۴ء سے سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور میں پانچ اقساط کی صورت میں شائع ہوا۔ رشید حسن خاں اس مضمون میں امیر کے مکاتیب میں تراکیب مہند کے استعمال، جملوں کی ساخت، تراکیب، محاورات، صنعتوں کے استعمال، تذکیر و تانیث، قواعد عروض وغیرہ پر نہایت محققانہ نگاہ ڈالی ہے اور ضروری حواشی بھی قلم بند کیے ہیں۔ امیر کی چھے سوانح عمریاں (۵۷) اور ان پر لکھے گئے دو پی۔ایچ۔ڈی۔ کے مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں (۵۸)۔ ان سب میں مکتوباتِ امیر کی اہمیت پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ رشید حسن خاں کا کام نمایاں اور برتر ہے۔

یہ تمام جائزہ امیر کے مطبوعہ خطوط کے حوالے سے تھا۔ مکتوباتِ امیر کا غیر مطبوعہ حصہ جو ابھی تک دنیائے ادب کے سامنے نہیں آیا۔ جو ان مطبوعہ مکاتیب سے کئی گناہ زیادہ ہے۔ نہایت بھرپور علمی و ادبی ذخیرہ ہے۔ مکاتیب کا غیر مطبوعہ ذخیرہ امیر مینائی کی زندگی کے شخصی پہلوؤں سے متعلق کثیر معلومات کا حامل ہے۔ اس کا تجزیہ کر کے امیر کی زندگی کی ایک تفصیلی روداد مرتب کی جاسکتی ہے۔

امیر ہماری اردو شاعری، تذکرہ نگاری اور لغت نویسی کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے دینی بزرگ بھی ہیں۔ بقول مولانا امتیاز علی خاں عرشی:

> "اگر وہ شاعری کی طرف نہ آتے اور دینی اور روحانی کاموں ہی کی طرف متوجہ رہتے تو شاعری میں ان کے شاگردوں سے کہیں زیادہ تعداد مریدوں، معتقدوں کی ہوتی" (۵۹)۔

اس پہلو سے بھی حیاتِ امیر کا ایک گوشہ سامنے آتا ہے وہ حضرت شاہ میناؒ لکھنوی کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے روابط تصوف کے دیگر سلسلوں کے بزرگوں سے بھی تھے۔ مثلاً جو ذخیرہ اس وقت بہ صورتِ عکس میری دسترس میں ہے اس میں حضرت شاہ محمد معصوم نقشبندی مجددی، حیدر آباد دکن، حضرت شاہ التفات چشتی، بریلی کے علاوہ کھوڑہ راول پنڈی کے نقشبندی مجددی بزرگوں کے نام بھی متعدد خطوط ہیں۔

اب میں فارسی مکتوبات کی طرف آتا ہوں جو غیر مطبوعہ ذخیرے میں موجود ہیں۔ اردو مکتوبات کی طرح امیر کے فارسی خطوط بھی نہایت توجہ طلب اور غور طلب ہیں وہ امیر کی فارسی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ تو ہیں ہی اس کے علاوہ مفید اور موثر علمی نکات بھی رکھتے ہیں اس

کے علاوہ متعدد فارسی اور اردو رباعیات، قطعات اور اصلاح کے نمونے ہیں۔ مکتوباتِ امیر کے مطالعے سے امیر کی بیشتر تصانیفات اور تالیفات کا بھی پتا چلتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر کی جس قدر چیزیں شائع ہوئی ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ غیر مطبوعہ ہیں۔

الغرض مکتوباتِ امیر معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہیں ان مکتوبات کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو مفید علمی نکات کا ایسا قابلِ ذکر خزانہ ملے گا جو یقیناً ہماری ادبی تاریخ میں اہم اضافہ ہوگا اسی لیے مکتوباتِ امیر علمی طور پر نہایت قابلِ ذکر اور قابلِ توجہ ہیں۔

حوالے

(۱) خواجہ احمد فاروقی کے بقول "سرور نے بے خبر اور غالب سے بھی پہلے ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیان اردو میں خطوط لکھنا شروع کر دیے تھے"۔ (اردو کے مکتوباتی ادب پر ایک نظر، ماہ نامہ "آج کل"، دہلی، اپریل ۱۹۵۴ء، ص ۴)۔

(۲) ماہ نامہ "آج کل"، دہلی، اپریل ۱۹۵۴ء ص ۶۔

(۳) سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، انتیسواں شمارہ، اکتوبر ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۔

(۴) احسن اللہ ثاقب: "خطوط منشی امیر احمد"، علی گڑھ، اردو پریس، ۱۹۱۰ء، ص ۱۴۵۔

(۵) ایضاً، ص ۱۳۵۔

(۶) ایضاً۔

(۷) ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ: "ان کے خطوط میرے پاس بھی تھے مگر افسوس ہے کہ بار بار مکان سکونت کے تبدیل کرنے میں اسباب منتقل سے کہیں خط گم ہو گئے۔ ("امیر مینائی"، ادبی پریس، لکھنو، ۱۹۴۱ء ص ۳۰۳)

(۸) "نقوش" مکاتیب نمبر، شمارہ نمبر ۶۵۔۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۵۔

(۹) "خطوط منشی امیر احمد"، ص ۱۴۵۔

(۱۰) شمارہ فروری مارچ، ۱۹۰۷ء، ص ۲۶ تا ۳۰۔

(۱۱) "مطالعہ امیر"، نسیم بک ڈپو، لکھنو، ۱۹۶۴ء، ص ۳۸۹۔

(۱۲) ملاحظہ کیجیے حوالہ نمبر ۱۰۔

(۱۳) اردو پریس، علی گڑھ ۱۹۱۰ء۔

(۱۴) مرتب: صفدر مرزاپوری، نول کشور، لکھنو، ۱۹۲۰ء، ص ۱۹ تا ۳۴۔

(۱۵) مرتب: احسن اللہ ثاقب، طبع دوم، مطبعہ ادبیہ، لکھنو، ۱۹۲۴ء۔

(۱۶) مطالعہ امیر، ص ۳۸۹۔

(۱۷) سہ ماہی "صحیفہ"، انتیسواں شمارہ، ص ۱۴۔

(۱۸) مرتب صفدر مرزاپوری: دار اشاعت، صدیقی بک ڈپو، لکھنو، ۱۹۲۷ء، ص ۲۶ تا ۳۱۔

(۱۹) حامد حسن قادری، "داستان تاریخ اردو" میں رقم طراز ہیں کہ : مولوی عزیز اللہ خاں رام پوری مرحوم نے غالباً ۱۹۲۷ء میں ریاست رام پور سے "نیرنگ" جاری کیا۔ گھر کا چھاپہ خانہ ان کے والد مغفور سعید اللہ خاں صاحب عیش رام پوری کا قائم کردہ مطبع سعیدی موجود تھا۔۔۔۔ان کے فرزند رشید عزیز اللہ خاں نے 'نیرنگ' علمی و ادبی شان کے ساتھ جاری رکھا۔ بعض خاص نمبر بڑے اہتمام سے شایع کیے جن میں میر نمبر اور امیر نمبر ممتاز ہیں۔(اردو اکیڈمی سندھ، کراچی چوتھا ایڈیشن، ص ۴۰۸)۔

(۲۰) مطبوعہ فروری مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۳ تا ۱۱۴۔

(۲۱) "داستان تاریخ اردو"، ص ۴۰۷۔

(۲۲) خطوط منشی امیر احمد، ص ۱۲۶۔

(۲۳) ادبی پریس، لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۳۰۳ تا ۳۰۹۔ صفحہ ۳۱۰ اور ۳۱۱ کے درمیان خط کا عکس بھی ہے۔اس کے علاوہ ایک خط جس پر تاریخ نہیں ہے۔ آہ نے رواں عبارت میں شامل کیا ہے۔

(۲۴) سہ ماہی صحیفہ، لاہور، انتیسواں شمارہ، ص ۱۵۔

(۲۵) اگست ۱۹۵۰ء، ص ۳۴ تا ۳۵۔

(۲۶) ماہ نامہ "نگار"، پاکستان، کراچی، نومبر، ۱۹۵۰ء، ص ۳۶۔

(۲۷) سید رفیق مارہروی : مرتب "زبانِ داغ" (مجموعہ مکاتیب) لکھنو، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد ص ۱۲۷۔

(۲۸) شمارہ نمبر ۶۵۔۶۶، نومبر، ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۴ تا ۱۲۹۔

(۲۹) ص ۲۶ تا ۳۱۔

(۳۰) ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، "صہبائے مینائی"، ڈھاکہ، مکتبہ عارفین، ص ۲۷۰۔

(۳۱) شمارہ نمبر ۱۰۹، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ص ۴۶۔

(۳۲) "صہبائے مینائی"، ص ۲۶۵ تا ۲۷۳۔

(۳۳) شمارہ نمبر ۷۹۔۸۱، اپریل ۱۹۶۰ء، ص ۵۸۹ تا ۵۹۱۔

(۳۴) شمارہ نمبر ۴، ۱۹۶۲ء، ص ۲۲ تا ۴۱۔

(۳۵) شمارہ یکم نومبر، ۱۹۶۳ء، ص ۸ تا ۹۔

(۳۶) سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، انتیسواں شمارہ، اکتوبر، ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۔

(۳۷) شمارہ نمبر ۱۰۹، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، صفحات نمبر : ۴۶۔۳۳۶۔۴۲۳ تا ۴۲۵۔

(۳۸) ص ۲۶۹۔

(۳۹) محمد نعیم الحق آزاد شیخ پوری : "حیات الشعراء" میرپور خاص، سندھ، بلدیہ میرپور خاص، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵۲ تا ۲۷۱۔

(۴۰) ڈاکٹر کریم الدین احمد : "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء۔

(۴۱) ایضاً ص ۱۲۷ تا ۱۲۶۔

(۴۲) ایضاً، ص ۲۷۔

(۴۳) آسی غازی پوری: عین المعارف، کراچی، مکتبہ رضویہ، ۱۹۸۸ء، ص ۷۰۔

(۴۴) شعبہ جاتی مجلہ "تحقیق"، شعبہ اردو، جامعہ سندھ، شمارہ ۳، ۱۹۸۹ء، ص ۳۶۹ تا ۴۰۵۔

(۴۵) ایضاً، شمارہ ۵، ۱۹۹۱ء، ص ۲۳۲ تا ۲۳۳۔

(۴۶) ایوان امیر مینائی، کراچی، ۱۳/ اکتوبر، ۲۰۰۰ء، ص ۶ تا ص ۸۔

(۴۷) دیکھیے حوالہ نمبر ۴۲۔

(۴۸) مکاتیبِ امیر مینائی ص ۱۶۵۔

(۴۹) ایضاً

(۵۰) ایضاً، ص ۱۲۸۔

(۵۱) ایضاً، ص ۱۸۲۔

(۵۲) ایضاً، ص ۲۱۲۔

(۵۳) ایضاً، ص ۳۴۱۔

(۵۴) ایضاً، ص ۳۳۱۔

(۵۵) ایضاً، ص ۳۱۵۔

(۵۶) ملاحظہ کیجیے صفحات نمبر: ۱۲۹، ۱۴۸، ۲۹۳، ۳۲۱۔

(۵۷) (الف) سجاد علی شاہ مینش حیدر آبادی: "یادگار امیر مینائی"، دہلی، مطبع رحمانی، ۱۹۰۳ء۔

(ب) جلیل مانک پوری: "سوانح امیر مینائی"، حیدر آباد دکن، مطبع سیدی، ۱۳۸۷ھ۔

(ج) ممتاز علی آہ: "امیر مینائی"، طبع اوّل، لکھنؤ، ادبی پریس ۱۹۴۱ء۔

(د) امیر احمد علوی: "طرہ امیر"، طبع اول، لکھنو، انوار المطابع، ۱۹۲۸ء۔

(ہ) سید عبدالحکیم حکمت: "دبدبہ امیری"، پٹنہ، برقی مشین پریس، ۱۹۳۷ء۔

(ھ) آفتاب احمد صدیقی: "صہبائے مینائی"، طبع اول، ڈھاکہ مکتبہ عارفین، سنہ ندارد۔

(۵۸) (الف) ڈاکٹر ابو محمد سحر: "مطالعہ امیر"، لکھنو، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء۔

(ب) ڈاکٹر کریم الدین احمد: "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء۔

(۵۹) ماہنامہ "معیار" میرٹھ، تنقید نمبر مرتبہ نجم الاسلام (ڈاکٹر) ۱۹۵۴ء، ص ۱۴۵۔

☆☆☆

باب دوم

مکتوباتِ امیر میں لسانی تصریحات

امیر مینائی کا شمار اردو کے ان صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے جن کی علمیت و قابلیت کا شمار آسان نہیں ہے۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر زبان اور لغت نویس بھی تھے۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو زبان پر ید طولیٰ حاصل تھا۔

امیر کو دبستان لکھنؤ اور دہلی کی شاعری اور زبان کے مسائل کا گہرا ادراک تھا۔ چناں چہ انھوں نے اپنی اس صلاحیت کا نمونہ "امیر اللغات" کی صورت میں پیش کیا۔ یہ ایک جامع لغت ہے جس میں دہلی و لکھنؤ کی زبان، محاورات اور دیگر باریکیوں کو نہایت محققانہ نظر سے گزار کر پیش کیا گیا ہے۔ بقول علامہ نیاز فتح پوری:

> "حقیقت یہ ہے کہ زبان کی صحت، لغت کی تحقیق، محاورے کے استعمال، الفاظ کی بندش اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے وہ بڑے زبردست استاد تھے" (۱)۔

امیر کا شمار اردو کے حوالے سے ان معدودِ چند اشخاص میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی بے پناہ علمیت سے پورے ایک دور کو متاثر کیا۔ ان کے سیکڑوں شاگرد تھے جنھوں نے امیر کے علمی و ادبی خیالات کو اردو میں رواج دیا۔ یوں امیر کا سلسلہ تلمذ پھیلتا ہی گیا یہی نہیں بلکہ ان کے بہت سے شاگرد بھی صاحبِ سلسلہ استاد قرار پائے۔ ادبی تاریخ میں جلیل مانک پوری، ریاض خیر آبادی، وسیم خیر آبادی، دل شاہجہاں پوری، زاہد سہارنپوری، کوثر خیر آبادی، مضطر خیر آبادی، جگر بسوانی، حفیظ جون پوری، عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، حبیب الرحمان خاں شروانی بلاشبہ اپنی دور کے بڑے مرتبے کے اہلِ علم شمار کیے جاتے ہیں۔ کسریٰ منہاس لکھتے ہیں:

> "امیر مینائی انیسویں صدی کے آخری دور میں استادی کے اس مرتبے پر فائز تھے جن سے طالبانِ فن ہر روز شعر و سخن کے متعلق ان کے خیالات سے استفادہ کرنا عین سعادت خیال کرتے تھے" (۲)۔

اس باب میں ہم امیر کے علمی جوہر ان کے مکاتیب سے چن کر استفادے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ زبان سے متعلق یہ خیالات ان مکاتیب میں ملتے ہیں جو امیر نے اپنے تلامذہ کو تحریر کیے۔ اس باب میں سب سے پہلے لسانی مسائل سے متعلق امیر کے خیالات پیش کیے جائیں گے۔ پھر تذکیر و تانیث، اصلاحِ سخن، لغت کے مسائل اور اس کے بعد بلاغت کے عنوان کے تحت دیگر افادات درج کیے جاتے ہیں۔

(۱)

۱۔ "ایک ضرب المثل کی سند"

> **پتھر اپنی جگہ بھاری ہے کلام میں میری نظر سے نہیں گزرا مگر اکثر فصحائے دہلی کو میں نے بولتے ہوئے سنا ہے۔ خیال رکھوں گا، اگر کہیں کلام میں پاؤں گا تو سند بھیجوں گا" (۳)۔**

یہ دہلوی محاورہ ہے۔ داغ کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ایک شعر میں یہ محاورہ باندھا تھا۔ ۱۸۹۱ء کا ایک خط جو امیر کے نام ہے۔ داغ لکھتے ہیں:

"بندہ پرور، پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے یہ محاورہ میں نے باندھا، آپ سے داد طلب ہوں، یہ خیال تھا کہ میرا کوئی حریف پہلے ہی لے اڑا ہو۔ میری نظر سے نہیں گزرا" (۴)۔

داغ کا وہ شعر جس میں مذکورہ محاورہ باندھا گیا ہے۔ ان کے مطبوعہ داوین میں نہیں ہے۔

۲۔ "سری اور پیکان"

"سری" تیر کے ڈانڈ کو کہتے ہیں "پیکان" کو نہیں کہتے۔ "پیکان" کو کانسی کہتے ہیں۔

لکھتا ہوں وصفِ مژگاں ، ترکش ہوا قلم داں
نوک قلم ہے پیکاں، نامے قلم سری ہے" (۵)۔

مولف "فرہنگ آصفیہ"، "سری" کے لیے لکھتے ہیں "تیر کا گزر، خدنگ" انھوں نے بھی ناسخ کا مذکورہ شعر سند میں دیا ہے (۶)۔

جب کہ "پیکان" کے لیے لکھتے ہیں "نیزہ کی نوک، بھال، تیر یا برچھی کی انی" (۷)۔

ناسخ کا مذکورہ شعر ان کے کسی دیوان میں نہیں ملتا البتہ "کلیاتِ ناسخ"، جلد اول مرتب یونس جاوید، میں یہ شعر ملتا ہے۔

ہر غنچۂ گلِ فرقتِ جاناں میں ہے پیکاں
ہر شاخ میں عالم نظر آتا ہے سری کا (۸)

۳۔ "تذکیر و تانیث اور امالہ"

"تشریف بہ معنی 'خلعت' نہ بول چال میں ہے نہ میں نے کسی کے کلام میں ایسے عنوان سے دیکھا کہ تذکیر و تانیث اس سے معلوم ہو۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ اس کو مذکر سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ جس لفظ کی تذکیر و تانیث کا پتا نہ لگے یعنی بول چال میں نہ ہو اور اساتذہ نے بھی تذکیر و تانیث کو ثابت نہ کیا ہو، تو اس کو اس لفظ کا حکم دینا چاہیے جو ان معنی میں مشہور ہو۔ یہی حال تشریف بہ تذکیر کا ہے۔ یعنی چوں کہ 'خلعت' بہ تذکیر مستعمل ہے تو اس کو بھی مذکر سمجھنا چاہیے۔

میر نے 'حوالہ' اور ذوق نے 'خامہ' جن شعروں میں کہا ہے وہ ان کے استعمال کے اعتبار سے نہایت غیر فصیح ہے۔ 'خامے' اور 'حوالے' بولتے ہیں (۹)۔

"فرہنگ آصفیہ" میں "تشریف" کو اسم مونث لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس لفظ کے معنی یہ لکھتے ہیں :

"شرف، بزرگی، عظمت، عزت [۲] تعظیم و تکریم (۳ف) خلعت، اعزازی لباس جو بادشاہ یا کسی رئیس کی طرف سے مرحمت ہو + خلعتِ فاخرہ، وہ لباس جو حکام ماتحتوں کو امتیاز کے لیے پہنائیں" (۱۰)۔

"مولف" "فرہنگ آصفیہ" نے بھی کسی کلام سے اس کی سند نہیں دی ہے۔

۴۔ ''شگفانند''

غنچہارامجمن بہر چہ سے ''شگفانند'، میں کاف کا سکون بے تکلف جائز، بلکہ فصیح ہے۔ البتہ مثال اس وقت یاد نہیں''(۱۱)۔

''شگفانند''بسکون کاف فارسی کی سند تلاش کرنے کا خیال رہا مگر ہنوز نہ ملی''(۱۲)۔

۵۔ ''شنوا''

''شنوا بسکون کہاں ہے یہ تو میں نے کہیں نہیں دیکھا بحر کت نون ہی چاہیے''(۱۳)۔

''شنوا بسکونِ نون اگر کلام میں ہو تو بدل دیجیے''(۱۴)۔

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں ''شنوا''بسکونِ نون کی مثال میں قائم چاندپوری کا یہ شعر درج کیا ہے :

گوشِ شنوا جب بہم پہنچا نہ کوئی یاں تو آہ
لے گئے ہم ساتھ اپنے وہ جو دل بات تھی '' (۱۵)۔

۶۔ ''بعد''

بعد کے ساتھ لفظ''میں''کا لانا خلافِ فصاحت ہے''(۱۶)۔

۷۔ ''ہو''

''ہو''کی جگہ ''ہووے''یا''ہوئے''اگلی زبان ہے''(۱۷)۔

جلال لکھنوی نے ''قواعد المنتخب ''میں لکھا ہے کہ :۔

''یہ جو آئے، جائے، پائے، کھائے، لائے، وغیرہ یا روئے، دھوئے، سوئے وغیرہ میں کبھی بجائے ہمزہ واؤ بھی بولتے ہیں اور لکھتے ہیں، یعنی آوے، جاوے، پاوے، رووے، سووے، دھووے، مولف کے عندیہ میں نہایت غیر فصیح بلکہ غیر صحیح ہے۔ اور ''ہو'' جو باش یا باشد کا ترجمہ ہے اس کے بعد تو واؤ اور ی دونوں کے لانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کہ فقط ہو پر مدعا تمام ہو جاتا ہے۔ اور ''واؤ'' ،''ی''زائد ٹھہرتے ہیں۔ جیسا کہ اس شعر میں :

گل وہ کھاؤں کہ چمن محو تماشا ہووے
دیکھنے کا اسے کچھ ذوق تو پیدا ہو وے

یہاں ''ہو'' کے آخر میں واؤ اور ی کے بڑھانے کی کچھ حاجت نہ تھی مطلب ہو ہی پر تمام ہو گیا تھا۔ پس یہی وجہ ہے کہ ہووے کو متاخرین نے ترک کر دیا ہے۔ ہر گز اپنے کلام میں ''ہووے'' نہیں لاتے۔ اور یہ جو ''ہو'' کے آخر میں کبھی ہمزہ اور ''ی'' بڑھا کر ''ہوے ''بولتے ہیں بلکہ شعراء روئے، سوئے، دھوئے وغیرہ کا قافیہ بھی گردانتے ہیں۔ یہ مؤلف کے نزدیک زوائد میں کہنا، محض غلط ہے''(۱۸)۔

۸۔ ''مثال و ممثل لہ کی عدم مطابقت''

مثال و ممثل لہ، کی عدم مطابقت کا جزئیہ جس محاورے میں آپ نے لکھا ہے وہ محاورہ یہ ہے۔

''آئینے میں منہ کو دیکھو''

اور مثال میں یہ ہے :''آئینے میں تو دیکھ حال اپنا''

بے شک ظاہری الفاظ عدم تطبیق پر دلالت کرتے ہیں۔ مگر تعمقِ نظر سے مغزِ سخن پر اگر غور کیا جائے تو ظاہری مخالفت اٹھ جائے اس لیے کہ :''آئینے میں منہ تو دیکھو، کا مطلب یہ ہے کہ دیکھو تمھارا حال کیا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منہ کی جگہ صورت و شکل بہ سبب درست نہیں اور یوں بھی کہتے ہیں کہ :

''ذرا آئینہ تو دیکھو''

بہر کیف مقصود یہی ہے کہ اپنی تغیر حالت پر نظر کرو اس صورت میں بالکل مثال و ممثل لہ میں تفاوت نہیں ہے''(۱۹)۔

۹۔ ''ڈھونڈتا''

''ڈھونڈتا ہے'' کی جگہ ''ڈھونڈے ہے''اب زبان نہیں ہے قدما کہتے ہیں۔ متاخرین نے ترک کر دیا ہے''(۲۰)۔

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب ''منشورات'' میں متروکات پر نہایت مدلل بحث کی ہے (۲۱)۔جب کہ ''کیفیہ'' میں انھوں نے چار بنیادی اصول پیش کیے ہیں :

۱۔ ''ایک لفظ مدت سے اردو میں مستعمل ہے۔اب جو اسے ترک کیا جاتا ہے تو کس بنا پر ؟اس کے خلاف کون سی نئی باتیں پیدا ہو گیں اور اس معنی اور موقع کا کون سا بہتر لغت مل گیا۔

۲۔ وہ کون شخص یا اشخاص ہیں جو الفاظ کو متروک قرار دینے کے اہل ہیں۔

۳۔ جو الفاظ متروک بتائے جاتے ہیں آیا وہ اردو زبان سے نکال دیے گئے ہیں یا صرف اردو نظم سے ؟اگر صرف نظم سے خارج کیے گئے ہیں تو اس اخراج کا اطلاق محض غزل اور عاشقانہ شاعری پر ہے یا نئے طرز کی شاعری پر بھی۔

۴۔ اس بناء پر کوئی لفظ متروک نہیں قرار دیا جا سکتا کہ ایران یا عرب میں جہاں سے وہ کبھی آیا تھا اس کے یہ معنی تھے۔یہ جنس یا یہ تلفظ تھا۔ جو لفظ اردو میں آگیا وہ اب اردو کے قاعدے اور ضابطے کا پابند ہو گا اس کو اپنے ماخذ سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا(۲۲)۔

علامہ کیفی مزید راقم طراز ہیں کہ :۔

اب یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لفظوں کو جو نیچے دیے جاتے ہیں۔ متروک کہنا واجب ہے۔

ان میں بہت سے داغ اور امیر کے آخری دیوانوں میں اور دوسرے ثقات کے کلام میں آچکے ہیں۔ شاعر ہی جانتا ہے کہ ان کی ضرورت کہاں پڑتی ہے۔

پہ (= پر، اوپر) تلک (= تک) بتلانا، سکھلانا، دکھلانا۔ یاں (= یہاں) واں (= وہاں) پنھانا (= پہنانا) پر (= مگر) گر (= اگر) لیجو (= لیجیے) سدا (= ہمیشہ) دکھنا (= دکھائی دینا) سندیسا (= خیر خبر) پانسو (= پانچ سو) ورے (= پرے) ورلا، = پرلا"۔

فراق نے اپنی کتاب "اردو کی عشقیہ شاعری" میں اسی سلسلے میں ایک نہایت عمدہ بات لکھی ہے :۔

"ہندی یا اردو فعل کی ایک قدیم صورت ایسی تھی جو مذکر و مونث دونوں کے لیے آتی تھی جیسے "آئے ہے" یا "آوے ہے" •••وغیرہ، جن کی جگہ پر اب "آتی ہے" یا "آتا ہے"......وغیرہ کہتے ہیں اس قدیم شکل میں واحد و جمع بھی صرف ہے 'کو' ہیں کر دینے سے بن جاتا تھا"۔

ولی دکنی کا یہ شعر سنیے جس پر مہذب دنیا کی مہذب سے مہذب شاعری وجد کرے گی اور جس میں محبوب کے بارے میں یہ کھلتا ہی نہیں کہ وہ امرد ہے یا عورت :

ولی اس گوہر کانِ حیا کا واہ کیا کہنا
مرے گھر اس طرح آوے ہے جیوں سینے میں راز آئے (۲۳)

رشید حسن خاں فراق کے بیان پر رائے دیتے ہوئے رقم طراز ہیں :

فراق نے جس ابہام کی طرف اشارہ کیا ہے، اس ابہامِ رنگین کے علاوہ عام صورتوں میں بھی ایسے افعال بہت لطف دے جاتے ہیں۔ قدما نے بھی جہاں ان کو استعمال کیا ہے، وہاں کسی قسم کی عدم فصاحت کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً : ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی (غالب) آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب (غالب)۔ آج کل ایسے افعال کو بے تکلف نظم کیا جاتا ہے، خصوصاً ردیف میں۔ خود فراق نے ان کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے، مثلاً ان کی وہ غزل جس کا ایک قابلِ ذکر شعر یہ ہے :

جو بے خواب رکھے ہے تا زندگی
وہی غم کسی دن سلا جائے ہے

ایک نسبتاً نئی شاعرہ (خانم ممتاز مرزا) کے یہ دو شعر دیکھیے، ردیف نے کیا حسن پیدا کیا ہے :

کیا قیامت ہے کہ راہِ عشق میں ہرگام پر
منزلوں کا فاصلہ کچھ اور بڑھتا جائے ہے
اس شبِ تاریک میں تنہا ہوں میں، تنہا ہوں میں
کوئی جگنو، کوئی تارا، جی بہت گھبرائے ہے " (۲۴)۔

رشید حسن خاں کی اس ساری بحث کو کیفی کے اصولوں پر رکھ دیکھیں تو یہ رائے بنتی ہے کہ ڈھونڈے یا اس قبیل کے دوسرے الفاظ اردو زبان سے نکالے نہیں گئے ہیں۔ یہ لفظ ایک زمانے تک اردو میں رائج رہے ہیں پھر اس کی بہتر صورت مل گئی تو شعراء نے استعمال ترک کر دیا۔ لیکن ظاہر ہے شاعر جانتا ہے کہ اس سے شعر میں زیادہ حسن پیدا ہوتا ہے تو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

امیر کا ایک اصول یہ بھی تھا جس کا اعادہ انھوں نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے کہ اچھا معلوم نہ ہو تو استعمال نہ کیجیے۔ گویا یہ حسنِ معملا ذوق کی بات ہے۔ موجودہ زمانے میں وہ الفاظ جن کو متاخرین نے ترک کر دیا تھا اگر استعمال ہوتے ہیں تو ہمارے خیال میں بطور جدت ہے کسی قاعدے کے مطابق نہیں۔

۱۰۔ "خورونوش"

"نوش کا قافیہ خوب کہا ہے۔ سبحان اللہ ۰۰۰ خورونوش مستعمل ہے فقط نوش اس محل پر زبان نہیں ہے۔ اور کوئی عیب نہیں مضمون اچھا ہے اور معنا درست ہے۔ لہذا رہنے دیا جائے" (۲۵)۔

امیر کا یہ بیان زاہد حسین زاہد کے درج ذیل شعر پر ہے۔

روزی گرے پڑوں کو پہنچتی ہے ان کے گھر
ہے میرے آبلوں کا لہو نوشِ نقشِ پا (۲۶)۔

امیر کے اس شعر پر مولانا سید جمیل احمد جمیل سہسوانی (شاعر دربار بھوپال) صفدر پوری کے نام ایک خط میں اعتراض کرتے ہیں:

"منشی صاحب نے اس شعر کی تعریف فرمائی اور کچھ اصلاح نہ دی لیکن میرا خیال ہے کہ آبلوں میں لہو نہیں ہوتا پانی ہوتا ہے" (۲۷)۔

ہمارے خیال میں اس شعر میں اصلاح کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی لیے امیر نے اصلاح نہیں دی۔ شعر معنوی اور صوتی اعتبار سے نہایت بھرپور ہے، معترض کا یہ کہنا کہ "آبلوں میں لہو نہیں ہوتا پانی ہوتا ہے"۔ درست ہے۔ لیکن آبلوں میں پانی کا ہونا ابتدائی مرحلہ ہے۔ پانی کی نیچے کی جلد جب پھٹ جاتی ہے تو پھر پانی کی جگہ خون بھر جاتا ہے۔ آبلوں میں خون کا ہونا مرض کی شدت اور تکلیف کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے امیر کی یہ رائے درست ہے کہ "مضمون اچھا ہے اور معنا درست ہے"۔

۱۱۔ "آری۔ عاری"

"آری میرے نزدیک ہندی ہے اس لیے عاری، زچ و تنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلافِ اصول ہے۔ ہندی میں عین کہاں" (۲۸)۔

عاری: عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں برہنہ (۲۹)۔ عربی میں یہ "زچ و تنگ و عاجز" کے معنی میں مستعمل نہیں، یہ معانی اردو کا اضافہ ہیں۔ اردو میں عربی کے ایسے بہت سے لفظ ہیں جن کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ ان میں کچھ لفظ ایسے بھی ہیں کہ معنی بدل جانے سے ان کا املا بھی بدل گیا ہے، لیکن بیشتر الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ گھروں میں "حرافہ" اور "علامہ"، جن جن بلیغ مفاہیم میں استعمال کیے

جاتے ہیں وہ اردو سے مخصوص ہیں، اور ایسے ہی نہ معلوم کتنے لفظ ہیں کہ معنی بدل جانے سے یا کسی نئے معنی کے اضافے سے ان کے املا میں تغیر نہیں ہوا۔ "عاری" بھی انھی الفاظ میں شامل ہے۔ اس میں املا کی تبدیلی کو لازمی قرار دینا کچھ ضروری نہیں۔ اصل چیز استعمال عام ہے اور عام طور سے یہ لفظ عین سے لکھا جاتا ہے۔ امیر نے اپنے لغت "امیر اللغات" (۳۰) میں اور ان کی تقلید میں صاحب "نور اللغات" (۳۱) نے اس کو حرف الف کے ذیل میں درج کیا ہے، لیکن کسی اور تحریر میں اس لفظ کا یہ املا نظر سے نہیں گزرا۔ مستندین لکھنؤ کے لغات میں (ان دونوں لغات کے علاوہ) علی اوسط رشک، تلمیذ ناسخ کا لغت "نفس اللغۃ" (۳۲)، ان کے شاگرد جلال کا لغت "سرمایہ زبان اردو" (۳۳) اور مرزا محمد مرتضی عاشق کا لغت، "بہار ہند" (۳۴) قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے "سرمایہ زبان" اور "نفس اللغۃ" میں تو لفظ "آری" یا "عاری" درج ہی نہیں۔ البتہ "بہار ہند" میں "آری" ہے، لیکن اس کو "آرے" کا مصغر لکھا گیا ہے، "لفظ عاری" کے معانی کو اس سے متعلق نہیں کیا گیا ہے۔ "فرہنگ آصفیہ" (۳۵) میں "عاری" اور اس کے جملہ مرکبات عین سے لکھے ہوئے ہیں، اس سے اہل دہلی کی رائے کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لفظ کا املا الف سے صرف امیر کی ایجاد تھی، یہ املا ان کے لغت تک اور اس خط کے زیر اثر "نور اللغات" تک محدود رہا۔ اردو میں "آری" ایک جداگانہ لغت ہے "آرے" کا مصغر: اس امتیاز کے لحاظ سے بھی اس کو عین سے لکھنا انسب ہے۔ "عاری" کو اردو کے معانی کے لحاظ سے مہند کہنا چاہیے۔

۱۲۔ "مسالا یا مصالح"

"مسالا" معلوم ہوتا ہے کہ مصالح کا مہند ہے جو عربی میں مصلحۃ کی جمع ہے اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہی محل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے جیسے عمارت کے لیے چونا سرخی وغیرہ۔

تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے۔ کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لیے گوٹا پٹھا، بنت، کناری۔

کھانے کے لیے لونگ، الائچی، دھنیا، مرچ۔ بال دھونے کا مسالا، محرم کا مسالا، مسالے کا تیل، دلی والے اصل کی طرف جاتے ہیں مگر چوں کہ زبانوں پر مصالح نہیں ہے یعنی یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا، گرم مصالح ہو گیا، کرتی میں مصالح کم پڑا۔ اب کے محرم کا مصالح ہم کو نہیں دیا۔ اس لیے میری رائے ہے کہ اردو میں جو بولیں وہی لکھیں جس طرح مسالا بولتے ہیں اسی طرح لکھا بھی جائے۔ اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنو کا ہے۔ جیسا رشک نے اپنے لغت میں لکھا ہے۔

"مسالا" میم مفتوح سین مہملہ ولام بالف کشیدہ ضروریات ہر چیز باشد کہ بداں ضروریات رونق ولذت آں چیز شود ظاہرا ایں لغت از مصالح باشد"۔

اور اس کی تقلید جلال نے بھی اپنے لغت "گلشنِ فیض" میں کی ہے۔

منیر مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے۔

نمک چھڑکنے کو مانگے جراحت دل پر
جو دیکھے آپ کے موباف کا مسالا سانپ

کالا سانپ اور پالا سانپ زمین ہے۔ اور جان صاحب کے ایک شعر سے یہی پتا چلتا ہے کہ محلات لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی۔

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر
انگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا (۳۶)۔

"فرہنگ آصفیہ، میں "مصالح" درج ہے۔ اس کے ذیل میں اس کے مرکبات گرم مصالح، مصالح بنانا، مصالح ٹانکنا، مصالح دار، مصالح رگڑنا، مصالح کا تیل، مصالح کی سل لکھے ہوئے ہیں (۳۷)۔ نیز م مع س کی فصل میں "مسالا" لکھ کر لکھا ہے کہ صحیح لفظ "مصالح" تحریر کیا ہے (۳۸)۔ اہل دہلی کی تحریروں میں عام طور سے اس لفظ کا بھی املا (مصالح) ملتا ہے، لیکن آج کل اس کو عام طور سے س اور الف سے لکھا جاتا ہے (مسالا) اور اب یہی صحیح ہے ۔۔۔۔ جلال نے "سرمایہ زبان اردو" میں بھی مسالا لکھا ہے " (۳۹)۔ لیکن اس کا عربی مرادف "مصالح" لکھا ہے، جس کا غلط ہونا عیاں ہے۔ عربی میں "مصالح" مصلحت کی جمع ہے اور بس ریاض خیر آبادی اپنے ایک خط بنام صفدر مرزاپوری میں لکھتے ہیں: "مسالا۔ س۔ ہ سے صحیح اردو ہے (۴۰)۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں۔ صحیح لفظ الف سے ہے (مسالا) جیسا کہ امیر نے لکھا ہے۔

۱۳۔ "سن، سنہ"

"سن" (بفتح اول) بمعنی سال کہیں نہیں نکلتا۔ فارسی میں بہت تلاش کیا کوئی سند قابلِ اعتبار نہیں، اردو میں بغیر ترکیب اگر سن (بفتح اول) بہ معنی سال کوئی کہے تو تاویل ہو سکتی ہے۔ محققین اس جگہ سال کہتے ہیں" (۴۱)۔

جلال "گلشنِ فیض" میں "سن" کی بابت لکھتے ہیں:

"سن، سین مہملہ، مفتوح بہ نون، بہ معنی سال آید
ع: سنۃ بفتحتین و در آخر تاے موقوفہ۔ و بہ ختمِ سین مہملہ، عضویکہ بے حس و حرکت شدہ باشد۔ و امر بود از شنیدن" (۴۲)۔

رشید حسن خاں نے اپنی کتاب "اردو املا" میں "سن" اور "سنہ" کی بابت تفصیلی بحث کی ہے (۴۳)۔

۱۴۔ "جرس کھڑکنا"

"جرس کا کھڑکنا فصحا نہیں کہتے" (۴۴)۔

امیر کا یہ بیان زاہد حسین زاہد کے درج ذیل شعر کے دوسرے مصرعے پر ہے۔ شعر :

"قافلے ہوش کے رخصت ہوے مے خواروں سے
شب جوے خانے میں کھڑکا جرس جام شراب

امیر نے مصرع بدل کر یہ لکھا

سن کے مے خانے میں شور جرسِ جامِ شراب"(۴۵)۔

۱۵۔ "مطابقت فعل و فاعل"

"ہم اور صدرالدین صاحب گئے" فصیح ہے اور "میں اور صدرالدین صاحب گئے" صرف صحیح ہے۔ اور اگر اسی جملے میں صدرالدین صاحب سے میں کو مؤخر لایئے اور یوں کہیے کہ "صدرالدین صاحب اور میں گئے" تو کلام بالکل مہمل ہو گیا۔ اور اگر "گئے" کی جگہ اس جملے میں "گیا" لا کر یوں کہے کہ "صدرالدین صاحب اور میں گیا" تو یہ بھی فصاحت بلکہ صحت سے گرا ہوا ہے۔ ایسے مقامات میں فصحا "دونوں" کا لفظ بڑھا کر یوں بولتے ہیں کہ "صدرالدین صاحب اور میں دونوں گئے"(۴۶)۔

۱۶۔ "گھڑنا اور گڑھنا"

"گھڑنا اور گڑھنا دونوں صحیح ہیں۔ مگر گڑھنا شعراء کے کلام میں نہیں پایا۔ فصحائے لکھنؤ گھڑنا کو ترجیح دیتے ہیں۔

رشک مرحوم نے جب گھڑی نہیں اور چھڑی نہیں طرح کی تھی تو مجھے یاد آتا ہے کہ شعراء نے گھڑی نہیں بھی ان معنوں میں کہا تھا۔ رشک مرحوم کا شعر یہ ہے۔

ڈھالے ہوے ہیں سانچے میں یہ بھی بدن کی طرح
ہرگز سنار نے تیرے زیور گھڑے نہیں

اور چھڑے بمعنی البتہ میں نے لکھنؤ میں فصحا سے نہیں سنا اور کلام میں بھی نہیں دیکھا"(۴۷)۔

۱۷۔ "راہ باٹ"

اردو میں راہ باٹ تو کوئی بولتا بھی ہے فقط باٹ بمعنی انتظار تو ذرا بھی مستعمل نہیں ہے"(۴۸)۔

"فرہنگ آصفیہ" میں باٹ بمعنی رستہ، سڑک ہے۔ اس صراحت کے ساتھ کہ گنوار بولتے ہیں۔ نیز "باٹ دیکھنا" بمعنی راہ دیکھنا درج ہے (۴۹)۔

امیر، زاہد حسین زاہد کو ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۵ء کے خط میں رقم طراز ہیں۔

"باٹ دیکھنا، راہ دیکھنے کے معنی میں فصحائے لکھنؤ و دہلی کی زبان نہیں میر کا کہنا اس وقت سند نہیں ہو سکتا۔ اس وقت بولتے ہوں گے اب کوئی نہیں بولتا"(۵۰)۔

اسی خط میں مزید رقم طراز ہیں۔

''مخزن المحاورات'' چرنجی لال کا کیا اعتبار اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہیں۔ مجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ بہر کیف، ''باٹ دیکھنا''، کسی طرح صحیح نہیں''۔

۱۸۔ ''خنجر کا دونا''

''خنجر کا دونا ہونا صحیح ہے''(۵۱)۔

''فرہنگ آصفیہ ''میں ''دونا ہو جانا'' بمعنی تلوار کا دہرا ہو جانا، تیغ کا خمیدہ ہو جانا تحریر ہے۔ صبا:

جان شیریں ہم نے کس سختی سے دی
نیمچہ قاتل کا دونا ہو گیا

مولف ''فرہنگ آصفیہ'' نے اسے لکھنؤ والوں کی زبان قرار دیا ہے (۵۲)۔

۱۹۔ ''ابر کی بوند''

''منہ کی بوند، منہ کے پانی کی بوند یہ سب درست ہے مگر ابر کی بوند مستعمل نہیں''(۵۳)۔

ابر کی بوند بے شک شعرا نے اور شاہ نصیر اور داغ نے کہا ہے اس سے یہ غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن اپنی اپنی پسند ہے۔ زبانوں پر مستعمل نہ ہونے سے میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی اور اگر آپ اپنے کلام میں لکھنا چاہتے ہیں تو چنداں مضائقہ بھی نہیں''(۵۴)۔

زاہد کا وہ شعر جس پر اعتراض کی وجہ سے امیر کا مذکورہ بیان سامنے آیا یہ ہے:

ہوا ہو سرد مجھے سوزِ دل شراب چلے
پڑے اگر کوئی ابرِ سیاہ فام کی بوند (۵۵)۔

شاہ نصیر نے ایک قطعہ میں ''یار کی بوند'' اور سحابِ سیاہ کی بوند باندھی ہے:

الٰہی میری دعا تو قبول کر اس وقت
پڑے نہ کوئی سحابِ سیاہ گوں کی بوند
ہو اسے ہم سری کرنے کو پر تکلف
ہوئی ہے آج مرے یارِ ذوفنون کی بوند (۵۶)۔

۲۰۔ ''جامہ سے باہر ہونا''

''جامہ سے باہر ہونا اور اس کی امثال میں بے خودی ضروری ہے۔ مگر بے خودی کی علل بہ اختلاف مواقع مختلف ہوتی ہے۔ کہیں کمال غضب کہیں کمال سرور، کہیں کمالِ رشک و قس علیٰ ھذا۔

ناسخ کے اس شعر میں :

تجھ کو جس گلِ پیرا ہن نے اک نظر دیکھا وہی
نکہتِ گل کی طرح جامے سے باہر ہوگیا

منشائے بے خودی رشک ہے۔ اور اس شعر ناسخ میں :۔

اپنے جامے سے وہیں ہوگئے باہر لاکھوں
گھر سے پوشاک بدل کر جو وہ باہر آیا

منشائے بے خودی و خود سرور ہے۔ اور اس فقرے میں کہ تم سے کوئی کیا دردِ دل کہے تم توذرا ذرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتے ہو۔ منشائے بے خودی فرطِ غضب ہے بہر حال آپ کے اس شعر میں :

جامے سے باہر ہے جب سے چھولیا تیرا لباس
عطر کی بو ہر طرف پھرتی ہے اترائی ہوئی

منشائے بے خودی و خود سرور ہے اور اترانے کا ذکر صاف اس کی طرف شعر میں ہے یعنی بوے عطر اس بات پر کہ میں نے اس کا لباس چھوا ہے، ناز کر رہی ہے۔ پس یہ مقام سرور اور نشاط کے جوش کا ہے۔ یہاں غضب اور رشک کی گنجائش نہیں پس یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ جامہ سے باہر ہونا بے خودی کے معنی میں مان لیا جائے تو میرے شعر میں بوئے عطر کا اترانا لطف نہیں دیتا، مسلم نہیں۔ بلکہ خوب لطف دیتا ہے۔ اور شعراء نے ایسے موقع میں بہت کہا ہے۔ چوں کہ سر دست تنقیح کلام کی فرصت نہیں لہذا مثالیں نہیں لکھ سکتا اور آپ کی سلامت رائے اور ذہن و قار پر اعتماد کر کے اس قدر توضیح کو کافی سمجھتا ہوں۔ چوں کہ مقصود آپ کے شعر کا صحیح اور اس میں محاورے کا بر محل ہونا ظاہر کرنا تھا لہذا جلدی میں، میں نے اسی قدر اس وقت لکھا تھا کہ فصحاء نے اس محاورے کو کمال خوش ہونے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اور یہ توضیح نہیں کی تھی کہ منشائے بے خودی ہر جگہ مختلف ہوا کرتا ہے"(۵۷)۔

۲۱۔ "پسِ چلمن"

"چلمن نہ فارسی ہے نہ عربی اس کی طرف اضافت فارسی کی ہر گز جائز نہ ہوگی "جانبِ متھرا" کی نظیر اس کے لیے سند نہیں ہے۔ متھرا علم ہے شہر کا نام ہے۔ اس کا ترجمہ فارسی عربی میں کیا ہوگا۔ لہذا ایسی لفظ ترکیبوں کے ساتھ بے تردد باندھا جائے گا آپ کے مطلع میں جس میں پسِ چلمن ہے یوں اصلاح ہو سکتی ہے۔

دلِ صد چاک میں دیکھا رخِ روشن ان کا
ہم نے نظارہ کیا ڈال کے چلمن ان کا "(۵۸)۔

"چلمن ہندی ہے"(۵۹)۔

"جانبِ متھرا" کا تعلق ترکیبِ مسند سے ہے۔ یہ اور اس طرح کی مثالیں عام ہیں۔ جن اساتذہ نے اس کو عیب بتایا ان کے یہاں بھی اس کا استعمال ملتا ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ :

"یہ پابندی ہی غیر اصولی ہے۔ اصل چیز کسی مرکب کا بلحاظ محل استعمال مناسب ہونا ہے۔ اگر وہ بارِ ذوق نہیں ہے تو پھر اس کی کوئی حیثیت نہیں کہ وہ کن الفاظ سے مرکب ہے مثلاً یقین کا یہ مطلع دیکھیے :

اُس بسنتی پوش سے آغوشِ رنگیں کیجیے
جی میں ہے اس مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجیے

اس میں بسنتی پوش کی ترکیب بلحاظ قاعدہ مفروضہ ہے لیکن بلحاظِ حسن استعمال مناسب تر ہے"(۶۰)۔

اسی ذیل کی چند مثالیں اور ملاحظہ کیجیے : اس لفظ کو بہ اضافت استعمال کیا گیا ہے :

کیوں نہ وہ پردہ نشیں پھر مجھے سرن مانگے
میں نے تھے پھول کئی جانب چلون مارے
انشا

نیم جلوے کو بھی وہ کہتے ہیں اب بے پردگی
جسم کاہیدہ یہ کس کا صرف چلمن ہو گیا
مومن

یہ کاہ ربا سے بھی ہیں کم اے کششِ دل
مذکور کچھ ایسا پسِ چلمن ہے ہمارا
مومن

اضطرابِ شوق ، شاید غیر اس کے پاس ہو
جانبِ چلون نظارہ دم بدم کیوں کر کریں
مومن

بے پردہ پس چلمن یک بار تم آبیٹھے
مومن

۲۲۔ "دمل۔دنبل"

"دمل لفظ عربی ہے۔ دمامیل اس کی جمع ہے۔ دنبل صحیح نہیں"(۶۱)۔

"دنبل کی صحت میں اس لیے کلام ہے کہ کہیں فارسی میں پایا نہیں جاتا"(۶۲)۔

"دنبل کا فارسی میں صحیح ہونا آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا آپ نے جن لغات کا یعنی 'ہفت قلزم' و 'تمہ برہان قاطع' کا حوالہ دیا ہے میں بھی اس میں انشاء اللہ دیکھوں گا"(۶۳)۔

"میری ران میں ایک دمل نکل آیا ہے"(۶۴)۔

"نور اللغات"(۶۵)اور "فرہنگ آصفیہ"(۶۶) میں یہ لفظ "دنبل" موجود ہے دونوں مولفین نے اسے فارسی کہا ہے۔البتہ نور اللغات میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ "دمل" عربی ہے۔ یہ دونوں لغات بعد کے ہیں اس سے پہلے یہ لفظ "ہفتِ قلزم" میں اس صراحت کے ساتھ ملتا ہے۔

"بضم اول وسکون نون وفتح موحدہ تحتانی ولام زدہ معروف است وآنرادر تازی دمل گویند، بضم دالِ ابجد و تشدیدِ میم۔ وبفتح دالِ ابجد وسکونِ نون، سرناری است کہ آنرا در ہندی سرمندل گویند'(۶۷)۔

فرہنگ آنندراج میں ہے:

"دنبل بضم اول وسکوت دوم وفتح بای موحدہ ولام در آخر

ف۔ ایشی کہ بیشتر بر ساق وبدن اسفل بدآید بعربی آزادومل گویند مرزابیدل

چرخ در یوزۂ مرہم کنہ از خاک درش

تاگر بہ شود اندر خم پشتن دنبل واز نفائس (۶۸)"

تمہ برہان قاطع میں "دمل" کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے۔

"دنبل بفتح اول ودلال ابجد، دھل مانندیست کہ بہ ہندوستان مندل گویند در فرہنگی بمعنی غلولہ نوشتہ اند۔ وبضم اول، ورمی کہ دراعضابہم رسد وبزبانِ عربی دمل گویند"(۶۹)

منشی محمد بادشاہ

فرہنگ آنندراج جلد دوم

مطبع منشی نول کشور لکھنو ۱۸۹۴ء

امیر نے اسے اپنے خط میں عربی کے تحت استعمال کیا ہے۔

۲۴۔ "دامن نکلنا"

"دامن نکلنا، گریبان نکلنا، آستین نکلنا ہر ایک صحیح ہے۔ کسی کا شعر ہے۔

گریباں کو میں روکوں یا سنبھالوں اپنے دامن کو

بڑی مشکل تو یہ ہے ساتھ ہی دونوں نکلتے ہیں " (۷۰)۔

اس ذیل میں امیر کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے

وہ پردے سے نکلے پیرہن کو جس کے غیرت ہو

ہوا چیں بر جبیں دامن جو دیکھی آستیں نکلی

امیر کا ایک اور شعر ہے۔

رفوگر دیکھ کر میرے جنوں کو ہاتھ ملتا ہے
گریباں کو رفو کرتا ہے تو دامن نکلتا ہے

امیر کے شاگرد رشید جلیل کا شعر ہے۔

جنوں کی جب ہوئی آمد بڑھے سب پیشوائی کو
چلا دامن ادھر سے اس طرف سے آستیں نکلی

۲۵۔ "تیروں کا گنجان ہو کر بیٹھنا"

"تیروں کا گنجان ہو کر بیٹھنا۔ یہ زبان نہیں ہے۔
درخت، آبادی و خط کی نسبت گنجان کہا جاتا ہے"(۷۱)۔

۲۶۔ "زکریا۔ ذکریا"

زکریا بفتحتین و کسرا و تشدید یا ہے۔ اس میں کوئی تغیر اب تک نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ذکریا ذال سے بالکسر لکھتے ہیں اور سکون ثانی و تخفیف یا کے ساتھ بولتے ہیں محض غلط ہے۔ خواہ دہلی والے ہوں یا لکھنو والے"(۷۲)۔

زکریا 'زے' سے ہے۔ ذال سے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور اس کے اعراب میں بھی تغیر ممکن نہیں ہے"(۷۳)۔

۲۷۔ "کسر بفتحتین"

"کسر بفتحتین اردو ہے اور اسی طرح مستعمل ہے جس طرح داغ نے کہا ہے۔ ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ تھوڑی سی کسر باقی ہے ۔ بے تکلف زبان ہے ۔ اور کسر بفتح اول و سکون ثانی عربی ہے۔ جو بمعنی شکستن ہے جیسے کسر شان، کسر نفس۔ وہ اس جگہ مستعمل نہیں ہے۔ جس جگہ سے بحث کی گئی ہے اور نہ اس کے معنی یہاں چسپاں ہوتے ہیں بہر کیف کسر اپنے مقام پر صحیح اور بول چال میں داخل ہے"(۷۴)۔

امیر نے اس بیان میں داغ دہلوی کے جس شعر کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے۔

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا

اسی ذیل کا تسلیم لکھنوی کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

اب فلک در پے آزار ہے کیوں
کیا کسر تم نے اٹھا رکھی ہے

۲۸۔ "اعلان نون"

"اضافت کی حالت میں اعلانِ نون جائز نہیں (۷۵)۔

" حالتِ اضافت میں اعلانِ نون مضاف الیہ میری رائے میں جائز نہیں اگرچہ بعض اشعار فارسی میں بہت تتبع کے بعد اس اعلان کا پتا لگتا ہے مگر وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ اردو زبان میں قدما تو کہتے تھے مگر طبقۂ متوسطین و متاخرین کے محققین کے ترک کر دیا" (۷۶)۔

اعلانِ نون کی بابت امیر کا پہلا بیان زاہد حسین زاہد کے اس مصرعے سے متعلق ہے :

جنھیں شوق نام و نشان تھا یہی فکر تھی یہی دھیان تھا

امیر نے مصرعے کی اصلاح اس طرح کی :

جنھیں شوق تھا کہ نشان رہے کوئی یادگار مکان رہے "(۷۷)۔

نظم اردو میں شعرا نے نون کے استعمال کے جو قواعد بیان کیے ہیں کسریٰ منہاس نے انھیں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس بابت انھوں نے نون کے استعمال سے متعلق بارہ اصول بتائے ہیں جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) "گلشن۔ مدفن۔ چلمن۔ دن۔ جن۔ من۔ بن۔ چمن۔ وطن۔ یہ وہ نون ہیں جو کبھی غنہ نہیں آتے۔ ان کے ماقبل حروف علت (ا۔ واؤ۔ ی) نہیں۔ تقطیع میں شمار ہوتے ہیں۔ اور زبان سے ادا کیے جاتے ہیں۔

(۲) وہ نون جو ناک میں بولا جاتا ہے۔ اور کبھی زبان پر نہیں آتا۔ "نون غنہ" کہلاتا ہے۔ ایسا نون تقطیع میں نہیں لیا جاتا۔ جیسے ہاں۔ کہاں۔ وہیں۔ دھواں۔ کنواں۔ آنسو۔ رانڈ۔ سانڈ۔ بوند۔ مونگ۔ مانگ۔ وغیرہ یا علامتِ واحد متکلم آؤں۔ جاؤں۔ کھاؤں۔ علامت جمع متکلم۔ کھائیں۔ لائیں یا علامت جمع مونث گھوڑیاں۔ روٹیاں۔ ساریاں یا علامت جمع مذکر مونث کی آنکھوں۔ شہروں۔ یہ نون جن لفظوں میں آتا ہے۔ اس کے ماقبل یا ما بعد حرف علت ضرور ہوتا ہے۔ اس کا شمار تقطیع میں نہیں۔

(۳) وہ عربی فارسی الفاظ کا نون جو آخر لفظ میں حرف علت کے بعد آتا ہے اور ترکیب اضافی فارسی یا ترکیب عطف فارسی ہوتا ہے۔ اس کو بھی غنہ لکھنا چاہیے۔ اس کا شمار بھی تقطیع میں نہیں۔ جیسے ع

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے (غالب)

دورِ ساغر میں سبو پیر مغاں بن بیٹھا (امیر)

اہلِ چیں چیں میں ایران میں ساسانی بھی (اقبال)

خار دامن میں چنے ہیں گل وریحاں کے عوض (جلیل)

حضرت امیر نے جو زاہد سہارنپوری کو اعلان نون کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔اس کی مثالیں اوپر دے دی گئی ہیں۔ایک دفعہ اس مصرع پر

"فخرِ ہندوستان ہے گویا"

پر اعتراض کیا گیا تھا۔ چناں چہ صفدر مرزاپوری مرحوم نے حضرت جلیل سے اس کے متعلق استفسار کیا کہ کیا "فخرِ ہندوستان" میں ہندوستان کے نون کا اعلان درست ہے یا معیوب۔ حضرت جلیل نے ان کو لکھا تھا۔ "اعتراض صحیح ہے۔ ہندوستان میں نون کا اعلان نہ چاہیے۔اس لیے کہ اس کے ساتھ اضافت فارسی آگئی ہے۔اسی طرح واوٴ عطف کے آجانے سے بھی اعلان نون ناجائز ہو جاتا ہے۔

(مرقع ادب از صفدر مرزاپوری جلد اول ص ۵۹)

لیکن کسی لفظ میں حرفِ علت (ی) واقع ہو اور اس کے ما قبل فتح ہو تو اعلان جائز۔ جیسے

مالک کیا ہے تو نے جسے مشرقین کا

پروردگار واسطہ خونِ حسین کا

(۴) اگر الفاظ عربی بہ ترکیب اضافی عربی ہوں۔ تو نون کو بہ اعلان نظم کرنا بہتر ہے۔ جیسے عظیم الشان ، فصیح البیان وغیرہ کیوں کہ عربی میں نون غنہ نہیں ہے۔

(۵) فارسی کے وہ تمام الفاظ جن کے درمیان نون ہے۔ اور ما قبل اور مابعد کوئی حرف علت نہیں۔ ہمیشہ بہ اعلان نظم کئے جائیں گے۔ جیسے سکندر، سوگند، جنبانیدن، خندیدن وغیرہ۔اسی طرح جن الفاظ کے ما قبل الف وصل متحرک آجائے۔اور حرفِ نون درمیان میں واقع ہو۔ اعلان سے استعمال کئے جائیں گے۔ جیسے اندر، انجام، انجیل، اندیشہ، دن، (کلمہ تشبیہ) وندا ور، ینابیع، ینگ وغیرہ۔

(۶) فارسی و عربی کے وہ اسما جن کے آخر میں نون ہے اور ما قبل کوئی حرفِ علت بھی ہے۔ اور وہ بغیر ترکیب اضافی و توصیفی ہیں تو ان پر اختیار ہے۔ چاہے نون غنہ سے یا اعلانِ نون سے نظم کریں۔ لیکن خاندانِ امیر کے شعرا ایسے نون کو بہ اعلان نظم کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جو الفاظ سہ حرفی ہیں وہ ضرور بہ اعلان استعمال کرنا چاہئیں۔ خون، آن، بان، جان وغیرہ کو بہ اعلان نظم کریں۔ جب ترکیب اضافی یا توصیفی نہ ہو۔ آسان، مدفون، قانون، مخزون، قالین ایسے الفاظ پر اختیار ہے چاہے اعلان سے نظم کریں یا اخفائے نون سے۔ حروف فارسی و جمع فارسی بہ اخفائے نون (غنہ) نظم ہوں گے جیسے چناں، چنیں، خموشاں، شاہاں، درختاں وغیرہ۔

(۷) وہ نون غنہ جن کے بعد (ب) ہوتا ہے۔ اور وہ نون میم سے بدل جاتا ہے۔ تقطیع میں محسوب

ہوتا ہے۔ جیسے انبہ، منبع، قنبول، سنبھالناوغیرہ۔

(۸) وہ نون غنہ جو مشدد ہوتا ہے۔ اور لفظ کے درمیان میں آتا ہے۔ اس کے ماقبل کوئی حرف علت نہیں ہوتا۔ اور مابعد (گ) ہوتا ہے۔ ایسا نون شمار میں آتا ہے۔ اس کو بہ اخفا نظم کرنا معیوب ہے مثلاً رنگ، جھنگ، بھنگ، جنگ، پلنگ وغیرہ۔

(۹) نون مخلوط ہندی تقطیع میں نہیں لیا جاتا۔ جیسے مینہ، مند، مہندی وغیرہ۔

(۱۰) ایک نون ہندی الفاظ کے درمیان آتا ہے۔ اور اس کے پہلے کوئی حرف علت نہیں ہوتا وہ تقطیع سے خارج ہے جیسے اونچ، سانچ، پانچ، وغیرہ۔

(۱۱) ایسے مرکبات جیسے دیں دار، ایماں دار، احساں مند، احساں فراموش، فارسی میں بہ اخفائے نون نظم ہوں گے۔

(۱۲) چند الفاظ خاندان، جانور، خانماں اماں، وغیرہ بہ اعلان نون آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان خانہ اور دان سے مرکب ہے۔ اس ترکیب میں ہائے ہوز ساکت ہوگئی۔ اسی طرح جانور۔ جانہ اور ور سے مرکب ہے اور خانماں، خانہ اور ماں سے مرکب ہے۔ ان میں ہائے ہوز ساکت ہوگئی" (۷۸)۔

۲۹۔ "قرار"

"قرار بمعنی اقرار عربی و فارسی میں نہیں ملتا بغیر عطف قول قرار کو جس طرح آپ نے اردو کر لیا ہے۔ اس کا مضائقہ نہیں" (۷۹)۔

امیر کا یہ بیان زاہد کے اس شعر سے متعلق ہے۔

"تری بات کا ہت بے وفا کوئی کیا یقین کرے بھلا
کبھی اس سے وعدہ وعید ہے کبھی اس سے قول قرار ہے" (۸۰)۔

کیفی لکھتے ہیں کہ :

"جب معطوف اور معطوف علیہ فارسی یا عربی زبان کے کلمے ہوں تو واؤ عطف کا استعمال صحیح ہے ورنہ مخالفِ قیاس لغوی کے ذیل میں آئے گا" ••• مثال : پہار و چٹان، انسان و معبود، عورتیں و مرد یک جا ہوں شہر و گاؤں وغیرہ (۸۱)۔

مذکورہ مثالیں جید لوگوں کی تحریروں سے اخذ کی گئی ہے۔ کیفی اس کے لیے کہتے ہیں کہ "انہوں نے فارسی کا واؤ عطف نہیں لکھا بلکہ پراکرت کا واؤ لکھا ہے" (۸۲)۔

۳۰۔ "ویا"

"ویا اب بالکل متروک ہے اس کی جگہ صرف یا بولتے ہیں" ••• (۸۳)۔

"یاکاف سے کام لیجیے، جو یا کے معنی میں آتا ہے" (۸۴)۔

امیر کا یہ بیان زاہد کے اس مصرعے سے متعلق ہے۔

"ارم ہو حرم ہو ویا دیر ہو"

امیر نے اس مصرعے کی اصلاح اس طرح کی ہے۔

"ارم ہو حرم ہو کہ بت خانہ ہو" (۸۵)۔

وزیر لکھنوی نے "ویا" کو اس طرح باندھا ہے:

نہ آؤ ، خوش رہو ، جس جا رہو مرے صاحب
ملو ویا نہ ملو ہم نباہ کرتے ہیں "

ناسخ نے بھی "ویا" کو اپنے ایک شعر میں اس طرح باندھا ہے۔

بعد موت سو گیا ہوں چین سے
یہ جنازہ ہے ویا گہوارہ ہے

۳۱۔ "باہمدگر"

"باہمدگر کی صحت میں کلام ہے۔ "بایکدگر" ہو سکتا ہے محض "ہمدگر چاہیے لکھیے" (۸۶)۔

رشید حسن خاں "باہمدگر" کی صحت پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"باہمدگر کی صحت میں مطلق کلام نہیں کیا جاسکتا۔ فارسی میں یہ لفظ موجود ہے۔ وہیں سے یہ لفظ ہمارے یہاں آیا ہے۔ سلیمان جیم لغت میں یہ لفظ درج ہے (جلد اول، ص ۲۲۱) اور یہ سند کے لیے کافی ہے۔ غالب نے قاطع برہان میں کئی جگہ اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً لفظ "بر پروشان" کے تحت لکھا ہے: "و تبدل شینِ نقطہ دار و سین بے نقطہ باہمدگر اصلی است محکم در ضوابطِ زبان ایران"۔ لفظ 'برخ' کے ذیل میں لکھا ہے: 'نہ بایں شش معنی موافق و نہ باہمدگر متحد و مرادف'۔ مولفِ آصف اللغات نے "باہم" کو "باہمدگر" کا مخفف لکھا ہے (جلد نہم) اردو کے اساتذہ نے بھی اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ چند اسناد درج کی جاتی ہیں: ع۔ باہمدگر رکھے ہے میاں عالم اختلاط (قائم۔ دیوان قائم، عکس نسخہ ء لندن) دیا ان کو باہمدگر التیام (قائم) ہوئی ہے روح قیس و کوہکن باہمدگر اک جا۔ (انشا۔ کلام انشا ص ۷۴) اٹھ جائے چاہیے سب باہمدگر تکلف (انشا، ص ۱۱۷) خود پرستی سے رہے باہمدگر ناآشنا۔ (غالب۔ دیوان نسخہ عرشی، ص ۱۹) باہمدگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب (غالب، ص ۲۲۵) اگر اختلاف ان میں باہمدگر تھا۔ (حالی۔ تاج کمپنی، ص ۲۳) باہمدگر ہیں خشت بنیاد (صفی لکھنوی۔ مثنوی تنظیم الحیات حصہ حمد) (۸۷)۔

۳۲۔ "پہ"

"پہ بہ معنی لیکن و مگر واجب الترک ہے بجائے پر جو ہر جگہ مستعمل ہے"(۸۸)۔

رشید حسن خان نے اس لفظ پر تفصیلی بحث کی ہے اور دل چسپ نتائج نکالے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ :

"امیر کا مفہوم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پر بمعنی ۔ لیکن و مگر مستعمل ہے لیکن اس کا مخفف پہ واجب الترک ہے۔ پر بمعنی ۔ لیکن کے مخفف پہ کو اساتذہ لکھنؤ نے بالاتفاق متروک قرار دیا ہے۔ البتہ پر (بمعنی لیکن) کے ترک واختیار میں اختلاف ہے۔ جلال نے اپنے تیسرے 'دیوان مضمونہائے دلکش' میں جہاں اپنے متروکات کی فہرست درج کی ہے، اس لفظ کو بذیل متروکات لکھا ہے۔ شوق نیموی نے 'رسالہ اصلاح' میں اور مولف 'نور اللغات' نے لکھا ہے کہ بعض فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ اثر صاحب نے صاحبِ 'نور اللغات' کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے : "لیکن میں وہ بات کہاں، جو بعض موقع پر لفظ پر سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً :

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

شوق نیموی نے زیادہ صراحت کی ہے :"فی الواقع پر بمعنی لیکن بکثرت مستعمل تھا۔ استادی جناب شمشاد لکھنوی جن کو متروکات کا بہت خیال ہے، ان کے دیوان اول میں جس کا نام 'خزانۂ خیال' ہے، یہ لفظ موجود ہے۔ اور مولف بھی پہلے اس لفظ کا تارک نہ تھا، مگر 'رسالہ اصلاح' کی وجہ سے جب بہت سے لوگ احتیاط کرنے لگے، حتی کہ کچھ دنوں سے جناب شمشاد کو بھی احتیاط کلی ہے، تو مولف نے بھی وجوباً ترک کر دیا ہے" (حاشیہ رسالۂ اصلاح، ص ۱۲) مولف 'اصلاح زبان اردو' نے لکھا ہے : "لیکن کے معنوں میں پر کا استعمال اب فصحا نے ترک کر دیا ہے۔ آخر میں جلال وداغ، نے بھی ترک کر دیا تھا"۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم برہم (تلمیذ امیر) نے لکھا ہے :"پر کا استعمال لیکن کے معنی پر بکثرت ہے، اگر کچھ لوگ نہیں کہتے تو اس سے متروک نہیں ہو سکتا۔ امیر نے آخر تک اس کو جائز رکھا ہے اور دیگر شعرا بھی استعمال کرتے ہیں"۔

پر بمعنی ۔ لیکن کو خواہ بعض فصحا نے بالجبر ترک کر دیا ہو، لیکن بیشتر نے اس کو بے تکلف نظم کیا ہے۔ امیر کے مندرجہ مکتوب قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس کے تارک نہیں تھے۔ 'مراۃ الغیب' اور 'صنم خانۂ عشق' میں اس کی بلا مبالغہ سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں۔ داغ کے یہاں بھی یہ لفظ بے تکلف نظم ہوا ہے اور اس کثرت سے کہ مثالوں کی کوئی ضرورت نہیں"(۸۹)۔

۳۳۔ "پرے"

"پرے لکھنؤ میں بالکل متروک ہے اور دلی میں بھی اب فصحا کے کلام میں پایا نہیں جاتا(۹۰)۔

ریاض خیر آبادی نے بھی ایک خط میں امیر کے اس قول کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"میں پرے کے لفظ کو متروک سمجھتا ہوں داغ و امیر و جلال نے بھی استعمال نہیں کیا، نہ ان کے متبعین، عام بول چال میں بھی نہیں۔ بعض دلی والے شاید بولتے ہیں"(۹۱)۔

دہلی میں یہ لفظ ہر زمانے میں مستعمل رہا ہے۔ میر و سودا، انشاو مصحفی و جرات، اور غالب وذوق وغیرہ کے یہاں اس کی مثالیں بہ آسانی مل سکتی ہیں۔ مولفِ 'فرہنگ آصفیہ' نے اس لفظ کے متروک یا غیر فصیح ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ "پرے بٹھانا" کے ذیل میں یہ فقرہ بطور مثال لکھا ہے : "ایسا پکایا کہ باورچی کو پرے بٹھایا"(۹۲)۔ اس فقرے کے اندراج سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مؤلف کے زمانے میں بھی یہ لفظ رائج تھا۔ لیکن فصحاء کے یہاں نہیں۔

۳۴۔ "پیار"

"پیار بر وزن فاع ہے"(۹۳)۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں :

"اس قبیل کے کئی لفظ ہیں، جن میں سے بعض کو بہ اخفاے یا فصیح مانا جاتا ہے اور بعض کو بہ اظہار یا۔ ان لفظوں میں پیار، پیاس، پیالہ، پھوار، پیاز، پیال، پیادہ، دھیان، قابل ذکر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے تلفظ میں کبھی کبھی مختلف کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میری راے میں ایسے الفاظ کے کسی ایک تلفظ پر مہر نہیں لگانا چاہیے۔ ذوق کے شعر میں "پیاسے" بہ اظہار یا نظم ہوا ہے اور قطعاً خلاف فصاحت نہیں معلوم ہوتا۔ جب پیالہ پیادہ وغیرہ بہ اظہار یا درست ہی نہیں، فصیح بھی ہیں، تو پیاس وغیرہ کو بہ اظہار یا کیوں مطلقاً غیر فصیح مانا جائے۔ صوتی حیثیت ان سب کی ایک ہے"(۹۴)۔

۳۵۔ "بھانا"

"بھانا پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے"(۹۵)۔

بھانا، پسند آنا کے معنی میں فصحاے لکھنو نہ بولتے ہیں، نہ لکھتے ہیں۔ اگر اہلِ دہلی بولتے ہیں تو آپ ضرور لکھیے"(۹۶)۔

شوق قدوائی نے ایک خط میں یہ لکھا ہے کہ :

"میں نے حضرتِ امیر مرحوم کے اس خط کو دیکھا ہے جس میں اس لفظ (بھانا) کو وہ متروک تحریر فرماگئے ہیں ۔ میرے خیال میں ان سے سہو ہوا وہ خود بھی اپنے کلام میں اس لفظ کا استعمال

کر چکے ہیں اس کے معنی ہیں 'پسند آنا'۔ یہ لفظ اب بھی استعمال میں ہے اور اس کے ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے"(۹۷)۔

امیر کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

داور محشر کو بھائی میری اس کی چھیڑ چھاڑ
چھیڑ کر پوچھا مکرر کیا ہوا کیوں کر ہوا

اس حوالے سے ناسخ کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے۔

بھاگئی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ
نہ کبر رکھتے ہیں کافر نہ دہاں رکھتے ہیں

مولف "نور اللغات" نے لکھا ہے کہ "متاخرین شعرائے لکھنو نے اس لفظ کا استعمال ترک کر دیا ہے"(۹۸)۔ جلال نے بھی "سرمایہ زبان اردو" میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ "بعض فصحائے متاخرین کے نزدیک متروک الاستعمال ہے"(۹۹)۔ اس کے علاوہ حکیم سید مہدی علی کمال نے بھی "دستور الفصحا" میں اس لفظ کو متروک قرار دیا ہے"(۱۰۰)۔ البتہ "بحر لکھنوی نے اپنے رسالہ ء قواعد و لغت، بحر البیان میں بھانا کو درج کیا ہے"(۱۰۱)۔ اس صورت حال پر جلال کی یہ رائے زیادہ اہم ہے کہ بعض فصحائے متاخرین کے نزدیک متروک الاستعمال ہے۔ جہاں تک امیر کی رائے کا تعلق ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ جلال کے بیان کے مطابق ہو یا پھر انھوں نے کسی شاگرد کی فرمائش پر اس لفظ کو باندھا ہو لیکن ان کے نزدیک متروک ہی ہو۔

۳۶۔ "بھدنا"

"بھدنا لفظ نہیں ہے۔ "بدھنا" ہے اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صبا

شور جس کا ہے وہ عشقِ جنوں زا دل میں
بدھ گیا ہے نمکیں حسن کا سودا دل میں (۱۰۲)۔

مولف "فرہنگ آصفیہ"، "بدھنا" (ھ بالکسر) کے معنی میں لکھتے ہیں خدا تعالیٰ، قادرِ مطلق اور بو علی شاہ قلندرؒ کا یہ دوہا نقل کرتے ہیں:

سجن سکار لے جائیں نین مرینگے روئے
بدھنا ایسی رین کر کہ بھور کبھو نہ ہوئے

مولف "فرہنگِ آصفیہ "بدھنا" (ب بالفتح) کے معنی "وہ مٹی کا لوٹا جس میں ٹونٹی بڑھی ہوئی ہو"(۱۰۳)۔ جب کہ جلال لکھنوی نے "سرمایہ زبانِ اردو" میں بدھنا کے معنی "کسی کا جادو زدہ یا آفت زدہ ہونا" لکھے ہیں اور سند میں بحر کا یہ شعر درج کیا ہے۔

بدھا ہوا ہوں ازل سے میں ترک چشموں میں
کسی پر ان کا چلا تیر، میں نشانہ ہوا" (۱۰۴)۔

جب کہ اثر لکھنوی نے بدھنا کے "معنی چھیدا ہوا ہونا، وابستہ ہونا لکھے ہیں اور سند میں مندرجہ بالا شعر نقل کیا ہے (۱۰۵)۔ مولف "نور اللغات "بدھنا" اور "بھدنا" دونوں کو شامل کیا ہے "بدھنا" (ھ بالکسر) کے معنی میں صبا اور بحر کے مذکورہ اشعار کے ساتھ تعریف میں" پیوست ہو جانا، رگ رگ میں اثر کر جانا لکھتے ہیں جب کہ "بدھنا" (ھ بالفتح) میں فرہنگِ آصفیہ سے تعریف نقل کی ہے (۱۰۶)۔ ان تعریفات کے مقابلے میں وہ "بدھنا" کے ذیل میں بھی کم وبیش وہی تعریف لکھتے ہیں جو انھوں نے "بدھنا" (ھ بالکسر) میں دی ہے۔ "نمک مرچ یا اور سفوف کا کسی دوسری چیز میں مل جانا، سرایت کر جانا کسی چیز میں بو بس جانا۔ پھر سند میں جان صاحب کا یہ شعر درج کرتے ہیں:

سوئی ہے تو لپٹ کے کل شب کو اے زلیخا
بو تیری بھد گئی ہے یوسف کے پیرہن میں "

غالباً یہاں "بدھنا" (ھ بالکسر) ہی درست ہے "بھد گئی" شعری ضرورت کے تحت لایا گیا ہے۔ گویا "بھدنا" کوئی لفظ نہیں بلکہ بدھنا ہی درست ہے (۱۰۷)۔

۷۔۳۔ "مہیں"

مہیں۔ میں ہی کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گزرا۔ حکم اس کو استعمال کا نہیں دیا جاسکتا" (۱۰۸)۔

جلال نے "سرمایہ زبانِ اردو میں امیر کے بیان سے اختلاف کیا ہے وہ رقم طراز ہیں کہ:

"مہیں، تحتانیِ معروف واخفاے نون کے ساتھ۔ اک کلمہ ہے کہ فائدہ اپنی ذات کے حصر کے معنی کا دیتا ہے اور جو اس لفظ کو "میں ہی" پڑھتے یا لکھتے ہیں، مولف ہیچمدان کے عندیے میں غلط ہے" (۱۰۹)۔

جلال کے اس بیان پر وجاہت جھنجھانوی "اختلاف اللسان" میں لکھتے ہیں:

"جناب جلال کا یہ اجتہاد با قاعدہ ضرور ہے کیوں کہ جب تم ہی، ہم ہی کو تمھیں اور ہمیں کہتے ہیں تو اسی قیاس پر میں ہی کو مہیں کہنا چاہیے۔ مگر تمہیں اور ہمیں کے مقابلے میں یہ لفظ نہایت غیر فصیح معلوم ہوتا ہے۔ شاید اجنبیت کی وجہ سے اور سچ پوچھیے تو یہ اجتہاد ایسا ہے جیسے کوئی یہاں وہاں کے قیاس پر کہ ان کا مخفف یاں واں آتا ہے۔ کہاں کا مخفف کاں کرنا چاہیے شعراے دہلی ولکھنو میں سے اور کوئی اس کا عامل نہیں پایا جاتا صرف جنابِ جلال اور ان کے شاگرد لکھتے ہیں" (۱۱۰)۔

جلایا کیے وہ شبِ وصل بھی
مہیں رات پھر شمعِ محفل رہا

جلال نے امیر کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے جو توجیح پیش کی ہے وہ وزن نہیں رکھتی اگر جلال اس حوالے سے اسناد پیش کرتے تو اچھا ہوتا لہٰذا امیر "مہیں" کی بابت کے بعد وجاہت کے بیان کو درست مانا جاسکتا ہے۔

۳۸۔ ""انکھڑیاں"

""انکھڑیاں چشم معشوق کے لیے مخصوص ہے اور یہ لفظ مجھے پسند ہے" (۱۱۱)۔

""انکھڑیاں چشم معشوق کے لیے مخصوص ہے اور یہ لفظ مجھے نہیں پسند ہے (۱۱۲)۔

امیر کے اس بیان میں ہماری رائے یہ ہے کہ طبع اول کی عبارت درست ہے اس لیے انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس لفظ کو خوب صورتی سے باندھا ہے۔

"کاجل یہ نہیں ہے انکھڑیوں کا
اٹھا ہے دھواں تری مسی کا

"امیر اللغات" میں لکھتے ہیں "آنکھ کی جمع۔ پیارے سے معشوق کی آنکھ کو کہتے ہیں" (۱۱۳)۔ اور سند میں یہ اشعار درج کیے ہیں :

آتش : ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا
سلام جھک کے کروں گا جو پھر حجاب آیا

قلق۔ انکھڑیاں قہر کی لگاوٹ باز
دلربا بات بات کا انداز

سودا۔ خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑ مت مرنے کے بعد از بھی
دلا آیا جو تو اس میکدے میں جام لیتا جا

عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے "اصلاح زبان اردو" میں جلال کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ ""انکھڑیاں" اب بول چال میں نہیں ہیں" (۱۱۴)۔

جلال کا شعر یہ ہے :

اپنی شوخ انکھڑیوں میں کچھ تو حجاب آنے دو
راہ پر آئیں جو یہ خانہ خراب آنے دو

حکیم برہم اپنے ایک خط میں عبدالرؤف عشرت کے رسالے "اصلاح زبان اردو" پر کڑی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ رسالہ اپنے مقصد میں بالکل ناقص بلکہ عوام الناس کو مغالطہ میں ڈالنے والا ہے"۔ وہ مزید رقم طراز ہیں کہ : انکھڑیاں متروک نہیں ہے "چشم معشوق" کو کہتے ہیں۔ دیکھیے "امیر اللغات" اور گلشن فیض"۔ اس بیان کے بعد آتش اور بحر کے دو شعر بطور سند درج کیے ہیں۔ آتش کا شعر مذکورہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے۔ بحر کا شعر یہ ہے :

دو چار کو جو قتل کریں اس کی انکھڑیاں
شیروں سے بھی زیادہ غزالوں کی دھاک ہو (۱۱۵)۔

شوق نیموی نے رسالہ "اصلاح" (۱۱۶) میں مولف "نور اللغات" (۱۱۷) اسے متروک قرار دیا ہے۔

اس بحث میں اثر لکھنوی نے "فرہنگ اثر" میں نہایت مدلل بیان دیا ہے :

انکھڑیاں، آنکھیں : دونوں کے محلِ استعمال میں فرق ہے آنکھیں، عام لفظ ہے، انکھڑیاں معشوق کی خوب صورت آنکھوں کو کہتے ہیں۔ میرا شعر ہے :

ان انکھڑیوں کی اف نیم خوابی
ڈورے پڑے تھے جن میں گلابی

انکھڑیوں میں جو بانکپن ہے۔ وہ آنکھوں میں کہاں" (۱۱۸)۔

نواب عزیز جنگ والا نے اپنے رسالے "معیار فصاحت" میں متعلق بیان دیا ہے کہ :

"آنکھوں میں انکھڑیوں کی تخصیص معنوی کا لطف کہاں ہے جو پیار سے متعلق ہے۔ متعدد استادانِ سلف اور معاصر کے کلام میں اس کا استعمال موجود اور ہمارے ذوق کے موافق ہے" (۱۱۹)۔

رشید حسن خاں امیر کے بیان کی تائید میں لکھتے ہیں :

"بیشتر حضرات نے زور دیا ہے کہ انکھڑیاں چشم معشوق کے لیے مخصوص ہے لیکن مطلق آنکھوں کے لیے بھی اس کو استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً میر سوز کا شعر ہے۔

جب تلک آنکھیں کھلی ہیں ،دکھ پہ دکھ دیکھیں گے یار
مند گئیں جب انکھڑیاں ، تب سوز سب آنند ہیں

(دیوانِ سوز، قلمی نسخہ، رضا لائبریری رام پور)(۱۲۰)۔

۳۹۔ "اخفائے نون"۔

"خون، جان وغیرہ۔ سہ حرفی الفاظ میں نون کا اخفا غیر فصیح ہے۔ الاحالت اضافت وغیرہ" (۱۲۱)۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ بعض مواقع پر ایسے الفاظ میں اخفائے نون صریحاً فصاحتِ کلام کے منافی معلوم ہوتا ہے جیسے امیر کے ان مصرعوں میں :

اسی معجون سے طبیعت نے بشاشت پائی
(مراۃالغیب، ص ۱۲)

مخمس جو مرے دیوان میں ہے پنجہ ہے مرجان کا
(مراۃالغیب ص ۴۳)

لیکن اس کا تعلق فصاحت کلام سے ہونا چاہیے۔ جہاں جیسا محل ہو، مثلاً اسی مصرع میں لفظ دیواں میں اخفائے نون ناگوار معلوم ہوتا ہے لیکن لفظ مرجاں کی یہ صورت نہیں ہے (۱۲۲)۔

۴۰۔ "ساکھا"۔ بھاکا

"لفظ 'ساگا' کی اصل 'ساگھا' بمعنی جنگ وجدل ہے میر تقی میر مرحوم کے شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متوسطین ومتاخرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا" (۱۲۳)۔

بھاکا اصل میں بھاشا ہے اور ہندی میں شا اور کھا کا بدلا ہوتا ہے۔ اردو میں فصحا کی زبان پر بیشتر بھاکا اور کمتر بھاشا مستعمل ہے" (۱۲۴)۔

مکتوبات میں "ساگا" اور "ساگھا" لکھا گیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی سے ہوا ہے۔ درست "ساگا" یا ساکھا ہے۔

جلال نے "سرمایہ زبان اردو" میں لکھا ہے :

"ساکھا یک دل اور متفق ہونا چند آدمیوں کا کسی کام پر مثلاً حریف سے لڑنے پر اتفاق کرنا یا اور اس طرح کے کسی امر پر متفق ہو جانا" (۱۲۵)۔

مولف "فرہنگ آصفیہ" نے بھی جلال سے اتفاق کیا ہے (۱۲۶)۔

۴۱۔ "چند متفرق تصریحات"۔

"پرستان" اور "افشاں" اور "عرصہ" بہ معنی "زمانہ" وغیرہم ایسے الفاظ جن کا پتا فرہنگ ہائے متداولہ اور کلامِ اساتذۂ پارس میں نہیں ملتا، عطف واضافت کے ساتھ لانا چاہیے۔ محققینِ اردو کا یہی مشرب ہے۔ شمشیر کو تدبیر و نخچیر کے ساتھ ہم قافیہ کرنا جائز ہے۔ اساتذہ اردو زبان نے اس کا استعمال بکثرت کیا ہے ۔بات کرنی ،راہ چلنی کے استعمال میں کچھ مضائقہ نہیں بلکہ اس کو ترجیح ہے ۔ "کاہے کو" کسی واسطے کی جگہ قابلِ ترک نہیں ہے۔ فصحا نے کہا ہے۔ اٹھا بہ تخفیف و تشدید دونوں طرح مستعمل ہے۔ بر بالکسر وبہ معنی راس ہندی ہے۔ اور بالفتح فارسی، حالتِ ترکیب فارسی میں بالفتح ہی چاہیے اور بغیر ترکیب بالکسر وبالفتح دونوں طرح جائز ہے" (۱۲۷)۔

۴۲۔ "قرن"

قرن بفتحتین صحیح ہے۔ انوری

دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا
توچہ دانی کہ جہاں لی توچہ بے برگ و نوست "(۱۲۸)۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ :

امیر نے انوری کے اس شعر کی بنیاد پر قرن کو بہ فتحتین صحیح لکھا ہے۔ اصل میں ٹیک چند بہار نے "بہار عجم" میں اس شعر کو بہ فتحتین کی سند میں درج کیا ہے ••• غالب قاطع برہان میں بہت پہلے اس پر اعتراض کر چکے تھے ••• ۔

غالب کا بیان : استغفر اللہ ! حرف ندارا فرو خوردن و آوازہ در افگندن کہ انوری قرن را بحرکت رای قرشت آوردہ است، حال آں کہ بی لفظ ای لطف بیان نمی ماند :

ای دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا "(۱۲۹)۔

رشید حسن خاں نے غالب کے اس بیان کو درست قرار دیا ہے۔

۴۳۔ "مایقرا"

"مایقراء کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہے، جیسے کہیں فلاں شخص کا خط مایقراء ہے، خوش نویس نہیں۔ اور کسی چیز کے ساتھ استعمال میں نہیں سنا۔

بحر نے جو ایک شعر میں :

اب مجھ سے القیام کی باتیں نہ کیجیے
دل تم سے پھٹ گیا جگر افگار ہو گیا

"مصرع اولی میں کیجیے کے ساتھ خطاب کیا ہے اور دوسرے مصرع میں تم سے یہ بحر پر موقوف نہیں بلکہ اس زمانے تک اکثر معاصرین بحر جن کا شمار اساتذہ میں ہے اس کے تارک نہ تھے۔ ان کے بعد متاخرین نے اس اختلافِ خطابات سے احتراز کیا میں بھی انھیں تارکین میں ہوں "(۱۳۰)۔

بحر کے مذکورہ شعر کی ردیف غلط کتابت ہو گئی ہے۔ درست اس طرح ہے۔

دل تم سے پھٹ گیا جگر افگار ہو چکا

۴۴۔ "خانہ کعبے کا ترجمہ کعبے کا گھر

"خانہ کعبہ کا ترجمہ کعبے کا گھر، بالکل مستعمل نہیں اور نہایت برا معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ ترکیب اضافی نہیں ہے۔ ترکیبِ توصیفی یا بدل مبدل منہ ہے پھر کعبے کا گھر کیوں کر درست ہو گا "(۱۳۱)۔

۴۵۔ "چپقلش"

"چپقلش بمعنی جنگِ شمشیر "غیاث" میں بفتح لام ہے۔ اور اردو میں بکسر لام انبوہ کے معنوں میں ہے "(۱۳۲)۔

مولف "غیاث اللغات" لکھتے ہیں :

"چپقلش۔ ت۔ بفتح اول و سکونِ باے فارسی و ضم قاف و فتح لام و شین معجمہ، جنگِ شمشیر را گویند۔ از لغاتِ ترکی "(۱۳۳)۔

"نور اللغات" میں "بالفتح و ضم سوم و فتح چہارم" درج ہے (۱۳۴) اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اردو میں بالفتح و فتح سوم و کسر چہارم بھی زبانوں پر ہے"۔ مولف نے داغ اور اختر کا ایک ایک شعر بھی سند میں دیا ہے۔

داغ۔ ہوئی لوگوں میں چپقلش کیا کیا
رہی آپس میں کش مکش کیا کیا

اختر۔ ایک تم اور لاکھ غمزہ و ناز
بزم میں چپقلش بلا کی ہے

"فرہنگِ آصفیہ" میں "چپقلش" کے معنی لڑائی، جھگڑا، ٹنٹا، تکرار، راڑ، ردوبدل، قضیہ، بک بک، جگہ کی تنگی، انبوہ، بھیڑ بھاڑ درج ہیں (۱۳۵)۔ اس کے علاوہ بیشتر فارسی لغات میں یہ لفظ نہیں ہے۔ امیر سے پہلے یہ لفظ صرف بکسر لام اور صرف انبوہ کے معنوں میں مستعمل تھا امیر نے اسی بنیاد پر کہا ہے کہ اردو میں بکسر لام انبوہ کے معنوں میں ہے۔ لیکن بعد میں اس لغات کے معنی میں وسعت ہوئی۔ اردو میں اب اصل معنی یعنی تلوار کی لڑائی تو ختم ہو گئی اس کی جگہ تنگی جھگڑا انبوہ وغیرہ مستعمل ہیں۔

۴۶۔ "مدفن"

"مدفن بکسر فالغتہ صحیح پھر موزوں کرنے کو کون منع کرتا ہے اچھا نہ معلوم ہو نہ کہیے۔ میں نے بھی کبھی نہیں کہا" (۱۳۶)۔

اس لفظ سے متعلق امیر کی رائے سے مولف "نور اللغات" (۱۳۷) اور "فرہنگِ آصفیہ" (۱۳۸) نے اتفاق کیا ہے۔ مولف "نور اللغات" نے اس ذیل میں امیر کا شعر بھی درج کیا ہے جس میں "مدفن" باندھا گیا ہے۔

ادھر بھی کرم اے نسیم بہاری
ترستا ہے پھولوں کو مدفن کسی کا

مولف "فرہنگِ آصفیہ" نے داغ، وحید اور اشک کے شعر درج کیے ہیں۔

داغ: غبار آلودہ ہیں پائے حنائی
مٹا کر آئے ہو مدفن کسی کا

اشک: سینہ میں دلِ مردہ کو میں خاک پکاروں
آواز بھی دی ہے کہیں مدفن سے کسی نے

۴۷۔ "پیرنا اور تیرنا"

"پیرنا اور تیرنا میں آپ کی رائے صحیح ہے۔ میرے ایک شعر کا مصرع تھا۔

تیراک پانی چیر کے سن سے نکل گیا

میرے استاد مرحوم نے 'پیراک' ٹھیک بنادیا تھا"(۱۳۹)۔

بحر لکھنوی نے اپنے رسالے "بحر البیان" میں دونوں لفظوں کو مرادف لکھا ہے۔ یعنی "تیرنا و پیرنا بفتح، شناوری کردن لکھے ہیں(۱۴۰)۔ "فرہنگِ آصفیہ" میں تیرنا اور پیرنا دونوں درج ہے(۱۴۱) کسی امتیاز معنوی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جلال نے "سرمایۂ زبان اردو" میں تیراک کے ذیل میں لکھا ہے کہ: "بعضوں کے نزدیک اس لغت میں بجائے فوقانی بائے فارسی ہے" (۱۴۲)۔ رشید حسن خاں نے جلال کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "گویا جلال اس کے قائل نہیں تھے۔ وہ تیراک کو صحیح سمجھتے تھے(۱۴۳)۔ مولف "نور اللغات" نے یہ وضاحت کی ہے کہ:

"فصحائے لکھنو بے جان چیزوں کے پانی پر چلنے کے لیے تیرنا بولتے ہیں اور جاندار کے لیے پیرنا"(۱۴۴)۔

اثر لکھنوی اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ درست نہیں۔ مرغابی جان دار ہے۔ لیکن اس کے لیے کہتے ہیں کہ پانی میں تیر رہی ہے۔ نہ کہ پیر رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ پیرنا فنِ شناوری ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شے آب پر رہے یا بہے۔ اس کو تیرنا کہتے ہیں"(۱۴۵)۔

مذکورہ بحث میں ہماری رائے یہ ہے کہ تیرنا اور پیرنا کا معنوی فرق مسلم اکثر مواقع پر اس کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ لیکن تیراک و پیراک میں اس کی پابندی لازمی نہیں۔ کیوں کہ دونوں لفظ عموماً انسانوں کے لیے بولے جاتے ہیں۔ غالباً اسی نکتے کے پیشِ نظر جلال نے تیراک کے ذیل میں بعضوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ امیر بھی دونوں کو درست قرار دیتے ہیں۔

۴۸۔ آنچل اور دامن

"آنچل اور دامن کے جھگڑے میں میری رائے یہ ہے کہ دوپٹے اور اوڑھنی وغیرہ اوڑھنے کی چیزوں میں آنچل کہنا چاہئے۔ اور قبا، عبا وغیرہ پہننے کی چیزوں میں دامن کہنا چاہیے۔ مگر شعر محوث عنہ کی تصحیح یوں ہوسکتی ہے کہ شعراء نے گوشۂ دامن کو بھی آنچل کہا ہے"(۱۴۶)۔

امیر نے "امیر اللغات" میں "آنچل" سے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔

"دوپٹے وغیرہ اوڑھنے کی چیز کے (سوا رومال کے) دونوں سرے جو ایک طرف سے دوسری طرف شانے پر ڈالے جاتے ہیں"۔

مومن: آنچلوں سے کہو مقیش کہاں جھڑتا تھا
کب دوپٹا یہ مری طرح گرا پڑتا تھا

گلزار نسیم: آنچل ہوا وہاں حجابِ عارض
(سرا) ہوا یاں نقابِ عارض

اور شعراء نے "دامن" کے کنارے کو بھی "آنچل" کہا ہے مگر زبانوں پر نہیں ہے۔ میر

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میر دریا کا سا اس کا پھیر ہے

نسیم:

دھیان دانتوں کا جو آیا تو یہ سوجھی تشبیہ
صبح نے منہ پہ لیا دامنِ شب کا آنچل (۱۴۷)۔

۴۹۔ یاں واں

یاں اور واں، یا یہاں اور وہاں بروزنِ فاع فصحائے لکھنو اب نہیں لکھتے۔ لیکن آپ چوں کہ دہلی کی زبان پسند کرتے ہیں اور اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لیے آپ لکھیے" (۱۴۸)۔

امیر سے اس موقع پر توارد ہو گیا ہے خود ان کے یہاں یہ الفاظ متعدد جگہ استعمال ہوئے ہیں: مثلاً

مرآۃ الغیب

ڈھونڈے گر عاشق تو یاں معشوق کا پائے وہاں (ص ۱۸)

ہر روش سبزے پہ واں عکسِ گل ولالہ نہ تھا (ص ۳۳)

صنم خانۂ عشق

واں نگاہیں تیز تیز اور یاں تھیں آہیں تیز تیز (۵)

یاں کثرتِ سجود وہاں جوشِ نقشِ پا (۲۱)

ان الفاظ سے متعلق بحث "دستور الفصحا" (۱۴۹) اور "رسالۂ اصلاح" (۱۵۰) میں بھی ملتی ہے۔ دونوں نے اسے متروک قرار دیا ہے۔ اور اس کی جگہ "وہاں" اور "یہاں" بروزن فعل کو درست قرار دیتے ہیں۔

ممکن ہے امیر کے علاوہ دیگر فصحائے لکھنو نے ان کا استعمال ترک کر دیا ہو۔ لیکن امیر نے رام پور کے علمی حالات کے سبب سے یا داغ کے اثر کی وجہ سے اسے بہ کثرت استعمال کیا ہو۔ یا بہت ممکن ہے جس زمانے کا یہ بیان ہے اس وقت ترک کیا ہو اس سے پہلے استعمال ہوتا ہو اور مذکورہ اشعار اسی زمانے کے ہوں۔

(۲)

اس حصے میں "تذکیر و تانیث" سے متعلق امیر کے خیالات پیش کیے جائیں گے۔ امیر کے ان علمی خیالات کو پیش کرنے کے لیے خطوط کے زمانی تسلسل کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۱۔ "خرد کی جنس"

"خرد" کو میں مونث ہی بولتا ہوں۔ اور فصحائے لکھنو سے ہمیشہ اور احباب سے مونث ہی سنا ہے"(۱۵۱)۔

"نور اللغات"(۱۵۲)اور "فرہنگ آصفیہ"(۱۵۳) نے بھی خرد کو مونث ہی لکھا ہے۔ گویا دہلی اور لکھنو دونوں جگہ مونث ہی مستعمل ہے۔

۲۔ "میم"

"میرے نزدیک میم ضرور مذکر ہے اور میں نے مذکر ہی کہا ہے"(۱۵۴)۔

امیر کے نعتیہ دیوان "محامد خاتم النبین" میں میم کو مذکر باندھا گیا ہے۔ شعر یہ ہے۔

جو آنکھیں ہوں تو نامِ پاک سے پیدا یکتائی
کہ آغوشِ احد میں جلوہ گر ہے میم احمد کا

صفیر بلگرامی نے "رشحات صفیر"(۱۵۵) میں اور جلال نے "مفید الشعراء"(۱۵۶) میں مذکر ہی کہا ہے۔ ناسخ کا مصرعہ ہے:

برائے قافیہ رکھا ہے میں نے میم احمد کا

لیکن ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے "تلخیص معلّیٰ" میں "میم کو مونث بولنا چاہئیے" لکھا ہے(۱۵۷)۔ اس بابت رشید حسن خان لکھتے ہیں کہ:

"جن حضرات نے "م" کو مونث بتایا ہے انھوں نے رشک کے یہاں سے سند لی ہے: مصرعہ
لکھ سکو ایسی اگر دو ایک میمیں لطف ہے (۱۵۸)۔

رشید حسن خاں مزید رقم طراز ہیں:

رشک کے دونوں دیوانوں میں حرفِ م بصورتِ واحد کہیں اس طرح نہیں آیا ہے کہ اس کو مذکر یا مونث کہا جائے۔ مندرجہ بالا مصرع میں میمیں حالت جمع ہے۔ اس سے اصولاً واحد کی تذکیر یا تانیث پر استدلال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جیسے لفظ کی جمع لفظیں بھی مستعمل ہے، لیکن اس سے لفظ کے مونث ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں نے ایسا کیا ہے، انھوں نے غلطی کی ہے"(۱۵۹)۔

۳۔ "مردم دیدہ"

"مردم دیدہ مذکر ہے"(۱۶۰)۔

نعیم الحق آزاد شیخ پوری جو آزاد سے پہلے ضو تخلص کرتے تھے۔ امیر اور داغ دونوں سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے بعض مرتبہ وہ ایک ہی مسئلے پر دونوں اساتذہ کی رائے لیا کرتے تھے۔ آزاد نے اس قسم کے خطوط اپنی کتاب "حیات الشعراء"(۱۶۱) میں جمع کر دیے ہیں۔

انھوں نے "مردم دیدہ" کی بابت داغ سے بھی رائے لی تھی۔ داغ اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"مردم دیدہ کے باب میں مجھ کو معلوم نہ تھا کہ جناب غالب مرحوم نے یہ لکھا ہے۔ "مردمان دیدہ" میں جب لکھوں گا مذکر لکھوں گا جمع کے ساتھ جیسا کہ لکھ چکا ہوں صرف مردم میں تامل ہوا کہ عجب طرح کا لفظ ہے۔ نہ اس کی تانیث کان کو کو مزہ دیتی ہے نہ تذکیر اس لفظ کے استعمال سے کی، کا، تھی، تھا سے بچاؤ کا تم کو اختیار ہے۔ تمھارے شعر میں تمھارا کی جگہ تمھاری ہو سکتا ہے چوں کہ ایک اوستاد نے مونث فرمایا ہے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مردمک بلاشبہ مونث ہے۔ حضرت نے بھی مردم اوڑا کر مردمک بنادیا۔ ڈھول مذکر ڈھولک مونث ہے۔ عربی میں انسان آنکھ کی پتلی کو کہتے ہیں فارسی والوں نے اس کا مردم بنادیا۔ دواوین پر نظر رکھو کہیں صرف مردم کو کسی نے مونث باندھ کر لکھا ہو تو اطلاع دینا" (۱۶۲)۔

نعیم الحق آزاد نے "مردم دیدہ" پر حاشیہ لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ غالب کے سامنے جب شاکر کا یہ شعر اصلاح کے لیے پیش ہوا:

" مردمِ چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا
بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہوکر

تو اصلاح میں یوں تحریر فرماتے ہیں: مردم یعنی پتلی مذکر نہیں مونث ہے۔ شعر کو یوں بنا دیا:

نظر آتی ہے جہاں مردمک چشمِ سیاہ
بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہوکر " (۱۶۳)۔

"مردمان دیدہ" پر بھی حاشیہ لکھا ہے جس میں یہ شعر درج ہے۔

ماتم ہے طفلِ اشک کا یا دل کا سوگ ہے
کیوں <u>مردمان</u> چشم سیہ پوش ہوگئے (۱۶۴)۔

۴۔ قامت،

"قامت، متاخرین مونث کا استعمال کرتے ہیں۔ ناسخ اور آتش کے وقت تک مذکر کہا گیا ہے" (۱۶۵)۔

مولف نور اللغات لکھتے ہیں: "قامت لکھنو میں مونث، دہلی میں مذکر۔

بحر لکھنوی: اڑا لے گئی سرو سے قمریوں کو
قیامت ہے، بوٹا سی قامت کس کی

داغ دہلوی: قامتِ موزوں قیامت ہے ترا
کیا ہے گر سروِ صنوبر بڑھ چلے" (۱۶۶)۔

فرہنگِ اثر میں ہے کہ : "لکھنو میں مونث، دہلی میں مذکر بولتے ہیں" اس کے علاوہ اثر لکھنوی لکھتے ہیں : لکھنو میں اختلاف ہے۔ بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث جلال مونث کی تائید میں ہیں پلیٹس نے مونث لکھا ہے" (۱۶۷)۔

جلال لکھتے ہیں کہ :

"تحقیق یہ ہے کہ آتش کے خاندان میں مذکر اور ناسخ کے خانوادہ میں مونث ہے ۔ قامت کے معنی میں چوں کہ درازی اور شان کا پہلو موجود ہے اس لیے مذکر ہونا چاہیے۔ دہلی کے اساتذہ کا یہی طریقہ ہے :

تفاوت قامت یارو قیامت میں ہے کیا ممنوں
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

ہوئے وہ کب قائل قیامت جو تیرا قامت نہ دیکھ لیں گے
رہیں گے رویت کے بلکہ منکر جو تیری صورت نہ دیکھ لیں گے (۱۶۸)۔

احسان دانش کی رائے یہ ہے کہ "قامت" دونوں صورتوں میں مستعمل ہے" (۱۶۹)۔ "فرہنگ آصفیہ" میں مذکر لکھا گیا ہے۔ اور لکھنو و دہلی کی اسناد پیش کی ہیں جو مذکر کی تائید میں ہیں۔

دبیر : تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ قامت سرک گیا
ٹوپی گری زمین پہ منکا ڈھلک گیا

ذوق : آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہو پست قامت ہو تو ہو

مولف : ترے قامت کو دیکھتے ہیں ہم
شرح وحدت کو دیکھتے ہیں ہم (۱۷۰)۔

غالبؔ نے بھی مذکر باندھا ہے :

تیرے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

یہ لفظ مختلف فیہ ہے۔ ہماری رائے میں ناسخ اور آتش کے وقت تک یہ لفظ مذکور ہ استعمال ہو تا رہا لیکن بعد میں لکھنو، اور دہلی دونوں جگہ مونث بھی استعمال کیا جانے لگا۔ جلال نے "سرمایہ زبان اردو" کے بعد جب "مفید الشعراء" شائع کی تو اسے مختلف فیہ لکھا اور بہ صراحت یہ بھی لکھا کہ "فی زماننا اکثر متاخرین قامت کی تانیث ہی کے قائل ہیں اور مولف کے عندیہ میں بھی مونث ہے"۔

۵۔ "مد"

"مد بھی مختلف فیہ ہے۔ مگر میرے نزدیک مدِ حساب مونث ہے۔ مداتِ حروف مذکر" (۱۷۱)۔

"فرہنگ آصفیہ" میں بھی مونث کہا گیا ہے۔ سند میں کئی اشعار ہیں (۱۷۲) : شہیدی

شبِ معراج چڑھ کر عرش پر دم میں اتر آیا
بیاں اس قلزم معنی کے ہو کیا جذبہ اور مد کا"

البتہ "نور اللغات" مذکر ہے اور محسن کا شعر سند میں دیا گیا ہے۔

مری طبع رواں کا پھر اسی گھاٹ اب اتارا ہے
تماشا دیکھیے بحر سخن کے جزر کا مد کا (۱۷۳)

مؤلف "نور اللغات" لکھتے ہیں کہ اس معنی میں تذکیر اور تانیث میں اختلاف ہے (۱۷۴)۔

ان لغات کی روشنی میں دیکھا جائے تو امیر کا بیان صائب ہے۔ اور "مد" کے متعلق ان کی رائے فیصلہ کن ہے مبہم نہیں۔ احسان دانش "مد" کی بحث میں لکھتے ہیں۔

"مد، علامت اشباع درخت کی رطوبت، مدوجزر دریا کے چڑھاؤ یا طغیانی کے معنوں میں مذکر جیسے نیم کا مد الف کا مد وغیرہ لیکن نوکری یا حساب یا تحریر کے معنی میں مونث ہے:

برق: ہر عضو فرد فرد کہے گا تمام حال
ہر رگ بدن میں مد ہے ہمارے حساب کی

برق کا مصرعہ: بے کارم و باکارم چوں مد حساب "(۱۷۵)۔

۶۔ "برس"

"برس مذکر ہے"(۱۷۶)۔

"رشحات صفیر" میں صفیر بلگرامی نے لکھا ہے کہ :

برس کی جمع برسیں غلط ہے : "بعض ناواقف برس کے لفظ کو جو بمعنی ۲ سال ہے، مونث سمجھ کر اس کی جمع ین سے برسیں کرتے ہیں، حالاں کہ برس مذکر ہے اور اس کی جمع برسوں ہوگی"۔

رند : اب تک وہ ایک ایک سے کرتے ہیں تذکرہ
ہر چند ترکِ عشق کو برسوں گزر گئے " (۱۷۷)۔

رشید حسن خاں نے صفیر بلگرامی کے بیان سے اختلاف کیا ہے وہ لکھتے ہیں :

"صفیر کی یہ رائے درست نہیں ہے : کسی بھی لفظ کی جمع جب ین لگا کر بنائی جائے گی اور وہ مونث مستعمل ہوگی تو اس سے واحد کے مذکر ہونے کی نفی نہیں ہوگی۔ جیسے لفظ مذکر ہے، اس کی جمع لفظیں بھی مستعمل ہے اور الفاظ بھی۔ لیکن اس کی بنا پر لفظ کا مونث ہونا لازم نہیں آتا۔ نہ لفظ کے مذکر ہونے کی بنا پر اس کی جمع لفظیں کو غلط کہا جاسکتا ہے۔ استعمالِ عام میں برس کی جمع برسوں بھی مستعمل ہے اور

برسیں بھی، بلکہ بعض جگہ برسوں کی بجائے برسیں بہتر معلوم ہوتا ہے۔ رند کے مندرجہ بالا شعر میں یہی صورت ہے" (۱۷۸)۔

۷۔ "تو"

"تو۔ کی تذکیر و تانیث بھی کیا مگر جس محل استعمال کی رو سے آپ پوچھتے ہیں اس جگہ تو ہی کہیں گے کہ "اس نے مجھے تو کہا" لیکن اس سے تذکیر و تانیث تو کی نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس جگہ لفظ 'لفظ' مکدر ہوتا ہے۔ جیسے اس نے مجھے عورت کہا دیکھیے عورت کو قطعی مونث ہے۔ وقس علی ہذا" (۱۷۹)۔

۸۔ "دشنام"

"دشنام، زیادہ مونث ہے مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر کہا ہے فلہذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے۔ ناسخ

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی
تو گویا پیمبر کو دشنام دی

ولہ

بارہا میں گیا ہوں نذرِ امام
کبھی مجھ کو نہ دی کوئی دشنام

ظفر

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے
خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے
ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہم کو
کاہے کو سننے کو دشنام کسو کے آتے" (۱۸۰)۔

مؤلف "نوراللغات" نے مونث لکھا ہے اور یہ صراحت بھی کی ہے کہ "دہلی میں مذکر ہے" (۱۸۱)۔ سند میں ناسخ اور ظفر کا شعر درج کیا ہے۔

"معین الشعراء" میں ہے کہ دہلی میں مذکر اور لکھنو میں مونث بولتے ہیں" (۱۸۲)۔ اور ظفر کا شعر درج کیا ہے۔ ان کے علاوہ "فرہنگِ آصفیہ" نے بھی مونث لکھا ہے (۱۸۳)۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ "یہ لفظ دونوں جگہ بہ تانیث مستعمل ہے 'ظفر کا شعر شاذ کا حکم رکھتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ" میں بھی صرف بہ تانیث درج ہے" (۱۸۴)۔ اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امیر کی رائے اس لفظ سے متعلق ان کی بالغ نظری پر دلالت کرتی ہے۔

۹۔ "ایجاد"

"ایجاد مذکر ہے سند کے شعر ذیل میں دیکھیے۔ آج کل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں اور جا بجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں مونث ہے مگر کلام میں کہیں مونث کا پتا نہیں چلتا اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں ہے۔

نسیم دہلوی: قبر پہ آیا دینے کو مبارک باد مرگ
یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

میر: یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستان میں
راتوں کو لگا رہنے صیاد گلستان میں

اگر چہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا وہ سند کے لیے پوری طور سے کافی نہیں ہو سکتا۔ مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے۔ ثقات کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے۔

غافل لکھنوی: اتنی بینائی کہاں دیکھیں جو سیر جزو و کل
عالم ایجاد ہیں تو سیکڑوں ایجاد ہیں " (۱۸۵)۔

امیر نے "امیر اللغات" میں ایجاد کے ذیل میں نسیم اور غافل کے علاوہ داغ کا شعر بھی سند میں پیش کیا ہے (۱۸۶)۔

ایجاد ستم سے ہمیں برباد کریں گے
گر تیں دن ایسے ہی وہ ایجاد کریں گے

فرہنگ آصفیہ میں بھی "ایجاد" کو مذکر ہی کہا گیا ہے۔ اور سودا کا یہ شعر سند میں ہے :۔

ہائے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے
نسخے میں معجون زر اںباد ہے (۱۸۷)۔

امیر نے اس خط میں لفظ "ایجاد" کے متعلق داغ کے قول کو شک کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ "سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں کہیں مونث کا پتا نہیں چلتا اگر ایک معتبر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے۔ امیر کے اس بیان میں ایک حیرت بھی چھپی ہوئی ہے اس لیے کہ دہلی کے بیشتر شعراء کے ہاں یہ لفظ مذکر ہی استعمال ہوا ہے۔ داغ کے ایک خط سے اس لفظ سے متعلق جھگڑے کا پتا چلتا ہے۔ وہ احسن مارہروی کو لکھتے ہیں :

"ایک اشتہار آپ اس گلدستے میں چھاپ دیجیے کہ اکثر استاد کے شاگرد، بجائے خود استاد بن کر، اپنی

غزلیں بے اصلاحی چھپوا دیتے ہیں اس میں ••• غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی شخص نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا، حالاں کہ اہل دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں" (۱۸۸)۔

احسن مارہروی تاریخ نثر اردو (نمونہ منثورات) میں اس لفظ کی بابت رقم طراز ہیں :

"لفظ ایجاد کہ اس کو تمام یا بہ کثرت شعرائے دہلی و لکھنو نے مذکر استعمال کیا ہے، لیکن اب چند شعراء کے سوا اس کی تذکیر پر ہر شخص کو تامل ہے۔ یہی حال لفظ فہم وغیرہ کا ہے" (۱۸۹)۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ : "یہ لفظ ایک زمانے میں اساتذہ دہلی و لکھنو کے نزدیک بالاتفاق مذکر تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا" (۱۹۰)۔

امیر نے "ایجاد" سے متعلق بیان میں دہلی و لکھنو کے معتبر شعراء کے اشعار سند میں دیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں دبستانوں کے علمی و ادبی مسائل سے آگاہ تھے۔ اور آزادی کے ساتھ زبان اور اس کی جزیات پر گفتگو کر سکتے تھے۔

۱۰۔ "ستارہ مشتری"

"مشتری ستارہ مذکر ہے یا مونث واضح ہو کہ یہ ستارہ مونث ہے اور جہاں کہیں سخن دانوں اور سخن وروں نے استعمال بہ تذکیر کیا ہے۔ وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے جس کو مشتری سے تشبیہ دی ہے جیسے ناسخ کے اس مطلع پر :۔

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

ان کے شاگرد رشید مرزا محمد رضا برق نے جو مصرعے لگائے ہیں اس میں قمری کو جس کی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں بتذکیر استعمال کیا ہے تو بات یہی ہے کہ وہاں قمری طائر مقصود نہیں ہے۔ وہ تضمین یہ ہے۔

پروانہ ہوں ازل سے سراج منیر کا
قمری ہوں سرو باغ علی کبیر کا
میں نغمہ سنج ہوں چمن بے نظیر کا
بلبل ہوں بوستانِ جناب امیر کا

جہاں تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ آئے گا وہاں مشتری سے دولھا ہی مقصود ہوگا جیسے قمری سے برق کے شعر میں عاشق یا خود متکلم و مصنف مراد ہے" (۱۹۱)۔

امیر نے "ستارہ مشتری" کو مونث قرار دیا ہے۔ ان کے بقول "جہاں کہیں سخن دانوں اور سخن وروں نے استعمال بہ مذکر کیا وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے"۔ امیر کے اس بیان کی تصدیق مولف "نور اللغات" کے بیان سے ہوتی ہے جنھوں نے سند میں منیر کا شعر درج کیا ہے

جس میں مشتری بمعنی ستارہ مشتری نہیں بلکہ خریدار، مول لینے والا ہے۔

مشتری حسن کے بکتے ہیں تمھارے ہاتھوں
آج نیلام ہے یوسفؑ کے خریداروں کا

مولف "نور اللغات" نے مشتری بمعنی خریدار مذکر اور بہ معنی ستارہ مشتری بھی مذکر لکھا ہے۔ اس کی سند میں بھی منیر کا شعر نقل کیا ہے۔

ہوا ہے مشتری محبوس گویا برج عقرب میں
نظر آتے ہیں اہلِ علم و فضل اس سال زندانی (۱۹۲)۔

"فرہنگ آصفیہ" میں بھی مشتری بمعنی ستارہ مشتری اور بمعنی خریدار، مول لینے والا دونوں مذکر لکھے ہیں (۱۹۳)۔
جلال "کار آمد شعراء" میں لکھتے ہیں:
"جملہ ستاروں کے نام مذکر بولے جاتے ہیں سوا زہرہ و ناہید و مشتری و برجیس کے کہ یہ چاروں اسم مونث آتے ہیں" (۱۹۴)۔
"نور اللغات" میں جلال ہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مونث ہے۔ اور محسن کا یہ شعر سند میں درج کیا ہے۔

خواب میں بھی جو وہ زہرہ سی جبیں پیش آئے
مشتری طالع کنعاں کی زحل ہو جائے (۱۹۵)۔

مشتری بمعنی ستارہ، مونث کی سند میں ناسخ کے یہ دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

نقد جاں لائی ہے تالے مول نور اس ماہ سے
مشتری رکھا ہے نام اپنے برجیس کا
تیرا غلام کچھ مہ؟ کنعاں فقط نہیں
کہتی ہے مشتری بھی تیری خرید ہوں

مذکورہ جائزے سے یہ رائے بنتی ہے کہ یہ لفظ مختلف فیہ ہے لیکن امیر اس سے متعلق گمراہ کن رکھتے تھے اور اس کے مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے تشفی بخش جواب بھی۔

۱۱۔ "دولت سرا"

"دولت سرا مونث ہے۔ دولت سرا کی جگہ دولت کدہ مناسب ہے" (۱۹۶)۔

مولف "فرہنگِ آصفیہ" (۱۹۷) اور "نور اللغات" (۱۹۸) مذکر لکھتے ہیں۔

ناسخ: بچے اے غافلو سیل حوادث سے نہیں ممکن
کرو بالفرض اگر دولت سرا تعمیر لوہے کی

(۳)

اس حصے میں لغت کے مسائل سے متعلق امیر کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔

ا۔ "بانگی"

"بانگی بمعنی نمونہ کو آپ نے دو جگہ اپنے خط میں "باندگی" بہ اضافۂ دالِ مہملہ بعدِ نون لکھا ہے۔
حالاں کہ دال اس میں نہیں ہے" (۱۹۹)۔

مولف "نوراللغات" لکھتے ہیں :

بانگی (ھ بروزن خانگی۔ باعلانِ نون) مونث۔ نمونہ چاشنی :

رنگین : یہ دوگانا میری ایسی ہی پری ہے خانگی
جتنی ہیں حوریں بہشتی سب کی ہے یہ بانگی

داغ : اے مہ فروش ہم نوا گائیں گے دام پھر
تو بانگی دکھا ہمیں پہلے شراب کی (۲۰۰)۔

۲۔ تیوری اور تیور

"تیوری" میں جو بحث تم نے لکھی ہے وہ میں نے دیکھی۔ فعلن کے وزن پر فقط رشک نے نہیں کہا ہے بلکہ انشا اور سرور، نکہت، ناسخ، وزیر، صبا، ان سب کے کلام میں اسی وزن پر پایا گیا ہے۔ البتہ یاد پڑتا ہے کہ داغ "تیوری" کو اس طرح پڑھتے تھے کہ تحتانی اور واو دونوں میں سے کوئی تائے ترشت مکسور کے ساتھ تلفظ میں مخلوط نہ ہوتا تھا۔ یائے تحتانی کو مجہول اور واو کو ساکن ادا کرتے تھے اور شاید ان کے کسی شعر میں بھی یوں نہیں موزوں ہے کہ وہ اس وقت یاد نہیں مگر تلاش سے مل سکتا ہے۔ اور تعین اس بات کی کہ اس کی اصل "تیوری" بضم واو ہے یہ بھی دشوار ہے، بخلاف "پیارا" کے کہ اس کو قدما نے بفتح یائے تحتانی کہا ہے، گو اب کثرت استعمال سے وہ فتحہ فقط بو دیتا ہے اور پورا پڑھا نہیں جاتا، یہاں زبان کا کوئی لغت مبسوط موجود نہیں۔ پنڈت نرائن ملازم ریاست ایک مرد قابل ہے اور "دفتر امیر اللغات" میں اکثر الفاظ کی تحقیق اس سے کی جاتی ہے۔ وہ آج کل بیمار ہے۔ میں نے حالت بیماری میں بھی اس کو بلوا لیا اور پوچھا تو کوئی بات اچھی طرح سے نہ ہوئی۔ وہ صحیح ہوتا تو تلاش کر کے کچھ بتاتا۔ "تیور" اور "تیوری" میں لفظاً اور معناً قرب ظاہری اور تیور میں تو واو مفتوح ہے۔ پھر کسی بناء پر تجویز کیا جائے کہ اصل میں "تیوری" کا واو مضموم ہے اور بر تقدیر تسلیم ضم واو بھی، "پیارا" پر اس کا قیاس قیاس مع الفارق ہے۔ غور سے دیکھو کہ "پیارا" میں یائے تحتانی جو زبانِ حال میں یائے عجمی مکسور کے ساتھ

مخلوط التلفظ ہے، اصل میں استعمال قدما سے مفتوح معلوم ہوئی ہے۔ خلاف "تیوری" کے اس میں یاے تحتانی تو کسی حالت میں متحرک نہیں ہے۔ اگر احتمال ہے تو واو کے متحرک ہونے کا ہے۔ پھر "تیور" کا "پیارا" پر قیاس کیوں کر ٹھیک ہو سکتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جو تمہارے خیال میں ہے کہ جب "پیارا"، ہمارا کے وزن پر درست ہے تو "تیوری" چوری کے وزن پر درست ہونا چاہیے اور دونوں کو ایک قاعدے کے تحت میں ضبط کرنا چاہیے۔ ہر ملک میں اب یہ خیال میری رائے ناقص میں اقرب الی الصواب نہیں ہے۔ اور کچھ "تیوری" ہی پر موقوف نہیں، ڈیوڑھی، چیونٹی، نیولہ، نیوتا، بیورا اور بہت سی اس کی امثال کا یہی حال ہے۔ اگر تم "تیوری" کو چوری کرنے کے وزن پر لانا قاعدے کے موافق نہ جانو اور جیسا کہ متقدمین و متاخرین نے استعمال کیا ہے اس کو صحیح مانو تو سر دست تو اس قدر اس لفظ کی تحقیق میں کافی ہے"(۲۰۱)۔

داغ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"توری اہلِ لکھنو کہتے ہیں۔ دلی میں تیوری بروزن خاوری ہے"(۲۰۲)۔

امیر نے مذکورہ بیان میں داغ کے جس شعر کی طرف اشارہ کیا وہ یہ ہے۔

چڑھاؤ پھول مری قبر پر جو آئے ہو
کہ اب زمانہ گیا تیوری چڑھانے کا

"نور اللغات" میں "تیور" بروزنِ "زیور" لکھا ہے۔ اور سند میں امیر اور داغ کے شعر پیش کیے ہیں۔

امیر : کب آنکھ اٹھاتا ہوں کہ آتے نہیں تیور
کب بیٹھ کے اٹھتا ہوں کہ چکر نہیں آتا

داغ : غیر کے آتے ہی وہ تیور نہ تھے
تم کو انھیں باتوں نے رسوا کیا (۲۰۳)

"تیوری" کے متعلق مولف "نور اللغات" لکھتے ہیں کہ "دہلی میں بروزن فاعلن اور لکھنو میں بروزن فعلن ہے" اس بابت میر کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تونے یہاں دم نکل گیا (۲۰۴)۔

"علی اوسط رشک "نفس اللغۃ" میں "تیوری" کو "بروزنِ دوری، بروزنِ" عروضی لکھتے ہیں (۲۰۵)۔

۳۔ نشہ، شبہہ

"نشہ "بروزن" قشقہ " صحیح ہے اور نشا بروزن خطا غلط صریح اور مؤلف "غیاث اللغات" نے جو نشہ بروزن بچہ لکھا ہے۔ میں نے اور کسی لغت میں نہیں دیکھا۔ غالباً ان سے مسامحہ ہوا۔ واللعلم عنداللہ۔
"شبہہ "بضم شین معجمہ و سکون بائے موحدہ و فتح ہائے ہوز و ہائے مختفی صحیح ہے۔ اور عمدہ کو اس کا ہم وزن جانیے۔ بمعنی شک اور کسی وزن پر نہیں آتا۔ البتہ یاد آتا ہے کہ "شبہہ "بروزن کلمہ شاید اس کی جمع آئی ہو مگر فارسی اور اردو میں اس کا استعمال نہیں ہے"(۲۰۶)۔
"نشے "میں ی سے پہلے ہمزہ مقروع چاہیے"(۲۰۷)۔

"فرہنگ انندراج"

نشا بفتح اول و سکون ثانی و ہمزہ و اینکہ بعد خط مستقیم خط کج منحنی نویسند بے جا است و اگر بالفرض نویسند بالائے خطِ مستقیم نویسند تا اشارت شود کہ خطِ مستقیم در ینجا الف نیست بلکہ ہمزہ است و ایں لفظ را بروزن سرائے گفتن غلط است و بصورتِ پشہ نوشتن ہمہ خطا است میر زا بیدل"۔

آخرز گریہ نشاء شوقم بلند شد
اشک آنقدر چکید کہ جام شراب داد (۲۰۸)

نشاء اور نشئے کو عام شعراء فاع کے وزن پر کہتے ہیں۔ مثلاً

ع۔ نشا پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

اس مصرعے میں نشا بروزن خطا ہے جس کو امیر نے غلط قرار دیا ہے۔ اس کا استعمال جس طرح ناسخ نے کیا ہے وہ صحیح ہے۔

نشاء ہے مجھ کو بادۂ خم غدیر کا

"نور اللغات" میں ہے :

"نشاء (ع۔ بالفتح و فتح حرف سوم) الف کے بعد ہمزہ لکھنا غلط ہے۔ الف پر ہمزہ اس غرض سے کہ یہ الف نہیں ہے بلکہ ہمزہ ہے مضائقہ نہیں ہے۔ ... فارسیوں نے بمعنی اس کیفیت کے استعمال کیا جو شراب یا دیگر مسکرات کے استعمال سے ہوتی ہے اردو میں اس کا املا نشہ ہے"(۲۰۹)۔

"فرہنگ آصفیہ" میں مذکورہ بیان کی تائید ملتی ہے۔ پھر اس لفظ کی بحث میں لکھتے ہیں :

"اس لفظ کی تحقیق میں اختلاف ہے۔ صاحب "نفائس" اس کو فارسی قرار دیتے ہیں صاحبِ "بہارِ عجم" اس کو اخیر میں ہمزہ کے ساتھ لکھ کر عربی ہونے کا شبہ ڈالتے ہیں۔ صاحبِ آب حیات نشاہ، لکھتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نشا اس کا مخفف اور یہ دراصل فارسی ہے۔ صاحبِ 'غیاث اللغات' اس کا

املا نشہ بروزن پشہ لکھ کر عربی و فارسی ہونے کا احتمال پیدا کرتے ہیں ان کے نزدیک الف یا ہمزہ سے لکھنا محض غلط ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشدید حذف ہو کر نشہ ہو گیا۔ صاحبِ "تنقیح اللغات" بھی انھی کے ہم زبان ہیں مگر انھوں نے مشدد ہونا ثابت نہیں کیا پس ان اختلافات کی وجہ سے ہم نے بھی اس کو اردو قرار دے کر اساتذہ کے کلام کے موافق نشہ فارسی ہی مانا اور اسے دوسرے موقع پر یعنی ترتیب سے اپنی جگہ پر دینا بھی مناسب سمجھا"(۲۱۰)۔

مولف "نوراللغات" لکھتے ہیں :

عربی میں نشوۃ(مسی) تھا۔ فارسی میں بالفتح و فتح حرف سوم (جس کی آواز ہمزہ کی ہے) مستعمل ہے۔

مرزا بیدل : آخر ز گریہ نشاء شوقم بلند شد
اشک آنقدر چکید کہ جام شراب داد

فارسی میں املا نشاء اور اردو میں نشہ ہے۔بول چال میں یہ لفظ بفتح اول و دوم و سکون سوم ہے۔اور بعض مستند شعراء نے اسی طرح نظم کیا ہے"(۲۱۱)۔

ذوق : رات سے مے خانہ میں ساقی جو نشہ میں بکا
خسِ شیشہ کو لگا کہنے خسِ جام شراب

رند : مے حسن کی کیا ہوئیں وہ ترنگیں
نشے رند نے کیا اتارے تمھارے

میر : کھلا نشہ میں جو پگڑی کا پیچ اس کے میر
سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا

مولف "نوراللغات" نے اس لفظ سے متعلق قابلِ قدر معلومات فراہم کی ہیں۔اسی بحث میں وہ لکھتے ہیں۔

"متاخرین کے کلام میں بالفتح و فتح سوم ہی پایا جاتا ہے اور اس زمانہ کے فصحا بفتح اول و دوم کو غلط سمجھے ہیں۔

نشہ میں ہم نے کرلی توبہ
ہوش میں آؤ کیسی توبہ

ناسخ : جو کچھ کہ دل میں ہے وہ ہے جاری زبان پر
ہے نشہ مجھ کو بادۂ خم غدیر کا (۲۱۲)

اس لفظ سے متعلق قابلِ لحاظ تعداد میں امثال "نوراللغات" اور "فرہنگِ آصفیہ" میں ملتی ہیں۔ جو امیر کے بیان کی تسلی بخش تشریح فراہم کرتی ہیں۔

۴۔ "ہمزہ"

"ہمزہ وہ خطِ مستقیم ہے جو ابتدائے لفظ میں متحرک ہے یا درمیانِ لفظ یا آخرِ لفظ میں بالفِ سکون ضغطۂ زبان سے پڑھا جائے اور علامت کے واسطے ایسے خطوط مستقیمہ یعنی انھوں پر ایک خطِ منحنی بنا دیتے ہیں۔ عرف میں اس خط کو ہمزہ کہتے ہیں" (۲۱۳)۔

"نور اللغات" میں ہے کہ "ہمزہ وہ الف جو کھینچ کر پڑھا جائے۔ (فقرہ) شروع میں آکر ہمزہ الف ہو جاتا ہے" (۲۱۴)۔ اس کی تذکیر و تانیث کی بابت دیکھا جائے تو یہ مختلف فیہ ہے۔ کوئی مذکر کہتا ہے کوئی مونث۔ احسان دانش اپنی کتاب "تذکیر و تانیث" میں لکھتے ہیں :

"اپنے املا کی صورت اور ہائے ہوز پر ختم ہونے کی وجہ سے نیز امیر حمزہ سے صوتی مطابقت کے باعث مذکر ہی بولا جاتا ہے" (۲۱۵)۔

۵۔ "پذیر یا پزیر"

"پزیر میرے نزدیک زائے ہوز سے لکھنا بہتر ہے۔ اس لیے کہ لفظ فارسی ہے اور فارسی میں بلا ضرورت وہ حرف لانا جو فارسی میں نہیں آتا مناسب نہیں (۲۱۶)"۔

فرہنگِ آصفیہ میں کہ :

"ز" عربی کا گیارواں، فارسی کا تیرہواں اردو کا سولھواں حرف جسے زائے معجمہ۔ زائے منقوطہ۔ زائے ہوز کہتے ہیں ••• یہ حرف سنسکرت یا ہندی میں اپنے خاص تلفظ کے ساتھ نہیں پایا جاتا" (۲۱۷)۔

امیر نے اپنے بیان میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اصل میں یہ "ذ" اور "ز" کی بحث ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے "جامع القواعد" حصہ نحو میں اس سے بحث کی ہے اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے اس موضوع سے متعلق خیالات کو بالتخصیص پیش کیا ہیں۔ وہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ :

"عربوں نے ایرانیوں سے استاد ہی سنا اور اسی طرح بولنے اور لکھنے لگے۔ خود ایرانیوں میں بعد کو وہ "ذ"، "د" ہو گئی یا بعض لفظوں میں "ذ" کا تلفظ 'ز' سے بدل گیا مگر آذر، گذشتن، پذیرفتن، تذرو، کاغذ کو ایرانی پرانی عادت کے مطابق 'ذ' ہی سے لکھتے رہے۔ ایک گنبد ایسا لفظ جو 'ذ' اور 'د' دونوں طرح بولا اور لکھا جاتا ہے" (۲۱۸)۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی "گذر" اور "گذار"، "ز" اور "ذ" دونوں سے لکھنا درست قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح "آذر" اور "پذیرا" کو "ذ" سے لکھنے کو درست مانتے ہیں۔ اسی حوالے سے وہ یہ بیان دیتے ہیں کہ :

"ان فارسی لفظوں کے علاوہ جن لفظوں میں "ذ" آتی ہے وہ عربی سے آئے ہیں۔ اب چاہے وہ ٹھیٹ عربی ہوں یا کسی اور زبان سے عربی میں مستعار ایسے لفظوں میں عربی املا کی پیروی لازم ہے گو کہ آواز کے لحاظ سے اردو میں ایک اکیلی ز ہی ذ، ض اور ظ کی قائم مقام ہے" (۲۱۹)۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ان خیالات و نظریات کو رشید حسن خاں نے نہایت مدلل انداز سے رد کیا ہے۔

"پذیرفتن کے معنی ہیں: قبول کرنا اس میں ذال ہے اس کے سارے مشتقات میں ذال آئے گی، جیسے
پذیرفتہ، پذیرا، پذیرائی، دل پذیر، اثر پذیر، رقم پذیر، جلا پذیر، خلل پذیر

غالب: جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

مومن: جلا پذیر ہو میرے غبارِ دل سے، تو زنگ
فنائے آئنہ کے بعد بھی نہ ہو زائل (۲۲۰)۔

۵۔ "شرف" یا "شرف"

"بلبلِ باغِ تصوف شاہ شرف الدین ولی

سوال: میں نے اس مصرعے میں "شرف" بالتسکین استعمال کیا ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: میرے نزدیک "شرف" بسکون رائے مہملہ صحیح نہیں ہے۔ نہ لغات موجودہ و متداولہ میں
نہ اساتذۂ مستند کے کلام میں دیکھا" (۲۲۱)۔

مولف "نور اللغات" لکھتے ہیں: "بفتح اول و دوم صحیح و بہ سکون دوم غلط ہے"۔ گویا امیر کی تائید کی ہے۔ "شرف" یا "شرف" دونوں الفاظ اپنے الگ معنی رکھتے ہیں۔ "شرف" سے مراد "بزرگی میں کسی پر فوق لے جانا" جب کہ "شرف" "بلندی، جائے بلند وغیرہ (۲۲۲)۔

۶۔ "چھڑے"

چھڑے بمعنی تنہا البتہ میں نے لکھنو میں فصحا سے نہیں سنا اور کلام میں بھی نہیں دیکھا" (۲۲۳)۔

"فرہنگِ آصفیہ" (۲۲۴) اور "نور اللغات" (۲۲۵) میں یہ لفظ انھی معنوں میں موجود ہے جس کی طرف امیر نے اشارہ کیا ہے۔ اور دونوں مؤلفین نے میر کے شعر کو سند میں پیش کیا ہے۔ لکھنو سے کوئی مثال نہیں دی ہے۔

میر: فرہاد و قیس ساتھ تھے سب کب کے چل بسے
دیکھیں نباہ کیوں کہ ہو اب ہم چھڑے رہے

۷۔ "اعجاز محسنی اور مترادفات اللغات"۔

'اعجاز محسنی' کو سرا سری جو دیکھا تو دو ہی چار دن جا بجا نظر ڈالنے میں کچھ کچھ قبائح معلوم ہوئے جن کو بطور نمونہ علیحدہ ورق پر عرض کرتا ہوں اور مترادف اللغات کو تفصیل سے دیکھنے کی حاجت نہیں، سرے سے اس پر یہ مراد ہے کہ مترادف الفاظ اس میں بہت کم ہیں اور متبائن اور منقول اور مجاز اور مرتجل بہت ہیں۔ اس لیے کہ مترادف ان دو یا زیادہ لفظوں کو کہتے ہیں جو ایک اعتبار سے ایک چیز

پر دلالت کریں۔ امام فخر الدین رازی نے کہا ہے ،وحدتِ اعتبار کی قید سے وہ الفاظ نکل گئے جو دو اعتبار سے ایک معنی پر دلالت کرتے ہوں جیسے سیف و صارم ، یہی دو لفظ مثال میں آئے ہیں اور کہا ہے کہ ایسے لفظ متبائن ہیں نہ مترادف۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ دونوں لفظ ایک معنی پر دلادت کرتے ہیں (لیکن) دو اعتبار سے۔ اس لیے کہ سیف ذات پر دلالت کرتی ہے اور صارم صفت پر، جو کہ صفحہ ۱۳۲ پر 'مترادف اللغات' میں لکھے ہیں اور الفاظ مترادف میں وضع اول یہی شرط ہے جو الفاظ ایسے ہوں کہ ابتدا ایک معنی کے واسطے موضوع ہوں پھر دوسرے معنی میں کسی مناسبت کی وجہ سے بلا مناسب استعمال کر لئے جائیں وہ منقول یا مجاز یا مرتجل کہلاتے ہیں ، نہ مترادف جیسے آب پانی کے لیے موضوع ہوا ہے۔ اور پھر اسے کسی مناسبت سے تیغ کے معنی میں استعمال کر لیں تو یہ تیغ کا مترادف نہیں کہلائے گا۔ اس طرح آپ تمام کتاب مترادف اللغات کو تصور فرمالیجیے(۲۲۶)"۔

امیر کے مذکورہ بیان میں کئی قابلِ ذکر نکات سامنے آئے ہیں۔ جو مترادفات کے ذیل میں اہم ہو سکتے ہیں۔ امیر کا یہ بیان "مترادفات اللغات" پر تبصرہ بھی ہے۔ اور ہمارے خیال میں کسی کتاب کا خاکہ بھی کیوں کہ جس پیرائے میں انھوں نے مترادف کی ضرورت اور تعریف پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اصل میں تو یہی وہ اصول ہے جس پر کوئی مترادفات سے متعلق کتاب لکھی جانی چاہیے۔ ہمارے خیال میں احسان دانش کی "اردو مترادفات" (۲۲۷)۔ امیر کے بیان یا تعریف کے مطابق مرتب کی گئی لغت ہے۔

۸۔ شنبہ :

"شنبہ" میں ہائے مظہرہ ہے۔ برہان قاطع میں دیکھا ہے۔ ہائے مختفیہ الف ہو جایا کرتی ہے۔ ہائے مظہرہ بدل نہیں سکتی۔ معہذا روز کی اضافت شنبہ کی طرف جب ہوئی تو اس کی گنجائش کہاں رہی۔ بہر کیف "شنبہ" کسی طرح "شنبا" نہیں ہو سکتا" (۲۲۸)۔

مولف فرہنگِ آصفیہ کہتے ہیں کہ "یہ لفظ بکسر ہائے موحدہ و ہائے ملفوظ صحیح ہے اور اس طرح اساتذہ فارس کے کلام میں پایا جاتا ہے" (۲۲۹)۔ مولف "نور اللغات" کے بقول "ہائے موحدہ فارسی میں مکسور ہے"۔ نظامی

از دِگر روز ہفتہ آں بہ بود
نام بخش گر سہ شنبہ بود" (۲۳۰)۔

۹۔ "الفاظِ مثلثہ"

"الفاظ مثلثہ میں ساکن کو متحرک کرنے کا قاعدہ عام نہیں ہے بلکہ جس قدر اساتذہ نے تصرف کر لیا اسی قدر جائز ہے۔ اور خواجہ نصیر مرحوم کا کلام استناد کے لیے کافی نہیں ہے۔ قادر سخنان فارس نے کہا ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ معہذا خواجہ نصیر نے قدس بمعنی پاک نہیں کہا ہے بلکہ قدس ایک شہر کا نام

تھا وہاں کے دشت کو کہا ہے مصرعہ :اور وحشی نے ترے دشتِ قدس کی تتلیاں"(۲۳۰)۔

"المنجد" میں "قدس" (بضم اول و سکون دوم) یروشلم کو کہتے ہیں روز "قدس" (بضم اول و فتح دوم) کے معنی ہیں قدح صغیر (۲۳۲)۔

۱۰۔ امیر اللغات میں شانِ امثال کا طریقہ

"شانِ امثال میں، میں نے یہ رائے قرار دی ہے کہ جس حکایت میں خلافِ عقل و عادت کوئی بات نہ ہو وہ ضرور لکھی جائے۔ میرا گمان ہے کہ مانعیں بھی وہی لوگ اکثر ہیں جو نیچر کے خلاف امور پر معترض ہیں"(۲۳۳)۔

(۴)

اصلاح سخن سے متعلق امیر کے دو اہم نکات پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۔ "تعقید"

کھائے پھرتے اودھار ہم بھی ہیں۔ محاورہ فصحا کا نہیں ہے اور بندش بھی تعقید سے خالی نہیں۔

کھائے پھرتے ادھر اور ہیں ادھر اور بیچ میں اودھار ہم بھی خوش نما نہیں۔ چاہو رہنے دو"(۲۳۴)۔

۲۔ "کشش و جذبہ"

کشش اور جذبہ ایک ہی چیز ہے۔ کشش کی جگہ دل مناسب ہوگا:

پیغامِ وصل یار نے بعدِ فنا دیا
آخر کو دل نے جذبۂ الفت دکھا دیا (۲۳۵)۔

سالک کا مصرعہ ہے:

جذبۂ شوق ہی بن جائے گا رہبر اپنا

صبا کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

خوب معلوم ہے حال دل نا شاد مجھے
دیکھ جذبے میں نہ لا اوستم ایجاد مجھے

چتر بھنگلی:

آدھی میسر آوے پاؤ تم لو پاؤ مجھے دو
کوئی دن کی کشش ہے اللہ آسان کردے گا

منیر:

ابرو کا عشق ہے خطِ تقدیر میں رقم
ہر حرف میں کشش نظر آئی کمان کی

اسی ذیل میں امیر مینائی کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے

سفر میں مجھ سے کہتی ہے کشش ہر دم مرے دل کی
کہ وہ بھی پوچھنے آتے ہی ہوں گے راہ منزل کی

۳۔ "بناشد جز بتوائے شوخ عیار

اس میں اگر 'جز' بتو، پسند نہیں تو 'غیر تو' رکھیے کوئی مضائقہ نہیں" (۲۳۶)۔

(۵)

اس حصے میں بلاغت سے متعلق امیر کے بیانات کو پیش کیا جارہا ہے جو ان کے شاگردِ رشید زاہد حسین زاہد کے نام ایک مکاتیب میں ملتے ہیں۔

ا۔ مگسِ جام شراب کی تشبیہ

"معشوں کی چشمِ مست کی مژہ کو مگس جام شراب سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ایسی تشبیہات میرے نزدیک کراہت سے خالی نہیں۔ شعراء نے خال کو مگس سے تشبیہ دی ہے اور بحر نے باعتبار نیش کے زنبو کے ساتھ تشبیہ دے لی ہے" (۲۳۷)۔

امیر نے زاہد حسین زاہد کے اس شعر پر یہ اصلاح دی ہے:

کیا بری چاٹ ہے چاٹے ہی چلا جاتا ہے
بن گیا شیخ تو بالکل مگسِ جام شراب (۲۳۸)۔

۲۔ "رکھیں"

"رکھیں میں اب تخفیفِ کاف کو فصحا خلافِ فصاحت جانتے ہیں" (۲۳۹)۔

امیر کا یہ اعتراض زاہد کے اس شعر پر ہے:

سنگِ در حرم پہ اسے جا کے کیا رکھیں
جو سر کہ کھا چکا ہے ترے سنگِ در کی چوٹ (۲۴۰)۔

امیر نے اپنے خطوط میں زبان اس کے قواعد، محاورات اور اس کے استعمال سے متعلق جو کچھ رائے دی ہے یا جو مباحث پیش کیے ہیں

وہ اردو کی لسانی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

امیر کی لسانی خدمات ایک بڑا موضوع ہے۔ جس پر کوئی جامع کام اب تک نہیں ہوا اس کی وجہ بہ ظاہر یہ سامنے آتی ہے کہ "امیر اللغات" (دو جلد) کے سوا ان کا کوئی کام منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ انھیں لسانی مسائل، تذکیر و تانیث اصلاحِ سخن، لغت کے مسائل یا فصاحت و بلاغت سے لگاؤ نہیں تھا جن لوگوں نے مکتوباتِ امیر کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ بڑی مضبوط رائے رکھتے ہیں کہ امیر کو زبان کی صحت اور الفاظ کی تحقیق وغیرہ کا گہرا درک تھا۔ ان سے پہلے یا ان کے دور میں جو کتابیں ان موضوعات پر اردو اور فارسی میں لکھی گئی تھیں وہ ان کی نظر میں تھیں اور وہ ان کتابوں کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ تھے۔

امیر کے دور میں اردو محاورات کے حوالے سے کئی کتابیں شائع ہوئی تھیں ان میں سبحان بخش کی "محاورات ہند" (۲۴۱)، مادھو نرائن کی "مخزن المحاورات" (۲۴۲) چرنجی لال کی "مخزن المحاورات" (۲۴۳) اور وجاہت حسین وجاہت کی "اختلاف اللسان" (۲۴۴) وغیرہم نمایاں ہیں۔ اسی طرح تذکیر و تانیث سے متعلق بھی کئی نمایاں کتابیں شائع ہوئیں ان میں "تذکیر و تانیث" از میکش نمانوی (۲۴۵) "دستور الشعراء" از خواجہ محمد اشرف علی لکھنوی (۲۴۶)، "دو پیکر" از ظہیر الدین احمد خان (۲۴۷) وغیرہم شامل ہیں اس کے علاوہ صنائع بدائع سے متعلق بال کند قیصر سکندر آبادی کی بدیع البدائع (۲۴۸)، سید عبداللہ کی "زبدۃ الصنائع" (۲۴۹) اور سراج الحسن مودودی کی "گورکھ دہندھا" (۲۵۰) وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔

مذکورہ تمام کتابیں زبان کی تاریخ میں یقیناً اہم ہیں راقم ناچیز کی رائے میں امیر کے مکتوبات میں زبان، محاورات، تذکیر و تانیث صنائع و بدائع اور اصلاح سخن سے متعلق جو مباحث یا آراء ملتی ہیں وہ ان کتابوں میں شامل مباحث سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ امیر کو تو درباری ماحول نے تباہ کر دیا ورنہ وہ بنیادی طور پر ایک اعلیٰ پائے کے محقق تھے اور اپنے معاصرین میں علمیت، قابلیت اور کردار، غرض ہر اعتبار سے ممتاز تھے۔ انھیں وہ وقت میسر نہیں آسکا جس میں وہ بھرپور طور پر علمی جوہر دکھاتے۔ مکاتیب میں اس حوالے سے جو مواد ملتا ہے وہ یقیناً بہت اہم ہے اور ہمارے خیال میں اسے امیر کی علمیت کی ایک جھلک سمجھنا چاہیے۔

☆☆☆

حوالے

(۱) نیاز فتح پوری : "انتقادیات"، لکھنو، نگار بک ایجنسی، سنہ ندارد، ص ۳۶۷۔

(۲) کسریٰ منہاس : "تحقیقاتِ امیر مینائی"، مضمون مشمولہ "نقوش"، لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۰۔

(۳) غیر مطبوعہ خط بنام نواب عالم گیر محمد خان، مورخہ ۲۴/ اگست، ۱۸۹۰ء۔

(۴) داغ دہلوی : "زبانِ داغ"، مرتبہ سید رفیق مارہروی، لکھنو، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد، ص ۱۲۱۔

(۵) غیر مطبوعہ خط بنام حافظ سید محمد حسین بسمل، وکیل ٹونک، مورخہ ۱۰/ ستمبر ۱۸۹۰ء۔

(۶) سید احمد دہلوی : "فرہنگِ آصفیہ" جلد سوم، دہلی، نیشنل اکادمی، ۱۹۷۴ء، ص ۵۷۔

(۷) ایضاً، جلد اول، ص ۷۷۵۔

(۸) مطبوعہ "مجلس ترقی ادب"، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۸۔

(۹) غیر مطبوعہ خط بنام ممتاز حسین وکیل، پیلی بھیت، مورخہ ۱۴/ جنوری ۱۸۹۱ء۔

(۱۰) "فرہنگِ آصفیہ" جلد اول، ص ۶۰۹۔

(۱۱) امیر مینائی : "مکاتیب امیر مینائی"، طبع دوم مرتبہ احسن اللہ ثاقب، لکھنو، مطبعہ ادبیہ، ۱۹۲۴ء، ص ۲۶۲۔

(۱۲) ایضاً، ص ۲۶۳۔

(۱۳) ایضاً

(۱۴) ایضاً، ص ۲۶۴۔

(۱۵) امیر مینائی کے ادبی خطوط انتقادی جائزہ، قسط ۲ "صحیفہ"، لاہور، شمارہ نمبر ۲۹، ص ۷۳۔

(۱۶) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۶۵۔

(۱۷) ایضاً

(۱۸) جلال لکھنوی : "قواعد المنتخب، لکھنو، مطبع قومی، ۱۳۱۰ھ ص ۱۲۔

(۱۹) غیر مطبوعہ خط بنام مولوی حفیظ اللہ، مورخہ ۱۰/ مئی ۱۸۹۱ء۔

(۲۰) "مکاتیبِ امیر مینائی" ص ۱۶۷۔

(۲۱) برجموہن دتاتریہ کیفی : "منثورات"، دہلی، دانش محل، ۱۹۴۵ء،

(۲۲) برجموہن دتاتریہ کیفی : "کیفیہ"، لاہور، مکتبۂ معین الادب، ۲۶۶۔

(۲۳) "امیر مینائی کے ادبی خطوط انتقادی جائزہ"، قسط ۳، "صحیفہ" شمارہ نمبر ۳۴، ص ۴۵۔

(۲۴) ایضاً، ص ۴۶۔

(۲۵) مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۶۷۔

(۲۶) صفدر مرزاپوری: "مشاطۂ سخن"، حصہ اوّل، لکھنو، دارالاشاعت، صدیق بک ڈپو، ۱۳۳۶ھ، ص ۵۹۔

(۲۷) صفدر مرزاپوری: "مرقع ادب"، جلد دوم، لکھنو، دارالاشاعت صدیق بک ڈپو، ۱۹۲۷ء، ص ۸۲۔

(۲۸) مکاتیب امیر مینائی، ص ۲۶۹۔

(۲۹) منتخب اللغات: کانپور، در مطبع قیومی، ۱۹۰۴ء، ص ۴۳۳۔

(۳۰) امیر مینائی: "امیر اللغات"، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص ۹۲۔

(۳۱) مولوی نورالحسن، نیر: "نوراللغات"، جلد اول دوم، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۷۲۔

(۳۲) علی اوسط رشک: "نفس اللغۃ"، حصہ اول، لکھنو، نیر پریس، ۱۳۱۹ھ، ص ۳۔

(۳۳) جلال لکھنوی: "سرمایہ زبان اردو" لکھنو، مطبع جعفری، ۱۳۰۴ھ۔

(۳۴) مرزا محمد مرتضٰی عاشق: بہار ہند، مطبع شوکت جعفر، ۱۳۰۶ھ۔

(۳۵) "فرہنگ آصفیہ"، جلد چہارم، ص ۳۷۱۔

(۳۶) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۶۹۔

(۳۷) "فرہنگ آصفیہ"، جلد چہارم، ص ۳۶۱۔

(۳۸) ایضاً، ص ۳۴۴۔

(۳۹) "سرمایہ زبان اردو"، ص ۳۰۵۔

(۴۰) "مرقع ادب" جلد دوم، ص ۱۶۲۔

(۴۱) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۹۴۔

(۴۲) جلال لکھنوی: "گلشنِ فیض"، لکھنو، نول کشور پریس، ۱۲۹۸ھ، ص ۵۲۸۔

(۴۳) رشید حسن خاں "اردو املا،" لاہور، فیکشن ہاؤس، ۱۹۹۴ء، ص ۳۱۰ تا ۳۱۳۔

(۴۴) مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۷۲۔ "مکاتیب امیر مینائی" میں اس خط کی تاریخ ۳۰/ جنوری ۱۸۹۲ء ہے جب کہ "مشاطہ سخن" حصہ اول میں ۲۰/ جنوری ہے۔ (ص ۶۰)

(۴۵) "مشاطہ سخن"، حصہ اول، ص ۶۰۔

(۴۶) غیر مطبوعہ خط بنام محمد رفیع، کوٹھی نواب فتح نواز جنگ بہادر، حیدر آباد، دکن، مورخہ ۲۱/ اگست ۱۸۹۲ء۔

(۴۷) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۳۱۔

(۴۸) ایضاً، ص ۱۸۴۔

(۴۹) "فرہنگ آصفیہ" جلد اول، ص ۳۴۶۔

(۵۰) ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۱۲۔

(۵۱) ایضاً، ص ۱۳۶۔

(۵۲) ''فرہنگِ آصفیہ'' جلد دوم، ص ۲۸۷۔

(۵۳) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۲۰۰۔

(۵۴) ایضاً، ص ۲۱۲۔ یہ عبارت ''مکاتیب امیر مینائی'' اور ''مشاطہ سخن'' حصہ اول کو مدِ نظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہے۔

(۵۵) ''مشاطہ سخن''، جلد اول، ص ۶۱۔

(۵۶) مولف ''فرہنگ آصفیہ'' نے ''بوند ہونا'' کی سند میں یہ قطعہ درج کیا ہے۔ جلد اول، ص ۴۲۴۔

(۵۷) ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی: ''صہبائے مینائی''، ڈھاکہ، مکتبۂ عارفین، سنہ ندارد، ص ۲۲۶۔

(۵۸) 'مرقعِ ادب' جلد دوم، ص ۲۶۔

(۵۹) ''نقوش'' مکاتیب نمبر، شمارہ ۶۵، ۶۶، ص ۱۲۸۔

(۶۰) ''امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ تنقیدی جائزہ''، شمارہ ۷ ۳، ص ۱۵۔

(۶۱) ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۲۲۷۔

(۶۲) ایضاً، ص ۲۲۸۔

(۶۳) ایضاً، ص ۲۲۹۔

(۶۴) ایضاً، ص ۳۴۴۔

(۶۵) ''نور اللغات'' جلد سوم چہارم، ص ۸۳۔

(۶۶) ''فرہنگ آصفیہ'' جلد دوم، ص ۲۷۲۔

(۶۷) مولوی قبول محمد: ''ہفت قلزم''، طبع دوم، لکھنو، مطبع منشی نول کشور، ۱۲۳۷ھ، ص ۱۴۵۔

(۶۸) منشی محمد بادشاہ: فرہنگ انندراج، جلد دوم، لکھنو، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۹۴ء، ص ۹۹۔

(۶۹) غالب، اتتمہ برہان قاطع، لکھنو نول کشور پریس، ص ۵۸۳۔

(۷۰) 'مرقع ادب' جلد دوم، ص ۳۱۔

(۷۱) ایضاً، ص ۲۸۔

(۷۲) ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۱۹۔

(۷۳) ایضاً

(۷۴) ایضاً، ص ۳۴۸۔

(۷۵) ایضاً ص ۲۲۴۔

(۷۶) غیر مطبوعہ خط بنام احمد حسین خاں مذاق، تعلقہ دار، پریانواں، ضلع پرتاب گڑھ، مورخہ ۴؍ دسمبر ۱۸۹۱ء۔

(۷۷) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۳۔

(۷۸) "نقوش"، جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۰ تا ۲۳۱۔

(۷۹) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۲۴۔

(۸۰) "مشاطہ سخن"، حصہ اول، ص ۶۳۔

(۸۱) " کیفیہ" ، ص ۱۵۴۔

(۸۲) ایضاً، ص ۱۵۶۔

(۸۳) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۲۲۶۔

(۸۴) "مشاطہ سخن"، ص ۶۳۔

(۸۵) ایضاً

(۸۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۲۶۔

(۸۷) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ تنقیدی جائزہ"، "صحیفہ" لاہور، شمارہ ۳۵، ص ۴۸۔

(۸۸) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۲۶۔

(۸۹) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ تنقیدی جائزہ"، "صحیفہ" لاہور، شمارہ ۳۵، ص ۴۹۔

(۹۰) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۲۲۶۔

(۹۱) "نقوش" مکاتیب نمبر، شمارہ ۶۵۔۶۶، ص ۲۴۲ تا ۲۴۳۔

(۹۲) "فرہنگِ آصفیہ" ، جلد اول، ص ۵۱۹۔

(۹۳) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۲۶۔

(۹۴) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ تنقیدی جائزہ"، "صحیفہ"، لاہور، شمارہ ۳۵، ص ۵۱۔

(۹۵) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۴۲۔

(۹۶) "مشاطہ سخن" جلد اول، ص ۶۶۔

(۹۷) "مرقع ادب" جلد اول، ص ۸۵۔

(۹۸) "نور اللغات" جلد اول دوم، ص ۶۸۱۔

(۹۹) "سرمایہ زبان اردو"، ص ۶۵۔

(۱۰۰) حکیم سید محمد مہدی کمال: "دستور الفصحاء" لکھنو، یوسفی پریس، ۱۳۱۵ھ، ص ۱۲۔

(۱۰۱) بحر لکھنوی: "بحر البیان"، حیدر پریس ۱۳۱۱ھ، ص ۲۷۔

(۱۰۲) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۴۲۔

(۱۰۳) فرہنگ آصفیہ جلد اول، ص ۳۷۸۔

(۱۰۴) "سرمایہ زبانِ اردو"، ۵۲۔

(۱۰۵) اثر لکھنوی: "فرہنگِ اثر" لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔ ص ۱۷۔

(۱۰۶) نور اللغات، جلد اول دوم، ص ۵۶۳۔

(۱۰۷) ایضاً، ص ۶۹۲۔

(۱۰۸) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۴۲۔

(۱۰۹) "سرمایہ زبان اردو"، ص ۳۱۶۔

(۱۱۰) منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی: "اختلاف اللسان"، لاہور، رفاہِ عام اسٹیم پریس، ۱۹۰۶ء، ص ۱۷۔

(۱۱۱) امیر مینائی: "خطوط منشی امیر احمد"، مرتب احسن اللہ ثاقب، علی گڑھ، اردو پریس، ۱۹۱۰ء، ص ۱۲۷۔

(۱۱۲) مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۴۲۔

(۱۱۳) امیر مینائی: "امیر اللغات" لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۶۔

(۱۱۴) محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی: "اصلاحِ زبان اردو" لکھنو، نول کشور، ۱۹۱۹ء، ص ۱۲۔

(۱۱۵) "مرقعِ ادب"، جلد دوم، ص ۵۴ اور ۵۷۔

(۱۱۶) شوق نیموی: "رسالہ اصلاح"، ص ۲۵۔

(۱۱۷) "نور اللغات"، جلد اول دوم، ص ۳۹۷۔

(۱۱۸) فرہنگِ اثر، ص ۸۷۔

(۱۱۹) نواب عزیز جنگ ولا: "معیارِ فصاحت"، حیدر آباد دکن، عزیز المطابع، ۱۳۲۸ھ، ص ۲۴۔

(۱۲۰) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ تنقیدی جائزہ"، قسط نمبر ۴ "صحیفہ"، لاہور، شمارہ نمبر ۳۵، ص ۳۵۔

(۱۲۱) "صہبائے مینائی"، ص ۳۷۲۔

(۱۲۲) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ انتقادی جائزہ"، آخری قسط، "صحیفہ"، لاہور، شمارہ نمبر ۳۷، ص ۲۲۔

(۱۲۳) "مکاتیب امیر مینائی" ص ۲۳۶۔

(۱۲۴) ایضاً

(۱۲۵) "سرمایہ زبانِ اردو"، ص ۲۰۹۔

(۱۲۶) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد سوم، ص ۹۔

(۱۲۷) غیر مطبوعہ خط بنام حافظ سید مختار احمد، بہادر گنج شاہ جہاں پور، مورخہ ۲۲/ اپریل ۱۹۰۰ء۔

(۱۲۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۲۲۔

(۱۲۹) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ انتقادی جائزہ"، قسط نمبر ۲، شمارہ نمبر ۱۳، ص ۳۰۔

(۱۳۰) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۲۲۔

(۱۳۱) ایضاً، ص ۱۴۷۔

(۱۳۲) ایضاً

(۱۳۳) محمد غیاث الدین: "غیاث اللغات"، کراچی، ایچ۔ ایم۔ سعید کمپنی، سنہ ندارد، ص ۱۶۱۔

(۱۳۴) "نور اللغات"، جلد اول دوم، ص ۱۱۴۵۔

(۱۳۵) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد دوم، ص ۹۸۔

(۱۳۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۴۷۔

(۱۳۷) "نور اللغات"، جلد سوم چہارم، ص ۱۲۱۱۔

(۱۳۸) فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، ص ۳۱۵۔

(۱۳۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۶۵۔

(۱۴۰) بحر لکھنوی: "بحر البیان"۔

(۱۴۱) "فرہنگِ آصفیہ" جلد اول، ص ۱۵۱ اور ۳۷۵۔

(۱۴۲) "سرمایہ زبان اردو"، ص ۱۲۰۔

(۱۴۳) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ تنقیدی جائزہ"، قسط نمبر ۵، شمارہ ۳۸، ص ۱۷۔

(۱۴۴) "نور اللغات" جلد اول دوم، ص ۹۱۳۔

(۱۴۵) فرہنگِ اثر، ص ۲۵۵۔

(۱۴۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۰۶۔

(۱۴۷) "امیر اللغات"، ص ۱۸۶۔

(۱۴۸) "مشاطہ سخن"، حصہ اول، ص ۶۵۔

(۱۴۹) "دستور الفصحا"، ص ۲۴۔

(۱۵۰) "رسالہ اصلاح"، ص ۱۲۔

(۱۵۱) غیر مطبوعہ خط بنام حافظ سید محمد حسین بسمل، وکیل ٹونک، مورخہ ۷ اراگست ۱۸۹۰ء۔

(۱۵۲) "نور اللغات" جلد اول دوم، ص ۱۲۵۱۔

(۱۵۳) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد دوم، ص ۱۸۸۔

(۱۵۴) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۹۴۔

یہ خط اس مجموعے میں محمد نعیم الحق شیخ پوری تخلص آزاد کے نام ہے۔ تاریخ ۱۴ر نومبر ۱۸۹۱ء درج ہے۔ غیر مطبوعہ ذخیرۂ مکاتیب میں یہ خط محمد نعیم الحق تخلص ضو کے نام ہے۔ غالباً محمد نعیم الحق پہلے ضو پھر آزاد تخلص کرنے لگے۔ امیر کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ وہ پہلے صفیر تخلص کیا کرتے تھے اس کے بعد انھوں نے امیر سے مشورہ کرنے کے بعد اپنا تخلص "آزاد" کرلیا۔ (مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۲۹۶) عرفان عباسی نے دبستانِ امیر مینائی میں محمد نعیم الحق ضو شیخ پوری کو اس فہرست میں شامل کیا ہے جن کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔ اس غیر مطبوعہ خط کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ محمد نعیم الحق آزاد سے پہلے ضو تخلص کرتے تھے۔ محمد نعیم الحق آزاد کے اخلاف میرپور خاص سندھ، میں رہتے ہیں۔

(۱۵۵) صفیر بلگرامی: "رشحاتِ صفیر"، پٹنہ، مطبع احمد، ۱۳۰۱ھ، ص ۶۳۔

(۱۵۶) جلال لکھنوی: "رسالہ تذکیر و تانیث" مشہور بہ "مفید الشعراء"، لکھنو، مطبع گلزار محمدی، ۱۳۱۱ھ، ص ۲۶۔

(۱۵۷) ڈپٹی کلبِ حسین خاں نادر: "تخلیص معلی"، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷۔

(۱۵۸) "امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ تنقیدی جائزہ"، شمارہ ۳۷، ص ۹۔

(۱۵۹) ایضاً

(۱۶۰) غیر مطبوعہ خط بنام محمد نعیم الحق ضو، شیخ پور، ڈاک خانہ سکندر پور، ضلع بلیا، مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۸۹۱ء۔ یہی خط "مکاتیبِ امیر مینائی" (۲۹۴) میں بھی شامل ہے۔ جس میں "ضو" کے بجائے "آزاد" تخلص ہے۔

(۱۶۱) مطبوعہ معین پریس میرپور خاص سندھ، ۱۹۶۹ء، ص ۳۳۶۔

(۱۶۲) "حیات الشعراء"، ص ۲۹۸۔

(۱۶۳) ایضاً

(۱۶۴) ایضاً

(۱۶۵) غیر مطبوعہ خط بنام منشی جمیل احمد ضیاء، شیخ پور، ڈاک خانہ سکندر پور، ضلع بلیا۔ مورخہ ۵ر دسمبر ۱۸۹۱ء۔

(۱۶۶) "نور اللغات"، جلد سوم چہارم، ص ۶۴۴۔

(۱۶۷) "فرہنگِ اثر"، ص ۷۴۴۔

(۱۶۸) جلال لکھنوی: "سرمایہ زبان اردو"، ص ۲۳۳۔

(۱۶۹) احسان دانش: "تذکیر و تانیث"، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۷۲۔

(۱۷۰) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد سوم، ص ۳۶۵۔

(۱۷۱) دیکھیے حوالہ نمبر ۱۵۸۔

(۱۷۲) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد چہارم، ص ۳۱۱۔

(۱۷۳) "نور اللغات"، جلد سوم چہارم، ص ۱۲۰۷۔

(۱۷۴) ایضاً
(۱۷۵) ''تذکیر و تانیث''، ص ۲۳۰۔
(۱۷۶) ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۳۳۷۔
(۱۷۷) صفیر بلگرامی: ''رشحاتِ صفیر''، ص ۱۱۸۔
(۱۷۸) دیکھیں حوالہ نمبر ۱۵۰، ص ۱۳۔
(۱۷۹) ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۹۱۔
(۱۸۰) ایضاً، ص ۱۴۲۔
(۱۸۱) ''نور اللغات''، جلد سوم چہارم، ص ۳۹۔
(۱۸۲) آفاق بنارسی: ''معین الشعراء''، لکھنو، صدیق بک ڈپو،
(۱۸۳) فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم، ص ۲۴۹۔
(۱۸۴) ''امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ انتقادی جائزہ''، قسط نمبر ۳، ''صحیفہ''، لاہور، شمارہ ۳۴، ص ۳۸۔
(۱۸۵) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۴۲۔
(۱۸۶) ''امیر اللغات''، ص ۲۹۹۔
(۱۸۷) ''فرہنگِ آصفیہ''، جلد اول، ص ۳۳۲۔
(۱۸۸) ''زبانِ داغ''، ص ۵۰۔
(۱۸۹) مولانا احسن مارہروی: ''تاریخ نثر اردو''، بنام تاریخی ''نمونہ منثورات''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۳۵۸۔
(۱۹۰) ''امیر مینائی کے ادبی خطوط۔ انتقادی جائزہ'' قسط نمبر ۳ ''صحیفہ'' لاہور، شمارہ ۳۴۔ ص ۳۶۔
(۱۹۱) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۲۳۴۔
(۱۹۲) ''نور اللغات''، جلد سوم چہارم، ص ۱۲۶۹۔
(۱۹۳) ''فرہنگِ آصفیہ'' جلد چہارم، ص ۳۵۶۔
(۱۹۴) جلال لکھنوی: ''کار آمد شعراء''، لکھنو، مطبع ریاض محمدی، ۱۲۹۳ھ، ص ۶۷۔
(۱۹۵) ''نور اللغات''، جلد سوم چہارم، ص ۱۲۶۹۔
(۱۹۶) ''صہبائے مینائی''، ص ۲۷۳۔
(۱۹۷) ''فرہنگِ آصفیہ''، جلد دوم، ص ۲۸۶۔
(۱۹۸) ''نور اللغات'' جلد سوم چہارم، ص ۱۰۴۔
(۱۹۹) ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۵۸۔

(۲۰۰) "نوراللغات"، جلد اول دوم، ص ۵۲۰۔

(۲۰۱) غیر مطبوعہ خط بنام احمد علی شوق، مورخہ ۲۵؍ ستمبر ۱۸۹۰ء۔

(۲۰۲) "حیات الشعراء"، ص ۲۹۹۔

(۲۰۳) "نوراللغات"، جلد اول دوم، ص ۱۰۲۷۔

(۲۰۴) ایضاً، ص ۱۰۲۸۔

(۲۰۵) "نفس اللغۃ"، ص ۱۵۰۔

(۲۰۶) غیر مطبوعہ خط بنام احمد حسین خاں مذاق، تعلقہ دار، پریانواں، ضلع پرتاب گڑھ، مورخہ ۴؍ دسمبر ۱۸۹۱ء۔

(۲۰۷) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۲۴۔

(۲۰۸) منشی محمد بادشاہ: "فرہنگ اندراج"، حصہ سوم لکھنو، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۹۲ء، ص ۵۷۱۔

(۲۰۹) "نوراللغات"، جلد سوم چہارم، ص ۱۵۰۶۔

(۲۱۰) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد چہارم، ص ۵۶۳۔

(۲۱۱) "نوراللغات"، جلد سوم چہارم، ص ۱۵۱۰۔

(۲۱۲) ایضاً

(۲۱۳) غیر مطبوعہ خط بنام منشی جمیل احمد ضیاء، شیخ پور، ڈاک خانہ سکندر پور، ضلع بلیا، مورخہ ۵؍ دسمبر ۱۸۹۱ء۔

(۲۱۴) "نوراللغات"، جلد سوم چہارم، ص ۱۶۸۹۔

(۲۱۵) "تذکیر و تانیث"، ص ۲۸۷۔

(۲۱۶) غیر مطبوعہ خط بنام حکیم محمد قیام الدین نیر، ملاٹولہ، جونپور، مورخہ ۲۲؍ فروری ۱۸۹۲ء۔

(۲۱۷) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد دوم، ص ۳۹۶۔

(۲۱۸) ڈاکٹر غلام مصطفےٰ: "جامع القواعد"، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء، ص ۱۹۴۔

(۲۱۹) ایضاً ص ۱۴۹۔

(۲۲۰) "اردو املا"، ص ۱۵۴۔ نوٹ: اس بابت تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ کیجیے ص ۱۴۹۔۱۵۶۔

(۲۲۱) غیر مطبوعہ خط بنام محمد بقاء اللہ، متصل امام باڑہ، بانسووالا، پانی پت، مورخہ ۲۸؍ اپریل ۱۸۹۲ء۔

(۲۲۲) "نورالغات"، جلد سوم چہارم، ص ۷۴۳۔

(۲۲۳) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۳۱۔

(۲۲۴) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد دوم، ص ۱۴۱۔

(۲۲۵) "نوراللغات"، جلد اول دوم، ص ۱۱۹۶۔

(۲۲۶) غیر مطبوعہ خط بنام نواب عالم گیر محمد خان جمعرتی دروازہ، بھوپال مورخہ ۱۳۱۷ھ۔

(۲۲۷) احسان دانش : "اردو مترادفات"، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۰ء۔

(۲۲۸) غیر مطبوعہ خط بنام سید علی حسین نجم، اندرونِ دریچہ ماتا، حیدر آباد دکن، مورخہ ۲/ مئی ۱۹۰۰ء۔

(۲۲۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۸۲۔

(۲۳۰) "المنجد"، دہلی، مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات، ص ۸۳۷۔

(۲۳۱) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۸۱۔

(۲۳۲) ایضاً، ص ۱۵۰۔

(۲۳۳) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد سوم، ص ۱۸۹۔

(۲۳۴) "نور اللغات" جلد سوم، چہارم، ص ۴۵۶۔

(۲۳۵) یہ عنایت اللہ روشن بدایونی کے خط کا اقتباس ہے۔ اس خط کا ابتدائی حصہ "صہبائے مینائی" صفحہ ۲۷۲ پر شائع ہوا ہے۔ یہ عبارت رشید حسن خاں نے "صحیفہ" لاہور، شمارہ ۷۳، صفحہ ۲۲ پر امیر کے اصل خط سے نقل کی ہے۔ امیر کا یہ خط جناب عبرت بریلوی کے پاس محفوظ تھا۔

(۲۳۶) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۵۰۔

(۲۳۷) ایضاً، ص ۱۸۲۔

(۲۳۸) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۰۔

(۲۳۹) "مشاطہ سخن"، حصہ اول، ص ۶۲۔

(۲۴۰) ایضاً۔

(۲۴۱) مطبوعہ امیر مجتبائی پریس، دہلی، ۱۸۹۰ء۔

(۲۴۲) مطبوعہ جوہر ہند پریس۔ دہلی، ۱۸۸۶ء۔

(۲۴۳) مطبوعہ امپریل بک ڈپو، دہلی، ۱۸۹۸ء۔

(۲۴۴) مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور، ۱۹۰۶ء۔

(۲۴۵) مطبوعہ اختر دکن پریس، حیدر آباد۔

(۲۴۶) مطبوعہ نامی پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۹ء۔

(۲۴۷) شمس پریس، حیدر آباد دکن ۱۹۰۰ء۔

(۲۴۸) مطبوعہ دبیر پریس، بلند شہر، ۱۸۷۰ء۔

(۲۴۹) سبحانی پریس، حیدر آباد دکن، ۱۳۱۵ھ

(۲۵۰) مطبوعہ ۱۸۸۵ء۔

☆☆☆

باب سوم

مکتوباتِ امیر میں عروضی تصریحات

امیر مینائی کا شمار اردو کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے زبان اور شاعری کی نوک پلک سنوارنے میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ یہ بات اپنے موضوع سے خاص دلچسپی کی بناء پر نہیں کہی گئی بلکہ اس کی شہادت میں وہ ڈھیر سارے خطوط پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جس میں امیر نے لسانی مسائل کے علاوہ عروضی مسائل پر بھی آزادانہ رائے دی ہے۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

"ادبی مسائل ... جوان سے پوچھے جاتے تھے، آزادی سے جواب دیتے تھے اور کسی شخص یا جماعت کی پاسداری نہیں کرتے تھے" (۱)۔

امیر اپنے دور کے ان ممتاز فضلاء میں سے تھے جن سے ان کے معاصرین علمی معاملات میں صلاح و مشورے کیا کرتے تھے ان میں داغ کے علاوہ امیر اللہ تسلیم بھی خاص احباب یا معاصرین میں شامل نظر آتے ہیں۔ تسلیم اپنے ایک خط میں نعیم الحق آزاد شیخ پوری کو لکھتے ہیں :

"ایک مثنوی دو برس ہوے کہی ہے اس پر نظر ثانی نہیں کی، پڑی ہے۔ جناب منشی امیر احمد صاحب کی خدمت میں حاضر کی تھی کہ آپ ایک نظر دیکھ دیجیے انھوں نے بسبب اپنے اخلاق کے انکار تو نہیں کیا مگر بہ سبب عدم فرصتی کے آج تک ویسی ہی پڑی ہے" (۲)۔

امیر کی علمیت اور قابلیت کا ایک اور اعتراف امیر اللہ تسلیم کے خط میں اس طرح ملتا ہے۔

"بعض الفاظ جو خط میں تحقیق طلب آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کی نسبت میری یہ حقیقت نہیں کہ کچھ لکھ سکوں، ... انسب جانتا ہوں کہ ان لفظوں کی تحقیق جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی سے فرمائی جائے وہ جواب قابلِ اطمینان دیں گے" (۳)۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں کہ "امیر کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے زبان کے جادو اور زور اظہار کے سحر سے وہ واقف ہیں" (۴)۔ اس کی وجہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے بقول : "امیر کی زبان لکھنو کی ٹکسالی زبان ہے" (۵)۔

یہ تمام اعترافات امیر کے شاعرانہ فن کی روشنی میں سامنے آئے ہیں لیکن جب ہم ان کے ذخیرہ مکاتیب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو حیران ہوئے بغیر نہیں رہتے کہ امیر کے یہ خطوط زبان، اصلاح زبان، نکاتِ سخن، علم عروض، علم القوافی، قواعدِ اردو، تذکیر و تانیث، متروکاتِ اردو، تاریخ گوئی، مترادف اللغات، اور فصاحت و بلاغت کے بارے میں ایسے بصیرت افروز نکات سے مملو ہیں کہ جس کی مثال نہ توان کے دور میں ملتی ہے اور نہ ان کے بعد۔ اور امیر پر لگایا گیا یہ اعتراض بھی دم توڑتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ صرف لکھنوی زبان و محاورات پر ہی دسترس رکھتے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو زبان کے اصل مزاج سے واقف تھے جب کہ دیگر معاصرین لکھنو اور دہلی کے دبستانی خانوں میں محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

ہم نے گزشتہ باب میں لسانی مسائل، تذکیر و تانیث، متروکاتِ لغت کے مسائل اور بلاغت کے حوالے سے مکتوباتِ امیر کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس باب میں علمِ عروض کے متعلق نکات کو عروضی مسائل، نکاتِ سخن، علم القوافی اور تاریخ گوئی کے عنوان کے تحت استفادے کے لیے پیش کریں گے۔

(۱)

ا۔ "لواورلوں"

"لو" اور "لوں" دونوں کلام میں ہیں۔

لگے جلنے پتھر چلی ایسی لوں
لگے جوش کھانے جوانوں کے خوں

یہ قدما میں کسی کی مثنوی ہے، اس وقت یاد نہیں کہ کس کی ہے۔ "لو" کو بحر مرحوم نے قافیہ "گیسو" میں موزوں کیا ہے۔

وہ کہاں ٹھنڈی ہوائیں کہ ہوئی لو پیدا

میرے نزدیک فصیح یہی ہے اور میری زبان پر یہی ہے"(٦)۔

مصرعہ :وہ کہاں ٹھنڈی الخ۔ اس کا پہلا مصرعہ یہ ہے :

پھر گئی رُت چمن اب سیر کے قابل نہ رہا

"لو" (بالضمہ) اور "لو" (بالفتح) دونوں مستعمل ہیں۔ "لو" (بالضمہ) میں بحر لکھنوی کا شعر ملاحظہ کیجیے۔

خس سے بو آنے لگی پنکھوں سے لو آنے لگی — آہِ سوزاں کا ہوا شاید اثر خس خانے میں

امیر کے بیان میں بحر کا شعر اسی ذیل کی مثال ہے۔ "لو" (بالفتح) میں ظفر کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

دکھاؤں آہ سے گر اپنے دل کے داغ کی لو — نہ نکلے روزنِ فانوس سے چراغ کی لو
خجل ہے شعلہء دل سے مرے چراغ کی لو — نہ کیوں کہ دیکھ کے کانپے اسے اجاغ کی لو
ہلائے ہے پر پروانہ باد کش اے شمع — فرد ہو کیوں کہ ترے سوزشِ دماغ کی لو

شعور :

پیری کی زندگی کو ثبات و قرار کیا — اکثر بھڑک اٹھی ہے چراغِ سحر کی لو

صبا :

لو لگ رہی شمع رخِ یار کی ہمیں — روشن چراغ طور ہے موسیٰ کے سامنے

مولف "فرہنگ آصفیہ" لکھتے ہیں کہ :

بعض شعراء نے "لوں" بھی باندھا ہے۔ بلکہ دہلی میں بھی جہاں اور اکثر الفاظ میں نون بڑھا کر بولتے ہیں وہاں یہ لفظ بھی ان میں داخل ہے چناں چہ لفظ 'لوں' میں میر تقی اور شاہ نصیر کے شعر درج ہیں :

جل گیا دل مگر ایسی جو بلا نکلے ہے
جیسے لوں چلتی مرے منہ سے ہوا نکلے ہے
دشت میں ڈھونڈنے لیلیٰ تجھے مجنوں چلتی
نالۂ گرم سے تیرے نہ اگر لوں چلتی "(۷)۔

"لو" اور "لوں" سے متعلق امیر کی رائے ان کی بصیرت اور اردو شاعری سے گہری واقفیت کا پتا دیتی ہے۔ حقیقت یہی سامنے آتی ہے کہ یہ الفاظ فصحاء دہلی اور لکھنو دونوں میں آزادی کے ساتھ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں۔ "فرہنگِ آصفیہ "(۸)"نور اللغات "(۹) اور "فرہنگِ اثر"(۱۰) میں اس بابت تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔

۳۔ "اقسامِ ردیف"

ردیف کی کئی حالتیں ہیں۔ایک یہ کہ اس کے بغیر شعر کا مطلب تمام نہ ہو سکے۔ مثال کی کچھ حاجت نہیں اس لیے کہ اساتذہ کا تمام کلام اس کے لیے نظیر ہے، مگر میں احتیاطاً ایک شعر ناسخ کا لکھے دیتا ہوں :

مجھ رہِ بدعمل کے جنازے کو گر لگے
ثابت ہو روز حشر یہ تقصیر دوش پر

دوسرے یہ کہ مطلب تو بغیر اس ردیف کے تمام ہو جائے مگر ادائے مطلب میں اس ردیف کی وجہ سے حسن ہو۔یہ شعر ناسخ کا :

گلشن میں اس گلی سے زرِ گل اٹھانے کو
لائی نسیم تودۂ اکسیر دوش پر

وجدان صحیح اس کو جانتا ہے کہ یہاں مطلب بغیر ردیف کے تمام ہے، مگر اس وجہ سے کہ بوجھ دوش پر لایا کرتے ہیں، ردیف حسن کو بڑھاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ نہ اتمام مطلب پر موقوف ہو نہ حسنِ ادائے مطلب میں اس کو دخل ہو، مگر اس ردیف کا ذکر بے محل نہ ہو، جیسے یہ شعر ناسخ کا :

در پر جب اس کے جا کے گرا میں ہوا یہ حکم
بستر اٹھائے عاشقِ دل گیر دوش پر

یہ ردیف اگرچہ اتمامِ مطلب اور حسنِ ادائے مطلب میں دخل نہیں رکھتی مگر بے محل نہیں ہے، اس لیے کہ بستر کو تہ کر کے اکثر کاندھے پر ڈال لیا کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے میں قسم ثانی اور قسم ثالث متحد ہو گئیں۔ خیر اس سے کوئی حرج نہیں۔ چوتھے یہ کہ ان اقسام مذکورہ بالا میں سے کسی قسم میں دخل نہ ہو، مگر اساتذہ کا استعمال اس کو جائز رکھے، جیسے یہ شعر ناسخ کا :

آیا نظر فراق میں مجھ کو مہ صیام
لا جلد کھینچ کر کوئی شمشیر دوش پر

یہاں یہ کہنا نہیں ہوسکتا کہ یہ ردیف مثل اقسام ما سبق ہے، مگر اساتذہ نے اس کو جائز رکھا ہے اور ان کے کلام میں ایسی ردیفیں بھی پائی جاتی ہیں۔ میری رائے میں شعر مجوث منہ میں شاید قسم ثانی میں داخل ہوگی۔

بہر کیف نہ یہ ردیف بے محل ہے، نہ محاورے کے خلاف نہ زبان سے بیگانہ، اور بالفرض اگر معترض اس کو چوتھی قسم میں بھی داخل کرے تو ایسی ردیفیں جب اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں تو اس کے جواز سے انکار نہیں کر سکتا۔ مجھے فرصت ہوتی تو بہت سے شعر ایسی ردیفوں کے نکال کر بھیج دیتا مگر ناسخ کا ایک شعر بھی سند کے لیے کافی ہے"(۱۱)۔

امیر نے اس خط میں ناسخ کی ایک غزل (یہ کسی بھی مطبوعہ دواوین میں نہیں ہے) کی ردیف (تقصیر، اکسیر، دل گیر، شمشیر) کے ذیل میں اس کی چار اقسام پر اظہار خیال کیا ہے۔ اور ردیف قبول کرنے کا یہ معیار مقرر کیا ہے کہ "جب اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں تو اس کے جواز سے انکار نہیں"۔ امیر نے ایک اور موقع پر اپنے ایک خط میں یاے معروف اور یاے مجہول کے بارے میں صراحت کی ہے۔ اس بابت نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں کہ "اگر آپ کو یہ مشرب پسند آئے تو آپ بھی اختیار کیجیے"(۱۲)۔ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں کہ پسند نہ آئے تو رہنے دیجیے"(۱۳)۔

ان بیانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ انتہا پسند نہیں تھے اور نہ اپنی رائے دوسروں پر (چاہے شاگرد ہی کیوں نہ ہو) ٹھونستے تھے۔ نہ یہ پابندی لگاتے تھے کہ لکھنو میں مستعمل نہیں ہے۔ اس لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ امیر کی شاعری میں تین رنگ ملتے ہیں لکھنوی، دہلوی اور ان دونوں کا امتزاج۔ امیر کی یہ روشن خیالی ان کی لغت میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ سند میں لکھنو کے شعراء کے ساتھ دہلی کے شاعروں کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ وہ اردو زبان کا زیادہ سے زیادہ فروغ چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ذوق اور ذاتی پسند و ناپسند کی اہمیت بہت زیادہ تھی لہذا وہ اس خط میں بھی صلح پسندی کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ جو امیر کی روشن خیالی کی مثال قرار دی جاسکتی ہے۔

۴۔ "پاؤں بہ اشباع ہمزہ"

"پاؤں باشباع ہمزہ' فعلن کے وزن پر صحیح ہے۔ 'رند' پر موقوف نہیں اور مستند اساتذہ دہلی اور لکھنو نے بھی کہا ہے۔ معترض کی تسکین کے لیے دو تین شعر جو اس وقت یاد آئے بھیجتا ہوں۔

ذوق:

جو کھل کر ان کا جوڑا بال آئیں سر سے پاؤں تک
بلائیں آکے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک

ناسخ:

سنگِ کہسار برائے سر شوریدہ ہے
ہوئے پاؤں کے لیے خار بیاباں پیدا
گلوں کا اور میرا فصلِ گل میں ایک عالم ہے
چبھے ہیں خار پاؤں میں گریباں پارہ پارہ ہے"(۱۴)۔

پاؤں بہ اشباع ہمزہ" کے متعلق امیر کی رائے بہت واضح اور شفاف ہے۔ انھوں نے دہلی اور لکھنو کے نمائندہ اساتذہ کے کلام سے سند دے کر اسے ہر شک و شبہ سے بالاتر کر دیا ہے۔ اس ذیل کی چند اور مثالیں ملاحظہ کیجیے:

آتش: آئی تو ہے پسند اسے چال یار کی — سن لینا پاؤں کبکِ دری کا اکھڑ گیا
مصحفی: کس کس کے سر پر دیکھیں آتی ہے اب قیامت — نکلا ہے پاؤں باہر اس فتنۂ زماں کا
میر: وہ سر چڑھا ہے اتنا اپنی فروتنی سے — کھویا ہمیں نے اس کو ہر لحظہ پاؤں پڑ کر
جنود: تیرے کشتے پاؤں پھیلا کر نہ سوئیں کس طرح — تیغ اٹھنے بھی نہیں پاتی کہ آجاتی ہے نیند
رنگین: دل کو لو، جی کو نہ مانگو صاحب — پاؤں بس اور نہ پھیلاؤ ائی
داغ: کون بادِ خزاں کے ساتھ چلے — پاؤں بھاری عروسِ باغ کا ہے
خواجہ وزیر: زمین بھی نکلی جاتی ہے مرے پاؤں کے نیچے سے — مجھے مشکل ہوا ہے ساتھ دینا اپنی منزل کا

۵۔ "تصرفات بہ ضرورتِ شعری"

"جو اشعار سند میں آپ نے لکھے ہیں وہ قابلِ استناد نہیں۔ مثلاً "در جہاں کو بِ شرف زد صادق" اس کی تقطیع: فاعلاتن، فعلاتن، فعلن بھی ہو سکتی ہے، پھر کیا ضرورت ہے کہ فاعلاتن کی جگہ مفاعلن لا کر غلط لفظ کی تصحیح کی جائے۔ البتہ اگر اور مصرعے اس کے فاعلاتن، مفاعلن، فعلن کے وزن پر ہوں تو اس تقطیع کا مضائقہ نہیں۔ اور یہ بھی تو نہیں معلوم کہ یہ تاریخ کن کن کی ہے اور وہ سند لینے کے قابل ہیں یا نہیں اور یہ رائے کہ ضرورتِ شعر کے واسطے متحرک کو ساکن کر لینا جائز ہے میرے نزدیک صحیح نہیں۔ اساتذہ نے جس قدر تصرفات کیے ہیں ہندیوں کو انھیں کا استعمال جائز ہے، نہ یہ کہ جس متحرک کو چاہیں ساکن کر لیں۔ اگر اساتذہ کے مثل ہر شخص کو اختیار ہو، جو تصرف چاہے کرے تو زباں بالکل خراب اور قواعد برباد ہو جائیں"(۱۵)۔

امیر اس خط میں بھی اساتذہ کی پیروی پر زور دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اساتذہ نے جس حد تک تصرفات کیے ہیں اس کی پابندی ضروری ہے۔ ضرورتِ شعر کے لیے اپنی مرضی سے ردوبدل کرنا درست نہیں اگر سب اس طرح کرنے لگ جائیں تو زبان خراب اور قواعد برباد ہو جاتے ہیں زندگی کے ہر معاملے کی طرح شعر و ادب میں بھی قواعد اور نظم و ضبط کی پابندی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مشکل پیش آ رہی

ہو تو راستہ بدل لینا چاہیے روایت کے بر خلاف نہیں جانا چاہیے۔ اختلاف اسی موقع پر پیدا ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں امیر کی یہ رائے اچھی سوچ اور فکر کی غماز ہے۔ ایک باعمل عالم اور باصفا مشرب استاد سے یہی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ دیانت داری کے ساتھ صائب مشورہ دے گا۔

۴۔ ''سقوطِ الف''

''الف کا گرنا جائز نہیں۔ ہندی کا الف جو آخر میں ہو وہ گرتا ہے۔ بعض شعراء نے جو ایسا کہا ہے، وہ قابلِ استناد نہیں کیوں کہ اساتذہ کی طرف سے وہ ہمیشہ موردِ ایرادت رہے ہیں۔ مطلع میں، میں نے دخل دیا ہے :

ہاتھ تک اس کے جو ہو دسترسِ جام شراب
کیوں نہ اس کے ہاتھ سے ہو پھر ہوسِ جام شراب

دوسرے مصرعے میں اس ہاتھ سے 'کی جگہ' مے خواروں کو بنا دیا ہے کیوں کہ لطف اسی قدر مضمون میں ہے کہ جب جام شراب کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے ہاتھ تک پہنچا ہے، تو ایسے جام شراب کی ہوس مے خواروں کو کیوں نہ ہو۔ جب اس ہاتھ سے کہیے گا تو جامِ شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا فائدہ کچھ نہ رہے گا'' (۱۶)۔

امیر نے زاہد حسین زاہد کے مذکورہ بالا شعر کے دوسرے مصرے کی جو اصلاح اور وضاحت کی ہے۔ وہ یہ ہے۔ ع

کیوں نہ مے خواروں کو ہو پھر ہوسِ جام شراب (۱۷)

کسری منہاس لکھتے ہیں کہ :

''الف ہندی یہ الفاظ ہندیہ کے آخر اور مصرع کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس الف کے ماقبل ہمیشہ فتحہ ہوتا ہے جب الف گرتا ہے تو فتحہ بحال رہتا ہے۔ ع۔ ناسخ

طمع ہے انصافِ دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے

اتنا کا الف دوم گرا ہے ۔ (ک اتن فعول) فرما فعلن

اندھیرا چھایا ہے تاریک آج دنیا ہے

اس مصرع میں (ردسے رچا = مفاعلن) (یمہ تاری = فعلاتن) اس میں ''اندھیرا'' اور 'چھایا' کا الف ہندی شاعر نے گرا دیا ہے اور اس کا گرانا جائز ہے۔ عیب میں داخل نہیں۔ اسی طرح الف وصل کا گرانا بھی جائز ہے جیسے امیر مرحوم کا ایک شعر ہے

مے کدے میں کہیں پڑے ہوں گے
شبِ جمعہ ہے آج امیر کہاں

جیسے امیر کا الف (ھ ا ا ج م ی = مفاعلن) (۱۸)۔

مرزا یاس عظیم آبادی لکھنوی نے اپنے ہی شعر سے مثال دی ہے۔

" دھواں سا جب نظر آیا سواد منزل کا
نگاہ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

پہلے مصرع میں لفظ "سا" اور دوسرے میں لفظ 'تھا' دونوں ہندی کے الفاظ ہیں ان کا الف گر گیا اور ما قبل کا فتحہ باقی رہ گیا یہ عیب نہیں ہے"(۱۹)۔

۵۔"الفاظ ہندیہ"

میں سے آخر کا حرف گر تا ہے، بیچ کا حرف نہیں گر تا"(۲۰)۔

امیر کا یہ بیان زاہد حسین زاہد کے اس شعر سے متعلق ہے۔

وہ جو رنگ رنگ کے قصر تھے وہ عمارتیں جو عجیب تھیں
وہاں صرف اب ہیں کھنڈر پڑے نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے

امیر نے اصلاح کے بعد دوسرے مصرعے کو یوں بنادیا۔ع

کھنڈر اب وہاں نظر آتے ہیں نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے(۲۱)۔

رشید حسن خان نے امیر کے بیان سے اختلاف کیا ہے اور وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ :

"امیر کا یہ لکھنا کہ الفاظ ہندیہ سے آخر کا حرف گر تا ہے ٹی چ کا نہیں اور اسی کے تحت وہاں میں سقوط الف کو غلط سمجھ کر بدل دینا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ ایسے اردو الفاظ میں ، جن کے آخر میں نون غنہ ہو، اساتذہ نے بالعموم ن سے پہلے کے حرفِ علت کا سقوط روا رکھا ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں"(۲۲)۔

۸۔ "یائے اول کا گرنا"

"کردے گی، کی 'یائے اول' کا گرنا ناپسند کر کے اس کی جگہ کرے گی بنانا ٹھیک ہے۔اب اپنے وجدانِ سلیم سے کام لیجیے اور مصرع کو یوں ہی رکھیے جیسا کہ میں نے بنایا ہے"(۲۳)۔

۹۔ "تسبیغ"

"بحر متقارب کی تخصیص نہیں ہر بحر سالم میں تسبیغ کراہت سے خالی نہیں محقق نصیر الدین طوسی نے "معیار الاشعار" میں اس کی تصریح کی ہے اور یہی محقق، بحر متقارب میں یہ شعر :

بیالا نگارا چو آزادہ سردی
ولیکن برخسارِ مانندِ گل نار

لکھ کر کہتے ہیں "وایں ناپسندیدہ است چہ حرف آخر از دائرہ بیرون ست" اور متقارب مزاحف میں

اہلِ فارس اور اہلِ اردو نے تسبیغ کا استعمال کیا ہے۔ اور اس کو کسی نے مکروہ نہیں جانا حافظ ؎

گر تیغ بارد در کوے آں ماہ
گردن نہادیم الحمد للہ

تقطیع مصرعہ اول : فعلن فعولن فعلن فعولان
تقطیع مصرعہ ثانی : فعلن فعولان ، فعلن فعولان

اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ
کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں
ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں

میری رائے میں یہ سالم ہے نہ مسبغ " (۲۴)۔

اس خط میں امیر نے عروضی مسائل کے ذیل میں "بحرِ متقارب"، "بحرِ سالم" اور تسبیغ کا ذکر کیا ہے۔

عروض وہ علم ہے جس میں نظم کی درستگی کے قواعد سے بحث کی جاتی ہے۔ اس ذیل میں بحروں اور زحافات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ فروعاتِ بحور بیس [۲۰] شمار کی جاتی ہیں ان میں سے ایک "بحرِ متقارب" بھی ہے جس کے زحافات آٹھ ہیں۔ مرزا یاس لکھنوی "رسالہ "عروض و قوافی" میں لکھتے ہیں۔

"اصول افاعیل میں بباعث نقصان حرکت یا نقصان حرف یا زیادتی حرف کے تغیر واقع ہوتا ہے تو اس تغیر کو زحاف اور ان ارکان متغیرہ کو مزاحف یا فروغ ارکان کہتے ہیں" (۲۵)۔

قسم سوم میں جو زحافات "عروض و ضرب" سے مختص ہیں وہ تیرا [۱۳] ہیں تسبیغ ان میں بارواں ہے۔ مرزا یاس لکھنوی اس زحاف کی بابت لکھتے ہیں :

"تسبیغ بحر ہزج و رمل و مضارع متقارب و مدید و طویل و مجتث میں ممکن الوقع ہے اور اکثر آخر مصرع میں آتا ہے۔ ترفیل فارسی اردو میں نادر الوقوع ہے اور عربی میں بحر کامل سے مخصوص ہے اور رجز میں بھی آتا ہے" (۲۶)۔

کسریٰ منہاس اور رشید حسن خاں (۲۷) نے تسبیغ کی تشریح عمدگی سے کی ہے۔ کسریٰ منہاس لکھتے ہیں :

"اردو کے مشہور زحافات بیس ہیں ان میں سے ایک تسبیغ بھی ہے۔ تسبیغ جب سبب خفیف رکن کے آخر میں واقع ہو تو اس کے متحرک و ساکن کے درمیان الف بڑھا دینے کا نام ہے۔ مثلاً فاعلاتن بحر رمل کا ایک رکن ہے اس میں 'تن' سبب خفیف ہے۔ جب 'تن' کی ت اور ن کے درمیان الف بڑھا دیا گیا تو

'تن' سے تاں بن گیا۔ اب یہ رکن "فاعلاتاں" ہو گیا اسی طرح فعولن سے فعولاں اور مفاعیلن سے مفاعیلاں بنا لیتے ہیں" (۲۸)۔

امیر نے ان اشعار کو جس میں تسبیغ کا استعمال ہوا ہے تقطیع کے ساتھ پیش کیا ہے اور اسی بنیاد پر رد کرتے ہوئے یہ رائے دی ہے کہ "میری رائے میں یہ سالم ہے نہ مسبغ" امیر نے جس عالمانہ انداز سے اپنی بات کہی ہے یا سوال کا جواب دیا ہے ان کے معاصرین میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ امیر بلاشبہ زبان اور قواعدِ شاعری کے بہت بڑے عالم تھے۔

(۲)

اس حصے میں مکتوباتِ امیر سے نکات سخن سے متعلق نکات پیش کیے جاتے ہیں۔

ا۔ "یائے تحتانی کا اسقاط"

"یہ بخقتی میں عدیم المثل"، یہ بخقتی میں یائے تحتانی کا اسقاط نہ چاہیے۔ ترکیب فارسی ہے اگرچہ بعض اساتذہ اردو کے کلام میں سند ملتی ہے۔ مگر کیا ضرور ہے" (۲۹)۔

رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"ناسخ نے یہ اصول وضع کیا تھا کہ فارسی و عربی الفاظ کے آخر سے حرفِ علت، خصوصاً یائے معروف ساقط نہیں ہونا چاہیے، خواہ یہ لفظ بہ ترکیب آئیں یا بغیر ترکیب، تلامذہ ناسخ نے اس پابندی کو لازمی قرار دیا، لیکن یہ اس قدر بے اصولی پابندی تھی کہ کسی سے پوری طرح نباہی نہ جا سکی۔ اسی لیے بعض اساتذہ نہیں، اکثر اساتذہ کے یہاں اس کی مثالیں موجود ہیں"۔ (۳۰)

رشید حسن خاں نے ناسخ کے اس اصول سے سخت اختلاف کیا ہے اسی بنیاد پر امیر سے بھی۔ امیر کا اپنا ایک مزاج تھا کہ وہ اساتذہ اردو کے اصول و قواعد پر خود بھی عمل کیا کرتے تھے اور تلامذہ کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ اساتذہ کے بنائے ہوئے اصولوں سے وہ اس وقت روگردانی کیا کرتے۔ جب ذوق قبول نہ کرے یا کسی موقع پر معاملا فصاحتِ کلام کا آجائے۔ یا پھر اس زمین پہ قدم ہی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں اس وقت بھی اسی نوعیت کی بات ہے۔

۲۔ "نقشِ محفل"

"نقشِ محفل اجنبی ہے۔ نہ اس کا استعمال فارسی میں نظر سے گزرا نہ اردو میں اور باعث ہونے کا یہ مقام نہیں" (۳۱)۔

امیر کا یہ اعتراض داغ کے اس شعر پر ہے۔

تمھاری بزم میں ہر بات کا باعث مرا دل ہے
جسے تو رنگِ محفل ہے اڑے تو نقشِ محفل ہے

داغ، امیر کے اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں کہ :

"واقعی نقشِ محفل اجنبی ہے، میں نے اول یہی کہا تھا، اس کے بعد لفظ 'حسن' بنایا ••• باعث مجھ کو نہیں کھٹکتا تھا اس میں "تو" کا اشباع ہوا ہے ورنہ یوں ہی مصرع ہو سکتا تھا میری راے ناقص میں ترکیب پہلے مصرعے کی ہی اچھی ہے۔ع

یہ جم کر رنگِ محفل ہے، یہ اڑ کر حسنِ محفل ہے" (۳۲)۔

امیر کی طرف سے کیے گئے دو میں سے ایک اعتراض کو داغ نے قبول کیا "باعث" کی بابت امیر ذرا وضاحت کرتے تو ممکن ہے کوئی دل چسپ بحث سامنے آتی۔

۳۔ "غزل کے اشعار کی تعداد"

"تم نے تو فرسِ جام شراب اور قفسِ جامِ شراب میں دریا بہا دیے۔ اب ذرا طبع رواں کو روکو ••• مکرر یہ کہ اب قفسِ جامِ شراب سے اپنے مرغِ فکر کو رہائی دو۔ ہر زمین میں اشعار کی تعداد غزل سے نہ بڑھ جانا چاہیے۔ ہر زمین کا ایک پیمانہ ہوا کرتا ہے۔ جہاں اس سے بڑھ جاتی ہے بد نمائی آجاتی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ سنگلاخ زمینوں میں لاکھ کوشش کی جائے مگر مزے دار شعر ایسے نہیں ہوتے کہ سننے والے چٹخارے بھرنے لگیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمھارا سا مزے دار شاعر اپنا وقت ایسی شور دلا حاصل زمینوں میں نہ صرف کرے۔ لوچ دار زمین اختیار کرو تو دیکھو کیا مزا آتا ہے۔ ••• اب اس زمین کو بھی چھوڑو اور ہمیشہ کے لیے ایسی زمینوں کو ترک کرو"۔ (۳۳)

یہ خط زاہد حسین زاہد کے نام ہے۔ اس زمین میں کہے گئے اشعار اور ان پر اصلاح "مشاطہ سخن" حصہ اول صفحہ ۶۰ تا صفحہ ۶۱ پہ موجود ہیں۔ زاہد حسین کو سنگلاخ یا مشکل زمینوں میں اشعار کہنے کا بہت شوق تھا۔ مکاتیب میں متعدد جگہ امیر نے ان کے اس شوق کے نتیجے میں کہے گئے بہترین اشعار پر کھل کر داد دی ہے۔ اور بعض مواقع پر روک ٹوک بھی کی ہے مذکورہ بالا بیان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس سے انتخابِ شعر کی بابت امیر کے خیالات کا پتا چلتا ہے۔

۴۔ "قدماء کی ترکیبیں"

"بعض مقام پر قدما کی وہ ترکیبیں جس کو متوسطین نے ترک کر دیا ہے، آپ نے استعمال کی ہیں، جیسے یہ شعر:

گہنا پھولوں کا زیبِ تن کر
دھانی جوڑا نیا پہن کر

کہ اس میں "زیب تن کر" طریقہ استعمال قدماء ہے۔ طبقہ متوسطین شعراء ایسی جگہ "زیب تن کر کے" لاتے ہیں۔ ایک جگہ "کھینچا" کو "سینچا" کے ساتھ قافیہ کیا ہے۔ حقیر نے فصحاء کے کلام میں جہاں تک دیکھا ہے کھینچا کو بکسر کاف نہیں پایا۔ و قس علی ھذا (۳۴)۔

امیر نے اس بیان میں جس شعر پر اعتراض کیا ہے وہ جوالا پرشاد برق کی "مثنوی بہار" کا شعر ہے۔ امیر کی اصلاح کے بعد یہ شعر اس طرح ہو گیا :

" گہنا پھولوں کا زیب تن ہے
دھانی جوڑے پہ کیا پھبن ہے "(۳۵)۔

۵۔ "زخمار، بندوقوں کے وار"۔

"زخمار" بمعنی زخمی نئی ترکیب نہیں ہے۔ ناصر علی دھلوی کا شعر اس وقت یاد ہے :

نمک بر دل زدم کون ومکاں خندید بر عالم
علاج خود چندیں زخمداراں می تواں کردن

تلاش ہو تو اور بھی بہت سے شعر نکل سکتے ہیں۔ مگر تلاش کی حاجت ہی نہیں۔ شعر :

ہو گئے کتنے قرابیوں کے فیر
چل گئے کتنے ہی بندوقوں کے وار

جس طرح تم نے لکھا ہے کسی نے وہ شاید (غلط) چھاپ دیا ہوگا۔ میں نے جو مصرع دوسرا کہا ہے اس میں میرا مقصود جو ہے وہ اک نازک بات ہے۔

جس طرح آپ نے لکھا ہے : "پھر کیے اعلان بندوقوں کے وار" تو یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بندوق کی ضرب کو وار نہیں کہتے ہیں"(۳۶)۔

بندوق کی ضرب کو وار نہیں کہتے۔ تلوار کی ضرب کو وار کہتے ہیں۔ جیسے ایک ہی وار میں گردن اڑا دی۔ تلوار کا وار کاری تھا وغیرہ۔ نصیر کا شعر ہے۔

کہا جو میں نے نہ کر میرے دل کے دو ٹکڑے
لگائی ضرب وہیں تیغ آب دار کی

"فرہنگ آصفیہ" میں ضرب بمعنی مار، چوٹ، ٹکر، دھکا، صدمہ استعمال ہوا ہے"(۳۷) اسی مناسبت سے شعراء نے "ضربِ لادب، گلِ ضرب"(۳۸) اور ضربِ شمشیر استعمال کیا ہے۔ البتہ بندوق سے ضرب لگانے کو آج کل ٹھوکنا یا ٹھونکنا کہا جاتا ہے۔ جو بمعنی

کو نشانہ زد کو ئی کرنا مستعمل ہے"(۳۹) لیکن اس کے لیے بندوق کا وہ حصہ جس میں لکڑی لگی ہوتی ہے۔ جسے بٹ کہتے ہیں اس کا استعمال ہوتا ہے۔اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ سر پر بٹ کی ضرب لگائی یا بندوق سے مارا یا بندوق کی ضرب دی وغیرہ لیکن یہ ہرگز نہیں کہا جاتا کہ بندوق سے وار کیا۔

۶۔ الفِ وصل کا اسقاط :

اس شعر مولوی محمد محسن صاحب کی صحت میں کوئی تامل نہیں :

ہے کس کو خطابِ ایزد پاک
لولاک لما خلقت الا فلاک

معلوم نہیں معترض کو کیا شبہ ہے۔ بہت غور سے یہ خیال آیا کہ شاید "الافلاک" کے الف تقطیع میں گرتے ہیں ان میں تردد ہے۔ حالاں کہ الف ھائے وصل کا اسقاط بے تکلف جائز ہے :

شبہہ

الا یا ایہا الساقی ادر کاسآ و ناولہا
کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

اس میں دیکھیے کہ الف گر گئے۔ وقس علی ھذا۔ اسی شعر اردوے اسیر مرحوم میں :

اول تو ہیں منتخب سب اشعار
دیوانِ سپہر کوکب اشعار

اس میں دونوں مصرعوں میں اشعار کے الف تقطیع میں ساقط ہوتے ہیں۔ اور شعر مولوی محمد محسن صاحب اور یہ شعر اسیر مرحوم ایک ہی بحر میں ہیں۔ یہ بحر ہزج مسدس ہے۔ اس میں کئی زحاف آتے ہیں۔ شعر مسئول میں خرب و قبض و قصر ہے یعنی ہزج مسدس اخرب مقصود مقبوض میں یہ شعر کہا گیا ہے۔ احتیاطاً تقطیع اس کی لکھی جاتی ہے :

ہے کسک مفعول خطاب اے مفاعلن ،زدے پاک
مفاعیل ، لولاک مفعول ، لما خلق مفاعلن ، تلفلاک مفاعیل ۔

اس سے زیادہ تفصیل لکھنا ہندی کی چندی کرنا ہے۔ اسی مصرع : لولاک لما خلقت الافلاک کو شوق نے بھی "مثنوی ترانہ شوق" میں تضمین کیا ہے۔ اور پہلا مصرع یہ لگایا ہے۔

ہے وصفِ جنابِ احمد پاک "(۴۰)۔

امیر کے اس بیان میں مسئلہ بہت واضح اور جواب نہایت تشفی بخش ہے غالباً غلط فہمی الف وصل کے اسقاط کے باعث ہے مرزا یاس عظیم آبادی اس بابت لکھتے ہیں۔

"الف وصل :۔ یہ الف متحرک ہوتا ہے اور الفاظ کے شروع میں کسی لفظ آخر الساکن کے بعد آتا ہے۔

اس الف کو گرا کر اور اس کی حرکت کو اس کے حرف ما قبل کی طرف منتقل کر کے مابعد الف سے ملا دیتے ہیں۔ مؤلف

خدا پرست بھی بندے ہیں حسنِ فطرت کے
سمجھ میں آئے نہ راز اس طلسم حیرت کے

دوسرے مصرع میں 'اس'، کا الف وصل گر گیا اور ز "س" سے مل گئی۔
جاننا چاہیے کہ بعض اوقات اس الف وصل کے دھوکے میں لوگ عین اور ہائے مظہرہ کو بھی گرا دیتے ہیں۔ یہ سخت معیوب ہے جیسے

آمدہ چار عنصر و ہفت اسمان

لفظ عنصر کا "عین" غائب ہو گیا یا جیسے میاں خوش دل کہتے ہیں :

نکاح جب تک نہیں ہوتا مرے ساتھ
لگانا ہے مناسب کب تمھیں ہاتھ

مسرِ حرفِ صحیح کا گرنا

یہاں جب کی "ج" گر گئی اور نکاح کے ح "جب" کی ب سے مل گئی۔ تقطیع میں حرفِ صحیح کا گرانا نہایت مذموم ہے" (۴۱)۔

امیر نے اپنے مذکورہ بیان میں بحر ہزج مسدس اخرب مقصود مقبوض کا ذکر کیا ہے۔ علامہ سیماب اکبر آبادی اس کے اوزان کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

"۔۔۔ کے چار وزن مروج ہیں۔
ا۔ مفعول مفاعلن مفاعیل ۲۔ مفعول مفاعلن فعولن ۳۔ مفعولن فاعلن مفاعیل ۴۔ مفعولن فاعلن فعولن اگر ایک مصرع ان اوزان میں سے کسی ایک وزن میں اور دوسرا وزن میں نظم ہو جائے تو جائز ہے۔ مثلاً۔ شعر

انسان کا سرور و رقص کیا ہے = مفعول مفاعلن فعولن
پریوں کا ناچ دیکھنا ہے = مفعول فاعلن فعولن "۔(۴۲)

امیر کی یہ اصلاح فنی لحاظ سے بھر پور اور عالمانہ ہے۔ اور ان کے گہرے مطالعے اور ریاضت کا پتا دیتی ہے۔

۷۔ "گلدستہ، رخ ور خسار اور روے کتائی"۔

"تاریخی فقرے میں اگر "گلہاے" کا لفظ نہ ہوتا اور "گلدستہ بندگی" کہا جاتا تو بہتر تھا اور اس صورت میں معنی یہی ہوتے کہ 'دستہ گلہاے بندگی پیش والا بارگاہ ہند'۔ 'دستہ گلہا' بھی صحیح ہے مگر استعمال میں

یہ ترکیبِ مقلوب 'گلدستہ' اکثر دیکھا ہے اور 'دستہ گل' یاد نہیں آتا اس شعر پر:

نہیں خطِ سیہ گوں صفحہ رخسارِ جاناں پر
بیانِ حسن کی توضیح میں یہ دو رسالے ہیں

جو اعتراض کیا گیا ہے میرے نزدیک ٹھیک نہیں۔ اگرچہ "رخسار" اور "رخ" میں لغتاً یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ "رخ" پورے چہرے کو اور "رخسار" نصف چہرے کو کہتے ہیں، مگر شعر کے استعمال میں رخسار بہ معنی رخ بھی آیا ہے۔ خواجہ آصفی:

کشادی مصحفِ رخسار تا ساز د مرا بسمل
بر آمد گرچہ بسم اللہ نظر را باز گردا ندی

اور روے کتابی اس چہرے کو کہتے ہیں جو مدور نہ ہو اور فی الجملہ مائل بہ طول ہو اس کو کچھ دو صفحے ہونے سے علاقہ نہیں" (۴۳)۔

امیر کی اصلاح کی یہ خوبی ہے کہ وہ مسئلے کی کما حقہ، وضاحت کر دیتے ہیں اور تشنگی نہیں چھوڑتے۔ اگر جواب تفصیل طلب ہو اور ان کے پاس وقت نہ ہو یا بیماری کے سبب وہ جواب لکھنے سے قاصر ہوں تو معذرت کر لیتے ہیں۔ مذکورہ بیان میں بھی انھوں نے وہ کوئی نکتہ تشنہ نہیں چھوڑا اور حتی الامکان مسئلے کی نشان دہی عمدگی سے کی ہے۔

۸۔ "شعر میں تقدیم و تاخیر الفاظ"۔

"یہ اعتراض معترض کا اس شعر پر:

دیکھ کر آئینے میں ابرو وہ بسمل ہو گیا
یہ تماشا ہے نیا، مقتول قاتل ہو گیا

کہ قاتل کا مقتول ہونا اس سے ثابت نہیں ہوتا اور یہ تقدیم و تاخیر شعر میں ناجائز ہے، بالکل صحیح نہیں ہے اور بحر مرحوم کا شعر جو آپ نے نظیر میں پیش کیا وہ سند کافی ہے۔ اگرچہ احتیاج نہیں ہے: مگر تمھاری درخواست کے موافق دو شعر بطور نظیر میں بھی بھیجتا ہوں:

آتش: اس ترک کی ثنا میں جو صرفِ رقم ہوا
خنجر زبان بن گئی نیزہ قلم ہوا

وزیر: حال اپنی بے قراری کا نہ ٹھہرا بیت میں
طائرِ رنگِ پریدہ طائرِ مضمون ہوا "(۴۴)

امیر نے شعر میں تقدیم و تاخیر الفاظ کی بابت صراحت بہت عمدگی سے کی ہے کہ تشریح یا حواشی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

۹۔ "تاج درو قار" :

"صرف مطلع میں تصرف کرنے کی ضرورت اس وجہ سے معلوم ہوئی کہ "تاج درو قار" اچھا نہ معلوم ہوا اور "د قار" کا قافیہ بھی بنظر مصرع ثانی کچھ مناسب نہ تھا۔ "سپر" کا لفظ مصرع ثانی میں اس کو مقتضی تھا کہ مصرع اول میں ذوالفقار کا قافیہ ہو تا مگر مواہات جمع اسر و سپر نے اس قافیے کو آنے نہ دیا۔ ناچار میں نے اور انداز سے اس کو بدلا۔ خدا کرے آپ کو بھی پسند آئے اور مقطع کا مصرعِ اول نا تمام تھا، اس کو تمام کر دیا۔ اور کہیں دخل کی حاجت نہ تھی"(۴۵)۔

شاعری میں رموز و نکات کو یک گونہ اہمیت حاصل ہے۔ انھی میں حسنِ بیان بھی ایک ایسا معیار فراہم کرتا ہے جس سے کلام میں حقیقی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس پر لطف سخن کا دارومدار ہے۔ امیر ان تمام باریکیوں سے واقف تھے۔ انھوں نے بہت سے تجربے اپنی شاعری میں انھی شاعرانہ باریکیوں کو اجاگر کرنے کے لیے کیے جس میں وہ کامیاب رہے، جس طرح وہ اپنی شاعری کی نوک پلک سنوارنے میں محتاط تھے اسی طرح وہ شاگردوں کی اصلاح کے سلسلے میں بھی دیانت دار تھے۔ ان سے جب بھی اصلاح مانگی جاتی وہ نہایت فراخ دلی سے اس کا جواب دیتے۔ امیر کی اس عادت یا رویے کی وجہ سے ان کے شاگرد بہت کم وقت میں شعر و سخن کی باریکیوں سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ اس بیان میں بھی ان کی علمی بصیرت اور دیانت داری کی جھلک نمایاں ہے۔

(۳)

اس حصے میں علم القوافی سے متعلق قابلِ ذکر نکات اور اس سے متعلق تشریحات پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔ "ھو، جو اور وہ، بارات اور ھات"

"ھو" اور "جو" کا قافیہ "وہ" کے ساتھ اور رات کا قافیہ ھات (ہاتھ) مستند شعرائے لکھنو کے یہاں نہ کبھی میری نظر سے گزرا نہ میں نے ان کی زبانی ان کا جواز سنا اور خاص کر میرے استاد مرحوم کے یہاں تو کبھی جائز ہی نہ تھا۔ ان باتوں کا ترک کرنا رام پور میں کمیٹی ہو کر اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ ہمیشہ سے متروک ہے۔ انتہی بقدر الضرورت"(۴۶)۔

یہ معافصاحت اور بلاغت کا ہے۔ ان الفاظ کے استعمال سے کلام میں وہ حسن پیدا نہیں ہو تا جو اعلیٰ معیار کی مثال قرار پاتا ہے اس لیے مستند شعراء کے یہاں نہیں ملتا اور اس کو دہلی اور لکھنو دونوں جگہ متروک قرار دیا گیا ہے یہاں تک کہ رام پور کے شعری ماحول میں بھی یہ ہمیشہ سے متروک رہا۔ امیر نے اپنے بیان میں نہایت عمدگی کے ساتھ ان لفظوں کے کئی پہلو پر اپنی رائے دی ہے۔

۲ "توضیح القوافی"۔

" دل و جاں سے ہوں میں فدائے وطن
خدا جلد مجھ کو دکھائے وطن

میرے نزدیک "فدائے وطن" اور "دکھائے وطن" میں بااعتبار "تقفیہ" کوئی نقصان نہیں۔ اور یہ "دلِ عاشق" اور "ملے عاشق" کے قبیل سے نہیں ہے۔ آپ جو "فدائے" میں ایک "یے" قرار دیتے ہیں، میں بھی کہتا ہوں کہ بے شک "فدائے" میں ایک "یے" ہے مگر آپ دکھائے میں دو "یے" مانتے ہیں، اس میں مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک دکھائے میں بھی حقیقتاً ایک ہی "یے" ہے اور جس طرح رعایت وزن سے فدائے میں ہمزہ بڑھایا جاتا ہے، اسی طرح دکھائے میں بھی بڑھایا جاتا ہے۔ یہ شبہ آپ کو کیوں ہوتا ہے کہ دکھائے میں کسرۂ اضافت تو ہے نہیں پھر اشباع کیوں، بندہ نواز! کسرۂ اضافت کو یہاں دخل نہیں۔ آپ خیال فرمائیں کہ دکھائے اور آئے لگائے وغیرہ افعال جہاں مصرعوں کے آخر میں آتے ہیں۔ کیا وہاں اشباع نہیں ہوتا ہے؟

گلشن میں صبا نے گل کھلائے

کیا نادرست ہے؟ بات یہ ہے کہ حقیقت ان سب افعال میں ایک ہی یائے تحتانی ہے۔ اور اشباع ہمزہ میں ہے جو برعایت وزن ہوا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اساتذہ اردو نے برابر ان قافیوں کا استعمال کیا ہے۔ اور تاریخ میں مورخین معتمد نے ہمیشہ افعالِ مذکورہ میں ایک ہی "یے" کے عدد لیے ہیں۔ ان افعال اور ان کی امثال میں نہ تلفظ میں دو "یے" ہیں نہ کتابت میں اور یائے اضافت کے ساتھ ان کا تقفیہ درست ہے"(۴۷)۔

اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ قواعد عروض سے متعلق امیر مینائی کی تصریحات کس قدر عالمانہ ہوتی تھیں۔

۳۔ "توضیح القوافی"

"جواب طلب بات یہ ہے کہ مطلع میں اگر "عنایت و شکایت" قوافی ہوں تو اس کے بعد غزل یا قصیدے میں "حسرت یا محبت" کے قافیے لانا جائز ہے یا نہیں۔

جواب: "عنایت و شکایت" میں الف حرفِ تاسیس ہے اور یائے تحتانی دخیل ہے اور تائے فوقانی روی۔ مدار قافیے کا روی پر ہے۔ تاسیس و دخیل کا التزام ضرور کرو مگر مطلع کے دونوں قافیوں میں تاسیس و دخیل کا لانا اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کو التزام منظور ہے۔ اس لیے اس لیے مصرعے میں حسرت و محبت قافیہ کرنا مکروہ اور قابلِ احتراز ہے۔ جو حال "عنایت و شکایت" کا ہے وہی حال 'یاورو

داور کا ہے، "یاور و داور" کے قافیے مطلع میں ہوں تو اس کے بعد "گوہر و خنجر" کے قوافی لانا نہ چاہئے، قس علیٰ ھذا اگر "حائل و سائل" کے قافیے ہیں تو "دل اور منزل" کو اشعار مابعد میں قافیہ کرنا مناسب نہیں۔ چونکہ اساتذہ کے کلام میں خال خال ان کی مثالیں ملتی ہیں اس وجہ سے میں صراحتاً ناجائز کہنا احتیاط کے خلاف جانتا ہوں۔ مگر اقتضائے فن وہی ہے جو اوپر لکھ چکا" (۴۸)۔

اس خط میں مسئلہ بہت واضح ہے۔ وہ رباعی جس کی درستگی کی گئی ہے سامنے نہیں۔ اس وجہ سے اصلاح کی وضاحت نہیں ہو سکی۔

۴۔ "دو" اور "وو"، "بات" اور "ہاتھ"۔

"دو" کے قافیے میں "وو" مختصاتِ دہلی میں سے ہے، اور "بات" کے قافیے میں "ہاتھ" قدماء کے یہاں بکثرت دیکھا ہے اور مرثیہ گویوں نے لکھنو میں بھی استعمال کیا ہے۔ اس کی نسبت مدت سے میری رائے یہی ہے کہ بنظر توسیع زبان اس کا استعمال جائز کر لیا جائے۔ "امیر اللغات" اگر میری زندگی میں تکمیل کو پہنچا، باب ہائے ہوز میں جب ہاتھ کا لفظ لکھوں گا تو اس بحث کو مفصل و مکمل لکھوں گا۔ ابھی تو بات کے قافیے میں ہاتھ کو نہ میں خود کہتا ہوں نہ اپنے احباب کو کہنے کی رائے دیتا ہوں" (۴۹)۔

"دو" کے قافیے "وو" اور "بات" کے قافیے میں "ہاتھ" قدما کے یہاں استعمال ہوا ہے لیکن اساتذہ نے اس کو جائز قرار نہیں دیا۔ امیر کی رائے ہے کہ توسیع زبان کی خاطر اسے جائز کر لینا چاہیے۔ یہ رائے ان کی دانش مندی کی دلیل ہے۔

۵۔ "ایطا"

"ساعت اور گھڑی ساعت کے قافیے میں احتیاط تو مقتضی اس کی ہے کہ ... شاعر بلا ضرورت شدید وہم التباس سے بھی بچے مگر جواز ثابت کرنے کے لیے بہت سے اشعار شعرائے فارسی و اردو کے ملیں گے جن میں انھوں نے جائز کر لیا ہے۔ جیسا کہ بحر نے یہ مطلع کہا ہے۔

بحر درویشی طریقہ ہے رسول اللہ ﷺ کا
باندھیے تسمہ کمر میں مدِ بسم اللہ کا "(۵۰)۔

رشید حسن خاں، بحر کے مذکورہ شعر کی بابت لکھتے ہیں کہ :-

"بحر کا یہ شعر غالباً بسلسلۂ ذکر ایطا درج کیا گیا ہے۔ شوق نیموی نے "رسالہ اصلاح" میں بحر کا یہ شعر اور خواجہ وزیر کا درج ذیل شعر نقل کر کے لکھا ہے : ان اشعار میں بھی ایطا نہیں ہے کیوں کہ بوجہ اختلاف علمیت معنی میں تکرار نہ رہی (ص ۲۵) وزیر کا شعر یہ ہے :

میں سراپا مظہر اسم خدا واللہ ہوں
ہم صفیرو ! اس چمن میں مرغ بسم اللہ ہوں "(۵۱)۔

رشید حسن خان نے کس بنیاد پر امیر کے مذکورہ بیان اور سند کو بسلسلہ "ایطا" کہا ہے وضاحت نہیں ہوتی۔

(۴)

امیر کو فنِ تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا ان کی کہی ہوئی تین سو کے لگ بھگ تاریخیں راقم ناچیز کے پاس بھی محفوظ ہیں۔ ایک روایت ہے کہ رام پور کے قبرستان میں کتبوں پر امیر کی کہی ہوئی سیکڑوں تاریخیں محفوظ ہیں واللہ اعلم بالصواب۔ بہر کیف اس حصے میں تاریخ گوئی سے متعلق تصریحات پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔ "پرچہ کی اضافت"

تاریخ کا قطعہ بہت اچھا ہے۔ مگر مادے کے مصرعے میں لفظ "پرچہ" کی اضافت کھٹکتی ہے کہ "پرچہ" فارسی میں نہیں نکلتا اور در صورت ہندی ہونے کے ، اضافت درست نہیں۔ ایک جگہ استاذی حضرت اسیر مرحوم ۲ نے بھی یہ ترکیب اضافی کہا تھا، اس شعر میں :

شاید اسی سے مجھ کو خبر یار کی ملے
اس واسطے ہے پرچۂ اخبار کی تلاش

میں نے جناب ممدوح سے اس باب میں گزارش کی اور انھوں نے لغت اور کلام میں بہت تلاش کی مگر سند نہ ملی تو فرمایا کہ چھپ نہ گیا ہوتا تو ضرور نکال ڈالتا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ اس کو بدل لئے۔ اس جگہ تو لفظ ملنا مشکل ہے۔ مگر دوسرا مادۂ تاریخ کہیے، اس لیے کہ دشمن بہت ہیں، لپٹ پڑیں گے "(۵۲)۔

مولف "فرہنگِ آصفیہ" "پرچا" کو ہندی اور "پرچہ" فارسی لکھتے ہیں(۵۳)۔ مولف "نور اللغات" نے بھی پرچہ کو فارسی لکھا ہے(۵۴)۔

۲۔ "ایک مادہ تاریخی کے بارے میں رائے"

"مصرع مادۂ تاریخ :

" یا قبلۂ کرو بیاں یا مسجد الاقصیٰ ست ایں "

اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بحر رجز سالم یعنی مستفعلن چار بار میں بہ سبب وزن طبعی نہ ہونے کے غرابت ہے۔ اہل فن عروضی مثال دینے کے واسطے بہ تکلف موزوں کرتے ہیں۔ ہندوستان میں مجزو (بروزن مدعو : س ج ا) ہی مستعمل ہے اور سالم بالکل غیر مستعمل، دوسرے یہ کہ جملہ مردودہ میں ایک ہی تردید پر اکتفا کیا کرتے ہیں۔ دوبارہ حرف تردید لانا بھی خوش نہیں آتا، اور اس

عیب مٹانے کو جو آپ نے مصرع اول میں "یا نخلِ ارم" لکھا ہے اس میں یہ قباحت ہے کہ مصرع تاریخ ناتمام ہوا جاتا ہے۔ جب مصرع تاریخی میں یہ خلل ہے تو اوپر کے مصرعوں سے بحث اور ان میں فکرِ اصلاح عبث ہے اور کوئی تاریخ کہیے، یہ درست نہ ہوگی" (۵۵)۔

۳۔ "ایک قطعہ تاریخ پر اصلاح"

"یہ مادۂ تاریخ مجھے بہت پسند آیا۔ مصرعوں میں یہ عیب تھا کہ سلیمان کا "نون" فارسی میں باعلان نہ چاہیے اور "اخی" میں ہائے متکلم ہے، حالاں کہ مقصود اس بات کا اظہار ہے کہ سلیمان خان اور کفایت اللہ خان باہم دونوں بھائی ہیں۔ ان عیوب کے مٹانے کے واسطے مصرعے بدلنا پڑے اور دو شعروں کی جگہ تین شعر ناگزیر ہوئے۔ میرے نزدیک تو اب یہ مادہ اور قطعہ بے عیب ہے، آئندہ صاحبِ فرمائش کی رائے۔

اصلاح سے قبل:

کانِ ہمت کفایت اللہ خان ہم سلیمان خان اخی شفیق
طرح کردند مسجد و سالش گفت ثالث "شبیہ بیتِ عتیق"
(۱۳۰۹ھ)

اصلاح کے بعد:

خانِ والا مکاں سلیماں خاں عابد و زاہد و کریم و خلیق
ہم اخِ او کفایت اللہ خاں داد ایں ہر دو را خدا توفیق
طرح کردند مسجد و سالش گفت ثالث "شبیہ بیتِ عتیق" (۵۶)
(۱۳۰۹ھ)

امیر کے مذکورہ دونوں مکاتیب میں مسئلہ بہت واضح ہے۔ اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امیر فنِ تاریخ گوئی پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اور شاگردوں کے کلام پر محض اصلاح نہیں دیا کرتے، بلکہ نقص کی نشاندہی کے ساتھ اس سے بچنے کے لیے راستوں کا تعین بھی کر دیا کرتے تھے۔ امیر زبردست ناقدانہ صلاحیت رکھتے تھے اس کے ثبوت میں فنِ تاریخ گوئی اور شاعری کے دیگر مسائل پر ان کی یہ آراء پیش کی جا سکتی ہیں۔

۴۔ "تاریخ ولادت"

"اس تاریخ ولادت میں آپ ذرا چوک گئے۔ تعمیہ کی طرف اشارہ برے طور سے کیا گیا ہے۔ آپ کے اس مصرع کی بندش:

خوشی عید سے بڑھ کے ہے ہم کو آج

اشارہ کرتی ہے کہ "ہے ہم کو آج" تینوں لفظوں کے عدد مصرع تاریخ میں بڑھائے جائیں۔ اس لیے کہ بڑھ کے" کے بعد یہ تینوں لفظ آئے ہیں، حالانکہ مقصود صرف آج کے عدد ہیں۔ مصرع یوں ہونا چاہیے تھا:

خوشی ہم کو ہے عید سے بڑھ کے آج

تو آج ہی کے عدد بڑھتے اور تعمیہ ٹھیک ہو جاتا۔ اب آپ کو سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں کہ اپنے مصرع کی نسبت الزام تقدیم و تاخیر کو کاتب کے سر رکھیے اور ظاہر کیجیے کہ میں نے یوں کہا تھا" (۵۷)۔

۵۔ "ایک رباعی کے بارے میں رائے"

رباعی کی نسبت پہلے مصنفِ رباعی سے معافی مانگتا ہوں، پھر اپنی رائے ناقص کا اظہار کرتا ہوں:

رباعی

یوں اپنے سخن کی اوج پر امیدیں ہیں
احباب کے اتفاق کی تمہیدیں ہیں
اس محفل رخشاں کے لیے اے صاحب
ہر ماہ میں دو مشاعرے دو عیدیں ہیں

اسکے مصرعہائے ۱۔ ۲۔ ۴ میں ایک ایک سبب خفیف زیادہ ہے۔ البتہ مصرع ۳ ٹھیک ہے، رباعی کے وزن پر ہے۔ وزن صحیح یوں ہے۔

ہیں اپنے سخن کی اوج پر امیدیں
احباب کے اتفاق کی تمہیدیں
اس محفلِ رخشاں کے لیے اے صاحب
ہر مہ میں دو مشاعرے دو عیدیں

میرا مقصود رباعی کو تصرف کر کے کہنے سے اصلاح نہیں ہے بلکہ صحتِ وزن کی صورت بتانی ہے" (۵۸)۔

۶۔ "بہ سلسلہ تاریخ گوئی"

"میں نے اب یہی مشرب اختیار کر لیا ہے کہ "آئی" اور "آے" اور "گئی" اور "گیے" سب میں دہری "ے" خیال کی جائے اور ۲۰ عدد لیے جائیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ "آے" میں ۱۰ عدد اور آئی میں ۲۰ عدد شمار کیے جائیں مگر اب بعض وجوہ سے یائے معروف یائے مجہول دونوں کے ۲۰ عدد قرار دیے ہیں۔

اگر آپ کو یہ مشرب پسند آئے تو آپ بھی اختیار کیجیے۔ اور جلال نے آئی میں ۱۰ عدد نہیں لیے بلکہ ۲۰ عدد لیے ہیں البتہ بوی میں ی نہیں لکھی ہے۔ واؤ کو اضافت دی ہے۔ چناں چہ دیوان میں بھی بغیر "ی" کے چھپوایا ہے اور "افادۂ تاریخ میں بھی اس سے بحث کی ہے مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا" (۵۹)۔

یہ ایک دل چسپ بحث ہے۔ اس سلسلے میں کئی لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ شوق نیموی لکھتے ہیں:

"آئے، جائے، بروزنِ فعلن کا املا دو طرح مروج ہے۔ ایک یہ کہ جس طرح آؤ، جاؤ، میں واو پر ہمزہ لکھتے ہیں، اسی طرح آئے وغیرہ میں ایک ی لکھ کر اس کے اوپر ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک ہی ی کے عدد لینا چاہیے۔ مور خین ہند نے جا بجا ایسے الفاظ میں ایک ہی ی کے عدد لیے ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ دو یائیں لکھ کر، پہلی ی پر ہمزہ لکھ دیں۔ فی الحال اکثر اس کا املا دو یاؤں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں، دو یاؤں کے بیس عدد لینا چاہیے، کیوں کہ تاریخ کی بنا کتابت پر ہے کیوں کہ ان کی کتابت دو یایوں سے ہے اس طرح (ئی)۔ (ئے) اور اگر یہی یا مثل آئی اور آئے بروزن فاع لکھے جائیں تو دس عدد شمار کریں مثال یائے معروف ہمزا وار کی۔ اسیر

دعائے خلق دوا ہو گئی شنا پائی

اور یائی کی یایوں کے بیس بیس عدد لیے ہیں (۶۰)"۔

جلال "افادۂ تاریخ میں لکھتے ہیں کہ:

"آئی، گئی میں بیس عدد لیے جائیں گے۔ لیکن یائے مجہول جن الفاظ کے آخر میں ہو، خواہ اس پر ہمزہ لکھا جائے خواہ نہ لکھا جائے، جیسے جائے، خدائے، صفائے وغیرہ اس میں دس عدد لیے جائیں گے" (۶۱)۔

داغ دہلوی کے شاگرد میر مہدی حسن الم حیدر آبادی نے جلال سے اختلاف کیا ہے۔ وہ گلشنِ تاریخ میں لکھتے ہیں:

"یائے مثناۃ تحتانی خواہ معروف یا مجہول جیسے خدائی، رسائی بروزن فعولن اور آئی بروزن فعلن بسکون عین اور گئی، ہوئی بروزن فعل بہ تحریک عین اور آئے بروزن فعلن بسکون عین اور گئے بروزن فعل وغیرہا ان یایوں کے بیس بیس عدد شمار کیے جائیں گے" (۶۲)۔

امیر نے اپنے اس خط میں جلال کے حوالے سے جو بیان دیا ہے وہ "گلزارِ داغ" کی تاریخ سے متعلق ہے جو دیوان میں یوں تحریر ہے۔

بوئے گلزارِ داغ آئی آج

جب کہ "افادہ تاریخ" میں اسی مصرع کی کتابت اس طرح ہے۔

بوءِ گلزار داغ آئی آج

کسریٰ منہاس نے اپنی کتاب "فنِ تاریخ گوئی" میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ وہ جلال کی مذکورہ تاریخ کے حوالے سے رقم

طراز ہیں کہ :-

"بصورتِ اوّل کے بعد 'ئے' اضافی ہے۔ اگر اس کے دس عدد شمار کیے جائیں اور آئی کی 'ئی' کے بیس عدد تو ۱۳۰۶ ہوتے ہیں جس سے دس عدد سنہ مطلوب سے بڑھ جاتے ہیں اور بصورتِ ثانی 'بو' کے بعد ہمزۂ اضافت (ء) خلافِ رسم الخط اور متروک ہے۔ خود جلال کا نظریہ اس باب میں یوں ظاہر ہوتا ہے کہ گلزارِ داغ چوں کہ افادۂ تاریخ سے پہلے طبع ہوا ہے اس لیے ابتدائی صورت میں جلال نے "بو" کو یاے اضافت کے ساتھ تحریر کیا تھا اور 'آئی' کی یا کے دس عدد لیے تھے لیکن افادۂ تاریخ کی تالیف کے وقت اس کی صحت کر لی گئی۔ چوں کہ 'آئی' کے یا کی بیس عدد لینا ضروری تھے اس لیے یاے اضافت کو اڑا کر ہمزہ اضافت لکھ دیا۔ یہاں جلال پر الم کا اعتراض درست نہیں معلوم ہوتا۔ جلال نے شعراے ایران کے تتبع میں یائے مجہول ہمزہ دار کے دس عدد لیے ہیں اور ہندی تاریخ گویوں نے اس نظریے کو نادرست قرار دیا ہے"(۶۳)۔

امیر نے جلال کے نظریے کو اس لیے پسند نہیں کیا کہ وہ ہندی تاریخ گویوں کے یہاں رائج نہیں۔ جب کہ جلال نے بقول کسری منہاس (شاگرد جلیل مانک پوری) ایران کا تتبع کیا ہے۔

۷۔ "مادہ تاریخ کے بارے میں رائے"

"مادہ تاریخ میں لفظ "ایجاب" محض اور بجائے قران لفظ "وصل" لانا اور اس سے معنی ایجاب و قبول اور "قران و اجتماع" مراد لینا بہت ہی تکلف ہے"(۶۴)۔

۸۔ "فنِ تاریخ گوئی اور فنِ تقریظ نگاری"

تاریخ جو آپ نے کہی ہے اس میں لفظ مکان محض بہ ضرورت تاریخ ہے۔ دیوان کی تاریخ میں شاعر کی صفت بلند خیال چاہیے نہ بلند مکان اور باایں ہمہ تکلف بھی باعتبار اعداد و تاریخ پوری نہیں کہ سر ااحتمال سے ایک عدد کا تعمیہ کیا گیا۔ تقریظ ہو یا تاریخ غرض تو اس سے بھی یہی ہوتی ہے کہ اہلِ سخن پسند کریں اور اگر بھرتی ہوئی تو اس ہونے سے نہ ہونا اچھا"(۶۵)۔

تاریخ گوئی اور تقریظ نگاری کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں ان میں کسی قریبی عزیز یا دوست کی خوشنودی حاصل کرنا یا ہدیہ تہنیت پیش کرنا بھی ہے اور یہی مقصد ان اصناف کا زیادہ اہم نظر آتا ہے۔ ہر دوست یا عزیز یہی چاہتا ہے کہ اس کی بابت جو قطعہ کہا جائے یا تقریظ لکھی جائے وہ بہترین ہو دوسری طرف اہلِ علم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان میں فن کا اعلیٰ معیار ہو۔ گویا لکھنے والے پر دو اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ امیر کا موقف اس حوالے سے یہ ہے کہ اگر لکھا جائے تو پھر پائے کی چیز ہو ورنہ نہیں ہو۔ اس لیے کہ ایک طرف دوست ناراض دوسری طرف اہلِ سخن میں مقام بننے کے بجائے گرے۔ تو اس کام سے کیا فائدہ۔

گذشتہ صفحات میں علمِ عروض سے متعلق امیر کی تصریحات کو خطوط کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصریحات اصل میں وہ شعری روایات ہیں جن کو تلامذہ امیر اور ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا اس طرح اردو شاعری کے ارتقاء میں امیر اور دبستانِ امیر نے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

امیر سے پہلے اور ان کے دور میں بھی علمِ عروض اور فنِ تاریخ گوئی پر قابلِ ذکر کتابیں شائع ہوئیں جس میں "جوہر عروض" از نواب واجد علی شاہ اختر، (۶۶)۔ "قوائد عروض" از سید غلام حسنین قدر بلگرامی (۶۷) "عروضِ ارمغانِ عشق" از خواجہ غلام غوث عشق (۶۸) "مفتی العروض و تحفہ الشعراء" از سید محمود علی (۶۹) "بحر العروض" از کنھیالال دہلوی (۷۰) "نغمہ آرزو" از عبدالحفیظ خاں حفیظ (۷۱) "مقیاس الاشعار" از مرزا محمد جعفر اوج (۷۲)، "محبوب الشعراء" از نظیر حسن خاں سخا (۷۳)، "گنج شائگاں" از حسیب الدین سوزاں (۷۴)، اور "پارۂ عروض" از مرزا حاتم بیگ (۷۵) وغیرہ اپنے موضوع کا عمدگی سے احاطہ کرتی ہیں۔

فنِ تاریخ گوئی پر حسین علی فرحت کی "ام التواریخ"، میر مہدی حسین رضوی الم کی "گلشنِ تاریخ" (۷۷)، میر نادر علی رعد کی "گنجینہ تواریخ" (۷۸)، محمد حسین علی فرقت کی "موجہ التواریخ" (۷۹) اور الٰہی بخش شائق کی "آئینہ تواریخ" (۸۰) قابلِ تعریف ہیں اور امیر کے مکتوبات میں غیر محسوس طور پر ان کتابوں کی بازگشت ملتی ہے۔ گویا امیر کے یہ مکتوبات اپنے دور کی شعری روایات اور اس سے متعلق فنی مباحث کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تو اتنے علمی افادات غالب کے بعد صرف امیر ہی کے مکتوبات میں ملتے ہیں۔ بلاشبہ امیر کا شمار اردو کے ان معدودے چند شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو زبان اور شاعری کی نہایت خلوص سے آبیاری کی۔ اردو شاعری کو وہ جو موضوعات اور معیار دے سکتے تھے انھوں نے اپنے دواوین میں پیش کر دیے۔ اصلاح زبان اور فنِ شاعری سے متعلق ان کی کوئی کتاب نہیں ہے لیکن ان کے مکاتیب اس کمی کا ازالہ کرتے نظر آتے ہیں اور اسی بنیاد پر انیسویں صدی کی شعری تنقید کی تاریخ میں امیر ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

حوالے

(۱) رام بابو سکسینہ: "تاریخِ ادبِ اردو"، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۳۴۴۔

(۲) نعیم الحق آزاد شیخ پوری: "حیات الشعراء"، میرپور خاص سندھ، بلدیہ میرپور خاص، ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۷۔

(۳) حیات الشعراء، ص ۲۷۸۔

(۴) ڈاکٹر عبادت بریلوی: "غزل اور مطالعہ غزل"، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء، ص ۳۶۷۔

(۵) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی: "تعارف تاریخِ اردو"، لکھنو، ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۶۲ء ص ۱۴۳۔

(۶) غیر مطبوعہ خط بنام قاضی ممتاز حسین، پیلی بھیت، مورخہ ۹ ذی الحج، ۱۳۰۸ھ۔

(۷) سید احمد دہلوی: "فرہنگِ آصفیہ"، جلد چہارم، دہلی، اردو اکادمی، ص ۲۱۷ اور ۲۲۵۔

(۸) ایضاً، ص ۲۱۷ تا ۲۱۸ اور ص ۲۲۵۔

(۹) مولوی نور الحسن نیر : "نور اللغات"، جلد سوم، چہارم، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۱۵تا۱۱۱۶۔

(۱۰) اثر لکھنوی : "فرہنگِ اثر"، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص ۵۲۱۔

(۱۱) غیر مطبوعہ خط بنام محمد عمر جنوں، پتا درج نہیں، مورخہ ۲۰ جون ۱۸۹۱ء۔

(۱۲) حیاتِ الشعراء، ص ۲۶۹۔

(۱۳) امیر مینائی : "مکاتیبِ امیر مینائی"، مرتب احسن اللہ ثاقب، لکھنو، مطبوعہ ادبیہ، ۱۹۲۴ء، ص ۱۷۲۔

(۱۴) غیر مطبوعہ خط بنام منشی محمد عمر، سرکار شیخ حسین میاں صاحب بہادر بندر مانگرول، کاٹھیاواڑ۔ مورخہ اپریل ۱۸۹۲ء۔

(۱۵) غیر مطبوعہ خط بنام محمد بقاء اللہ، مکانات متصل امام باڑہ، بانسووالہ، پانی پت، مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۹۲ء۔

(۱۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۷۲۔

(۱۷) صفدر مرزاپوری : مرتب "مشاطۂ سخن"، حصہ اول، لکھنو، صدیق بک ڈپو، ۱۳۳۶ھ۔ ص ۶۰۔

(۱۸) "نقوش" لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۴۔

(۱۹) مرزا یاس لکھنوی : "چراغِ سخن" (رسالہ عروض و قوافی)، لکھنو، مطبع منشی نولکشور، ۱۹۱۴ء، ص ۶۰۔

(۲۰) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۲۴۔

(۲۱) "مشاطۂ سخن"، حصہ اول، ص ۶۳۔

(۲۲) سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، شمارہ ۳۵، ص ۴۴۔

(۲۳) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۱۲۔

(۲۴) ایضاً، ص ۱۲۱۔

(۲۵) "چراغِ سخن"، ص ۶۳۔

(۲۶) ایضاً، ص ۶۸۔

(۲۷) سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، شمارہ ۳۱، ص ۲۵۔

(۲۸) "نقوش" لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۳۔

(۲۹) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۱۵۰۔

(۳۰) سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور شمارہ ۳۴۔ ص ۴۱۔

(۳۱) داغ دہلوی : "زبانِ داغ"، مرتب رفیق مارہروی، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد ہما، ص ۱۳۱۔

(۳۲) ایضاً

(۳۳) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۱۸۷۔

(۳۴) غیر مطبوعہ خط بنام : منشی حوالہ پرشاد برق، بی۔ اے ۰۰۰ گنج، ضلع بہرائچ، صوبہ اودھ۔ مورخہ یکم اکتوبر ۱۸۹۰ء۔

(۳۵) سید رفیق مارہروی : "ہندوؤں میں اردو"، جلد اول، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد، ص ۲۴۷۔

(۳۶) غیر مطبوعہ خط بنام : منشی عبدالحی، بے چین، بدایونی، مورخہ ۷ فروری ۱۸۹۲ء۔

(۳۷) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد سوم، ص ۲۳۴۔

(۳۸) "نوراللغات"، جلد سوم چہارم، ص ۵۰۳۔

(۳۹) فرہنگِ آصفیہ، جلد دوم، ص ۲۲۔

(۴۰) غیر مطبوعہ خط بنام : منشی سید احمد حسین، بورڈنگ اسلامیہ، موری گیٹ، لاہور، مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۹۲ء۔

(۴۱) چراغِ سخن، ص ۶۰۔

(۴۲) علامہ سیماب اکبر آبادی : "رازِ عروض"، طبع ہشتم، کراچی، مکتبہ سیماب، ۱۹۶۷ء۔ ص ۵۲۔

(۴۳) غیر مطبوعہ خط بنام : سید سبطِ رسول شاد، قصبہ سرسی، ضلع مراد آباد، مورخہ ۴ جولائی ۱۸۹۲ء۔

(۴۴) غیر مطبوعہ خط بنام : سید اظہر علی۔ محلّہ قاضی، قصبہ سہسوان، ضلع بدایوں، مکتوب غیر مورخ بربنائے تسلسل جولائی ۱۸۹۲ء۔

(۴۵) غیر مطبوعہ خط بنام : خان بہادر شیخ محمد حسین مذاق، مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۹۲ء۔

(۴۶) غیر مطبوعہ خط بنام : میر باقر حسین، حیدر آباد دکن، مورخہ ۱۸ ذی القعد ۱۳۰۹ھ۔

(۴۷) غیر مطبوعہ خط بنام : نامعلوم، مورخہ ۹ فروری ۱۸۹۲ء۔

(۴۸) غیر مطبوعہ خط بنام : بشیر احمد خان ملیح آبادی، مورخہ ۷ اجون ۱۸۹۲ء۔

(۴۹) غیر مطبوعہ خط بنام : میر باقر، مورخہ ۱۲ جولائی ۱۸۹۲ء۔

(۵۰) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۳۰۶۔

(۵۱) سہ ماہی "صحیفہ"، لاہور، شمارہ ۷۳، جلد ، ص ۱۳۔

(۵۲) غیر مطبوعہ خط بنام : پنڈت رتن ناتھ سرشار، مترجم ہائی کورٹ، نمبر ۲، میوروڈ الہ آباد، جولائی ۱۸۹۰ء۔

(۵۳) "فرہنگِ آصفیہ"، جلد اول، ص ۵۱۳۔

(۵۴) "نوراللغات"، جلد اول دوم، ص ۸۲۲۔

(۵۵) غیر مطبوعہ خط بنام : سید محمد مرتضیٰ، مکان محمد سلمان خاں، رئیس چھرا، ڈاک خانہ، قلعہ چھرا، ضلع علی گڑھ، مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۱ء۔

(۵۶) ایضاً، مورخہ ۵ جنوری ۱۸۹۲ء۔

(۵۷) غیر مطبوعہ خط بنام : حکیم محمد جعفر بیمار، قیام گاہ مہارجہ صاحب بہادر والئی ریاست کپور تھلہ، مورخہ ۶ جون ۱۸۹۲ء۔

(۵۸) غیر مطبوعہ خط بنام : منشی عبداللطیف مورخہ ۴ جون ۱۸۹۲ء۔

(۵۹) "حیات الشعراء"، ص ۲۶۹۔

(۶۰) شوقِ نیموی: "رسالہ اصلاح"، ص ۳۰۔
(۶۱) جلال لکھنوی: "افادہ تاریخ"، لکھنو، مطبع جعفری، ۱۳۰۳ھ، ص ۳۰۔
(۶۲) میر مہدی حسن الم حیدر آبادی: "گلبنِ تاریخ"، حیدر آباد دکن مطبع فخری نظامی، ۱۳۱۳ھ۔ ص ۸۔
(۶۳) کسریٰ منہاس: "فنِ تاریخ گوئی"، لاہور، "نقوش"، سنہ ندارد، ص ۴۷۔
(۶۴) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۳۵۔
(۶۵) ایضاً، ص ۳۶۰۔
(۶۶) مطبوعہ سلطانی پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۰ھ۔
(۶۷) مطبوعہ شامِ اودھ پریس، لکھنؤ، ۱۲۸۸ھ۔
(۶۸) مطبوعہ، اختر دکن پریس حیدر آباد، ۱۳۰۵ء۔
(۶۹) مطبوعہ چشمہ فیض پریس، دہلی، ۱۸۸۳ء۔
(۷۰) مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنو، ۱۸۷۲ء۔
(۷۱) مطبوعہ سید پریس، حیدر آباد، ۱۳۲۱ھ۔
(۷۲) مطبوعہ جعفری پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۲ھ۔
(۷۳) مطبوعہ روز آنہ پریس، دہلی ۱۹۰۰ء۔
(۷۴) مطبوعہ نول کشور پریس، کانپور، ۱۸۹۹ء۔
(۷۵) مطبوعہ دبدبہ حیدری پریس، آگرہ، ۱۸۹۳ء۔
(۷۶) مطبوعہ دہلی پنچ پریس، لاہور، ۱۲۸۹ھ۔
(۷۷) مطبوعہ فخر نظامی، حیدر آباد، ۱۳۱۳ھ۔
(۷۸) مطبوعہ فخر نظامی، حیدر آباد، ۱۸۹۵ء۔
(۷۹) شحنہ پریس، میرٹھ، ۱۳۰۱ھ۔
(۸۰) مطبوعہ ۱۸۹۴ء۔

باب چہارم

مکتوباتِ امیر میں نظام لغت نویسی

اردو لغت نویسی کے باب میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ امیر مینائی جدید اردو لغت نویسی کے بانی ہیں انھوں نے پہلی مرتبہ اردو لغت نویسی کو ایک باقاعدہ منظم سائنٹفک نظام سے روشناس کرایا اور ایک منظم لائحہ عمل کے تحت "دفتر امیر اللغات" کی بنیاد ڈالی۔

یہ پہلی لغت ہے جس کی ترتیب میں مؤلف کے علاوہ دیگر زبانوں کے لائق فائق علماء کا تعاون بھی حاصل کیا گیا اور پھر مسودہ تیار ہونے کے بعد ان علماء کو نظر ثانی کی دعوت دی جاتی تھی۔ آج "اردو ڈکشنری بورڈ پاکستان" لغت نویسی کے جس نہج پر کام کر رہا ہے وہ یقیناً ایک نہایت ترقی یافتہ نظام ہے جس کو آکسفورڈ ڈکشنری کے منظم طریقے پر قائم کیا گیا ہے۔ "امیر اللغات" کے دفتر میں اس نظم و ترتیب اور اصول و قواعد کی ایک جھلک ایک صدی پہلے نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ "امیر اللغات" اس کا نقشِ اوّل معلوم ہوتا ہے بلاشبہ نقشِ ثانی نقشِ اوّل سے بہتر ہے۔

"امیر اللغات" کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات مختلف کتابوں میں ملتی ہیں لیکن ان سب کو یکجا کر کے بھی ہم کوئی مضبوط رائے قائم نہیں کر سکتے یا ادبی تاریخ کو مفصل معلومات فراہم نہیں کر سکتے البتہ امیر کے مکاتیب، "امیر اللغات" اور "دفتر امیر اللغات" کی ایک بہترین تاریخ مرتب کرنے کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔

امیر اللغات کی ابتداء کب سے ہوئی؟ اس کا ابتدائی لائحہ عمل کیا تھا؟ دفتر کب اور کہاں قائم ہوا؟ اور کس طرح ختم ہوا؟ دفتر کے معتمدین، ملازمین اور علمی معاونین کون کون لوگ تھے؟ لغت کا طریق تالیف کیا تھا؟ لغت کے کتنے حصے مرتب ہوئے؟ کتنے شائع ہوئے؟ اور کتنے نامکمل ہو گئے؟ کس سبب سے مکمل حصے شائع نہ ہو سکے یہ لغت کس طرح فروخت ہوتی تھی، دفتر کی کاروباری شرائط کیا تھیں؟ ان تمام باتوں کے جوابات امیر کے مکتوبات فراہم کرتے ہیں۔

(۱)

"۷ ار اکتوبر ۱۸۸۴ء کو سر الفرڈ لائل صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آئے" (۱)۔ انھوں نے "فرماں روائے ریاست رام پور (نواب کلب علی خاں) سے اردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی، دربار میں بیسیوں زباں داں حاضر تھے لیکن آسماں بار امانت نتوانست کشید، یہ دشوار خدمت امیر مینائی کے سپرد کی گئی" (۲)۔

"امیر نے لفظ "آنکھ" کے تقریباً ساڑھے چار سو محاورات وغیرہ مرتب کر کے لغت کا نمونہ پیش کیا اور وہ جنرل اعظم الدین خاں مغفور (اس وقت سفیر ریاست تھے) کی معرفت سر الفرڈ لائل کی خدمت میں بھیجا گیا" (۳)۔ "جو دوسری جون ۱۸۸۶ء کو پیش کیا گیا" (۴)۔ یہ نمونہ دو حصوں پر مشتمل تھا پہلے میں کئی سو الفاظ و محاورات اور دوسرے حصے میں اشتہار تھا جس میں "امیر اللغات" کا لائحہ عمل پیش کیا گیا تھا۔ امیر اشتہار میں لکھتے ہیں:

طور پر تیار ہو جائے اور قریب قریب دو سو جلدیں اس کی تمام ہندوستان میں گردش کرائی جائیں ایک عمدہ چھاپہ خانہ اس کے واسطے ہو جس قدر تالیف ہو تا جائے اس کا پروف پہلے چھپوا کے مختلف اضلاع ہندوستان میں مشتہر کیا جائے اور جب اس پر اعتراض اور حرف گیری ہو لے تو اصلاح اور درستی کے بعد چھاپا جائے"(۹)۔

امیر نے نمونہ شائع کرانے سے پہلے اسے خاص خاص اہل علم کو ارسال کیا اور اس سے متعلق رائے مانگی۔ مولوی محمد مہدی حسن خاں شاداب رسول پوری کو ۳ر جنوری ۱۸۸۷ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں :

"ایک نمونہ 'امیر اللغات' کا روانہ خدمت عالی کیا ہے امید ہے کہ غور سے ملاحظہ ہو کر پوری ممبری اس کی قبول فرما کر سند لطف ہو اور عمدہ رائے دی جائے"(۱۰)۔

امیر، شاداب کو ۱۹ر ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ کے خط میں "نمونہ امیر اللغات" پر رائے دینے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" 'امیر اللغات' کے نمونے کی رسید بھی آئی اس کو سرسری مطالعہ فرما کر جس قدر داد دی گئی اس نے بہت دل بڑھایا جب آپ سے بالغ نظر سرآمد اہل ہنر اس کو پسند فرماتے ہیں تو امید واثق ہے کہ مصنف طبع اس کی قدر کریں گے"(۱۱)۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر "نمونہ امیر اللغات" پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"امیر مینائی اردو کے پہلے لغت نگار تھے جنھوں نے لغت کی تدوین میں عام طور پر ملک کی رائے حاصل کرنے کے لیے کئی سو الفاظ و محاورات کا ایک نمونہ شائع کیا"(۱۲)۔

"نمونہ امیر اللغات" پر آراء لینے کے لیے سر الفرڈ لائل کی ہدایت اور مشورے پر امیر کے صاحب زادے محمد احمد صریر مینائی نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے دورے کیے۔ امیر، شاداب کو ۳ر جنوری ۱۸۸۷ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں :

"محمد احمد نے صحت پا کر پنجاب کا سفر کیا ہے ایک مہینے میں واپس آنے کا ارادہ ہے اس سفر کا نتیجہ اگر اس لغت کے حق میں اچھا ہوا تو دوسرا سفر اور کسی لین پر کریں گے میری رائے نہ تھی کہ ابھی سفر کیا جائے مگر جناب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کی رائے یہی ہوئی کہ جب تک کوئی لائق آدمی ملک میں پھر کر اشاعت نہ کرے گا تب تک ملک متوجہ نہ ہوگا اور صحیح انتخاب ممبران کمیٹی انتظامی و مشیر کا نہ ہوگا۔ یہ جو اسما درج نمونہ ہوئے ہیں ان میں سے اکثر چھٹ جائیں گے بعض لایق آدمی بڑھ جائیں گے۔ سفر سے مقصود طلبِ زر نہیں ہے بلکہ لایق آدمیوں کا انتخاب کرنا ہے۔ روپیہ تو اس کام کے واسطے بہت درکار ہے جس کو میں اور میرے احباب نہیں لگا سکتے اس کے ذمہ دار تو لائل صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ہیں البتہ مجھ کو اہتمام لغت کے واسطے دو تین ہزار روپیہ درکار ہے جس کو میں اپنی ذات سے صرف کروں"(۱۳)۔

امیر "نمونہ امیر اللغات" کی اشاعت چاہتے تھے لیکن سر الفرڈ لائل نے اجازت نہیں دی۔ انھی کی ہدایت پر محمد احمد صریر مینائی نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے جو دورے کیے اس کی روداد امیر ایک خط میں یوں تحریر کرتے ہیں۔

"سر الفرڈ لائل صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی ۰۰۰ محمد احمد نے ان کی رائے کے موافق سفر عمدہ مقامات ہندوستان کا ارادہ کیا ہے۔ چناں چہ علی گڑھ میں آنریبل سید احمد خاں سے مل کر دہلی سہارنپور، انبالہ، پٹیالہ، امرتسر، لاہور وغیرہ کی سیر کی اور ان مقامات کے لایق یورپین اور ہندوستانیوں سے مل کر رائیں لیں اور جن کو لایق سمجھے ان سے ممبری کی درخواست کی اور جس کو اہل اور متوجہ نہ پایا ان سے ہاتھ اٹھایا فہرست مشیر اور انتظامی کمیٹی کی جو اس میں ہے۔ وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ بہت سے لوگ گھٹ جائیں گے اور بعض بڑھ جائیں گے کسب زر اس گردش سے مقصود نہیں۔ اس کی صورت میں جو کچھ صاحبِ فرمائش کو منظور ہوگی وہ کریں گے۔ مقصود اس سیر و سیاحت سے لایق ممبروں کی تجویز اور ملک کو متوجہ کرنا ہے" (۱۴)۔

۱۹ / ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ کے مکتوب میں امیر، شاداب کو زور دے کر لکھتے ہیں کہ: "آپ پورے نمونے کو مطالعہ فرمائیں اور جس جگہ جو خدشہ ہو وہ لکھ دیں" (۱۵)۔ بالآخر بہت سوچ بچار کے بعد یہ نمونہ ۱۸۸۶ء میں ۱۰ x ۱۴ کے سائز پر تاج المطابع (۱۶) میں طبع ہو کر نمونہ امیر اللغات کے نام سے شائع ہوا" (۱۷)۔

امیر نے ۱۸۸۸ء میں تالیفِ لغت کے دوسرے مرحلے میں مختلف شہروں کے دورے کیے تاکہ لغت کے کام کو بھرپور طریقے سے شروع کیا جا سکے، مقدمہ "امیر اللغات" میں تحریر کرتے ہیں:

"دیکھوں اردو لغت کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں، لکھنو فیض آباد اور بنارس ہوتا ہوا پٹنے تک گیا" (۱۸)۔

امیر نے اس دورے میں نوابین، ادباء، شعراء اور عربی فارسی کے علماء سے بالمشافہ ملاقات کی اور ان سے لغت کے بارے میں خیالات دریافت کیے۔ جب کہ امیر سے پہلے ان کے بڑے صاحب زادے محمد احمد صریر نے سر الفرڈ لائل کی رائے کے مطابق اسی مقصد سے مختلف شہروں کے دورے کیے تھے۔ امیر نے "امیر اللغات" کا نمونہ لکھنے، شائع کرانے، مختلف شہروں کا دورہ کرنے کے بعد اگلے مرحلے میں رائے لینے کا مکتوباتی سلسلہ بھی شروع کیا، ۹ / دسمبر ۱۸۸۸ء کے ایک خط میں صفیر بلگرامی کو تحریر کرتے ہیں:

"امیر اللغات کے اصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب باصواب کی آرزو ہے" (۱۹)۔

جب کہ حبیب الرحمان خاں شروانی کا اسی بابت شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مکتوب مورخہ ۹ / دسمبر ۱۸۸۸ء:

"مکرمت نامہ آیا ممنون التفات فرمایا۔ سب سے مقدم آپ کی تحریر، جواب مسئولات میں آئی جن کو دیکھ کر چندان نہایت مسرور ہوا" (۲۰)۔

مکتوباتی سلسلے میں جو آراء جمع ہوئیں امیر نے ان کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا کہ : "دفتر امیر اللغات" میں سکریٹری ان کو جمع کرتا جائے۔ کمیٹی جب فیصلہ کرے گی تو امر منفعل مؤلف ہوگا" (۲۱)۔ "نمونۂ امیر اللغات" کا شائع کرانا، اشتہار میں لغت کے اغراض و مقاصد اور اصول تالیف کو بیان کرنا امیر کی دیانت داری اور سلیقہ مندی کا ثبوت ہے۔ اور پھر اشتہار میں مشورہ دینے کی درخواست کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ یہ کام اہل علم کے مشورے سے انجام دینا چاہتے تھے۔ ان اہل علم میں اردو کے علاوہ انگریزی اور سنسکرت کے ماہرین کی موجودگی کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ تاکہ اس وقت تک موجود لغت میں "امیر اللغات" منفرد ہو جائے۔ امیر کی لغت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر کریم الدین احمد کی یہ رائے وزن رکھتی ہے کہ :

"انھوں نے لغت نگاری کا بڑا ہی اچھا اور سلجھا ہوا طریقہ اپنایا تھا" (۲۲)۔ یقیناً ان تمام امور کے پس منظر میں گزشتہ ادوار میں مرتب کیے گئے ان لغات کے تجربے تھے جو آج تک منظر عام پر نہ آسکے۔ گزشتہ دور کے لغات سے مراد "سرمۂ بصیرت" (۲۳)، "بہار ہند" (۲۴) اور "محاورات مصادر" (۲۵) اردو ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ان کارناموں کی وجہ سے امیر کو "وسیع النظر محقق قرار" دیتے ہیں (۲۶)۔

امیر زاہد حسین زاہد کو ۱۸۹۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"میرے پاس بھی الف سے ی تک مسلسل معنی و مثل کے ساتھ لغت موجود ہے جس کا نام میں نے بہار ہند رکھا تھا مگر وہ فارسی عبارت میں 'گلشنِ فیض' کی قطع کا ہے اب جہاں تک ممکن ہو اس سے بڑھانا مقصود ہے۔ 'امیر اللغات' اس سے کئی حصہ زیادہ ہوگا" (۲۷)۔

اصل میں امیر ابتدائی طور پر لغت مرتب کرنے کا ڈھنگ جان گئے تھے۔ اس لیے ایک مربوط اور جدید انداز سے لغت تالیف کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اب لغت کے اگلے مرحلے یعنی دفتر کے قیام سے متعلق مواد پیش کیا جاتا ہے۔

(۲)

۱۸۸۷ء میں محمد احمد اور ۱۸۸۸ء میں امیر نے ممکن حد تک مختلف شہروں کے دورے کیے اور پھر بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر : "۱۸۸۹ء میں انھوں (امیر) نے لغت کی تالیف کے لیے ایک دفتر قائم کیا" (۲۸)۔ لیکن مکاتیب کی داخلی شہادت اور مقدمہ امیر اللغات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دفتر ۱۸۸۸ء میں قائم ہو چکا تھا۔ امیر ۹ر دسمبر ۱۸۸۸ء کو حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھتے ہیں :

"اہل الرائے کی رائیں کمیٹی میں پیش ہو کر رد و قبول کا فیصلہ ہوگا ابھی دفتر امیر اللغات میں سکریٹری ان کو جمع کرتا جائے گا" (۲۹)۔

اس کے علاوہ امیر نے مقدمہ " امیر اللغات" میں تحریر کیا ہے کہ :

"میں نے ۱۸۸۸ء میں اس تجربے کے واسطے سفر کیا کہ دیکھوں اردو لغت کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں۔ سفر سے پلٹنے پر عرش آشیاں نواب محمد مشتاق علی خاں بہادر طاب ثراہ نے بااجلاس کونسل ایسی دستگیری فرمائی کہ میں نے رام پور میں 'امیر اللغات' کا دفتر کھول دیا" (۳۰)۔

لغت کے سلسلے میں امیر نے جو سفر کیے تھے اس کی شہادت ممتاز علی آہ کے بیان سے بھی ملتی ہے وہ لکھتے ہیں :

"۱۸۸۸ء میں ملک کے خیالات دریافت کرنے کو حضرت نے لکھنو، بنارس ہوتے ہوئے پٹنے تک سفر کیا"(۳۱)۔

دفتر قائم ہوئے کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ "۲۵ر فروری ۱۸۸۹ء کو نواب مشتاق علی خاں انتقال کر گئے"(۳۲)۔اس وجہ سے اور امیر شدید مالی پریشانی سے دوچار ہوئے۔۳۱ر مارچ ۱۸۸۹ء کے خط میں کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ :"دوسو روپے ماہوار دفتر لغت پر صرف ہو رہا ہے"(۳۳)۔امیر کے اس بیان سے یہ بھرپور تاثر ملتا ہے کہ دفتر قائم ہوئے خاصا وقت گزر چکا ہے۔

ان حوالوں کے علاوہ ممتاز علی آہ نے 'امیر اللغات' کے دفتر اور امیر کا جو حال متصل بیان کیا ہے اس میں عسر بول کے مرض کی شدت کی طرف اشارہ کیا ہے، مکاتیب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ وہی دور ہے جب دفتر قائم ہوا تھا :

"اس زمانے میں جامع مسجد کے سامنے چھوٹے نواب والے سرکاری مکانات میں قیام تھا۔ان میں دیوان خانے اور محل سرائے کے علاوہ اوپر بہت بڑے بڑے کمرے تھے جن میں دفتر امیر اللغات تھا کمروں کے بعد لمبا چوڑا صحن تھا اور نیچے بازار کی دکانیں تھیں۔ عسر بول کے باعث باربار چوکی پر جانے کی حاجت ہوتی تھی اس ضرورت سے دفتر کے قریب ایک کمرے میں کوٹھے کے صحن میں محل سرا اور دفتر کے بیچ والے کمرے کے پاس (جہاں دن کو آرام فرماتے تھے) اور ایک جگہ محل سرا میں چوکی لگی رہتی تھی اور جاڑوں بھر چوکی سے قریب ایک کونڈے میں کوئلے دہکتے رہتے تھے"(۳۴)۔

اور اس دفتر کے رابطے کا پتا یہ ہے جو "پیام یار" ۱۸۹۱ء کے اشتہار میں شائع ہوا۔

"ممتاز علی آہ، سیکریٹری دفتر امیر اللغات، ریاست رام پور روہیل کھنڈ"(۳۵)۔

اور امیر نے بھی زاہد حسین زاہد کو ۷ر مئی ۱۸۹۳ء کے خط میں کم وبیش یہی پتا دیا ہے :

"منشی امیر احمد مینائی، ریاست رام پور، دفتر امیر اللغات"(۳۶)۔

ڈاکٹر کریم الدین احمد کے مقالے میں دفتر سے متعلق غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

"پھونس کے چھپر میں دوبارہ دفتر قائم ہو گیا لیکن یہ بساط جلد ہی الٹ گئی۔ جنرل اعظم الدین خاں قتل کر دیے گئے"(۳۷)۔

جب کہ اس بیان سے فوراً پہلے ممتاز علی آہ کا بیان انھوں نے اپنے لفظوں میں یوں پیش کیا ہے کہ "عرش آشیاں نواب مشتاق علی خاں نے دو قسطوں میں سولہ ہزار روپیہ قرض دیا"(۳۸)۔اور ممتاز علی آہ کا بیان پاورقی حاشیے میں دیا ہے کہ "ریاست سے قرض دیئے جائیں اور چھپنے کے بعد کتاب کی قیمت سے رفتہ رفتہ یہ قرض منشی صاحب ادا کریں اس طرح دفتر قائم ہو کر امیر اللغات کی تالیف شروع ہوئی"۔ڈاکٹر صاحب کے بیان کی بنیاد آہ کی تحریر ہے۔ جس میں نہایت واضح الفاظ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ قرضہ ملنے کے بعد لغت کا کام شروع ہوا اور آہ نے زور دے کر کہا کہ "اس طرح دفتر قائم ہو کر امیر اللغات کی تالیف شروع ہوئی"(۳۹) یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ اس سے پہلے دفتر نہیں

تھا۔ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ "جنرل اعظم الدین خاں کو ۳ر اپریل ۱۸۹۱ء کو قتل کیا گیا" (۴۰)۔ قرض ۱۸۸۸ء کے (اندازا) وسط میں ملا اور کچھ عرصے میں دفتر قائم ہو گیا۔ اس دوران ایک بڑا عرصہ گزرا جس میں لغت کی پہلی جلد بھی منظر عام پر آئی۔ لیکن تحریر سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلا دفتر ختم ہو چکا تھا۔ پھر قرضہ ملتے ہی دوبارہ دفتر قائم ہوا اور جنرل اعظم خاں کا انتقال ہو گیا۔ جو درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۸۸ء کے آخر میں پہلی مرتبہ دفتر چھوٹے نواب صاحب کے سرکاری مکانات میں قائم ہوا، جہاں کم و بیش جون ۱۸۹۶ء تک کام کرتا رہا۔ ۲۵ر جون ۱۸۹۶ء میں امیر کے تحریر کردہ مکتوب بنام زاہد حسین زاہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دفتر ختم ہو گیا ہے:

"میں اس زمانے میں ایک جدید تکلیف پیش آجانے سے سخت پریشان ہوں عالی شان مکانات سرکاری جو ایک عمر سے سکونت گاہ تھے دفعتہً بضرورت سرکاری مجھے خالی کر دینا پڑے جس سے میرا سارا قافلہ پریشان ہو گیا، اولاد و احفاد کہیں، میں کہیں، اسباب کہیں، کتابیں کہیں، غرض ہنوز جمعیت و اطمینان کی کوئی صورت نہیں نکلی۔۔۔" (۴۱)۔

حقیقت میں امیر ان دنوں سخت مشکلات سے دوچار ہوئے گھربار اور دفتر "امیر اللغات" سب تتر بتر ہو گیا اور وہ بے یارو مددگار رہ گئے ایسے دور میں کچھ احباب تھے جنھوں نے امیر کی مدد کی منشی امتیاز احمد صاحب راز کو ۱۴ر اکتوبر ۱۸۹۶ء کو لکھتے ہیں:۔

"وسیع مکان میری گزر کے قابل باوجود کمال کوشش کہیں دستیاب نہ ہوا۔ ورنہ اس زمانے میں جس کرایہ کو ملتا بناچاری لیا جاتا بناچاری میں اپنی ذات سے خانقاہ معصومی کا مجاور ہوا اور اہل و عیال کو حافظ عبدالحیٔ والے مکان میں جو میاں صاحب کے مکان سے جانب جنوب متصل سڑک ہے بھر دیا اسباب حتیٰ کہ کتابوں کی الماریاں بھی سب کھنڈ سار کی زمین پر کھلے میدان میں ہیں اور جہاں تک ممکن ہے کوشش کر رہا ہوں کہ اس زمین کی تعمیرات کہنہ میں کسی عنوان سے صلاحیت برسات بسر کرنے کی نکلے" (۴۲)۔

منشی ولایت علی خاں صفی پوری کے خط میں جو ۸ر رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ کا تحریر کردہ ہے۔ انھی پریشانیوں کا ذکر ملتا ہے۔

"جن مکانوں میں سالہائے دراز سے میں اقامت گزین تھا دفعتہً وہ مکانات مجھے چھوڑنا پڑے اور اسباب سب متفرق جابجا عزیزان و احباب کے مکانوں پر پہنچایا گیا اس لیے کہ مکان وسیع سردست مل نہ سکا اب جو مسکن قرار پایا وہاں سب مقاموں سے اسباب منگوا کر بے ترتیب و بے تہذیب رکھ دیا گیا" (۴۳)۔

۱۹ر دسمبر ۱۸۹۷ء کے مکتوب بنام زاہد حسین زاہد سے نئے دفتر کے قائم ہونے کا علم ہوتا ہے: "بڑی کوششوں سے خدا خدا کر کے یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ دفتر قائم ہوا اور آگے کام چلے" (۴۴)۔ تو گویا کم و بیش پندرہ ماہ دفتر اپنی اصل کھونے کے بعد دسمبر ۱۸۹۷ء میں دوبارہ قائم ہوا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی اس کی تصدیق کی ہے (مطالعہ امیر، ص ۴۴۸) ممتاز علی آہ اس کی تفصیل یہ بیان کرتے ہیں:

"اس وقت پرانی کھنڈ سار میں قیام تھا کیوں کہ سرکاری مکانات جو پہلے رہنے کو ملے تھے وہ قلعے میں

آگئے تھے اور سرکار سے پرانی کھنڈ سار رہنے کو عطا ہوئی تھی۔ یہی جگہ احاطہ ء مینائیاں ہوئی، کچھ مختصر معمولی مکانات تھے اور بیچ میں ایک چھوٹا دو پلیا سائبان جس میں دفتر 'امیر اللغات' تھا" (۴۵)۔

یہ دوسرا دفتر امیر کے حیدر آباد روانہ ہونے (۱۹۰۰ء) تک کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کب تک قائم رہا اور دفتر کا کیا حال ہوا؟ اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں، مثلاً ڈاکٹر کریم الدین اپنے مقالے میں تحریر کرتے ہیں :

"امیر نے لغت کے لیے سولہ ہزار روپے قرض لیا تھا، وہ طلب کیا گیا۔ امیر کے بڑے لڑکے محمد احمد صریر ان دنوں ریاست میں تحصیل دار تھے اور سو روپیہ تنخواہ پاتے تھے۔ ان کی تنخواہ سے اسی روپے وضع کر لیے جاتے تھے اور انھیں کل بیس روپے ملتے تھے جس پر ۷۰۔ ۶۰ افراد کا گزارا تھا۔ مصیبتوں کا یہ زمانہ کوئی آٹھ برس رہا۔ اس عرصے میں امیر کی قیمتی لائبریری اور وہ تمام ذخیرہ جو انھوں نے ایک عمر صرف کر کے جمع کیا تھا تباہ ہو گیا... جس کے جو ہاتھ آیا اس نے بیچ دیا۔ اس طرح ان کا زندگی بھر کا اثاثہ تباہ ہو گیا" (۴۶)۔

امیر کے ذخیرے کا اس طرح فروخت ہونا سچائی پر مبنی معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ رام پور کے نواب اگر ناراض ہو گئے تھے تو امیر کے چاہنے والے ان کے دوست، شاگرد جو نواب یا نواب زادوں سے کم نہ تھے، کیا وہ بھی ناراض ہو گئے تھے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر کی بد قسمتی پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ مشکل وقت میں اکثر لوگوں نے امیر اور ان کے لواحقین کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جناب اسمٰعیل احمد مینائی (امیر مینائی) کہتے ہیں :۔

"کتابوں کی فروخت ہونے کی بھنک پھوپھیوں اور چچا کی زبانی میرے کانوں میں پڑی تھی۔ یہ ٹھیک بات ہے۔ لیکن اس کا ایک پس منظر ہے، جو کم لوگوں کو معلوم ہے ۱۹۰۰ء میں جب دادا (امیر) حیدر آباد دکن چلے گئے تو نواب حامد علی خاں، والد (محمد احمد صریر) سے اس بات پر ناراض ہو گئے کہ تم نے ان کو روکا کیوں نہیں اس جرم میں والد صاحب کی نوکری ختم ہو گئی، جائداد ضبط ہو گئی اور کم و بیش تین سال یہ حال ہوا کہ گھر میں دو دن میں مشکل سے ایک وقت چولھا جلتا تھا۔ وہ دن بڑی اذیت کے تھے اور کیوں کہ میرے والد (محمد احمد صریر مینائی) سب سے بڑے تھے اس لیے ان پر بڑی ذمے داری تھی۔ وہ سب کا بہت خیال رکھتے تھے" (۴۷)۔

یہ سوال ابھی تک قائم ہے کہ " دفتر امیر اللغات " کا کیا بنا؟ اس بارے میں ممتاز علی آہ لکھتے ہیں :۔

"وہ زمانہ زیادہ مالی پریشانی کا میں نے دیکھا۔ مکان میں آگ لگ جانے سے اسباب کے ساتھ غیر مطبوعہ کلام اور کتابیں جل کر خاک سیاہ ہو گئی تھیں۔ افسوس اور قلق سے حضرت کا دل مٹی ہو رہا تھا" (۴۸)۔

اس افسوس ناک واقعے کی شہادت امیر کے مکتوبات سے بھی ملتی ہے۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۰۰ء کے ایک خط میں بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں۔

"میرے گھر میں دفعتاً آگ لگ گئی ہوا بند تھی آناً فاناً ایسی بڑھی کہ سامان راحت و اسباب معاشرت مطبوعہ اور قلمی صدہا کتابیں خاکِ سیاہ ہوگئیں۔ میرے نتائج افکار منظوم و منثور غیر مطبوعہ بھی اکثر جل گئے جن کی تلافی اب ممکن ہی نہیں"(۴۹)۔

۷ار فروری ۱۹۰۰ء کے ایک خط میں زاہد حسین زاہد کو اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے یہ تحریر کرتے ہیں :

"نومبر کے مہینے میں آگ نے زنانے مکان سے مشتعل ہو کر مردانے مکان تک دو پہر میں تمام اسباب راحت و سامانِ معاشرت جلا کر خاک کر دیا۔ قلمی اور مطبوعہ کتابیں بھی بہت سی جل گئیں بڑا حصہ میرے کلام غیر مطبوعہ کا بھی نذر آتش ہوا"(۵۰)۔

آگ لگنے کے عینی شاہد حامد حسن قادری لکھتے ہیں :

"۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثے سے ہم سب پر عجیب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کو دیکھنا اچھی طرح یاد ہے"(۵۱)۔

جناب اسمٰعیل مینائی کہتے ہیں کہ "یہ آگ کھپریل سے لگی تھی جس سے دفتر کی چھت بنی تھی، اس حادثے نے امیر کو سخت پریشان کیا کیوں کہ اس میں ان کے کتب خانے کا بیش تر حصہ جل گیا تھا"(۵۲)۔ بقیہ کتب اور دفتر کے متعلق کہتے ہیں :

"ہمارے گھر کی یہ صورت تھی کہ وہ بہت بڑا تھا بڑے بڑے کمرے، ان کے آگے دالان پھر کمرے جو بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے اس کے قریب اصطبل، گودام اور اسٹور بنے ہوئے تھے جن پر کھپریل کی چھت تھی۔ والد صاحب (صریر) بتاتے تھے کہ یہ کمرے یہ کہہ کر بنائے گئے تھے کہ عارضی ہیں۔ اس میں دفتر امیر اللغات کی الماریاں تھیں جو کہ مقفل تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے شروع میں، میں نے اور میرے چچا مسعود مینائی نے انھیں کھولا ان میں بڑی نایاب کتابیں اور کچھ الماریوں میں لغت کے رجسٹر تھے جن میں لفظ و محاورات کی فہرست بنی تھی، صرف امیر کے وہ دیوان جن پر خود امیر کے ہاتھ کی ترمیم تھی میرے نزدیک زیادہ اہم تھے وہ میں گھر لے آیا۔ باقی سب بند کر دیا۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں، میں پھر رام پور آیا تو دیکھا کہ دفتر کے دروازے کھلے پڑے ہیں الماریاں بھی کھلی ہیں اور سب الٹ پلٹ ہوگیا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ شبیر حسین زیدی (چیف منسٹر رام پور) کے آدمی آئے تھے وہ لوگ کچھ چیزیں تلاش کر رہے تھے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں میری شادی تھی اور سارے گھر والے حیدر آباد دکن منتقل ہو رہے تھے۔ گھر کا سارا سامان ہم نے فروخت کیا، نایاب اور قیمتی کتابیں حیدر آباد دکن بھجوائیں۔ اور بقیہ کتابیں جن میں ناول وغیرہ زیادہ تھے وہ سب ایک پبلک لائبریری کو جو غالباً نئی کھلی تھی دے

دیے گئے۔ اب گھر اور دفتر کی وہ الماریاں جن میں لغت کے مسودے تھے وہ رہ گئے۔ یہ سب کچھ قریبی عزیز اور بھائی الیاس احمد مینائی کی (۵۳) نگرانی میں دے کر سب لوگ چلے گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں اس لیے کہ میں نوکری کی وجہ سے بہت مصروف ہو گیا تھا"۔

ہمارا خیال ہے کہ "دفتر امیر اللغات" زمانے کے ناساعد حالات کی نذر ہو گیا۔ لیکن بعض روایتوں کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس میں موجود ذخیرہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔

دفتر قائم کرنے کے بعد امیر نے اسے جدید خطوط پر چلانے کے لیے ذہین عملہ رکھا جس میں زیادہ تر ان کے شاگرد اور رشتے دار تھے، جنھوں نے اچھے اور برے وقت میں امیر کا بھرپور ساتھ دیا۔ دفتر میں عملہ کتنے ارکان پر مشتمل تھا؟ یہ تو تحقیق نہیں ہو سکا البتہ متفرق کتب اور مکاتیب میں کہیں کہیں کسی رکن کا نام ملتا ہے اور یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ وہ معتمد تھا یا محرر۔

ذیل میں معتمدین اور محررین کے نام اور ماخذات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

معتمدین :

(۱) وسیم خیر آبادی (۵۴)۔ (۲) منشی لیاقت علی (۵۵)۔ (۳) ممتاز علی آہ (۵۶)۔
(۴) جلیل مانک پوری (۵۷)۔ (۵) منشی لطیف احمد مینائی (۵۸)۔ (۶) منشی مسعود احمد مینائی (۵۹)۔
(۷) محمد احمد صریر مینائی (۶۰)۔ (۸) سید محمد شاہ (۶۱)۔

یہ کوئی حتمی فہرست نہیں ہے، کیوں کہ "دفتر امیر اللغات" گیارہ برس (درمیان میں پندرہ ماہ کے وقفے سے) قائم رہا۔ اس عرصے میں متعدد لوگ ملازمت چھوڑ گئے۔ کئی کا انتقال ہو گیا تھا۔

محررین :

(۱) عبدالوہاب خاں دل گیر (۶۲)۔ (۲) محمد صفدر علی خاں خیال (۶۳)۔ (۳) واحد علی بسمل (۶۴)۔
(۴) حسین الدین احمد اثر (۶۵)۔ (۵) امتیاز احمد خاں (۶۶)۔ (۶) ثامت علی (۶۷)۔
(۷) محمد قیام الدین (۶۸)۔ (۸) خان علی خان (۶۹)۔ (۹) مہدی علی خان (۷۰)۔
(۱۰) خورشید احمد مینائی (۷۱)۔ (۱۱) پنڈت صاحب (نام نامعلوم) (۷۲)۔ (۱۲) نبی احمد خان (۷۳)۔
(۱۳) محمد رضا خاں افسر (۷۴)۔ (۱۴) افضل شاہ افضل (۷۵)۔ (۱۵) عبدالرزاق جمیل (۷۶)۔
(۱۶) اصغر علی خاں اصغر (۷۷)۔

امیر نے "امیر اللغات" کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی (جسے انھوں نے ایک خط میں علمی کمیٹی بھی کہا ہے) تشکیل دی جس کے صدر وہ خود تھے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ جو لغت تالیف ہو اس کو سن لے اور بحث طلب مسئلے کو حل کرے۔ امیر نے کمیٹی کے انتخاب میں بھی بہت سوچ بچار سے کام لیا تھا رام پور اور دوسرے شہروں سے بھی صاحبِ استعداد افراد کو جمع کیا تھا۔ وہ منشی نظام الدین نظام کو بھی دفتر میں لانا چاہتے تھے لیکن مالی مسائل کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکے۔ ۲۸/ مارچ ۱۸۹۱ء کے ایک خط میں حکیم برہم کو لکھتے ہیں :

"منشی نظام الدین صاحب نظام کی لیاقت سے میں بخوبی آگاہ ہوں ۰۰۰ میری آرزو تو یہ ہے کہ
'امیر اللغات' کو رونق ہو تو ان کو اسی دفتر میں رونق افزائی کی تکلیف دوں" (۷۸)۔

امیر کے دفتر میں لوگوں کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں محررین بھی معمولی اہلیت کے لوگ نہیں تھے۔ بلکہ غیر معمولی استعداد کے مالک تھے۔ ہم نے حواشی میں کوشش کر کے وہ معلومات فراہم کی ہیں جس سے ان اشخاص کی علمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح امیر کے توسط سے بہت سارے علمی و ادبی لوگوں کے احوال بھی منظر عام پر آگئے ہیں۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۸۹۲ء کے خط میں حکیم کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ "میرے ایک دوست حکیم قیام الدین صاحب (محرر) جو کئی مہینے سے اس دفتر میں رونق افروز ہیں" (۷۹)۔ قیام الدین عربی و فارسی کے علاوہ ایک ذہین طبیب بھی تھے۔ حکیم کوثر خیر آبادی کے وہ نسخے جو امیر استعمال کرتے تھے پہلے حکیم قیام الدین سے ان کے بارے میں مشورہ کرتے تھے۔ بہر کیف امیر کو دفتر "امیر اللغات" کے ارکان پر بہت بھروسہ تھا خاص کر علمی کمیٹی کے ممبران پر۔ ۱۹ر ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ کے ایک خط میں شاداب کو لکھتے ہیں کہ "جس وقت علمی کمیٹی لائق ممبروں کی جمع ہو کر جی لگائے گی اور کام منقسم ہو جائے گا تو امید ہے کہ "امیر اللغات" اس سے بمدارج حسن تالیف اور محاسن تصنیف میں سوا ہو گا" (۸۰)۔ ذیل میں علمی کمیٹی کے ارکان کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ مولوی حفیظ اللہ (۸۱)۔ ۲۔ مولوی فصیح الزماں خاں فصیح (۸۲)۔ ۳۔ منشی عبدالرحمٰن بسمل (۸۳)۔
۴۔ حکیم نعیم الزماں خاں نعیم (۸۴)۔ ۵۔ حافظ محمود علی فدا (۸۵)۔ ۶۔ منشی محمد احمد صریر (۸۶)۔

اس فہرست میں سنسکرت کے ایک ماہر کا بھی پتا چلتا ہے لیکن ان کا مکمل نام سامنے نہیں آیا۔ امیر ۱۹ر جون ۱۸۹۲ء کے ایک خط میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں۔

"ہمارے یہاں علم سنسکرت کے تبحر ایک پنڈت ہیں اگر تم اس کتاب کا کوئی جزو بھیجو تو یہاں پنڈت سے دریافت ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب امیر اللغات کے لیے کہاں تک مفید ہے" (۸۷)۔

مکاتیب کی داخلی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس کمیٹی نے لفظ کی چھان پھٹک، اصول تالیف اور دیگر تدوین کے مراحل میں ابتدائی کام مکمل کیا جس کی بدولت تالیفِ لغت کا راستہ متعین ہوا۔ اس ذیل میں متعدد خطوط مثال میں پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن سر دست دو سے اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔

انگریزی الفاظ کو لغت میں جگہ دینے کی بابت حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے دریافت کیا تھا اس کے جواب میں امیر اپنی اور علمی کمیٹی کے ممبروں (جن کے لیے امیر مشیروں کا لفظ استعمال کرتے ہیں) کی بابت رقم طراز ہیں کہ "الفاظ انگریزی کی نسبت یہی رائے میری بھی ہے اور یہی مشرب میرے موجودہ مشیروں کا ہے۔ کمیٹی میں بھی یہی امر طے ہوا ہے" (۸۸)۔ انگریزی الفاظ کی بابت زاہد حسن زاہد نے بھی صراحت چاہی تھی چناں چہ امیر انھیں اپنے اور علمی کمیٹی کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے ۴ر ستمبر ۱۸۹۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"تم نے جو انگریزی الفاظ امیر اللغات میں کم پائے اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیٹی میں بالاتفاق یہ رائے قرار پائی کہ امیر اللغات میں وہی الفاظ انگریزی کے داخل کیے جائیں جن کی جگہ اردو میں کوئی فصیح مختصر اور ٹھیک انھی معنوں میں لفظ موجود نہیں ہیں۔ آفیس، آنحر، آرڈر، وغیرہ

لکھے لکھائے مسودے سے خارج کر دیے گئے۔ کیوں کہ آفیس کی جگہ کچہری اور دفتر اور آتھر کی جگہ مصنف، آرڈر کی جگہ حکم موجود ہے۔ آنر، آنر بیل، آنریری وغیرہ لکھے گئے ہیں" (۸۹)۔

(۶)

علمی کمیٹی کے علاوہ امیر نے بیرونی معاونین پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی تھی۔ جس کے اراکین مسودات کی چھان پھٹک، پروف خوانی، کتابوں کی فراہمی اور لغت کے لیے الفاظ کا ذخیرہ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ لغت کی تشہیر اور فروخت کا بندوبست بھی کیا کرتے تھے۔ ان میں چند نمایاں نام جو مکتوبات کے توسط سے سامنے آئے وہ یہ ہیں۔

۱۔ زاہد حسین زاہد (۹۰)۔ ۲۔ حکیم برہم (۹۱)۔ ۳۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۹۲)۔
۴۔ مولوی محمد اعجاز حسن خاں (۹۳)۔ ۵۔ مولوی محمد ریاض حسن خاں خیال (۹۴)۔ ۶۔ مولوی محمد مہدی حسن خاں شاداب (۹۵)۔
۷۔ صفیر بلگرامی (۹۶)۔

ذیل میں بیرونی معاونین کے نام لکھے جانے والے مکاتیب سے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جن سے نام کی نوعیت اور امیر سے ان کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امیر ۱۹؍اپریل ۱۸۸۹ء کو حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو رقم طراز ہیں:

"لغت اردو کی نسبت بھی توجہ چلی جائے اس کی فکر کیجیے کہ یہ لغت محبوب ہو کر نکلے۔ اب تک جو لغات اردو میں ہیں انشاء اللہ ان سے تو مفید تر ہونے کی امید قوی ہے مگر افکار رسا ادھر متوجہ رہیں کہ جمعیت بڑھے اور نفع عام تر ہو تو کیا عجب ہے کہ ایسی باتیں بڑھتی جائیں۔ آپ گھڑی دو گھڑی روز ادھر بھی توجہ رکھیں تو آپ کی جواں فکر ضرور عمدہ باتیں پیدا کرے گی" (۹۷)۔

زاہد حسین زاہد نے امیر اللغات کے لیے سب سے زیادہ علمی معاونت کی۔ کتب کی فراہمی، لفظوں کے ذخیرے کی فراہمی۔ تدوین سے متعلق مشورے، غرض کہ وہ آخر تک ہر طرح سے امیر کی مدد کرتے رہے۔ "مکاتیب امیر مینائی" میں ان کے نام پچاسی (۸۵) مکاتیب ملتے ہیں۔ اگر یہ مکاتیب دستیاب نہیں ہوتے تو دفتر "امیر اللغات" یا امیر کے نظریہ لغت نویسی کی متعدد کڑیاں گم ہو جاتیں ذیل میں زاہد کے نام ایسے ہی مکاتیب پیش کیے جا رہے ہیں جس سے ان کی کاوشوں اور امیر کے فنِ لغت نویسی پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

۲۶؍ستمبر ۱۸۹۱ء

"بعض لغاتِ اردو کے اوراق کا پمفلٹ مجھے پہنچا۔ تمہاری سچی ہمدردی اور پوری محبت و سعادت سے بہت ہی جی خوش ہوا ... تمہارے بھیجے ہوئے اوراق کو بغور دیکھوں گا اور جو بات ان میں نئی ملے گی اس کو لغت نویسی میں داخل کر کے ملک کو فائدہ پہنچاؤں گا (۹۸)۔

امیر لغت میں اردو زبان کی اصلیت اس کی ابتداء اور تغیرات پر بھی تفصیلی لکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت تک اس موضوع پر جو کتابیں دستیاب تھیں وہ ان کی دسترس میں تھیں لیکن امیر چاہتے تھے کہ کوئی نئی معلومات ہوں جو عوام کے لیے مفید ہوں۔ چناں چہ زاہد حسین زاہد کو ۳۰؍جنوری ۹۲ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

"تم سے اگر ممکن ہو تو زبان کی اصلیت کی ابتداء کہاں سے زبان پیدا ہوئی اور کن کن تغیرات کے بعد اس حد کو پہونچی۔ وغیرہ وغیرہ لکھو" (۹۹)۔

اس خط میں مزید رقم طراز ہیں کہ :

'تذکرہ آبِ حیات' میں آزاد نے اور 'جلوہ خضر' میں صفیر نے اور 'گلستانِ سخن' میں مرزا صابر شش شاہزادہ دہلی نے کچھ کچھ اس بحث کو لکھا ہے میں چاہتا ہوں کہ 'امیر اللغات' میں یہ بحث ان سے الگ اور نہایت شرح وبسط کے ساتھ لکھی جائے مگر اس کے مادے کا پتا نہیں لگتا کہ کہاں سے اخذ کیا جائے۔ تم کہیں سے ٹوہ لگاؤ میں بھی فکر میں ہوں جو کچھ آزاد و صفیر وغیرہ نے لکھا ہے "امیر اللغات" میں اس کی نقل کر دینے کو تو جی نہیں چاہتا۔ نئی باتیں بھی پیدا ہوں اور ان کے ضمن میں یہ باتیں بھی سب آجائیں" (۱۰۰)۔

زاہد حسین زاہد نے امیر کو زبان کی ابتداء وارتقاء سے متعلق مواد فراہم کیا تھا لیکن امیر کی محتاط طبیعت اس کو اس طرح قبول کرنے کے حق میں نہیں وہ علمی کمیٹی کے مشورے سے اسے شامل کرنے پر زور دیتے ہیں۔ زاہد کو ۷ ار جون ۱۸۹۲ء کے خط میں رقم طراز ہیں :۔

"اردو کی تحقیق میں جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ اس پر اچھی طرح نظر کروں تو اس کے بعد جواب لکھوں مگر اس وقت تک ایسا وقت نہ ملا ۰۰۰ آپ کی تحریر کے ہر جزیئے کو تدقیق نظر سے دیکھوں اور صاحبانِ رائے موجودہ دفتر سے بھی بحث کر کے رائے لوں" (۱۰۱)۔

امیر لغت میں لفظ اردو پر تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے۔ اور ان کا ارادہ تھا کہ اس سے متعلق معلومات لغت کے آخر میں لگائی جائیں۔ زاہد حسین زاہد کو ۳ ر اگست ۱۸۹۲ء کے خط میں "اردو" لفظ سے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں :

"آپ کے مرسلہ اوراق میں نے دیکھے اور جس جس جگہ سے مدد ملی اس سے فائدہ اٹھایا۔ مگر اردو کے لفظ میں بالفعل مختصر طور پر کچھ لکھ دیا گیا ہے۔ اور ہمیشہ سے یہ خیال ہے کہ اس کی تحقیق علیحدہ لکھ کر لغت میں لگائی جائے۔ کتاب ختم ہونے تک جس وقت موقع ملا یہ خیال پورا کیا جائے گا۔ اور آپ نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے وہ بھی آنکھوں کے سامنے رہے تاکہ مفید باتیں اس میں سے بھی چن لی جائیں" (۱۰۲)۔

امیر "امیر اللغات" میں انگریزی الفاظ بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس سے متعلق ان کا خاص نظریہ تھا کہ صرف وہ لفظ شامل کیے جائیں جن کی جگہ اردو میں فصیح مختصر اور ٹھیک انھی معنوں میں لفظ موجود نہیں لیکن ایک قباحت یہ تھی کہ امیر انگریزی زبان سے ناواقف تھے چناں چہ وہ زاہد حسین زاہد سے اس حوالے سے مدد کے طلب گار ہیں وہ ۲۶ ر ستمبر ۱۸۹۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"انگریزی الفاظ سے مجھے کوئی مناسبت نہیں اس لیے ایسا ذخیرہ نہ میرے سینے میں ہے نہ سفینے میں جس سے یہ معلوم ہو کہ اتنے الفاظ اردو نے قبول کر لیے ہیں۔ کتابیں بھی ایسی اب تک بہت کم ملک میں

تالیف ہوئی ہیں۔ صرف ' فرہنگ فرنگ ' اور بعض اخبار کے اوراق جن میں ایسے لفظ جمع کیے گئے ہیں دفتر میں موجود ہیں۔ اس لیے تم کو ایسے الفاظ کے جمع کر دینے کی ضرور تکلیف دوں گا"(۱۰۳)۔

زاہد حسین زاہد بیرونی معاونین میں سب سے زیادہ مستعد تھے انھوں نے امیر کی خواہش کے موافق الفاظ لکھ بھیجے لیکن انھیں اس کام میں دیر ہوئی۔ اس کے باوجود امیر کی خواہش یہ نظر آتی ہے کہ ان اوراق سے فیض اٹھایا جائے جو زاہد حسین زاہد نے انھیں بھیجے ہیں۔

"محبت نامہ پہنچا اور اس کے ساتھ وہ الفاظ بھی پہنچے جو آپ نے کسی ڈکشنری سے منتخب کر کے لکھے ہیں ۰۰۰ افسوس ہے کہ نصف ٹکڑا دوسرے حصہ کا ۱۵/ ستمبر کو چھپنے کے لیے روانہ ہو چکا لیکن پھر بھی جہاں تک اس ٹکڑے میں الفاظ کا بڑھانا ممکن ہو گا کوشش کی جائے گی"(۱۰۴)۔

کارکنانِ دفتر، معاونین لغت اور بیرونی علمی معاونین میں یہ بات مشترک تھی کہ ان میں بیش تر امیر کے شاگرد ہیں یا پھر عزیز و اقارب۔ اس سے ذہن میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہو گا کہ کیا رام پور یا ملک میں اور اہل قلم موجود نہیں تھے؟ یا امیر نے ان سے تعاون مانگا اور انھوں نے مدد نہ کی۔ ممکن ہے اس قسم کی باتیں امیر کے کان میں بھی پڑی ہوں یا زاہد حسین زاہد نے ان سے پوچھ لیا ہو چناں چہ وہ ۷ ۲/ ستمبر ۱۸۹۲ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے بہت دنوں ملک ملک کی رائے پر کام کرنا چاہا مگر باہم رایوں کا اختلاف اس قدر ہوا کہ میں عاجز آگیا چند نازک خیال اور عالی دماغ احباب نے یہی رائے دی کہ ان جھگڑوں میں لغت تالیف سے رہ جائے گا۔ صرف اپنی رائے کو دخل دینا چاہئے ملک سے بہت دنوں صلاح و مشورہ کیا گیا۔ ناچار میں اب اپنی ہی رائے سے کام لیتا ہوں اور جو عزیز یا دوست میری مدد کرتا ہے اور اپنی کوئی صائب رائے ظاہر کرتا ہے اس کا شکر گزار ہوتا ہوں اس کی رائے ماننے نہ ماننے میں ہٹ دھرمی نہیں کرتا"(۱۰۵)۔

مکتوبات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ امیر نے متعدد شہروں کے جو دورے کیے اور محمد احمد نے بھی اس سلسلے میں جو بھاگ دوڑ کی تھی اس سے امیر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ملک ان کا کتنا ساتھ دے سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے ایسے لوگ کمیٹی میں شامل کیے جو ان کے قریب تر یا تربیت یافتہ تھے بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر:

"اس کمیٹی کے اکثر ممبر امیر کے عزیز و شاگرد تھے رام پور میں اس وقت اور لوگ بھی تھے جو کمیٹی کے ممبر بننے کے اہل تھے لیکن مؤلف کے ہم خیال اور زیرِ اثر اصحاب ذی لیاقت کے منتخب کرنے میں جو عملی سہولتیں تھیں ان سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی"(۱۰۶)۔

یقیناً اس سے امیر کو فائدہ ہوا کیوں کہ "دفتر امیر اللغات" اول دن ہی سے مالی مشکلات سے دوچار رہا (جس پر آگے چل کر ہم تفصیل سے بات کریں گے)۔ ایسے میں اگر امیر سے محبت کرنے والے لوگ نہ ہوتے محض تنخواہ دار ملازم یا معاونین میں محض نام و نمود کی خواہش رکھنے والے لوگ ہوتے تو یہ دفتر مزید بحران کا شکار ہوتا اور جتنا کام ہوا اس کی بھی امید نہ ہوتی۔ امیر کے اس فیصلے سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ

بھی ہوا کہ بہت سارے لوگوں کو امیر سے علمی اور روحانی فیض حاصل کرنے کا موقع بھی ملا اور امیر کے تلامذہ ممتاز علی آہ، جلیل مانک پوری، وسیم خیر آبادی اور محمد احمد صریر وغیر ہم نے امیر کی صحبت ہی کی بدولت دنیائے ادب میں نہ صرف نام کمایا۔ بلکہ اپنے استاد کے مسلکِ ادب کو آگے بڑھانے کی کوشش بھی کی۔

(۷)

امیر نے لغت کی بنیاد بڑے اہتمام اور سوچ بچار کے بعد ڈالی تھی۔ اصولِ تالیف پر ان کی نگاہ ہمیشہ گہری رہی۔ جن عناصر کو لغت کا حصہ بنتا تھا ان کے حصول کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی اور جن چیزوں سے لغت کو بچانا تھا وہ ابتداء ہی میں رد کر دی گئیں یا کم از کم دوسری جلد کی تکمیل تک سارے اصول وضع کر دیے گئے۔ گزشتہ صفحات میں مکتوبات سے جو اقتباس درج کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں حاصل ہونے والے نکات یہ ہیں۔

۱۔ جو کتابیں "امیر اللغات" کے لیے مفید ہوں انھیں حاصل کیا جائے۔
۲۔ "امیر اللغات" میں وہی الفاظ انگریزی کے داخل کیے جائیں جن کی جگہ اردو میں کوئی فصیح مختصر اور ٹھیک انھی معنوں میں لفظ موجود نہیں۔
۳۔ کوشش کر کے "امیر اللغات" میں نئی نئی چیزیں شامل کی جائیں۔
۴۔ لفظ اردو پر تفصیل سے لکھ کر لغت کے آخر میں لگایا جائے۔
۵۔ بیرونی معاونین جو لوازمہ بھیجیں ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔
۶۔ زبان کے متعلق تحقیق کر کے سب سے منفرد اور نیا مواد لغت کے شروع میں لگایا جائے۔

دفتر قائم کرنے کے بعد لائحہ عمل کے مطابق کام شروع کیا گیا۔ "علمی کمیٹی" کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ بقول اسمعیل مینائی :

> "دفتر میں ہوتا یہ تھا کہ جو طریقہ آج کل کارڈ میٹنگ کا ہے وہ (امیر) اس کام کو ایک بڑے کاغذ پر کراتے تھے۔ یعنی ایک بڑے کاغذ پر کتابوں سے لفظ نکال کر منتقل کرتے جاتے تھے۔ پھر انھیں دوسرے اہل کار الفبائی طریقے پر لکھتے تھے۔ معتمدین ان کی سند خود اور امیر سے پوچھ کر لکھتے جاتے تھے"(۱۰۷)۔

"اس طرح دن میں جس قدر لغت تالیف ہوتا تھا وہ شب کو ارکان 'مشیر کمیٹی' سن لیا کرتے تھے" (۱۰۸)۔ لیکن یہ طریقہ زیادہ دن نہیں چل سکا مشیروں کے بحث مباحثے کا یہ نتیجہ ہوا کہ لغت کا کام رکنے لگا۔ چناں چہ دو جلدوں کے بعد چند نازک خیال اور عالی دماغ احباب نے یہی رائے دی کہ ان جھگڑوں میں لغت تالیف سے رہ جائے گا، صرف اپنی رائے کو دخل دینا چاہیے "(۱۰۹)۔ یوں امیر نے اپنے ہی اجتہاد سے کام لیا اور لغت کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس فیصلے کے بعد کام نسبتاً آسان ہو گیا۔ اہل کار الفاظ کی فہرست بناتے، معتمدین ترتیب دینے کے بعد سند لکھتے، اور امیر اس کی نظر ثانی کرتے تھے۔ جلد مکمل ہونے کے بعد مطبع جاتی تھی۔ وہاں کاتب اسے لکھتا تھا۔ اس کی کاپیاں واپس دفتر آتی تھیں اور اصل سے مقابلہ (پروف خوانی) کرنے کے بعد واپس مطبع جاتی تھیں، جہاں چھپائی کا کام ہوتا تھا۔ صاحب مطبع

پروف نہیں بھیجا کرتے تھے۔ اس ساری صورتِ حال کو امیر نے اپنے ایک خط میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ مکتوب بنام حکیم برہم مورخہ ۵/ جون ۱۸۹۲ء میں لکھتے ہیں :

"پروف تو یہیں دیکھنے کو نہیں ملتا ••• صرف کاپیاں آتی ہیں، وہ دفتر میں مقابلہ ہو کر واپس جاتی ہیں۔ کاپیوں کو پتھر پر ڈال کر، پروف اتار کر اگر صاحب مطبع بھیجیں تو جب تک پروف واپس نہ جائیں تب تک چھاپنے سے معذوری ہو اور ان کے پتھر گھرے رہیں۔ یہ ہرج کوئی کیوں گوارا کرے گا۔ ہاں کسی مطبع کا بہت بڑا کارخانہ ہو، پتھر بکثرت ہوں تو شاید ایسا ہو سکے" (۱۱۰)۔

شاید اسی قباحت کی وجہ سے امیر نے سر الفرڈ لائل کے مشورے پر عمل نہ کیا ہو۔ اس لیے کہ سر الفرڈ لائل نے نمونہ دیکھنے کے بعد یہ مشورہ دیا تھا کہ :

"ایک دو ورق پروف کے طور پر تیار ہو جائے اور قریب قریب دو سو جلدیں اس کی تمام ہندوستان میں گردش کرائی جائیں ایک عمدہ چھاپہ خانے کے واسطے ہو" (۱۱۱)۔

ڈاکٹر کریم الدین احمد لکھتے ہیں کہ :

"سر الفرڈ لائل نے پروف مشتہر کرنے کا جو مشورہ دیا تھا اگر اس پر عمل کیا جاتا اور انھیں اصولوں پر لغت مرتب ہوتا تو واقعی ایک معرکے کی چیز ہوتا" (۱۱۲)۔

لیکن مقدمہ "امیر اللغات" میں امیر لکھتے ہیں کہ :

"پروف مشتہر کرنے کی صورت جو سر الفرڈ لائل کی ہدایتوں میں تھی کسی طرح بن نہ پڑی، اس لیے کہ سر الفرڈ لائل کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اس کام کو سرکاری کاموں کا ضمیمہ بنائیں مگر اس خیال سے کہ لغت ملک کے لیے ہے میں نے نج کی تحریروں اور اخباروں کے ذریعے سے تالیف کے اہم مسائل کو ملک کے سامنے پیش کیا جس سے ایسے اچھے اچھے نتیجے نکلے جو کبھی کسی مصنف یا مؤلف کی خود رائی سے نہیں نکل سکتے" (۱۱۳)۔

امیر نے سر الفرڈ لائل کے مشورے پر عمل نہ کرتے ہوئے جو راستہ اپنایا وہ مجبوری تھی امیر جن حالات سے دوچار رہے ان حالات میں مشورے پر عمل کرنا ناممکن تھا، کیوں کہ اس میں ایک باقاعدہ مطبع کا ہونا بے حد ضروری تھا اس کے علاوہ ضروری نہیں تھا کہ لوگ بھی اس سلسلے میں تعاون کرتے، امیر نے جو دورے ملک بھر میں کیے تھے اس سے امیر کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ کس قدر لوگ تعاون کر سکتے ہیں۔ مگر دوسرے یہ کہ ریاست کے یکے بعد دیگرے انقلابات بھی اس کام پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اگر واقعی سر الفرڈ لائل کے مشورے پر مکمل عمل ہو جاتا تو امیر اللغات کا مرتبہ مزید بلند ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود بہترین منتظم کی طرح انھوں نے ہر ممکن طریقے سے اپنی لغت کو منفرد کرنے کی ٹھان لی تھی۔ جو مشورے دیے جاتے وہ انھیں شکریے کے ساتھ قبول کرتے اور جو قابلِ قبول نہیں ہوتے وہ دلیل کے ساتھ رد کرتے۔ وہ چاہتے تھے کہ لغت میں جو معلومات فراہم کی جائے وہ مستند ہو اور مستند ذریعے سے حاصل کی گئی ہو۔ اور ان کی یہ کوشش ابتداء سے

آخر تک رہی۔ اس کے علاوہ وہ ان کتابوں کے استفادے سے بھی محتاط رہے جو مستند نہیں تھیں۔ امیر کی خواہش تھی کہ ''امیر اللغات'' اب تک کی تمام کتابوں پر حادی ہو گویا ان کی لغت کے سامنے دوسری لغات ہیچ ہو جائیں، اسی حوالے سے وہ زاہد حسین زاہد کو ۱۰ر فروری ۱۸۹۲ء کے خط میں ''مخزن المحاورات'' اور ''گلشنِ فیض'' کے متعلق لکھتے ہیں :۔

''محاورات و لغات کی تحقیق کے واسطے ''مخزن المحاورات'' اور 'گلشن فیض' کسی قدر مفید ضرور ہیں مگر غیر محقق کو دھوکہ دینے میں بھی یہ کتابیں استاد ہیں۔ دعا کیجیے کہ ''امیر اللغات'' مکمل ہو جائے تو خدا سے امید ہے کہ وہ ان سب سے مستغنی کر دے گا''(۱۱۴)۔

زاہد حسین نے لغت کے لیے کچھ لوازمہ بھیجا لیکن ماخذ کا ذکر نہیں کیا چناں چہ امیر نے اسے اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک ماخذات کا علم نہ ہو گیا۔ ذیل میں ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو امیر کے فطری محقق اور لغت نگار ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے یہ خط ۲۲ر مارچ ۱۸۹۵ء کا ہے۔

''آپ نے تاریخی حالات جو لغت کے متعلق لکھ کر بھیجے ہیں وہ کس کتاب سے لیے ہیں ... مجھے اس کا انتظار ہے اور بڑی ضرورت ہے۔ چند لغت اور ہیں جن کے متعلق تاریخ سے کچھ حال لکھنا مقصود ہے۔ بہزاد۔ بہلول دانا، بیجو باورا بطلیموس ان کے نوٹ اگر آپ دے سکتے ہیں تو لکھیے اور بھیجیے۔ اور اگر جلد تلاش کرنا اور لکھنا ممکن نہ ہو یا دشوار ہو تو مجھے ان کتابوں کا پتا لکھیے جن میں ان کا حال لکھا ہے کہ میں خود لکھ لوں لیکن تعجیل بہت مطلوب ہے حصہ بالکل تیار و مکمل ہے صرف اتنی ہی کسر باقی ہے''(۱۱۵)۔

امیر لغت کے لیے بہترین معلومات حاصل کرنے کی مسلسل تگ و دو میں رہتے تھے اور ضروری کتب و رسائل ہر حال میں حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے ''جلوۂ خضر'' کو حاصل کرنے کی کوشش ان کے کئی مکاتیب سے پتا چلتی ہے۔ مولوی محمد اعجاز حسن خاں کو لکھتے ہیں :۔

''جلوۂ خضر کا پہلا حصہ میرے پاس ہے دوسرا حصہ مطلوب ہے۔ میں بہت ہی مسرور ہوں گا اگر آپ اس کا دوسرا حصہ تلاش کر کے مجھے بھیج دیں گے''(۱۱۶)۔

دوسرا حصہ موصول ہونے کے بعد پھر مولوی محمد حسن خاں کو ۱۰ر نومبر ۹۸ء کے خط میں رقم طراز ہیں :

''جلوۂ خضر کے دو حصے اور ہونا اس حصہ دوم سے معلوم ہوا شاید ان کے چھپنے کی نوبت نہ آئی ہو گی اگر آپ کی کوشش سے قلمی دونوں حصے نقل کے واسطے مل سکیں تو بہت ہی جی خوش ہو اور اگر صفیر مرحوم کے جانشین مستعار نہ دیں تو وہیں نقل لینے کا بندوبست کیا جائے''(۱۱۷)۔

مولوی محمد اعجاز حسن خان ''امیر اللغات'' کے بیرونی معاونین میں سے تھے وہ اس سلسلے میں بہت مستعد نظر آتے ہیں لغت کے لیے ایک اہم کتاب ''مقاصد حسنہ'' کی تلاش تھی لیکن صحیح نسخہ نہیں ملتا تھا چناں چہ امیر انھیں ۷ر جنوری ۹۹ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ :

"مقاصد حسنہ کا نسخہ صحیح نہ ملنے سے میں اب تک عبارت مندرجہ امیر اللغات کی فصیح نقل نہ کر سکا"(۱۱۸)۔اسی طرح ۳۰ر مئی ۱۸۹۹ء کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ کتاب حاصل کرنے کی بے تابی تحریر سے عیاں ہے۔

"سند ان پاس کا ذکر آگے آپ نے لکھا تھا چوں کہ دفتر 'امیر اللغات' میں اس کی حاجت ہے اس لیے چاہتا ہوں کہ جس مطبع سے اس کا ملنا ممکن ہو مجھے آگاہ کیجیے کہ میں طلب کرلوں"(۱۱۹)۔

اصل میں اچھی کتاب امیر مینائی کی کمزوری تھی۔ مکاتیب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اردو، فارسی اور عربی کی سیکڑوں کتابیں ان کے مطالعے میں رہ چکی تھیں اور وہ ان کے معائب و محاسن پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے خاص کر تلامذہ اور معاونین امیر اللغات کے کتب خانوں میں یہ جاننے کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے کہ ان کے پاس کیا ہے۔ وہ اکثر شاگردوں اور معاونین سے کتابیں مستعار لیا کرتے تھے اور پھر انھیں احتیاط سے واپس کر دیا کرتے تھے۔ مولوی محمد اعجاز کو ۱۵ر جولائی ۱۸۹۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ :"تمام نسخہ ہائے دیوان مطلوبہ گرامی روانہ کرنے کو دفتر میں کہہ دیا ہے"(۱۲۰)۔امیر شاعر تو تھے ہی لیکن وہ زبان کے بہت بڑے عالم بھی تھے اس کی ایک وجہ کثرت مطالعہ بھی تھی۔ زاہد حسین زاہد کے نام ۳۰ر ربیع الآخر ۱۳۰۰ھ کے مکتوب میں امیر کے کتابوں کے شوق کی بابت نہایت دل چسپ معلومات ملتی ہیں :

"اگر عمدہ کتابیں ہوں تو اپنے کتب خانہ میں غور کر کے اچھی اچھی کتابوں کی فہرست ضرور بھیجیے اور عمدہ کتاب میرے نزدیک مطلاو مذہب اور بہت خوش خط ہونے سے نہیں ہوتی بلکہ فی نفسہ مافی الکتاب کے حسن پر نظر رہے"(۱۲۱)۔

زاہد حسین زاہد کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"مطالعہ کتب سے آپ کو فرصت نہیں ہوتی اور کتاب بینی کا مشغلہ رہتا ہے ذرا مہربانی کر کے اپنے کتب خانہ کی فہرست بھجوایئے شاید کوئی کتاب مجھے مطلوب ہو تو مستعار لینے کی درخواست کروں اور نقل لے کر با احتیاط بھیج دوں"(۱۲۲)۔

کتابوں کے ذوق کا اندازہ اس اقتباس سے بھی ملاحظہ کیجیے۔ یہ ۱۹ر اپریل ۱۸۸۹ء کے ایک مکتوب کا ہے جو حبیب الرحمان خان شروانی کے نام ہے۔

"کتب خانہ کی فہرست بھیجیے تو شاید کوئی کتاب مفید سمجھ کر مستعار مطلوب ہو۔ "مثمر اللغات" خان آرزو کا کوئی صحیح نسخہ ہو تو ضرورت ہے"(۱۲۳)۔

"امیر اللغات" کی کامیابی کی بڑی وجہ امیر کا کتابوں سے متعلق عمدہ ذوق تھا۔ وہ ہر اچھی کتاب کو "دفتر امیر اللغات" کا حصہ بنانے کی خاص کوشش کرتے تھے۔ بقول اسمٰعیل احمد مینائی "دفتر امیر اللغات" میں نادر و نایاب کتب و رسائل کا نہایت نادر و نایاب ذخیرہ تھا(۱۲۴)۔ جو امیر کے علاوہ معتمدین دفتر امیر اللغات کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ اس لیے کتابوں یا الفاظ کے ماخذ کے سلسلے میں امیر یا معتمدین دھوکہ نہیں کھاتے تھے۔ زاہد کے نام ۲۷ر ستمبر کے ایک مکتوب میں امیر لکھتے ہیں کہ "جن لغاتِ متروک کے آپ نے نام لکھے وہ سب اور ان کے علاوہ

اور بھی اس دفتر میں موجود ہیں اور پیشِ نظر رہتے ہیں"(۱۲۵)۔

"امیر اللغات" میں نئے الفاظ شامل ہونے کی دو بڑی وجہیں تھیں ا۔ دفتر کی بہترین لائبریری، ۲۔ بیرونی معاونین کی عمدہ کوشش۔ بیرونی معاونین جب نئے الفاظ سے متعلق ذخیرہ بھیجا کرتے تھے تو فوراً اس کو علمی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اور ردو قبول کا فیصلہ بھی فوراً کر دیا جاتا اور معاونین کو مطلع کر دیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں زاہد حسین زاہد کے نام امیر کا خط ملاحظہ کیجیے یہ ۱۲ر جنوری ۱۸۹۵ء کا ہے۔ اس کے مطالعے سے علمی کمیٹی کی کارکردگی دفتر کے نظم وضبط اور لغت کے اعلیٰ معیار پر روشنی پڑتی ہے۔

> "میں نے آپ کے اجزاء اب نکالے اور دیکھے ۰۰۰ اس میں اکثر لغت نئے ملے اور اکثر شعر بھی کام آئے۔ امثال کی شان نزول اور بعض لغات کی تشریح جو تم نے لکھی ہے وہ قابلِ قدر ہے امیر اللغات نے اس کو خوشی سے لیا۔۔۔ مخزن المحاورات کے لکھنے میں تم نے ناحق محنت کی یہ کتاب وقت تالیف یہاں پیش نظر رہتی ہے۔ 'دریائے لطافت' بھی دفتر میں ہے مگر اس کے دیکھنے کی نوبت کم آتی ہے۔ بلکہ نہیں آتی۔ اس کے محاورے جو تم نے انتخاب کیے وہ مفید ہوئے۔ نظیر کے کلام نے ایک لفظ کا فائدہ نہیں دیا ان کے ماورا جو تم نے بعض بعض الفاظ کے نوٹ لکھے ہیں اور مثلوں کی شان لکھی ہے ان کا ماخذ معلوم ہونا چاہیے۔ کہ کہاں سے اور کس کتاب سے لیے گئے ہیں امیر اللغات میں تو وہی لکھنا ہوتا ہے جو کسی صورت سے نامعتبر نہیں ہوتا"(۱۲۶)۔

(۸)

"دفتر امیر اللغات" نے لگ بھگ بارہ سال کام کیا اس عرصے میں "امیر اللغات" کا کتنا کام ہوا۔ کتنی شائع ہوئیں اور کتنی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔ مکتوباتِ امیر میں لغت کی ترتیب و تدوین کی ایک مکمل روداد ملتی ہے۔ ذیل میں اسی سلسلے کی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

امیر نے نمونہ "امیر اللغات" میں اس لغت کو آٹھ جلدوں میں پیش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ "فروری ۱۸۹۱ء کے 'پیام یار' کے شمارے میں اسی ارادے کا اعادہ کیا گیا ہے(۱۲۷)۔ لیکن مسائل اور حالات نے امیر کو سکون نہیں لینے دیا لہذا صرف دو حصے طبع ہوئے اور بقیہ منظر عام پر نہیں آسکے۔

۱۸۹۱ء میں احسن اللہ ثاقب کو لکھتے ہیں کہ "امیر اللغات" کا پہلا نصف حصہ چھپ چکا ہے فروری میں تمامی کی امید ہے(۱۲۸)۔ ۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء کے خط میں برہم کو لکھتے ہیں کہ "امیر اللغات کا پہلا حصہ چھپ گیا اسی ہفتے میں خریداروں کو پہنچے گا"(۱۲۹)۔ ۳۰ر جنوری ۱۸۹۲ء کے مکتوب میں زاہد حسین زاہد کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "امیر اللغات کی جلد ثانی غالباً الف مقصورہ ہی پر تمام ہو یا شاید بائے موحدہ کا بھی کوئی ٹکڑا شریک ہو جائے"(۱۳۰)۔ گویا حصہ اوّل کی طباعت کے بعد ہی سے دوسری جلد پر کام شروع ہو چکا تھا۔ زاہد حسین زاہد کو ۹ر مئی

۱۸۹۲ء کے خط میں حصہ دوم کے بارے میں بے بسی سے لکھتے ہیں کہ :

"امیر اللغات کے دوسرے حصے کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی زمانہ دم نہیں لینے دیتا نصف نظر ثانی سے باقی ہے۔ غالباً بیس جزو کا یہ حصہ بھی ہوگا۔ اور صرف الف مقصورہ کا امید کرتا ہوں۔ ۱۵ر جنوری سے چھپنے کے واسطے روانہ ہونا شروع ہو جائے گا" (۱۳۱)۔

امیر ۱۵ر جون ۱۸۹۲ء کے خط میں برہم کو لکھتے ہیں کہ "امیر اللغات کا دوسرا حصہ عنقریب چھپنے جائے گا" (۱۳۲)۔ ۱۷ر جون ۱۸۹۲ء کے خط میں زاہد کو دوسری جلد کی بابت لکھتے ہیں کہ : "امیر اللغات کے دوسرے حصے نکلنے میں وقت سے تجاوز زیادہ ہو گیا ہے اس لیے باوصف عدمِ صحت اور ضعف و نقاہت اسی حصے کی تکمیل میں مصروف رہتی ہے" (۱۳۳)۔ ۳ر اگست ۱۸۹۲ء میں انتہائی بے بسی سے امیر رقم طراز ہیں کہ "امیر اللغات کا دوسرا حصہ بوجوہ اب تک چھپنے کو نہیں گیا" (۱۳۴)۔ لغت اشاعت کے لیے کیوں نہیں گئی اس سلسلے میں کوثر خیر آبادی کو ۶ر اگست ۱۸۹۲ء کے خط میں رقم طراز ہیں کہ :

"کتابِ لغت کی بدولت زیرباری حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ خدا رحم فرمائے پیشاب کا مرض سخت مکلف ہے، چوکی پر جاتے جاتے پاؤں تھک جاتے ہیں۔ اور ہر بار رک کر ہوتا ہے۔ دیر ہوتی ہے تو عسر بول بڑھ جاتا ہے۔ آنکھوں کو جب سے روگ لگا ہے تب سے لکھنا اور کتاب دیکھنا گویا چھوٹ ہی گیا ہے۔ دوسرے کی محتاجی اور زیادہ مکلف ہے اور اکثر ہرج بھی ہوتا ہے۔ اب دو سطریں لکھیں اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں کڑوانے لگیں، بصارت میں بھی کمی ہونے لگی" (۱۳۵)۔

جنوری ۱۸۹۲ء کے ایک خط میں کوثر خیر آبادی کو یوں لکھتے ہیں :

"حصہ دوم "امیر اللغات" کی کاپیاں مطبع مفید عام میں لکھی جاتی ہیں عنقریب چھپنا شروع ہوں گی اس حصے کا نصف اخیر ابھی یہیں ہے اس میں بعضے نوٹ دینا ہے۔ طبیعت کو سکون ہوتا ہی نہیں کہ وہ نوٹ لکھوادوں صبح سے بارہ بجے تک حتی الامکان کچھ کرتا ہی رہتا ہوں مگر پانچ پانچ منٹ کے بعد چوکی آنے جانے سے کوئی کام پورا نہیں ہوتا" (۱۳۶)۔

۲۷ر جنوری ۱۸۹۳ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ : صاحبِ مطبع یقین دلاتے ہیں کہ آخر فروری تک چھپ جائے گا" (۱۳۷)۔ ۱۰ر فروری ۱۸۹۳ء کے مکتوب میں کوثر کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "دوسرا حصہ چھپ رہا ہے۔ مارچ میں انشاء اللہ شائع ہونے کی امید ہے" (۱۳۸)۔ ۱۹ر مئی ۱۸۹۲ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ "امیر اللغات" کا دوسرا حصہ چھپ گیا۰۰۰اب صرف (ب) میں حصہ ثالث کی ترتیب ہو رہی ہے" (۱۳۹)۔ ۳۰ر جون ۱۸۹۳ء کے مکتوب میں زاہد حسین زاہد کو لغت کے تیسرے حصے کے متعلق لائحہ عمل سے آگاہ کرتے ہیں۔

"امیر اللغات کا تیسرا حصہ مرتب اور مکمل کیا جاتا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ ب کے لغات اسی میں آجائیں لیکن اس وقت تک تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کل لغات ب کے اس میں نہ ہوں گے۔ لغت کی

خوب صورتی بڑھانے اور کسی قدر اختصار کی راہ میں نے یہ نکالی ہے کہ اب صرف وہی مفردات اور مرکبات وغیرہ لکھے جائیں۔ جو زبانوں پر رات دن کی بول چال میں ہوں جن میں نظم و نثر کی تخصیص ہے وہ چھوڑ دیے جائیں"(۱۴۰)۔

حصہ سوم کی ترتیب میں امیر نے اختصار کے پہلو کو سامنے رکھا ہے۔ چناں چہ زاہد کے بعد کو ثر خیر آبادی کو ۹ر اگست ۱۸۹۳ء کے خط میں اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حصہ سوم کی ترتیب ہو رہی ہے قصد ہے کہ ب کا حرف اسی حصہ میں تمام کر دیا جائے۔ اگرچہ اس حرف میں بھی بڑی وسعت معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہاں حتی الامکان اختصار پر نظر ہے"(۱۴۱)۔ ۱۳ر ستمبر ۱۸۹۳ء کو زاہد حسین زاہد کو تیسرے حصے کی تالیف کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"اپنے حسن قابلیت سے اس میں امداد کی جلد کوشش کیجیے۔ اس لیے کہ حصہ جب ترتیب پا چکتا ہے تو پھر جابجا اس میں ترتیب دینا مشکل ہوتا ہے"(۱۴۲)۔

۹ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو زاہد کو ایک بار پھر تیسرے حصے کی تالیف کی اطلاع دی جاتی ہے(۱۴۳)۔ ۲۰ر فروری ۱۸۹۴ء میں امیر، زاہد حسین زاہد کی علمی معاونت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیسرے حصے کی ترتیب ہونے کے بارے میں بتاتے ہیں"(۱۴۴)۔ اس دور میں، سید محمد نوح کو نہایت بے چارگی سے لکھتے ہیں کہ :"دفتر امیر اللغات بے سر مایگی سے ابتر ہو گیا تیسرا حصہ مدت سے تیار ہے طبع کا سامان بہم نہ پہنچنے سے بستے میں بندھا رکھا ہے"(۱۴۵)۔ ۱۳ر جون ۱۸۹۴ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو بہت مایوسی کے عالم میں خط لکھتے ہیں اور امیر اللغات کی بابت اپنی کوششوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

"امیر اللغات کی تیسری جلد بعض موانع قویہ سے ابتک نہیں چھپی خداوند نعمت سراپا اقبال مسند آرائے حال کو متوجہ کرنے کی تدبیر کر رہا ہوں التفات ہو جائے تو کام چلے"(۱۴۶)۔

۱۲ر جنوری ۱۸۹۵ء کو زاہد حسین کو لکھتے ہیں کہ "لغت کا تیسرا حصہ تمام ہوا اور نظر ثانی بھی ہو گئی"(۱۴۷)۔ ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۵ء کے خط میں زاہد کو لکھتے ہیں کہ :"تیسرا حصہ لغت کا مدت سے تیار ہے بے سر مایگی اس کی طبع سے مانع ہے دفتر ابتر اور پریشان ہوا چاہتا ہے۔ بلکہ ہو گیا ہے۔ کام بند ہو گیا"(۱۴۸)۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں کہ "۱۸۹۵ء میں لغت کا تیسرا حصہ جس میں ب کے لغات تھے تقریباً تیار تھا، لیکن اس کی اشاعت کے لیے سرمایہ نہیں تھا"(۱۴۹)۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر اللغات کا تیسرا حصہ جون ۱۸۹۴ء سے پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ ملاحظہ کیجیے ۱۳ر جون ۱۸۹۴ء والا خط جو زاہد حسین زاہد کے نام ہے(۱۹۸ص) جب کہ ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۵ء کو تحریر کیے گئے۔ زاہد کے خط میں امیر کا یہ تحریر کرنا کہ "تیسرا حصہ لغت کا مدت سے تیار ہے"(۱۵۰)۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لغت مکمل ہوئے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔

۱۸۹۳ء میں تیسرے حصے کے بعد چوتھے اور پانچویں حصے کا کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ عرفان عباسی "دبستان امیر مینائی" میں ممتاز علی آہ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "آہ صاحب نے "ب" کا حصہ پوری طرح تیار کر لیا تھا اور پ و ت کے حصے زیر تکمیل

تھے"(۱۵۱)۔ آہ کی تحریر کردہ سوانح عمری سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دفتر کو خیرباد کہہ دیا تھا،اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۹۳ء سے بقیہ حصوں پر بھی کام جاری تھا۔ ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۷ء کے زاہد حسین زاہد کو لکھے گئے خط (۱۵۲) سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہ ان حصوں پر کام جاری تھا اور جولائی ۱۸۹۸ء کے مکتوب تک اسی حصے پر کام جاری تھا(۱۵۳)۔

جون ۱۸۹۶ء کے بعد دفتر ابتری کا شکار ہوا، جس کا اندازہ مکاتیب کے مندرجہ بالا اقتباسات سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دوران کم وبیش پندرہ ماہ دفتر کا وجود ہی نہیں رہا۔ اس لیے کام میں رکاوٹ ہوئی ۱۸۹۹ء میں جب آہ، رام پور آئے تو لکھتے ہیں کہ،"حضرت تالیف "امیر اللغات" میں مصروف تھے" تائے فوقانی" کے لغات لکھے جاتے تھے"(۱۵۴)۔ غالباً آہ جو کام چھوڑ کر گئے تھے وہ مکمل ہو چکا تھا۔ یعنی ب، پ، ت کے حصے مکمل ہو چکے تھے۔ صرف طبع ہونا باقی تھے۔

امیر نے ۱۹۰۰ء کے وسط میں حیدرآباد جانے کی تیاری شروع کی اور ماہ ستمبر میں رام پور کو خیرباد کہا، امیر کے نظم وضبط اور انداز تالیف کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے الف سے تائے فوقانی تک لغت کو بالکل مکمل کر لیا ہوگا۔ لیکن مرتب شدہ حصوں میں سے صرف دو حصے شائع ہوئے۔

اب سوال یہ باقی ہے کہ تائے فوقانی کے بعد کے حصوں کی کیا صورت حال رہی ؟ اس بارے میں اسمٰعیل احمد مینائی (نبیرہ امیر مینائی) کہتے ہیں کہ "امیر نے ایک لحاظ سے کام مکمل کر لیا تھا"(۱۵۵)۔ جب کہ ڈاکٹر کریم الدین احمد لکھتے ہیں کہ :

> "کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لغت مکمل کر لیا تھا صرف طبع ہونا باقی تھا۔ لیکن شاید ان کے خاندان میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان کے بعد اس سرمائے کی حفاظت کرتا۔ مرتب شدہ جلدیں وہ اپنے ساتھ دکن لے گئے تھے اور غالباً وہیں موسیٰ ندی کے سیلاب میں وہ جلدیں غرق ہو گئیں۔ اب صرف دو مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ جلد (مخزونہ رضا لائبریری، رام پور، باقی رہ گئی ہے"(۱۵۶)۔

ڈاکٹر صاحب کے بیان میں وزن معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ اگر لغت کی یہ صورت ہوتی کہ مکمل ہونے کے بعد صرف طبع ہونا باقی ہوتا تو یہ بات ایسی نہیں تھی کہ پردہ اخفا میں رہتی اس لیے کہ جلیل آخری سانس تک امیر کے ساتھ ساتھ تھے انھوں نے امیر کی جو سوانح لکھی اس میں ایسی کوئی اطلاع نہیں ملتی، اس کے علاوہ امیر کے نہایت چہیتے شاگرد ممتاز علی آہ نے جو سوانح لکھی اس میں کوئی تذکرہ اس بات کا نہیں اور ان دونوں سے پہلے احسن اللہ ثاقب نے ۱۹۱۰ء میں امیر کے مکاتیب مرتب کر کے شائع کیے اور پھر ۱۹۲۴ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا، ان کے کسی جملے سے یہ بات اخذ نہیں کی جا سکتی۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ امیر احمد علوی اور عبدالحکیم حکمت نے امیر کی جو سوانح عمریاں لکھیں ان میں بھی کہیں کوئی ایسی اطلاع نہیں ملتی اور موسیٰ ندی میں اگر یہ سرمایہ ضائع ہوتا تو بہت بڑا سانحہ ہوتا۔ لیکن اس بات کی تصدیق کسی بھی ادبی تاریخ اور امیر پر لکھی جانے والی کسی بھی سوانح عمری سے نہیں ہوتی ہمارے خیال میں ڈاکٹر کریم الدین کی یہ رائے کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ البتہ اسمٰعیل مینائی صاحب کی بات میں کچھ وزن ہے۔ اپنے اس بیان کی تشریح انھوں نے یوں کی ہے کہ :"امیر نے ی تک کے الفاظ کاغذ پر منتقل کر دیے تھے۔ معنی اور سندیں نہیں لکھی گئی تھیں"۔ اس وضاحت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تائے فوقانی کے بعد کے حصوں کو ترتیب دینے

اور نظر ثانی کا کام باقی تھا، جو غالباً امیر دکن سے واپسی پر کرنا چاہتے تھے۔ یوں "امیر اللغات" کے صرف دو حصے شائع ہوئے، کچھ حصے غیر مطبوعہ اور باقی غیر مرتب رہ گئے۔ یہ تو راقم ناچیز کی رائے ہے اس کے مقابلے میں ایک اطلاع زیادہ اہم ہے۔ جو ڈاکٹر شائر اللہ خان وجہی اپنے ایک مضمون "حیاتِ امیر مینائی۔ کچھ نئے مآخذ" کے حواشی میں دیتے ہیں کہ: "امیر اللغات کا مکمل مسودہ رضا لائبریری رام پور میں "فرہنگ حامدیہ" کے نام سے ۲۸ر جلدوں میں محفوظ ہے" (۱۵۷)۔ اب اس لغت کی جلدوں کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ یہ واقعی مکمل جلدیں ہیں یا اسمٰعیل احمد مینائی کے بیان کے مطابق وہ کاغذ ہیں جن پر "ی" تک کے الفاظ منتقل کیے گئے تھے۔ لغت ہی کے ذیل میں شمس الحق سجاد علی شاہ میکش حیدر آبادی اپنی کتاب "یادگار امیر مینائی" میں یہ بیان دیتے ہیں کہ "اب اس لغت کی چھے جلدیں اور موجود ہیں جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں" (۱۵۸)۔ یہ امیر پر لکھی جانے والی پہلی سوانح ہے جو ان کی وفات کے تین سال بعد شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ امیر کی صد سالہ برسی کے موقع پر ان کے اخلاف نے ایک مجلّہ "ارمغانِ امیر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں "مفصل فہرست تصانیف و تالیف امیر مینائی" کے ذیل میں لغت کے صرف تین حصوں کا ذکر ملتا ہے۔ دو مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ بائے عربی جو اسرائیل احمد مینائی کی (نبیرۂ امیر احمد مینائی) کی ملکیت ہے (۱۵۹)۔

امیر اللغات کا پہلا حصہ (الف ممدودہ) مارچ ۱۸۹۱ء (۱۶۰) میں "مطبع مفید عام آگرہ" سے شائع ہوا (۱۶۱)۔ "یہ 13x9.5 کی تقطیع پر لیتھو پر طبع ہوا (۱۶۲)۔ یہ حصہ ۲۰ر جزو پر مشتمل ہے (۱۶۳)۔ جس کے "۳۱۷ر صفحات میں ۰۰۰ تین ہزار لغت" ہیں (۱۶۴)۔

امیر اللغات کا دوسرا حصہ (الف مقصورہ) کا "نصف اوّل ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۲ء کو چھپنے کے لیے روانہ ہوا" (۱۶۵)۔ مئی ۱۸۹۳ء میں"، (۱۶۶) "اسی مطبع سے شائع ہوا" (۱۶۷)۔ "یہ حصہ بھی 13x9.5 کی تقطیع پر لیتھو پر طبع ہوا" (۱۶۸)۔ اور "مثل اوّل کے ۲۰ر جزو میں نکلا (۱۶۹)۔ جو کہ ۳۲۵ر صفحے اور ساڑھے تین ہزار لغت پر مشتمل ہے" (۱۷۰)۔

"امیر اللغات" کے صرف یہی دو حصے طبع ہو کر منظر عام پر آئے جن کو اہل علم نے بے حد پسند کیا۔ مشہور انگریزی اخبار "پائنیر" میں ۲۶ر مارچ ۱۸۹۱ء کو ڈاکٹر صاحب نے اس پر اڈیٹوریل شائع ہوا۔" (۱۷۱)۔ اس کے علاوہ ملک کے مشہور رسائل و جرائد مثلاً: اودھ پنچ ۲۳ر اپریل ۱۸۹۱ء، اخبار مفید عام یکم مئی ۱۸۹۱ء، اخبار آزاد جولائی ۱۸۹۱ء، رسالہ مرقع عالم، اکتوبر نومبر ۱۸۹۱ء رسالہ قمر مارچ ۱۸۹۲ء نے منصفانہ تبصرے شائع کیے۔ امیر کے اس کام کو سر سید احمد خاں، منشی محمد نورالحسن، اکبر الہ آبادی، منشی یاسین شفق اور شمس العلماء عبدالحق نے بے حد سراہا۔

امیر نے "امیر اللغات" حصہ اوّل کی اشاعت پر پہلے سے اس کی تشہیر کا بندوبست بھی کر لیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اس پر ریویو اور تقریظیں کثرت سے لکھی جائیں بعد ازیں جلد اوّل کے بعد جب جلد دوّم شائع ہو تو دونوں کے درمیان میں ان تقاریظ اور تبصروں کا انتخاب شامل کر دیا جائے۔ امیر، احسن اللہ ثاقب کو اپنے ایک خط میں ان تفصیلات سے آگاہ کرتے ہیں:۔

> "امیر اللغات کا پہلا حصہ مارچ سنہ حال (۱۸۹۱ء) میں تیار ہوگا۔ اگرچہ مطابع فروری میں چھاپ چکنے کا وعدہ کرتے ہیں مگر مجھے امید نہیں ہے۔ تقریظ لکھنے کے قصد نے شکر گزار کیا مگر کتاب کے آٹھ حصے ہوں گے تقریظیں تو آخر میں ہوتی ہیں حصے چھپ چھپا کر جس کو پہنچیں گے سب کو یکجا کر کے

ایک یادو مجلد کرلے گا پھر پیچ کی تقریظیں کیا ہوں گی غالباً نکل جائیں گی اور اگر رہیں گی تو بے موقع رہیں گی۔ لہذا میرے رائے ہے کہ حصے نکلنے کے بعد ریویو کہ وہ در حقیقت تقریظ ہی ہے لکھے جائیں۔ بہت سے احباب خصوصاً صاحبانِ اخبار ریویو لکھیں گے اور میں سب کو جمع کر کے دوسرے حصے کے ابتداء میں لگادوں گا۔ ریویو جب حصے کو دیکھ کر لکھا جائے گا تو بہت ٹھیک ہوگا" (۱۷۲)۔

امیر اللغات کا پہلا حصہ شائع ہونے کے بعد اس کی نہایت موثر انداز سے تشہیر کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی گئی کہ انگریزی داں طبقے کو زیادہ سے زیادہ مطلع کیا جائے امیر، 'دفتر اللغات' کی اس کارکردگی کی بابت ۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء کے خط میں بر ہم کو لکھتے ہیں۔

"امیر اللغات کا پہلا حصہ چھپ گیا اسی ہفتے میں خریداروں کو پہونچے گا۔ اشتہارات بعض ہندوستانی اخباروں میں چھپ گئے۔ انگریزی اخبار پائینیر میں اڈیٹوریل تو ۲۶ر مارچ کو شائع ہوگیا۔ عنقریب اشتہار انگریزی بھی جو ایک منتخب ادیب مسٹر فلیپ صاحب ڈائریکٹر ریاست رام پور نے لکھا ہے پائینیر میں ملفوف ہو کر نکلے گا تاکہ عموماً فرنگیوں کو اطلاع ہو جائے" (۱۷۳)۔

"امیر اللغات" کا پہلا حصہ شائع ہونے پر مولوی نور الحسن (مولف نور اللغات) نے نہایت معیاری تبصرہ کیا تھا امیر اس کے شکریے میں انھیں لکھتے ہیں:

"آشوبِ چشم کے سبب میں دیکھ تو نہ سکا مگر تمھارا ریویو امیر اللغات پر پڑھوا کر سنا۔ اس حیثیت سے کہ تم نے اپنی رائے ظاہر کی تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس نظر کہ تم نے بہت ہی نازک خیالی کے ساتھ ریویو لکھا آفرین و مرحبا کہتا ہوں چشم بد دور۔ تم نے تو 'امیر اللغات' کے بعض بعض وہ حسن ملک کو دکھا دیے جن کی نسبت میرا خیال یہ تھا کہ جو اس کام میں مصروف ہیں صرف انھی کی نگاہ میں ہیں" (۱۷۴)۔

لغت کی اشاعت کے بعد دوست احباب نے مبارک باد کے ساتھ بقیہ حصوں کے لیے امیر کو مفید مشورے بھی دیے جو مشورے صائب تھے امیر نے وہ مان لیے اسی نوعیت کے ایک خط کے جواب میں کوثر خیر آبادی کو ۹ر اگست ۱۸۹۳ء کو لکھتے ہیں:

"آپ نے جو 'امیر اللغات' کو شروع سے آخر تک دیکھا اور اسکی فروگزاشتوں سے مجھ کو مطلع کیا میں اس کا شکر گزار ہوں۔ بے شک کاتب نے غلطی کی اور تصحیح کرنے والے بھی چوک گئے جو بحر کے شعر میں 'پہنچوا' کی جگہ "پہونچا" چھپ گیا۔ اچھا اچھا کی مثال میں سخی کا شعر بے شک بہت مناسب اور اچھا تھا مگر اوّل تو سخی مستند استادوں میں نہیں ہیں دوسرے آج تک ان کا کلام لغت میں دیا نہیں گیا۔ ایک تنکے کا شرمندہ نہ ہونا میں منیر کا شعر ضرور دیا جاتا اگر پہلے سے ملتا اتفاق کی بات ہے کہ استقراء سے یہ شعر رہ گیا "اویر سویر" فصل الف مع الواد میں لکھا گیا ہے۔ آپ کی نظر اس پر نہیں پڑی" (۱۷۵)۔

لغت کی اشاعت کے بعد بقیہ حصوں کے لیے نئی پالیسی بیرونی معاونین اور دوستوں کے مشورے سے مرتب کی گئی۔ کوثر خیر آبادی کو اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "صفات و تشبیہات اس حصے (حصہ دوم) میں چھوڑ دیے گئے ملک کے اکثر لوگوں کی رائے ہوئی کہ یہ لغت میں نہ چاہیے "(۱۷۶)۔ ۲۷ر ستمبر ۱۸۹۲ء کے مکتوب میں زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں کہ "میں استقرائے کلام اور لغات سے عوام اور خواص کے وہی الفاظ لیتا ہوں جو اردو لغت کی شان پر پھبتے ہیں (۱۷۷)۔ اسی خط میں مزید لکھتے ہیں :

"میں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ جو لغات حصہ چھپنے کے بعد چھوٹے ہوئے معلوم ہوں گے۔ وہ سب ایک جگہ جمع ہوتے جائیں گے اور ختم کتاب کے بعد ایک ضمیمہ ان کا لگا دیا جائے گا جیسا کہ صاحب برہان قاطع نے کیا ہے "(۱۷۸)۔

اسی خط میں زاہد کی کسی بات کے جواب میں تحریر کرتے ہیں :

"آزردگی۔ آسودگی، آشفتگی، آوارگی، یہ سب قاعدے کی بناء پر چھوڑ دیے گئے۔ اور آزادہ رو، آفیس، آفیسر، آوارہ مزاج، آنچل ڈھلنا بے شک 'امیر اللغات' میں نہیں ہیں۔ بعض تو اختلاف رائے کی وجہ سے عاجز ہو کر چھوڑ دیے۔ مثلاً آفس کہ اس کی جگہ کچہری اور دفتر کا لفظ موجود ہے۔ جو آدھی انگریزی اور آدھی اردو بولتے ہیں زیادہ انھیں کی زبانوں پر یہ لفظ ہے۔ اور آفیسر لکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ افسر موجود ہے۔ اور اسے دوسرے حصہ میں لکھا گیا ہے۔ اور بعض نقص استقراء سے رہ گئے "(۱۷۹)۔

امیر اللغات کے دو حصے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ بعد ازاں ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور دونوں حصوں کو یکجا کر دیا گیا۔ ۲۵ر فروری ۱۸۹۸ء کے خط میں جلیل، مرزا پرورش کو تحریر کرتے ہیں کہ "امیر اللغات کی دونوں جلدیں باہم مربوط ہیں "(۱۸۰)۔

(۹)

لغت مکمل ہوا یا نہیں یہ ایک مختلف بحث ہے۔ لغت جو مکمل ہو گئے تھے ان کی اشاعت نہیں ہوئی اس پر تفصیلی بات ہو سکتی ہے اس کے لیے صرف امیر کے مکتوبات کا مطالعہ ہی کافی ہے۔

امیر اللغات کیوں شائع نہیں ہوا اس کی کئی وجہیں ہیں۔

۱۔ شدید مالی پریشانیاں
۲۔ دفتر کی بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی
۳۔ امیر پر خانگی ذمہ داریاں
۴۔ امیر کی بیماریاں

اب ہم ان محرکات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

"دفتر امیر اللغات" ہمیشہ سے مشکلات کا شکار رہا۔ پریشانیاں "نمونہ امیر اللغات" کی اشاعت ہی سے شروع ہو گئیں تھیں۔ کیوں کہ نواب کلب علی خاں کے انتقال (مارچ ۱۸۸۷ء) کر جانے اور سر الفرڈ لائل کے ہندوستان سے چلے جانے سے اس کام کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔

احسن اللہ ثاقب کو ۱۲ر رمضان ۱۳۰۴ھ کے خط میں لکھتے ہیں کہ "میں ضعف پیرانہ سالی اور دائم المرض ہونے سے عاطل محض ہوگیا ہوں۔ آلام روحانی سب پر طرہ ہیں۔ انقلاب ریاست سے ترددات ایسے بڑھ گئے ہیں کہ ان کو لکھ نہیں سکتا۔ فراق دائمی نواب خلد آشیاں کا صدمہ اور زیادہ روح فرسا ہے" (۱۸۱)۔ احسن اللہ ثاقب کو ۱۱ر مئی ۱۸۸۷ء کے خط میں رقم طراز ہیں "جناب اعظم الدین خاں بہادر جنرل ریاست اب مدار المہام بااختیارات کامل ہیں ۰۰۰ میری حالت اب تک توباعتبار تعلقات کے بدستور ہے" (۱۸۲)۔ اپنے رنج والم داغ دہلوی کو لکھتے ہیں :۔

"میں بھی اس حالت میں ہوں کہ ذرا رحم فرمایئے تو بیڑا پار ہو۔ پانسو روپے ماہوار کا خرچ اور دو سو کی آمدنی ہے رحلت خلد آشیاں سے اب تک تین ہزار روپے کے مصارف آمدنی سے علاوہ بڑھ چکے ہیں اپنی بساط ہی کیا تھی انھیں سات مہینے میں حیثیت بھی مٹ گئی قرض داری بھی بڑھ گئی۔ خدا ہی سبک دوشی کا سامان کرے افسوس ہم سب مسافروں کو کیا بے محل شام ہوئی ہے" (۱۸۳)۔

خلد آشیاں نواب کلب علی خاں امیر سے بہت محبت کرتے تھے۔ امیر انھیں یاد کر کر کے روتے اور متعدد مکاتیب میں ان کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں مہدی حسن شاداب کو نواب کلب علی خاں کی خوبیاں گنواتے ہوئے۔ ۱۹ر جولائی ۱۸۸۷ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں۔

"آقا محسن شفیق اور عزیز دوست اور قدر افزا شاگرد و ہنر شناس دنیا سے اٹھ گیا ایک تو اس کی مفارقت دائمی کا غم اس پر طرہ افکار و تشاویش کی زیادتی اس سے قیاس کر لیجے۔ میرے ساتھ خاص جوان کا برتاؤ تھا وہ سوا میرے اور ان کے کسی کو معلوم نہ تھا ۰۰۰ دو سو سولہ ماہوار تو تنخواہ وہ مجھ کو دیا کرتے تھے اور ہر سال ختم سال پر چار پانچ ہزار روپیا دے دیتے تھے اور اس طرح دیتے تھے کہ وہ جانتے تھے اور میں اور خدا بس اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی یوں پانچ چھ سو روپیہ ماہوار مجھے ملتے تھے جس میں بسر کرتا تھا اگر کسی وجہ سے کچھ مقروض ہو جاتا تھا تو میری ناواقفی میں وائن کو ادا کر کے دستاویز پھیر لیتے تھے پھر مجھے علم آتا تھا جلوت کی ملاقات میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم نوکر اور یہ آقا میں مگر خلوت میں وہ برتاؤ تھا کہ جیسے بے تکلف سچے احباب میں ہوتا ہے" (۱۸۴)۔

نواب کلب علی خاں کے بعد نواب مشتاق علی خاں مسند آراء ہوئے انھوں نے امیر کو ۱۸۸۸ء کے وسط میں دو قسطوں میں سولہ ہزار روپیہ قرض دیا جس سے دفتر قائم ہوا۔ ابھی دفتر قائم ہو کر لغت کا کام شروع ہوا ہی تھا کہ "۲۵ر فروری ۱۸۸۹ء بروز شنبہ کو نواب مشتاق علی خاں انتقال کر گئے" (۱۸۵)۔ بقول ڈاکٹر کریم الدین احمد :

"عرش آشیاں کے انتقال کے بعد نواب حامد علی خاں مسند آراء ہوئے ۰۰۰ لغت کا کام مزید روپیہ نہ ملنے کی وجہ سے بند ہو گیا نئے حاکم نے لغت سے اپنی دلچسپی کا اظہار نہ کیا" (۱۸۶)۔

ریاست کے حالات۔ امیر کی بیماریوں اور احباب کے رویے نے امیر کو اعصابی طور پر توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنی کیفیات اور "امیر اللغات" کی روداد بڑے دکھی انداز میں ۳۱ر مارچ ۸۹ء کے خط میں حکیم کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں :

"میری طاقت روز بروز گھٹتی جاتی ہے اور مکروہات بڑھتے جاتے ہیں۔ لغت میں مصروفی اور محنت کی بہت حاجت ہے۔ شاعری بالکل چھوٹی ہے۔ اصلاح کو کلام بکثرت آتا ہے کون بنائے کون جواب لکھے۔ انقلابات و تغیرات جو ریاست میں ہو رہے ہیں وہ اور پریشان کر رہے ہیں سیکڑوں روپے ماہوار کا خرچ اور آمد کچھ نہیں۔ احباب نے جو کچھ کہا وہ نہ کیا۔ حضرتِ شاداب نے رسم قدیم یک قلم ترک کر دی ۰۰۰ دو سو روپے ماہور دفتر لغات میں صرف ہو رہا ہے" (۱۸۷)۔

ان مشکلات کے باوجود دفتری امور کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے لیے امیر اور ان کے معاونین سارا سارا دن مصروف رہتے تھے بقول ممتاز علی آہ: "دن کو تو فرصت ملتی ہی نہ تھی" (۱۸۸)۔ اس کے علاوہ کام میں ہرج کی وجہ سے معاونین امیر کے سامنے دیگر مشاغل پر گفتگو سے گریز کرتے تھے۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں:

"امیر اللغات کے کام میں ہرج ہونے کے خیال سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ عرض کرنے، غزل کہنے اور شریک مشاعرہ ہونے کی اجازت حاصل کی جائے" (۱۸۹)۔

اور مصروفیت کا یہی حال امیر کا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی بیماریاں (خصوصاً عسر بول) انھیں چین نہیں لینے دیتی تھیں۔ بقول امیر "صبح سے نصف شب تک گویا چوکی ہی پر بیٹھ کر بسر ہوتی" (۱۹۰)۔ ۱۸۹۱ء میں بہ مشکل تمام لغت کی جلد اوّل کا حصہ اوّل منظر عام پر آیا لیکن فروخت کے سلسلے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ زاہد حسین زاہد کو ۷ اپریل ۱۸۹۱ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں کہ: "اب تک جو ہزار ہا روپیہ صرف ہوا ہے وہ رائیگاں نہ جائے اور جا لگا ہی ٹھکانے لگے" (۱۹۱)۔ مالی مشکلات سے تنگ آکر وہ شاگردوں سے ادھار دی گئی لغت کی رقم کا تقاضا بھی کرتے نظر آتے ہیں بر ہم کو لکھتے ہیں "ہاں اب 'امیر اللغات' کے روپے تو بھیج دو تم نے بڑی دیر کی بڑی ضرورت ہے" (۱۹۲)۔ اسمٰعیل احمد مینائی اس دور کے حالات اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"نواب حامد علی خاں کی کم سنی کے باعث ریجنسی کا دور رام پور پر بھی انگریزیت کا سیلاب بلا لے آیا تو "امیر اللغات" پر بھی آفت آئی ۰۰۰ امداد دفتر اس قدر گھٹا دی گئی کہ مولفین کو معاوضہ دینا تو در کنار دفتر کے عمال جیسے خدمت گار کاتب مصحح وغیرہ کی تنخواہیں تک ادا نہیں ہو سکتی تھیں" (۱۹۳)۔

اس دور کے حالات امیر کے ایک خط میں بھی ملتے ہیں۔

"رام پور ہے اور ٹڈل پاس مدار المہام بہادر ایک بڑے جفاکش اور مدبر و منتظم آدمی ہیں۔ اصول انتظامی کو انگریزی رنگ پر لاتے جاتے ہیں۔ بے خدمت بنظر استحقاق یا خصوصیت و پرورش کسی کو رکھنا یا تنخواہ اصول انتظامی انگلشیہ کے مخالف ہے میری تنخواہ میں بھی بلا سبب ۰۰۰ ایک سو سولہ کی کمی ہو گئی سرکار گردوں وقار نے اختیارات سپید و سیاہ مدار المہام بہادر کو دے رکھے ہیں۔ ایشیائی باغ جو انھوں نے دنیا بھر سے گل بوٹے چن کر لگایا تھا خزاں کے ہاتھوں اجڑ رہا ہے میں بھی اس باغ کا ایک کملایا ہوا شجر ہوں جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں یہیں پھیلی ہوئی

تھیں۔ اب جب اصل شجر میں نقصان ہو تو پھول پنکھڑی کی طراوت معلوم۔ مڈل پاس آ آکر ملازم ہو رہے ہیں اور انتظامی گروہ میں جگہ پا رہے ہیں"(۱۹۴)۔

اسمٰعیل احمد مینائی اپنے مذکورہ مضمون میں لکھتے ہیں: "انھوں نے (امیر نے) مجبور ہو کر باوصف پیرانہ سالی و عوارض، بہار بنگال کا ایک سفر اور کیا پٹنے میں مہدی حسن خاں شاداب کے پاس ٹھیرے اور انھی کے توسط سے عمائدین بہار تک اپنی آواز پہنچائی مگر نہ وہاں دال گلی نہ ڈھاکے یا مرشد آباد میں ۰۰۰" اس اثنا میں جنرل اعظم الدین خاں مار ڈالے گئے(۱۹۵) اور نواب حامد علی خاں بااختیار رئیس بن گئے"(۱۹۶)۔ محمد عبدالاحد کے نام ۳۰/اپریل ۱۸۹۱ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ جنرل اعظم الدین خاں نے آخر آخر میں "امیر اللغات" کے سلسلے میں معاونت کی تھی اور کچھ امید چل نکلی تھی کہ انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے نے امیر کو گویا بے جان کر دیا۔ وہ محمد عبدالاحد کو راقم طراز ہیں:

"آپ کی توجہ کماحقہ امیر اللغات کی طرف پائی گئی، لہذا کچھ کیفیت اس تالیف کی التماس کرنا مناسب ہے۔ حالی خاطر عاطر ہو کر اس زمانے میں دفعتہً سانحہ روح فرسا نے رحلت وائس پر سیڈینٹ ریاست جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر نے امیر اللغات کو گویا لاوارث کر دیا۔ مرحوم کی مربی گیری سے اس کو اپنی تکمیل اور اشاعت کی کچھ فکر نہ تھی۔ تالیف میں گوناگوں اعانتیں ان کی طرف سے ہوتی تھیں اور ملک میں اس کے پھیل جانے کی صورتیں عمدہ عمدہ نظر آتی تھیں ہند سے ولایت ہائے غیر تک ان کی بڑے بڑے معزز حکام سے رسم و راہ تھی سر رشتہ تعلیم و دفاتر سرکار میں عموماً اس کی کاپیاں خرید ہوئیں مگر افسوس کہ دفعتہً کھیل بگڑ گیا۔ اب دیکھا چاہیے کہ کس عالی ہمت فراخ حوصلہ کی تقدیر میں یہ ناموری ہے ۰۰۰ آپ سے علم دوست ہنر پرور، قدر شناس کا التفات پایا تو یہ کچا چٹھا جو درد دل ہے سنایا۔ یہ مضمون آپ ہی تک ہے"(۱۹۷)۔

مالی مشکلات کے باوجود دفتر میں پوری تندہی سے کام ہوتا رہا جس کی وجہ سے دفتر پر قرض بڑھتا گیا۔ اس دوران داغ دہلوی جو ان دنوں دکن میں نظام کے دربار سے وابستہ تھے امیر کو دکن آنے اور اعزاز حاصل کرنے کی دعوت دی۔ لیکن امیر نے دو ٹوک لکھ بھیجا کہ اگر لغت کے لیے خاصی مدد ملے تو ٹھیک ہے ورنہ اس پیرانہ سالی نے مجھ میں یہ ہمت نہیں چھوڑی کہ میں وہاں آکر اعزاز حاصل کروں یہ اعزاز آپ حاصل کیجیے۔ ملاحظہ کیجیے خط بنام داغ ۳۰/جولائی ۱۸۹۲ء۔

"میرے حق میں مساعی جمیلہ کا اثر اگر یہ ہو کہ امیر اللغات کے باب میں کافی مدد ملے تو البتہ مزید منت کا باعث ہے اس لیے کہ اب مجھ میں پیرانہ سالی اور عوارض و خستہ حالی نے وہ طاقت نہیں چھوڑی کہ میں وہاں پہنچنے اور اعزاز حاصل کرنے کا حوصلہ کروں یہ جامہ اولوالعزمی آپ ہی پر قطع ہے۔ حق تعالی چشم بد سے محفوظ رکھے"(۱۹۸)۔

ان دنوں امیر کی صرف اور صرف یہ کوشش تھی کہ کسی طرح امیر اللغات کا دوسرا حصہ شائع ہو جائے۔ کوثر خیر آبادی کو ۲۵/ستمبر ۹۲ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں کہ: "فرصت ایسی مفقود ہے کہ رات ۱۱/بجے تک جان نہیں چھوٹتی۔ لغت نے مجھے مار

ڈالا" (۱۹۹)۔ ۱۸۹۳ء میں جلد اوّل کا دوسرا حصہ منظر عام پر آگیا۔ لیکن نہ دفتر کے مصارف کم ہوئے، نہ ہی آمدنی بڑھی ان سب مشکلات میں ایک اضافہ یہ بھی ہوا کہ جو لغت شائع ہو گئے تھے ان کی فروخت بھی قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ایک غیر مطبوعہ خط سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

"لغت میں ہزاروں روپے کی قرض داری ہو گئی۔ ایک جلد نہیں بکتی، فکر کھائے جاتی ہے یہ قرض کس کے گنج سے ادا کیا جائے اور پھر تھوڑے نہیں، پندرا سولہ ہزار اور آگے کی تالیف بند ہوتی جاتی ہے" (۲۰۰)۔

دفتر کی ابتری کو سنبھالا دینے کے لیے امیر ۱۸۹۴ء میں مختلف شہروں کے سفر کا ارادہ کرتے ہیں۔ تا کہ کچھ امداد حاصل کی جائے۔ لیکن عوارض لازمہ کی وجہ سے ارادہ ملتوی کر دینا پڑا پھر وہ رام پور میں رہ کر نوابین سے دفتری امور کے لیے امداد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ناکامی ہوتی ہے۔ ۵ / جون ۱۸۹۳ء کے خط میں کو داغ دہلوی کو بڑی التجا کے ساتھ اس بات پر آمادہ کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ دکن سے کوئی انتظام کریں۔

"ریاست بھوپال سے قدردانی ہوئی اور میری حیثیت سے بڑھ کر ہوئی مگر یہ کام اتنا بڑا ہے کہ اس کے واسطے وہ مدد کافی نہیں سب سے بڑی سرکار اللہ رکھے وہی سرکار آصفیہ ہے وہاں سے لاکھوں کے وارے نیارے بھی ہو سکتا ممکن ہے بشرطیکہ بن پڑے۔ بڑے دربار سے مدد بھی بڑی ہی ہونا چاہئے۔ آپ اپنی فراخ حوصلگی سے کوئی عمدہ رائے فلاح نکالیے تو بات ہے" (۲۰۱)۔

اس خط میں داغ کو امیر اللغات کی تکمیل کی وجوہات تحریر کرتے ہیں :

"امیر اللغات کی تکمیل کا خیال کئی وجہوں سے ہے ایک تو یہ کہ جنرل صاحب مرحوم کے اصرار سے عہد عرش آشیاں میں ریاست سے روپیہ قرض لیا اور وہ قرض بڑھتے بڑھتے حد سے بڑھ گیا اب اگر اس کو چھوڑ دوں تو اس کے ادا کی امید بھی ہاتھ سے جائے دوسرے یہ کہ ملک میں کیسی بدنامی ہو۔ تیسرے ایک عمدہ سرمایۂ معلومات رائیگاں ہو۔ چوتھے یہ جو خیال ہے کہ دین کی کتابیں بھی اردو میں ترجمہ ہوتی چلی جاتی ہیں ان میں بھی اردو کا جامع لغت مدد دے گا۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے ثواب بھی ملے گا ترک کرنے میں یہ ثواب بھی ہاتھ سے جائے گا۔ الغرض ایسے ہی خیالات ہیں جو رؤسا سے التجا پر آمادہ کراتے ہیں" (۲۰۲)۔

امیر کے ذمے لغت کے کام کے علاوہ سیکڑوں تلامذہ کے کلام پر اصلاح دینا بھی ہوا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات شاگردوں کو ان کی فرمائش پر مشاعرے کے لیے کلام بھی لکھ کر دیا کرتے تھے۔ گھر کی ذمہ داریاں اس کے علاوہ تھیں آخری دنوں میں تلامذہ کو کلام دینے کا مشغلہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ حافظ غلام احمد فروغی کو ۶ / نومبر ۱۸۹۳ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"آپ اپنے مشاعرے کے لیے مجھ سے غزل طلب فرماتے ہیں۔ میں اس زمانہ میں بہت ہی رنجور اور

معذور ہو رہا ہوں خود بیمار اور کئی بیماروں کا پرستار رہتا ہوں جو وقت فرصت و اطمینان کا ملتا بھی ہے تو وہ 'امیر اللغات' کی تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا ہے شعر و سخن کا مشغلہ مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے"(۲۰۳)۔

دفتر کی ابتری کا اندازہ معتمد امیر اللغات ممتاز علی آہ کے اس خط (غیر مطبوعہ) کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو ۱۸۹۴ء میں مولوی محمد حسین کو لکھا گیا:

"لغت کا ابتدائی حال تو حصہ اوّل کے دیباچے سے معلوم ہوگا اس کے بعد اس قدر اور ہے کہ سوا ریاست عالیہ بھوپال کے اور کسی ریاست نے کچھ بھی امداد نہیں کی اس ریاست سے اور بھی قرضہ ملا تھا وہ بھی ختم ہو گیا پبلک نے بھی کچھ قدر نہیں کی نتیجہ یہ ہے کہ پندرہ ہزار روپیہ ریاست کا اس کتاب کی بدولت منشی صاحب پر قرض ہو گیا۔ کام آئندہ کے لیے گویا بند ہے۔ نہ کتابیں بکتی ہیں نہ کوئی رئیس یا گورنمنٹ فراخ حوصلگی کو کام میں لاتے ہیں"(۲۰۴)۔

دفتر کا یہ حال دیکھ کر کچھ احباب نے امیر کو یہ مشورہ دیا کہ آئندہ طبع ہونے والی لغت کی فروخت کے لیے پیشگی قیمت حاصل کی جائے۔ لیکن امیر نے احباب کی اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ :"پیشگی قیمت حاصل کرنے کے واسطے اشتہار دینے کی صورت 'امیر اللغات' کی شان پر نہایت بد نما ہے"(۲۰۵)۔ اس دوران قریبی احباب نے مشورہ دیا کہ انگریزی حکومت سے مدد حاصل کی جائے وہی یہ کام مکمل کرا سکتی ہے۔ چناں چہ ۲۰/ نومبر ۱۸۹۵ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ "ایسا عظیم الشان کام اس وقت تک انجام کو نہ پہنچے گا جب تک گورنمنٹ انگلشیہ یا کوئی ذی حوصلہ ریاست کافی مدد نہ کرے گی"(۲۰۶)۔ جون ۱۸۹۶ء میں ایک نئی پریشانی کے سبب دفتر امیر اللغات کم و بیش ڈیڑھ سال بند رہا۔ (جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے)۔ اس دوران امیر نے مالی امداد کے لیے ایک درخواست گورنر جنرل بہادر کو بھیجی۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ سکریٹری نے جواب لکھا کہ "یہ درخواست لفٹیننٹ کے ذریعے سے آنا چاہیے"(۲۰۷)۔ سکریٹری کے جواب کے مطابق درخواست لفٹیننٹ کو بھیجی گئی۔ وہاں سے اس ہدایت کے ساتھ واپس کی گئی تھی کہ لوکل گورنمنٹ کے ذریعے سے درخواست آنا چاہیے چناں چہ ایسا ہی کیا گیا(۲۰۸)۔ لیکن اس طرح بھی ناکامی ہوئی۔

دفتر کی ابتری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ان حالات سے پریشان ہو کر امیر ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد کا قصد کیا۔ دوران سفر وہ کانپور میں چار پانچ دن قیام کے بعد بھوپال روانہ ہوئے جہاں دو ماہ قیام کیا۔ اس دوران نواب شاہ جہاں بیگم نے امیر کو ملاقات کا شرف بخشا اور بھوپال میں رہ جانے کا اصرار کیا۔ امیر نے "حسب موقع اور مناسبِ وقت الفاظ میں اس وقت معذوری کی اور رخصت ہوئے (۲۰۹)۔ بھوپال ہی میں چھٹی ختم ہو جانے کی وجہ سے وہ حیدر آباد نہ جا سکے اور رام پور واپس آگئے۔ اس طرح پریشانیاں بدستور رہیں۔ والی رام پور نے جو وعدے کیے تھے وہ پورے نہ کیے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ امیر نے یہ کام بھی نواب کی مرضی ہی سے شروع کیا تھا اور اگر مکمل ہو جاتا تو ریاست ہی کی نیک نامی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں ریاست سے کوئی احسان ہوا بھی تو یہ کہ قرضہ دیا گیا تا کہ لغت فروخت کر کے رقم واپس کی جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر امیر مینائی والی بھوپال کی خواہش کے مطابق ریاست میں رہ جاتے تو یقیناً لغات کی تکمیل بھی ہو جاتی اور جو صدمات انھوں نے اٹھائے

ان سے بھی محفوظ رہتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر نے حق نمک خوب نبھایا۔ ۱۱ راگست ۱۸۹۷ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ :

"امیر اللغات کی ابتری بدستور ہے فی الحقیقت اس کے پورا نہ ہونے سے جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ حضور پرنور والی رام پور نے، جب میں سفر کے لیے رخصت ہوتا تھا اس کے تکمیل پر اپنی آمادگی اور پوری خواہش ظاہر فرمائی تھی بلکہ قرار پاگیا تھا کہ سفر سے میری مراجعت پر دفتر کھول دیا جائے گا مگر آئے قریب دو مہینے کے گزرے اب تک کچھ نہیں ہوا" (۲۱۰)۔

غالباً آخر اگست ۱۸۹۷ء میں دفتر کھل گیا لیکن ساتھ ہی نئی مشکلات کا سامنا تھا وہ یہ کہ تربیت یافتہ افراد یا تو انتقال کر گئے یا نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۷ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو تحریر کرتے ہیں۔

"امیر اللغات کی طرف کچھ توجہ ہمارے آقائے ولی نعمت کی ہوتی معلوم ہوئی ہے۔ بڑی کوششوں سے خدا خدا کر کے یہ صورت پیدا ہوئی کہ دفتر قائم ہو اور آگے کام چلے مگر اب یہ دقت درپیش ہے کہ وہ عملہ جو برسوں کی صحبت میں کاموں سے واقف ہو گیا تھا سب متفرق ہو گیا بعض ان میں کے دنیا ہی میں نہ رہے اور بعض کو اور مقامات پر تعلق پیدا ہو گئے۔ اب نئے ایسے آدمیوں کا بہم پہنچانا ہے جن میں قابلیت اس کام کے سیکھ جانے کی جلد ہو" (۲۱۱)۔

اس نئی پریشانی سے نمٹنے کے لیے امیر نے بیرونی معاونین سے خط و کتابت تیز کی تاکہ تکمیل کی کوئی صورت نکلے زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ :"آپ پہلے سے زیادہ کمر باندھ کر مستعد ہو جائیں اور بائے عجمی سے ترتیباً بقدر امکان استقراء کر کے مدد دیں" (۲۱۲)۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۸۹۷ء کو پھر زاہد حسین کو لکھتے ہیں :"اب کچھ ہمت باندھیے اور متوجہ ہو کر پوری مدد دیجیے۔ 'امیر اللغات' کو آپ سے امداد کی بہت امید ہے" (۲۱۳)۔

الغرض دفتر کھل جانے کے بعد کام تو ہوا لیکن افسوس کہ پریشانیاں بدستور رہیں سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ ۱۸۹۹ء میں دفتر "امیر اللغات" میں آگ لگ جانے کے سبب ہزاروں کا نقصان ہوا جس میں ایک بہترین لائبریری جو دفتری امور کے لیے تھی جل گئی۔ ۱۹۰۰ء کے اوئل میں نواب میر محبوب علی خاں نے کلکتے کے سفر کا ارادہ کیا۔ داغ دہلوی اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ داغ ہی نے کوشش کر کے بنارس میں امیر کی ملاقات نواب صاحب سے کرائی۔ نواب امیر سے بہت متاثر ہوئے" اور ارشاد ہوا کہ اب آپ ہمارے ساتھ حیدر آباد چلیے۔ عرض کی (امیر نے) میں قدیم نمک خوار ریاست رام پور کا ہوں وہاں سے اجازت نہیں لی ہے اور ہم رکاب سعادت چلنے کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا ہوں انشاء اللہ جلد حاضر ہوں گا" (۲۱۴)۔ امیر نے اس مرتبہ بھی ریاست رام پور کا نام اونچا رکھا اگر اس موقع پر وہ نواب صاحب کے ساتھ ہو لیتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی لیکن سچی بات یہی ہے کہ وہ نیک اور دین دار انسان تھے انھیں آخر وقت تک ریاست رام پور سے امید تھی۔ بلاشبہ وہ پکے اور سچے نمک خوار تھے۔ لیکن پھر امیر اور ان کے خاندان پر دن ورات سخت ہو گئے۔ ناچار امیر نے حیدر آباد دکن جانے کی تیاری شروع کی نوابین رام پور کے روکنے کے باوجود وہ۔ جولائی ۱۹۰۰ء میں چھپ کر حیدر آباد دکن روانہ ہو گئے۔ اور امیر اللغات کا کام ادھورا رہ گیا۔

اب ہم اس باب کے آخر میں مطبوعہ لغات کی بابت دفتر "امیر اللغات" کی کاروباری شرائط پر بھی روشنی ڈالنا چاہیں گے جو "امیر اللغات" کی تاریخ مرتب کرنے میں ممدود معاون ہونے کے ساتھ ساتھ امیر مینائی کے نظم وضبط اور ان کی ادارہ سازی کی صلاحیت پر بھی دلالت کرتی ہے۔

(۱۰)

امیر اللغات کا پہلا حصہ (الف ممدودہ) مارچ ۱۸۹۱ء اور دوسرا حصہ (الف مقصورہ) مئی ۱۸۹۳ء میں منظر عام پر آیا تو ان کی قیمت "ولایتی کاغذ پر سات روپے اور دیسی کاغذ پر چھے روپے تھی" (۲۱۵)۔

دفتر امیر اللغات میں لغت کے علاوہ امیر کی کتب بھی فروخت کی جاتی تھیں اور یہ سارے امور معتمدین نپٹاتے تھے۔ مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاروباری اصول بہت لچک دار تھے اور عموماً بدلتے رہتے تھے۔ البتہ لغت کی قیمتوں میں آخر تک کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مثلاً محمد مسعود ۲۲ر اپریل ۱۸۹۶ء ایک خط کے ذریعے منشی محمد حسن تاجر کتب کو مطلع کرتے ہیں:

> "امیر اللغات اور صنم خانہ عشق کے تاجرانہ خریداروں کو، اگر سو سو نسخے لیں تو پانچ پانچ نسخے بلا قیمت دیے جائیں گے اور محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا" (۲۱۶)۔

اسی تاجر کو ستمبر ۱۸۹۸ء میں جلیل تحریر کرتے ہیں:

> "کمیشن کا قاعدہ یہاں یہ رکھا گیا ہے کہ ۲۰ر جلدوں کا جو یک مشت خریدار ہو اس کے ساتھ بہ حساب فی صد دس روپیہ رعایت کی جائے گی" (۲۱۷)۔

۱۹ر اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پھر کاروباری شرائط میں تبدیلی کی جاتی ہے کہ جو سو روپے کی کتب خریدے، اس سے محصول ڈاک نہ لیا جائے۔ سید سراج الدین کو تحریر کرتے ہیں:

> "صرف ان تجار کو تخفیف دی جاتی ہے جو یکمشت سو روپے کی کتابیں خریدیں۔ اتنی رعایت آپ کے ساتھ بھی کی گئی ہے کہ محصول ڈاک نہ لی جائے" (۲۱۸)۔

متفرق خریداروں کو رعایت دینے کا کوئی قاعدہ نہیں تھا لیکن اگر کوئی مختلف اوقات میں کتب خریدے تو کسی ایک موقع پر خریدار کو رعایت دی جاتی تھی۔ جلیل، منیجر اخبار عام کو ۲۰ر ستمبر ۱۸۹۸ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

> "امیر اللغات، یہ اردو کا جامع اور بے مثل لغت لکھنو و دہلی کے محاورات و اصطلاحات و مفردات و مرکبات کا خزانہ ہے ابھی دو ہی جلدیں چھپی ہیں فی جلد ۶ر روپے" (۲۱۹)۔

دفتری شرائط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر واقعۃً لغت سے کوئی کاروباری فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ حقیقی معنوں میں زبان کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، "لکھنو کی لسانی خدمات" میں لکھتے ہیں:

> "لغت نویسی کی تاریخ میں وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ ایک جامع، مبسوط اور مستند لغت

مرتب کرنے کی بنیاد رکھی بلکہ وہ تمام اصول بھی مدون کر دیے جو اس سلسلے میں نہایت ضروری ہیں اس لیے کہنا چاہیے کہ امیر اردو لغت نویسی کے امام ہیں"(۲۲۰)۔

یہ حقیقت ہے کہ "امیر اللغات" سے پہلے بھی بہت سی لغات لکھی گئیں جن میں متعدد شائع بھی ہوئیں۔ مثلاً ملا عبدالواسع کی "غرائب اللغات"(۲۲۱)، سراج الدین علی خاں آرزو کی "نوادر الالفاظ"(۲۲۲)، محمد مہدی واصف کی "دلیل ساطع"(۲۲۳)، مولوی اوحد الدین کی "نفائس اللغات"(۲۲۴)، میر علی اوسط کی رشک کی "نفس اللغۃ"(۲۲۵)، نیاز علی بیگ نگہت کی "مخزن الفوائد"(۲۲۶)، مرزا محمد مرتضٰی عاشق لکھنوی کی "بہار ہند"(۲۲۷)، مولوی اشرف علی لکھنوی کی "مصطلحاتِ اردو"(۲۲۸)، مولوی سید احمد دہلوی کی "فرہنگ آصفیہ"(۲۲۹)، وجاہت حسین وجاہت کی "اختلاف اللسان"(۲۳۰)، جلال لکھنوی کی "سرمایہ زبانِ اردو"(۲۳۱)، اور "گلشنِ فیض"(۲۳۲)، اور حکیم سید محمد مہدی کمال کی "دستورِ الفصحاء"(۲۳۳)، وغیرہ لیکن جو اہتمام "امیر اللغات" کی تالیف میں کیا گیا اس کی مثال نہیں ملتی مثلاً لغت کی تالیف سے قبل اس کا نمونہ شائع کرنا اور ملک بھر کے علماء و فضلاء اور زبان کے ماہرین سے اس کے متعلق رائے لینا۔ دفتر قائم کرنا، تالیف لغت کے لیے کمیٹیاں (انتظامی کمیٹی، علمی کمیٹی، مشیر کمیٹی اور بیرونی معاونین) بنانا۔ دفتری امور کے لیے پریذیڈنٹ، وائس پریذیڈنٹ اور وائس پیٹرن مقرر کرنا۔ پھر لغات کی فہرست سازی کے لیے محرران کی سند، جمع کرنے کے لیے نائب معتمد اور سند منتخب کر کے لکھنے کے لیے معتمد کا مقرر کرنا، لغت کن اصولوں پر تالیف کی جائے اس بابت ملک بھر کے زبان کے ماہرین سے ذاتی ملاقات کر کے رائے لینا، مسودہ تیار ہونے کے بعد ماہرین کو بھیجنا اور اس پر رائے لینا لغت میں کون کون سے الفاظ شامل کرنا ہیں انگریزی کے کون سے الفاظ ہونا چاہئیں کون سے نہیں۔ محاورات کو کن اصولوں کے تحت شامل کرنا ہے۔ تشبیہات و استعارات کو اگر شامل کیا جائے تو کیوں کر۔ کس قابلیت کے لوگوں کو تالیف لغت کے سلسلے میں شامل کرنا ہے۔ لغت کی اشاعت کے بعد اس کی تشہیر کس طرح کی جائے۔ تبصرے کن کن ماہرین سے لکھوائے جائیں۔ کاروباری اصول و قواعد کیا ہوں اور ہندی الفاظ کی تحقیق کے لیے خاص طور پر پنڈت کو دفتری امور میں شامل کرنا یہ سب کام اور منصوبہ بندی ہمیں کسی اور لغت کی تالیف میں نظر نہیں آتی اس لیے لغت نویسی کے باب میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ جدید اردو لغت نویسی کے بانی ہیں۔ افسوس کہ "امیر اللغات دفتری اخراجات اور وسائل پوری طرح مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ سے مکمل ہونے کے باوجود شائع نہیں ہو سکا لیکن اردو لغت نویسی کے باب میں ایک جامع لغت کا خاکہ ضرور پیش کرتا ہے۔ اگر یہ لغت شائع ہو جاتا تو اردو کا سب سے ضخیم لغت کہلانے کے ساتھ ساتھ اردو کا پہلا سائینٹیفک لغت ہوتا۔

حواشی

۱۔ حکیم نجم الغنی خاں: "اخبار الصنادید"، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۱۸ء، ص ۱۶۸۔

۲۔ امیر احمد علوی: "طرۂ امیر"، لکھنؤ، انوار المطابع، ۱۹۲۸ء، ص ۵۹۔

۳۔ شاہ ممتاز علی آہ: "امیر مینائی"، لکھنؤ، اودھ پریس، ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۲۔

۴۔ عرفان عباسی: "دبستانِ امیر مینائی"، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۔

۵۔ امیر مینائی: "نمونہ امیر اللغات"، بحوالہ ڈاکٹر ابو محمد سحر: "مطالعہ امیر"، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء، ص ۴۲۱۔
۶۔ "مطالعہ امیر"، ص ۴۲۴۔
۷۔ "مطالعہ امیر"، ص ۴۲۴۔
۸۔ "امیر مینائی"، ص ۱۱۲۔
۹۔ امیر مینائی: "امیر اللغات"، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص ۳۔
۱۰۔ امیر احمد مینائی: "مکاتیب امیر مینائی"، مرتب: مولوی احسن اللہ ثاقب: طبع دوم، لکھنؤ، مطبعہ ادبیہ، ۱۹۲۴ء، ص ۳۲۸۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۳۲۹۔
۱۲۔ "مطالعہ امیر"، ص ۴۲۰۔
۱۳۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۳۲۸۔
۱۴۔ ایضاً، ص ۳۲۹۔
۱۵۔ ایضاً، ص ۳۳۰۔
۱۶۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر "اختر شہنشاہی" کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ: "تاج المطابع ۰۰۰ امیر کا ذاتی مطبع تھا۔ اس مطبع سے ایک ہفتہ وار اردو اخبار 'تاج الاخبار'، نکلتا تھا جس کے مالک وہ خود اور مہتمم ان کے صاحب زادے محمد احمد قمر مینائی تھے۔ مطبع اور اخبار دونوں یکم ستمبر ۱۸۷۵ء کو جاری ہوئے تھے"۔ (مطالعہ امیر، ص ۱۲۴)
۱۷۔ ایضاً، ص ۴۱۷۔
۱۸۔ "امیر اللغات"، ص ۳۔
۱۹۔ مکاتیب امیر مینائی، ۳۳۷۔
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۸۸۔
۲۱۔ ایضاً،
۲۲۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد: "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۴۲۴۔
۲۳۔ غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں ان عربی و فارسی کے الفاظ ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے مطابق یہ نادر کتاب رضا لائبریری، رام پور میں ہے۔ (مطالعہ امیر ص ۱۲۳)
۲۴۔ غیر مطبوعہ ہے۔ اردو کا لغت فارسی زبان میں ہے لیکن نایاب ہے۔
۲۵۔ غیر مطبوعہ ہے۔ ان محاورات کا مجموعہ ہے جو اردو کے مصادر سے نکلتے ہیں۔ یہ بھی نایاب ہے۔
۲۶۔ "صہبائے مینائی، ڈھاکہ، مکتبۂ عارفین، سنہ ندارد، ص ۵۷۔
۲۷۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۶۹۔

۲۸۔ ''مطالعہ امیر''، ص ۴۲۴۔

۲۹۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۸۸۔

۳۰۔ امیر اللغات، ص ۰۶۔

۳۱۔ امیر مینائی، ص ۱۱۲۔

۳۲۔ ''اخبار الصنادید''، ص ۲۹۷۔

۳۳۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۴۴۔

۳۴۔ امیر مینائی، ص ۱۴۔

۳۵۔ بحوالہ ڈاکٹر کریم الدین احمد: ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، آئینہ ادب، لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۴۴۵۔

۳۶۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۸۵۔

۳۷۔ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۴۴۸۔

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ حکیم نجم الغنی، ''اخبار الصنادید''، ص ۳۲۱۔

۴۱۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۲۸۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۰۹۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۷۱۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۴۵۔ امیر مینائی، ص ۱۱۱۔

۴۶۔ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۲۵۔

۴۷۔ دوران گفتگو جناب اسمٰعیل احمد مینائی مرحوم (نبیرہ امیر مینائی) نے بتایا۔

۴۸۔ امیر مینائی، ص ۱۱۲۔

۴۹۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۳۵۲۔

۵۰۔ ایضاً، ۲۳۸۔

۵۱۔ ''داستانِ تاریخ اردو''، طبع سوم، سندھ، اردو اکیڈمی ۱۹۶۱ء، ص ۴۰۰۔

۵۲۔ دوران گفتگو اسمٰعیل احمد مینائی بتایا۔

۵۳۔ **الیاس احمد مینائی**، اسمٰعیل احمد مینائی کے چھوٹے بھائی تھے جو بعد ازاں حیدر آباد دکن میں سکونت پذیر ہوئے۔

۵۴۔ **وسیم خیر آبادی** "دفتر امیر اللغات" کے پہلے سکریٹری تھے ممتاز علی آہ نے وسیم کے بعد ۱۸۸۹ء میں دفتر "امیر اللغات" کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ وسیم عربی کی متوسط کتابوں تک ریاض خیر آبادی کے ہم سبق رہے۔ ان کے اساتذہ میں مفتی حافظ سید نبی بخش، مولانا عبدالحق، بہاری لال خاوری، مصطفےٰ حسین راسخ اور محمد جعفر زہری جیسے فاضل شامل تھے۔ وہ اردو نظم و نثر پر عبور رکھتے تھے شعر و سخن میں حضرت امیر مینائی سے تلمذ تھا۔ وسیم نے ۲۴ رمضان المبارک مطابق ۷ رمارچ ۱۹۲۹ء کو انتقال کیا۔

(حوالے :ڈاکٹر ابو محمد سحر، "مطالعہ امیر"، ص ۴۲۵۔ عرفان عباسی، دبستانِ امیر مینائی، ص ۳۸۲ تا ۳۸۴)۔

۵۵۔ **منشی لیاقت علی** کو امیر اپنے ایک خط میں "برادر زاد داماد بندہ" لکھتے ہیں۔ ممتاز علی آہ نے بھی منشی لیاقت علی کو دفتر "امیر اللغات" کا سکریٹری اور امیر کا داماد لکھا ہے۔ منشی لیاقت علی حیدر آباد کے سفر میں امیر کے ساتھ تھے۔ ان کے خط کے نمونے ۱۸۸۴ء سے غیر مطبوعہ خطوط کے رجسٹروں میں ملتے ہیں۔ (حوالے : مکاتیب امیر مینائی، ص ۲۸۷۔ امیر مینائی، ص ۱۴۰)

۵۶۔ **محمد ممتاز علی آہ امیٹھوی**۔ ۱۸۸۹ء میں "دفتر امیر اللغات" کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ وہ "امیر مینائی" میں رقم طراز ہیں" ۱۸۸۹ء میں مجھے بہ اصرار طلب فرمایا اور "دفتر امیر اللغات" میں پانچ چھ برس تک سکریٹری رہا۔ آہ ۱۸۶۲ء میں اودھ کے مشہور قصبے امیٹھی (بندگی میاں) ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سخاوت علی خاندانِ پیرزادگان علم وادب، شعر و شاعری، زہد و تقویٰ، شرافت و نجابت میں ممتاز تھے۔

آہ کو شاعری کا فطری ذوق تھا وہ اوائل عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔ امیر مینائی جو ان کے قریبی عزیز تھے اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگ مثلاً ان کے ماموں محمود علی فدا وغیرہ۔ امیر کے شاگرد تھے اس لیے آہ نے بھی امیر کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ آہ پہلے دوست تخلص کرتے تھے پھر غالباً استاد کے مشورے پر آہ تخلص کرنے لگے۔ رام پور میں جب "امیر اللغات" کی تدوین و تالیف کا کام شروع ہوا تو انھیں اصرار کر کے بلایا گیا۔ "امیر اللغات" کی تالیف کے سلسلے میں زبان کی چھان بین، اور امیر کی توجہ اور فیض صحبت سے آہ کی فطری صلاحیتوں سے بھی نکھار آیا۔ انھوں نے ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۴ء تک کا وقت دفتر "امیر اللغات" میں گزارا اس دوران زیادہ تر وہ لغت کے سلسلے میں ہی مصروف رہے۔ "امیر مینائی" میں لکھتے ہیں۔ "۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۴ء میں نے دیکھا کہ اپنے شوق سے کچھ کہنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا"۔

"آہ نے ۱۲ ردسمبر ۱۹۳۵ء کو لکھنو میں وفات پائی۔ (حوالے :"امیر مینائی"، ص ۱۰، ص ۲۱۔ "دبستان امیر مینائی" ص ۸۰ تا ۸۴)

۵۷۔ **حافظ جلیل احمد مانک پوری** بھی آہ کی طرح امیر کی طلبی پر رام پور آئے اور "۱۸۹۰" میں سکریٹری مقرر ہوئے اور تقریباً ۱۱ ر سال رام پور میں گزارے۔

جلیل ۱۸۶۴ء میں اودھ کے مشہور شہر مانک پور ضلع پرتاب گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز عربی فارسی سے ہوا۔ انھوں نے ۱۲ رسال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ آکر فرنگی محل سے علم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ جلیل کی عمر ۲۰ ربرس کے قریب تھی جب انھوں نے امیر مینائی کی شاعرانہ عظمت سے متاثر ہو کر خط لکھا اور کام پر اصلاح لی۔ ۱۸۹۰ء میں جلیل نے رام پور میں آکر امیر کا ہاتھ بٹایا اور لغت کے حوالے سے فنِ عروض اور نکات شاعری میں دسترس حاصل کی۔

جس وقت ممتاز علی آہ "دفتر امیر اللغات" کے سکریٹری تھے اس وقت جلیل مانکپوری کو کاتب سکریٹری لکھا جاتا تھا۔

جلیل کا شمار امیر کے محبوب اور عزیز ترین شاگردوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۰۰ء میں امیر جب حیدر آباد دکن گئے تو جلیل ان کے ساتھ تھے لیکن امیر کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ وہیں وفات پا گئے استاد کے انتقال کے بعد جلیل نے حیدر آباد نہیں چھوڑا، آخری وقت تک وہیں قیام کیا اور شہرت و ناموری حاصل کی۔ دکن سے انھیں "استاد السلطان"، "فصاحت جنگ"، "امام الفن" جیسے خطابات سے نوازا گیا۔

جلیل اردو کے علاوہ ہندی شاعری کی بھی استعداد رکھتے تھے۔ جلیل کا پہلا دیوان "تاج سخن" ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ "تذکرہ و تانیث"، "سوانح امیر مینائی"، قصیدہ، رباعی، "تاریخ دکن"، "معیار اردو"، "فضائل رمضان المبارک"، "تعلیم الصلواۃ"، روح سخن وغیرہ اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ جلیل نے ۶ / جنوری ۱۹۴۶ء کو وفات پائی اور حیدر آباد دکن میں تدفین ہوئی۔ (حوالے: "دبستان امیر مینائی" ص ۱۴۱ تا ۱۴۵، "مطالعہ امیر"، ص ۱۴۴ تا ۱۴۵)

۵۸۔ **منشی لطیف احمد مینائی** حضرت امیر کے چوتھے صاحب زادے تھے۔ لطیف احمد اختر ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوئے اور والد ماجد کے زیر سایہ رام پور میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ منشی صاحب کی حوصلہ افزائی اور اپنے ذوق و شوق و مشق سے کم سن ہی ہیں، مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے اہتمام میں رسالہ "دامن گل چین" از سر نو جاری کیا اور منشی صاحب کے ادبی کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے رہے۔ جب امیر مینائی رام پور سے حیدر آباد منتقل ہوئے تو اختر مینائی بھی ساتھ تھے۔ امیر کی وفات بعد جلیل کی طرح اختر بھی وہیں رہ گئے۔ جہاں نظام دکن کے معتمد رہے اور نواب اختر جنگ کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ "سوانح امیر" کی تحریر کے وقت وہ سلطنت آصفیہ میں محکمہ عالیہ امور مذہبی کے ناظم اور معتمد تھے۔ "جولائی ۱۹۴۰ء کو انتقال ہوا۔ (حوالہ: "سوانح امیر مینائی" از جلیل مانک پوری: "سوانح امیر مینائی"، حیدر آباد، مطبع سیدی، ۱۹۳۴ء، ص ۷۰)۔

۵۹۔ **منشی مسعود احمد مینائی**۔ "حضرت امیر کے خلف اصغر اور ان ہی کے شاگرد تھے۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے، ذہانت و طباعی میں حضرت امیر کا نمونہ اور، ذکاوت غیر معمولی رکھتے تھے اور فوراً شعر کہہ لیتے تھے۔" ملازمتوں اور منصبی فرائض کی ادائیگی میں مصروفیت کی وجہ سے دنیائے شاعری میں خاص مرتبہ حاصل نہ کر سکے۔ (حوالے دبستانِ امیر مینائی، ص ۲۶۷۔ سوانح امیر از جلیل ص ۸۰)

۶۰۔ **محمد احمد صریر مینائی** یہ امیر مینائی کے بڑے صاحب زادے تھے ریاست رام پور میں مختلف عہدوں پر ممتاز رہے اور فنِ سخن میں والئی رام پور کے استاد تھے اردو، فارسی و عربی میں اچھی استعداد کے مالک تھے شاعری میں والد ماجد کے شاگرد تھے پہلے قمر تخلص کرتے تھے، اس کے بعد محو، آخر میں صریر صریر تخلص اختیار کر لیا تھا"۔ ضروریات فن سے آگاہ، عالم عروض سے واقف، خوش فکر، پختہ شاعر تھے۔ محو نے اپنا پہلا دیوان ضائع کر دیا تھا۔ جب کہ دوسرا دیوان کے اخلاف کے پاس محفوظ ہے، وہ دبستان حالی سے متاثر تھے اس مناسبت سے اس دیوان میں حالی کی پیروی کی گئی ہے۔

۶۱۔ **مولوی سید محمد شاہ محدث** ولد میاں حسن شاہ محدث ساکن محلہ زینہ عنایت خاں رام پور میں تقریباً ۱۲۵۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں اپنے والد سے صرف و نحو اور فارسی کی کتابیں پڑھیں ۰۰۰ مولوی عبدالحق خیر آبادی کی تحریک سے خلد آشیاں نے آپ کا تعلق مدرسہ میں کر دیا ۰۰۰ ۱۳۳۸ھ میں انتقال فرمایا جلیل نے تاریخ کہی۔

ثبت پر لوح مرا زرش کن جلیل　　　وارث دین رسول ، دوسرا

حوالے (حافظ احمد علی شوق : "تذکرہ کاملانِ رام پور" خدا بخش جنرل لائبریری شمارہ، ۳۳، ۳۴، ۳۵، پٹنہ ۱۹۸۵ء، ص ۳۵۷۔ دبستان امیر مینائی، ص ۲۵۵)

۶۲۔ **عبدالوہاب خاں دل گیر** امیر مینائی کے شاگرد تھے، کچھ دن "دفتر امیر اللغات" کام امیر مددگار رہے۔ نمونہ کلام :

آج گردوں کی طرف دیکھ کہ وہ کہتے ہیں ہائے　　　کیا ہوگئی وہ چاند سی صورت میری

(حوالہ : لالہ سری رام۔ "خم خانہ جاوید" جلد سوم، طبع اوّل، دہلی مخزن پریس ۱۹۰۸ء، ص ۲۰۰)۔

۶۳۔ **محمد صفدر علی خاں خیال** : ۱۸۹۲ء میں "دفتر امیر اللغات" میں کام کرتے تھے، امیر کے شاگرد تھے۔ نمونہ کلام :

وصل اور ہجر میں اس بت کے تماشا دیکھا　　　عاشقوں کو کبھی مرتا کبھی جیتا دیکھا

(حوالہ لالہ سری رام، "خم خانہ جاوید" جلد سوم، ص ۱۳۵)

۶۴۔ **واحد علی بسمل** : واحد علی نام، بسمل تخلص تھا۔ ۱۸۶۴ء میں قصبہ کاکوری میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی میں اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ کچھ دن بھوپال، حیدر آباد دکن میں ملازمت کی، شاعری کا شروع ہی سے لگاؤ تھا۔ اس لیے حضرت امیر مینائی کی شاگردی اختیار کی اور فارسی و اردو دونوں میں شعر کہنے لگے اس کے علاوہ وہ "امیر اللغات" کی تدوین کے کام میں استاد کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں فالج میں مبتلا ہو کر وفات پائی"۔

نمونہ کلام :

صبح سے بیٹھ گئے بام پہ وہ روک کے راہ　　　دوپہر بج گئے ، سورج کو نکلنے نہ دیا

(حوالہ : دبستانِ امیر مینائی، ص ۱۷۰)

۶۵۔ **حسین الدین احمد اثر** نے اوائل مشق سخن میں حضرت امیر مینائی کے شاگرد نعیم اور وسیم خیر آبادی کو کلام دکھایا اس کے بعد حضرت امیر سے اصلاح لی وہ "دفتر امیر اللغات" میں بھی کام کرتے تھے۔ نمونہ کلام :

گیا ہاتھ چھوٹ ، اس ادا سے کہا　　　کلائی مری دیکھو بل کھا گئی

(حوالہ دبستانِ امیر مینائی ص ۳۴)

۶۶۔ **امتیاز احمد خاں** راز رام پوری عرف پیارے خاں ریاست رام پور کے رہنے والے تھے پہلے احمد علی رسا سے اصلاح لیتے تھے پھر امیر

مینائی کے سلسلہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ نمونۂ کلام

ہوئی جو راہ خودی طے ، تو یار تک پہنچے　　　بڑھے جو آپ سے آگے تو ان کا گھر آیا

(حوالہ دبستانِ امیر مینائی ص ۱۸۶)

۶۷۔ **ثامت علی** کا ذکر مکاتیب امیر میں دو جگہ ملتا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ حضرت میر کی ہمشیرہ کے صاحب زادے تھے۔ ثامت علی فرزند خواہر زادۂ حقیقی۔ مکتوب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امیر، ثامت علی سے بہت محبت کرتے تھے اور اپنے ساتھ حیدر آباد دکن بھی لے جانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ذکر اور کہیں نہیں ملتا۔

۶۸۔ **محمد قیام الدین** : جون پور کے رہنے والے تھے۔ پہلے فکر تخلص کرتے تھے پھر ہنت اختیار کیا۔ جون پور سے آپ رسالہ بھی نکالتے تھے۔ امیر کے شاگرد تھے۔ امیر کے ایک خط میں ان کا ذکر اس طرح ملتا ہے جیسے وہ "دفتر امیر اللغات" میں ملازمت کرتے ہوں۔

گرائی تجلی جو اے چرخ ٹوٹ پڑ تو بھی　　　اٹھا نہ رکھ کوئی بیداد آشیاں کے لیے

(حوالہ دبستان امیر مینائی ص ۸۹)

۶۹۔ **خان علی خان** : ان کا ذکر امیر کے ایک خط کے سوا کہیں اور نہیں ملتا، اور یہ کہ امیر ان کو دکن کے سفر میں ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

(حوالہ مکاتیب امیر مینائی، ص ۲۸۷)

۷۰۔ **مہدی علی خاں** : نام اور ممتاز تخلص تھا۔ بلند خاں کے صاحب زادے تھے۔ منشی امیر احمد کی صحبتوں کا فیض اٹھایا تذکرہ "انتخاب یادگار" کی تدوین میں امیر کے معاون تھے اور اس وقت ان کی عمر ۳۴ برس تھی۔

نمونۂ کلام :

جو دفعتہً ادھر آیا گیا ممتاز　　　بہار کا کوئی جھونکا تھا وہ شباب نہ تھا

(حوالہ دبستان امیر مینائی، ص ۴۹)

۷۱۔ **خورشید احمد مینائی** کے بارے میں جلیل مانک پوری کہتے ہیں :

"یہ حضرت امیر کے خلف الرشید جناب صریر سے چھوٹے ہیں ان کی طبع سلیم میں صلاحیت اور متانت خاص ہے ذکی اور ذہی الحسد او ہیں "دفتر امیر اللغات" میں جب وہ لغت زیر تالیف تھا۔ بہت حصہ لیتے تھے شاعری کا شوق بھی رکھتے ہیں"۔

(حوالہ سوانح امیر، ص ۷۶)۔

۷۲۔ **امیر پنڈت صاحب** کا ذکر اس طرح کرتے ہیں : ہمارے یہاں علم سنسکرت کے متبحر ایک پنڈت ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور موقعہ پر امیر پنڈت صاحب کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ خط مورخہ ۲۵ / دسمبر ۱۸۹۰ء پنڈت نارائن ملازم ریاست ایک قابل ہیں اور دفتر "امیر اللغات" میں اکثر الفاظ کی تحقیق ان سے کی جاتی ہے"۔ مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ (حوالہ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۷۶۔ تحقیق شمارہ ۳ / ص ۳۷۸)۔

۷۳۔ **نبی احمد خاں** کا حوالہ ڈاکٹر سحر ابو محمد یک مخطوطے سے حاصل کر کے پاورقی حواشی میں درج کیا ہے جس سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ وہ دفتر امیر اللغات میں کام کرتے تھے۔ (مطالعہ امیر، ص ۴۲۵)

۷۴۔ **حافظ محمد رضا خاں** ولد حافظ محمد عمر خاں محدث قوم سا کن محلہ کھنڈ سار کہنہ ۱۲۶۸ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے اوّل قرآن شریف حفظ کیا۔ صرف و نحو مولوی حافظ غلام نبی فقہ، اطصول فقہ، تفسیر، فرائض۔ عروض، ادب، فصاحت وبلاغت کی کتابیں مولوی محمود عالم اور علم ہندسہ کتب مولوی عبدالعلی خاں ریاض واں سے پڑھیں ۰۰۰ فقہ اور صرف و نحو میں بے مثل تھے۔ کتب فارسی میں بھی رام پور میں تمام و کمال کے حاصل کی تھیں۔ ۱۳۱۵ھ میں انتقال کیا۔ (حوالہ "تذکرہ کاملان رام پور"، ص ۷۴ ۳)۔

۷۵۔ **منشی فضل شاہ افضل** حاجی محمد انور کے صاحب زادے تھے جو قصبہ دیوبند ضلع سارن پور کے رہنے والے تھے۔ افضل داغ کے شاگرد تھے۔

دل ہی دل میں یوں سماتا تھا   کبھی آنکھوں میں بھی تو آتا تھا

(حوالہ: خم خانہ جاوید، جلد اوّل، ص ۳۲۱)

۷۶۔ ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۷۷۔ **اصغر علی خان اصغر** عرب شاہ گیسو دراز محمد اسمٰعیل خاں مرحوم افغانوی کی قوم ندال سے تھے۔ اصغر ۱۲۸۵ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے مختلف اساتذہ سے فارسی پڑھی۔ کچھ دن جے پور میں ملازمت کی "امیر اللغات" کے دفتر اور دیگر دفتروں میں بھی تھوڑے تھوڑے دن کام کیا بیش وقت عبادت وریاضت میں گزارے تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور منشی امیر مینائی صاحب کے شاگرد تھے۔ نمونہ کلام:

ان کو سکتہ اس طرف، آئینہ ششدد اس طرف   ایک پیاری شکل پر دونوں کو حیرانی ہوئی

(حوالہ داستان امیر مینائی، ص ۶۵)

۷۸۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۰۸۔

۷۹۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۲۹۔

۸۱۔ **مولوی حفیظ اللہ**: رام پور کے مدرسہ عالیہ میں عربی کے استاد تھے۔ (مطالعہ امیر ص ۲۲۴)۔

۸۲۔ **فصیح الزماں خاں فصیح**، مولوی محمد وجیہ الزماں صدیقی کے ہاں بریلی میں پیدا ہوئے۔ وطن قصبہ فرخ آباد عرف چلانواں تھا۔ امیر کے قریبی عزیز اور رام پور میں ملازم تھے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ فارسی کا دیوان مرتب تھا اردو میں جو کچھ کہتے تھے امیر مینائی کو دکھاتے تھے۔

موسیٰ و برق طور انھیں کے ہیں دونوں نام خود بیں ہوئے کہیں وہ کہیں خود نما ہوئے

(حوالہ دبستانِ امیر مینائی، ص ۲۹۲)

۸۳۔ **منشی عبدالرحمٰن بسمل** کے بارے میں خم خانہ جاوید میں لالہ سری رام لکھتے ہیں (حصہ اوّل ص ۵۸۶) شیخ محمد زماں عرف عبدالرحمٰن صدیقی تخلص بسمل ابن شیخ افضل الرحمٰن جنوری نواح لکھنو میں ایک مقام ہے فرخ آباد عرف چلاواں وہ ان کے مولا وطن ہے مگر مدت سے شہر رام پور میں بود وباش ہے ۔۔۔ فارسی میں امیر مینائی سے مستفیض ہوئے اور ان کے شاگردوں میں ممتاز ہیں۔ نمونہ کلام

چشم بینا ہو تو دیکھے وہ تماشہ تیرا کعبہ و دیر میں ہے ایک سا جلوہ تیرا

۸۴۔ **حضرت امیر مینائی** کے عزیز و قریب، خوش فکر و ذی استعداد شاگردوں میں تھے کم سنی میں وفات پائی۔ (حوالہ دبستانِ امیر مینائی، ص ۳۲۶)

۸۵۔ **حافظ محمود علی فدا**، امیر کے عزیز و شاگرد اور ممتاز علی آہ کے حقیقی ماموں تھے۔ نمونہ کلام

ہو پچھتاؤ گے ڈھاکر ہمارے کعبہ دل کو یہ کہ وہ کعبہ نہیں جو جوگر کے ہو تعمیر کے قابل

(حوالہ دبستان امیر مینائی، ص ۲۸۹)

۸۶۔ دیکھیے حوالہ نمبر ۵۶۔

۸۷۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۷۴۔

۸۸۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔

۹۰۔ **سید زاہد حسین زاہد** عربی، فارسی اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں ذی استعداد تھے حضرت امیر مینائی کے شاگرد رشید، خوش فکر، مشتاق اور زود گو شاعر تھے۔ سرمایہ کلام بہت تھا لیکن کسی مطبوعہ دیوان کا پتا نہیں چلتا۔ زاہد کا انتقال ۱۹۴۲ء میں ہوا۔ نمونہ کلام

ٹھہرائے آہ جاکر لامکاں تک خدا سے ڈر بس اب آگے کہاں تک

(حوالہ: دبستانِ امیر مینائی، ص ۱۹۸)

۹۱۔ **عبدالکریم نام**، ہر ہم تخلص، فتح پور ہنسوا وطن، ہر ہم قادر الکلام و کہنہ مشق شاعر تھے ان کا شمار حضرت امیر مینائی کے خوش فکر و ممتاز تلامذہ میں ہوتا ہے۔ ہر ہم حیثیت انسان اور صحافی اور شاعر گورکھپور میں بہت مقبول ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں وفات پائی۔

نمونہ کلام:

کیا رنگ دیکھتے ہو دل داغ دار کا رہتا ہے یاں خزاں میں بھی عالم بہار کا ہے

(حوالہ: دبستان امیر مینائی، ص ۹۴)

۹۲۔ **حبیب الرحمٰن شیروانی**: حبیب الرحمٰن خاں شروانی حسرت، محمد تقی خاں صاحب کے فرزند رشید تھے۔ بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے شروانی خاندان کے افراد کا شمار روسا و عمائدین میں ہوتا تھا۔ حسرت کی ولادت ۱۲۸۵ھ میں ہوئی زمانہ کے رواج کے مطابق عربی، فارسی و اردو قابلِ اساتذہ سے پڑھ کر قابلِ رشک استعداد حاصل کی۔ وہ تاریخ و فلسفہ اور فقہ اسلامی کے زبردست عالم تھے انھوں نے میر حسن کے تذکرہ اور خواجہ میر درد کے دیوان کی ترتیب و تدوین کی تھی۔ "امیر اللغات" کی تدوین کے سلسلے میں منشی امیر مینائی صاحب سے مراسلت شروع ہوتی تھی جو پڑھتے پڑھتے تلمذ کا ذریعہ بن گئی۔ ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ میں انتقال کیا۔

نمونہ کلام:

حسرت و یاس کا انبوہ تعال کی کثرت　　میں تیری بزم سے کیا ہے بے سرو ساماں نکلا

(حوالہ دبستان امیر مینائی، ص ۱۵۱)

۹۳۔ **مولوی محمد اعجاز حسن خاں**، رئیس رسول پور ضلع مظفر پور تھے بقیہ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ ہماری خیال میں اعجاز حسن امیر کے شاگرد محمد ریاض حسن خیال کے قریبی عزیز تھے۔

۹۴۔ **محمد ریاض حسن خیال** مولوی حکیم ہادی حسن خاں نایاب رسول پوری کے خلف اوسط تھے۔ ہادی صاحب اچھے شاعر اور رسولپور ضلع مظفر پور کے رئیس تھے۔ خیال ۱۲۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی مختلف اساتذہ سے پڑھ کر اچھی استعداد حاصل کر لی۔ بچپن سے شعر و سخن کا ذوق تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور اپنے فارسی کے ایک استاد حافظ سید فرزند علی صاحب سے اصلاح لینے لگے ان کے بعد داغ دہلوی کے حلقہء تلامذہ میں شامل ہوئے۔ شاہ ممتاز علی آہ کے مطابق محمد ریاض امیر کے شاگرد تھے ریختہ میں خیال اور فارسی میں دانش تخلص کرتے تھے۔ عرفان عباسی کہتے ہیں کہ ریاض نے داغ کے بعد امیر مینائی کی بھی شاگردی اختیار کی تھی۔

نمونہء کلام:

کس کے یہ نقش پا ہیں کوئے عدو میں یارب　　سر جھک رہا ہے اپنا سجدے کو ہر قدم پر

مولوی محمد ریاض حسن خاں غالباً مولوی محمد مہدی حسن خاں شاداب کے قریبی عزیز تھے۔

(حوالے: خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۱۰۱۔ امیر مینائی، ص ۱۴۶۔ دبستانِ امیر مینائی، ص ۱۷۰)

۹۵۔ **سید مہدی حسن خاں شاداب رسول پوری** ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ امیر حسن خاں تعلقہ دار رسول پور ضلع مظفر پور کے صاحب زادے تھے۔ ابتدائے شاعری میں برادر بزرگ مولوی حکیم محمد ہادی خاں نایاب کے شاگرد تھے۔ ان کی وفات کے بعد منشی امیر احمد کو کلام دکھانے لگے۔ نمونہ کلام:

موت آئے گی مرجائیں گے ڈرنا کیا ہے　　مرضی ہے یہی رب کی تو کرنا کیا ہے
دل کی الجھن تو دور ہوجائے گی　　یہ راز تو کھل جائے گا مرنا کیا ہے

(حوالہ دبستان امیر مینائی، ص ۲۱۰)

۹۶۔ صفیر بلگرامی کی وجہ شہرت ان کی کتاب "جلوہ خضر" ہے۔

۹۷۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۸۹۔

۹۸۔ ایضاً ص ۱۶۸۔

۹۹۔ ایضاً ص ۱۷۱۔

۱۰۰۔ ایضاً

۱۰۱ ایضاً ص ۱۷۳۔

۱۰۲۔ ایضاً ص ۱۷۵۔

۱۰۳۔ ایضاً ص ۱۶۹۔

۱۰۴۔ ایضاً ص ۱۷۶۔

۱۰۵۔ ایضاً ص ۱۷۶۔

۱۰۶۔ مطالعہ امیر ص ۴۲۵۔

۱۰۷۔ دورانِ گفتگو بتایا اسمٰعیل احمد مینائی نے بتایا۔

۱۰۸۔ "امیر مینائی"، ص ۱۱۴۔

۱۰۹۔ دیکھیے حوالہ نمبر ۱۰۵۔

۱۱۰۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۰۹۔

۱۱۱۔ "مقدمہ امیر اللغات"، ص ۳

۱۱۲۔ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۴۴۴۔

۱۱۳۔ مقدمہ امیر اللغات، ص ۳۔

۱۱۴۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۳۴۔

۱۱۵۔ ایضاً ص ۲۰۲۔

۱۱۶۔ ایضاً ص ۳۱۹۔

۱۱۷۔ ایضاً ص ۳۲۱۔

۱۱۸۔ ایضاً ص ۳۲۳۔

۱۱۹۔ ایضاً ص ۳۲۴۔

۱۲۰۔ ایضاً ص ۳۱۶۔

۱۲۱۔ ایضاً ص ۱۶۱۔

۱۲۲۔ ایضاً ص ۱۶۸۔

۱۲۳۔ ایضاً ص ۲۹۰۔

۱۲۴۔ دورانِ گفتگو بتایا۔

۱۲۵۔ "مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۷۶۔

۱۲۶۔ ایضاً، ص ۲۰۱۔

۱۲۷۔ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۴۵۰۔

۱۲۸۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۶۴۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۱۳۱۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۱۳۳۔ ایضاً، ص ۱۷۳۔

۱۳۴۔ ایضاً، ص ۱۷۵۔

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۱۸۷۔

۱۴۱۔ ایضاً، ص ۱۳۸۔

۱۴۲۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔

۱۴۳۔ ایضاً، ص ۱۹۰۔

۱۴۴۔ ایضاً، ص ۱۹۱۔

۱۴۵۔ ایضاً، ص ۲۶۴۔

۱۴۶۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۲۰۱۔

۱۴۸۔ ایضاً، ص ۲۱۲۔

۱۴۹۔ "مطالعہء امیر"، ۴۱۶۔

۱۵۰۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۱۲۔

۱۵۱۔ "دبستانِ امیر مینائی"، ص ۸۳۔

۱۵۲۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۲۳۰۔

۱۵۳۔ ایضاً، ص ۳۳۲۔

۱۵۴۔ امیر مینائی، ص ۱۱۲۔

۱۵۵۔ دورانِ گفتگو بتایا۔

۱۵۶۔ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ۴۴۹۔

۱۵۷۔ نقوش، شمارہ ۱۴۲، ص ۲۵۴۔

۱۵۸۔ مطبوعہ مطبع رجمانی، دہلی، ۱۹۰۳ء، ص ۱۰۔

۱۵۹۔ محلِ امیر، کراچی شمارہ ۱، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۵۳۔

۱۶۰۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۰۸۔

۱۶۱۔ "مطالعہ امیر"، ص ۴۱۶۔

۱۶۲۔ ایضاً، ص ۴۲۱۔

۱۶۳۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۸۴۔

۱۶۴۔ غیر مطبوعہ خط: بنام منشی محمد حسن از محمد مسعود ۲۲/ اپریل ۱۸۹۶ء

۱۶۵۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۷۶۔

۱۶۶۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۱۶۷۔ مطالعہ امیر، ص ۴۱۶۔

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۴۲۱۔

۱۶۹۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۸۴۔

۱۷۰۔ غیر مطبوعہ خط: بنام منشی محمد حسن، محولہ بالا

۱۷۱۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۰۸۔

۱۷۲۔ ایضاً، ص ۲۶۲۔

۱۷۳۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۱۷۴۔ ایضاً، ص ۲۶۹۔

۱۷۵۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔

۱۷۶۔ ایضاً، ص ۱۴۹۔

۱۷۷۔ ایضاً، ۱۷۶۔

۱۷۸۔ ایضاً، ۱۷۷۔

۱۷۹۔ ایضاً،

۱۸۰۔ غیر مطبوعہ خط بنام مرزا پروش علی خاں از جلیل مانک پوری، ۲۵ /اکتوبر ۱۸۹۸ء

۱۸۱۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۵۳۔

۱۸۲۔ ایضاً، ص ۲۵۴۔

۱۸۳۔ ایضاً، ص ۲۷۶۔

۱۸۴۔ ایضاً، ۳۳۴۔

۱۸۵۔ "سوانح امیر"، ص ۴۴۔

۱۸۶۔ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۴۴۸۔

۱۸۷۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۴۴۔

۱۸۸۔ امیر مینائی، ص ۲۶۔

۱۸۹۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۱۹۰۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۴۸۔

۱۹۱۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

۱۹۲۔ ایضاً، ص ۱۱۵۔

۱۹۳۔ "ارمغانِ امیر"، ۲۹۔

۱۹۴۔ مکاتیب امیر مینائی، ص ۳۳۵۔

۱۹۵۔ جنرل اعظم الدین خاں ۱۸۵۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۳/اپریل ۱۸۹۱ء بروز اتوار افطار کی تقریب کے بعد رقص و سرور ہوا۔ آتش بازی کے بعد رات نو بجے ٹم ٹم پر سوار ہو کر جا رہے تھے کہ ان پر فائر کیا گیا۔ ("اخبار الصنادید" ص ۳۱۸ تا ۳۲۱)۔

۱۹۶۔ ارمغانِ امیر، ص ۲۹۔

۱۹۷۔ سید جاوید اقبال "معتمدینِ دفتر امیر اللغات کے مکتوبات"، مضمون مشمولہ شعبہ جاتی مجلہ "تحقیق" شمارہ ۵۔ ۱۹۹۹ء، ص ۳۷۶۔

۱۹۸۔ نعیم الحق آزاد شیخ پوری : "حیات الشعراء"، میر پور خاص سندھ ،بلدیہ میر پور خاص، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵۵۔

۱۹۹۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۲۹۔

۲۰۰۔ غیر مطبوعہ خط بنام ریاض احمد، مورخہ ۲۴/ اکتوبر ۱۸۹۳ء، از ممتاز علی آہ۔

۲۰۱۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۸۱۔

۲۰۲۔ ایضاً ص ۲۷۹۔

۲۰۳۔ ایضاً، ص ۳۱۱۔

۲۰۴۔ غیر مطبوعہ خط بنام مولوی محمد حسین ۱۸۹۴ء از ممتاز علی آہ

۲۰۵۔ "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۱۴۔

۲۰۶۔ ایضاً، ص ۲۲۵۔

۲۰۷۔ ایضاً، ص ۲۲۰۔

۲۰۸۔ ایضاً، ص ۲۲۲۔

۲۰۹۔ "امیر مینائی"، ص ۱۲۹۔

۲۱۰۔ "مکاتیبِ امیر"، ص ۲۲۵۔

۲۱۱۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۲۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۲۱۳۔ ایضاً ص ۲۲۸۔

۲۱۴۔ ایضاً، ص ۲۹۴۔

۲۱۵۔ امیر مینائی، ص ۱۳۴۔

۲۱۶۔ غیر مطبوعہ خط بنام منشی محمد حسن از محمد مسعود، ۲۲/ اپریل ۱۸۹۶ء۔

۲۱۷۔ غیر مطبوعہ خط بنام منشی محمد حسن از جلیل، ستمبر ۱۸۹۸ء۔

۲۱۸۔ غیر مطبوعہ خط بنام سراج الدین، ۱۹/ اکتوبر ۱۸۹۸ء۔

۲۱۹۔ غیر مطبوعہ خط بنام منیجر اخبار عام، ۲۰/ ستمبر ۱۸۹۸ء۔

۲۲۰۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی : "لکھنؤ کی لسانی خدمات"، طبع اول، دہلی، مکتبہ ء جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء۔

۲۲۱۔ سالِ تصنیف ۶۰۔۱۱۵۹ھ۔

۲۲۲۔ سالِ تصنیف ۱۱۶۵ھ۔

۲۲۳۔ یہ لغت ۱۸۳۳ھ میں تالیف ہوئی تھی۔ بعد ازاں مطبع مظہر العجائب، مدراس سے شائع ہوئی۔

۲۲۴۔ یہ لغت ۱۲۵۳ھ میں تالیف ہوئی اور ۱۸۶۹ء میں مطبع نول کشور، لکھنو سے شائع ہوئی۔

۲۲۵۔ یہ لغت ۱۲۵۶ھ میں تالیف ہوئی تھی بعد ازاں نیر پریس، لکھنو سے ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوئی۔

۲۲۶۔ مطبوعہ ۱۸۸۶ء۔

۲۲۷۔ مطبوعہ مطبع شوکت جعفر، ۱۳۰۶ھ۔

۲۲۸۔ مطبوعہ مطبع نامی، لکھنو، ۱۸۹۰ء۔

۲۲۹۔ اس لغت کا پہلا حصہ "ارمغانِ دہلی" کے نام سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں "ہندوستانی اردو لغت" کے نام سے پہلی جلد شائع ہوئی، پھر "فرہنگِ آصفیہ" کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

۲۳۰۔ مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور، ۱۹۰۶ء۔

۲۳۱۔ مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنو، ۱۲۹۸ھ۔

۲۳۲۔ مطبوعہ مطبع جعفری، لکھنو، ۱۳۰۴ھ۔

۲۳۳۔ مطبوعہ یوسفی پریس، لکھنو، ۱۳۱۵ھ۔

باب پنجم

مکتوباتِ امیر اور معاصرانہ چشمکیں

اردو ادب میں شعراء کی معاصرانہ چشمکوں کا مطالعہ ایک دل چسپ موضوع ہے اس کے مطالعے سے اس دور کے علمی، ادبی اور فکری رجحانات، معیارات اور مسائل کا پتا چلتا ہے۔ اسی ذیل میں اس دور کے اہل علم کی علمی و ادبی کاوشوں اور ادبی صحافت کے رویوں کی ایک تاریخ بھی سامنے آتی ہے۔ ہمارے خیال میں شعراء کی معاصرانہ لڑائیوں میں ملوث افراد کے مزاج ان کے اخلاق اور دیگر احباب سے تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ جو یقیناً ایک سوانح عمری کے لیے دل چسپ اور بہترین مواد ہوتا ہے۔ اردو ادب میں شعراء کی معاصرانہ چشمکوں کا جب بھی ذکر آتا ہے تو ذہن میں فوری طور پر میر و سودا، مصحفی و انشا، ناسخ و آتش، غالب و ذوق، انیس و دبیر اور امیر و داغ کا نام آتا ہے۔

امیر مینائی انیسویں صدی کے آخری ادوار کی ایک بلند پایہ شخصیت تھے۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بھی اور کردار کے حوالے سے بھی اپنے معاصرین میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے دور میں مرزا رحیم الدین حیا، میر ضامن علی جلال لکھنوی، سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی، محمد اسماعیل حسین منیر، شیخ امداد علی بحر، منشی امیر اللہ تسلیم اور داغ دہلوی استادانہ درجہ رکھتے تھے۔ لیکن داغ کے حوالے سے معاصرانہ چشمک کی بازگشت اردو کی ادبی تاریخوں میں ملتی ہے۔ کہیں کہیں جلال لکھنوی کے حوالے سے بھی امیر پر الزامات ملتے ہیں۔ اور اسی طرح کا رویہ سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" کے حوالے سے بھی ملتا ہے۔

ہم اس باب میں امیر کے اپنے معاصرین کے ساتھ تعلقات کو ان کے مکتوبات کی روشنی میں دیکھیں گے۔ اس لیے کہ مکتوبات کی دنیا بڑی عجیب ہے۔ اس سے شخصیت کو پرکھنے اور پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ مکتوب الیہ کے ظاہر اور باطن کا موازنہ اس کے مکاتیب سے کیا جاتا ہے۔ نتائج نکالے جاتے ہیں۔ شخصیت و کردار کی پیمائش اخلاقی پیمانوں سے کی جاتی ہے اور پھر حتمی فیصلے کر لیے جاتے ہیں۔

اس باب میں سب سے پہلے امیر و داغ (۱) کے تعلقات اور رویوں کو زیرِ بحث لائیں گے پھر امیر اور سید احمد دہلوی (۲) کے اختلافات کو اس کے بعد امیر اور جلال (۳) کے تعلقات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

(۱)

رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں امیر و داغ کا مقابلہ کے عنوان سے جو گوشہ قائم کیا ہے اس کی ابتداء اس جملے سے کرتے ہیں۔

"یہ مقابلہ بھی اسی قبیل سے سمجھنا چاہئے جیسا کہ میر و میرزا کا مقابلہ" (۴)۔

اس کے علاوہ سکسینہ امیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے داغ کو ان کا "بڑا حریف" قرار دیتے ہیں (۵)۔ ابو سلمان الہندی (ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری) نے "امام الہند" میں رام بابو سکسینہ کے بیان کو وسعت دیتے ہوئے یہ رائے دی ہے کہ :

"داغ ۔۔۔ سے رقیبانہ کش مکش لازمی تصور کی جاتی تھی" (۶)۔

غالباً ڈاکٹر انور سدید نے بھی رام بابو سکسینہ کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ رائے دی ہے کہ :

"داغ اور امیر اپنے زمانے میں ایک دوسرے کے حریف تھے" (۷)۔

اسی نوعیت کے خیالات اکثر کتابوں اور مضامین میں بھی ملتے ہیں چناں چہ ادب کے طالب علموں کی عام رائے یہی ہے کہ دونوں معاصرین ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ جیسا کہ میر و سودا اور غالب و ذوق وغیرہ۔ اصل صورتِ حال کیا ہے اس کے لیے ہم مکاتیبِ امیر کے مطالعے کی طرف آتے ہیں جہاں امیر اپنے مکاتیب میں داغ کو میرے پرانے غم گسار، روحی فداک، میرے پرانے غم گسار داغ سلامت، بندہ نواز، حضرت داغ نازک دماغ۔ معظم و محترم دام بالعنایتہ واکرام، دل نواز امیر فقیر سلمکم اللہ القدیر و صححکم اللہ عن التبخیر، مکرم قدیم، مصدرِ لطفِ اتم قدیمی، مکرم سلامت سے مخاطب کرتے ہیں۔ دوسری طرف داغ امیر کو میرے دل کو تسلی دینے والے سلامت رہو، حضرت سلامت، جناب منشی صاحب ارسطو تدبیر شاعری کی لکیر، پر تقصیر منشی امیر احمد صاحب دام عنا یتکم۔ مکرم و منعم ؟۔ جناب مکرم سے مخاطب کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر شاگردوں نے امیر کے سامنے داغ کی ایک غزل پڑھی امیر نے اسے پسند کیا اور خود بھی اس زمین میں غزل کہی اور مقطع میں ان کے کلام کی داد دی ؂

امیر اچھی غزل ہے ، داغ کی ، جس کا مصرع ہے
بھویں تنی ہیں ، خنجر ہاتھ میں ہے ، تن کے بیٹھے ہیں

نواب کلبِ علی خاں کی رحلت کے بعد رام پور کے حالات امیر و داغ کے لیے سازگار نہ رہے کچھ عرصے بعد داغ رام پور سے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ امیر نے اس صورتِ حال کو یوں رقم کیا :

کہاں ہم اے امیر اور کہاں داغ
یہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

دوسری طرف دکن میں داغ یہ کہتے ہیں :

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ
ملتے امیر احمد و سید جلال سے

داغ اور امیر کے درمیان مراسلت کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ جب داغ حیدر آباد گئے تھے۔ اس کے علاوہ آنے جانے والے افراد سے دونوں ایک دوسرے کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ امیر، نعیم الحق آزاد شیخ پوری کو لکھتے ہیں کہ "داغ کی کامیابی دکن مجھے بخوبی معلوم ہے۔ ان کے خطوط اکثر آتے رہتے ہیں" (۸)۔

داغ کے نام امیر کے مکاتیب میں گھریلو حالات، ریاستوں کی روداد، بیماریوں کی کیفیات، علمی و ادبی معاملات اور نوک جھونک ملتی ہیں۔ امیر اپنے ایک خط میں داغ کو لکھتے ہیں :

"یہ آپ ہی سے ہو سکتا ہے کہ غزل کہنے میں رمضان و شوال برابر ہے۔ کیوں کر نہ ہو سچے روزے کبھی رکھے ہوتے تو معلوم ہوتا کہ رمضان ہے" (۹)۔

داغ اس دوستانہ مذاق کا جواب خوش دلی سے دیتے ہیں۔

"میرے روزں کا حال شب بیدار، تہجد گزار خداشناس جانتے ہیں آپ نے تو نہ پڑھی نہ قضا کی"(۱۰)۔

امیر، داغ کو اپنے خطوط میں نصیحتیں بہت کیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے تھے کہ "خوشامد کرنے والے تمھارے سیکڑوں ہیں۔ ملامت کرنے والوں میں ایک مجھی کو رہنے دو"(۱۱)۔ یا ایک خط میں یہ لکھتے ہیں کہ "افسوس میں نے ۰۰۰ کوئی ساعت آپ کی خدا کی طرف مشغولی کی نہ سنی"(۱۲)۔ جواب میں داغ یہ لکھتے ہیں :

"مجھ کو یہ فکر ہے کہ آپ کو میرے بخشوانے کا اتنا خیال کیوں ہے"(۱۳)۔

امیر اپنے مکاتیب میں داغ کو رام پور آنے کی باربار دعوت دیتے تھے۔ داغ اپنے ایک خط میں شوخی سے لکھتے ہیں۔

"اگر زندگی مستعار باقی ہے کہ بہت کم رہ گئی ہے۔ میں ضرور انشاء اللہ رام پور کے علاوہ آپ سے ملوں گا۔ آپ کے توہمات نے مراد آباد نہ آنے دیا"(۱۴)۔

داغ کو نظام دکن کی ملازمت کرتے سات سال گزر گئے تھے۔ لیکن وہ کسی بڑے عہدے سے محروم تھے۔ امیر، داغ سے ان کی ملازمت کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ داغ لکھتے ہیں۔

"الطاف خسروانی تحریر و زبانی بہت کچھ امید دلا رہے ہیں۔ عمل خوانوں سے چارہ نہیں۔ حکم الٰہی کی دیر ہے۔ مگر تم عمل پڑھنا چھوڑ دو تو اجرائے کا جلد ہو"(۱۵)۔

امیر اور داغ کی مراسلت غالباً ۱۸۹۱ء سے ۱۹۰۰ء تک رہی اس عرصے میں نوک جھونک اور شوخ جملوں کا تبادلہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں کے تعلقات میں کشیدگی نہیں تھی۔ خلوص تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خطوط کا انتظار کرتے تھے۔ خط نہ لکھنے پر دونوں ایک دوسرے سے ناراضی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ امیر بیماری کے باعث داغ کو خط نہیں لکھ پاتے تھے۔ تاخیر سے خط لکھنے کی وجوہات اس طرح تحریر کرتے ہیں۔ جیسے دونوں برابر کے بھائی ہوں۔

"ایک مہینے سے زیادہ ہوا اگر اب تک میں جواب نہ لکھ سکا اور اس وقت بھی دوسرے کے قلم سے لکھوائے دیتا ہوں کیوں کہ اگر اب بھی یہی انتظار کروں کہ اپنے ہی قلم سے جواب لکھوں تو دھڑکا ہے کہ آپ خفا ہو جائیں گے"(۱۶)۔

امیر نے داغ کی اہلیہ کے انتقال پر تعزیتی خط تحریر کیا تھا اس کے جواب میں داغ لکھتے ہیں۔ (انتقال رجب ۱۳۱۶ھ کو ہوا تھا)۔

"میرے دل کو تسلی دینے والے سلامت رہو۔ تعزیت نامہ آیا اور بھی مجھے رلایا۔

ایک طوفان ہے غم ہجر میں رونا کیا ہے
نہیں معلوم کہ انجام کو ہونا کیا ہے

کہیے منشی صاب میری حیات کے جو نفس باقی ہیں کیوں کر گزر سکتے ہیں کوئی تدبیر تو بتایئے۔

مل جائے کوئی عاشق دیرینہ تو پوچھوں

کس طرح بسر کرتے ہیں ایامِ جدائی (۱۷)"

داغ ۱۳۱۸ھ، روز شنبہ والے خط میں یہ کہہ کر داد کے طلب گار ہیں۔

"بندہ پرور پتھر اپنی جگہ بھاری ہے۔ یہ محاورہ میں نے باندھا آپ سے داد طلب ہوں ... چند شعر اور کہہ کر غزل گور کھپور بھیج دی ہے ملاحظہ ہو گی"(۱۸)۔

امیر، داغ کے اس خط کا پر خلوص جواب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"آپ کی غزلیں دیکھ کر بھی بہت ہی جی خوش ہوا میں کس کس شعر کی تعریف کروں۔

ز فرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

ہمیشہ آپ کا کلام دیکھ کر دل سے بے اختیار آپ کی ترقی عمر کے لیے دعا نکلتی ہے۔ وہی حال دل و زبان کا اس وقت بھی ہے"(۱۹)۔

داغ کا تیسرا دیوان "مہتاب داغ"(۲۰) شائع ہونے والا تھا۔ داغ نے امیر سے اس کی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ امیر نے ان کی خواہش کی تکمیل نہایت شاندار طریقے سے کی۔ اس کاوش کا شکریہ داغ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں :۔

"مہتاب داغ کی تاریخ کا ممنون ہوا۔ تخرجہ کا معترف۔ شکر ہے سب سے پہلے آپ ہی نے حوصلہ نکالا(۲۱)۔ اگرچہ یہ دیوان بے حوصلہ ٹھرا یہ تخرجہ نہیں بلکہ تعمیہ اتحاد ہے ... یہ فن تو مر چکا تھا اتنی قدر بھی غنیمت جانیے"(۲۲)۔

امیر، داغ کے اس شکریے کے جواب میں لکھتے ہیں :

"تخرجے والی تاریخ میں آپ نے حوصلے سے متعلق کیا کیا لطیفے لکھے کہ جی خوش ہو گیا اس تخرجے کی تاریخ نہ کہتا تو ایسے لطیفے کیوں کر سنتا۔ دوسری تاریخ اس ڈر سے جلد بھیجی کہ شاید پہلی تاریخ تخرجہ پسند نہ آئے"(۲۳)۔

امیر اور داغ کے درمیان علمی معاونت کا سلسلہ بھی نہایت مستحکم معلوم ہوتا ہے۔ "مہتاب داغ" کی تکمیل میں رکاوٹ تھی اس کا سبب یہ تھا کہ چند زمینوں میں تتمہ باقی تھا۔ داغ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں :

"چند زمینوں میں تتمہ باقی ہے۔ مقدم الف میں اگر کوئی زمین نئے خیال میں آئے تو مصرعہ بھجوا دو بلکہ پانچ سات"(۲۴)۔

امیر اس خط کے جواب میں رقم طراز ہیں :

"ردیف الف میں چند زمین جو آپ نے طلب کی ہیں متعاقب فکر کر کے بھیجوں گا۔ مگر زمینیں تو آپ ایسی خوب صورت نکالتے ہیں کہ کبھی کبھی تو مجھ سا افسردہ خاطر بھی ان میں کچھ کچھ کہہ اٹھتا ہے"(۲۵)۔

داغ اسی طرح کی مدد ایک بار پھر مانگتے ہیں۔

"دیواروں پر انگاروں پر، اس زمین میں مجھ پر سخت فرمائش ہے۔ آتش کی غزل تو میں نے دیکھی کیا عجب اسیر مرحوم کی بھی غزل ہو آپ کی بھی غزل ہو سنتا ہوں کہ بہت اہل لکھنو کی غزلیں ہیں دو چار کی نقل بھجوا دو تو مہربانی ہو گی" (۲۶)۔

داغ کا اسی نوعیت کا ایک اور خط ہے۔ جس میں وہ اشعار کے انتخاب اور اسے شائع کرانے کی درخواست کرتے ہیں۔

"برخوردار لطیف احمد کا تعزیت نامہ بھی آیا اس میں غزل کی بھی چھیڑ تھی۔ اس بچے کی فرمائش سے سخت پریشانی ہوئی۔ آج یہ چند شعر کہے ہیں ان میں سے منتخب کر کے دو چار شعر چھپوا دیجیے گا۔ ایک میں ایک مثل بندھ گئی ہے۔ مگر مقدم جملوں میں شبہ ہے گھر میں پوچھ کر لکھئے گا یا جس طرح آپ کو یاد ہو" (۲۷)۔

ایک موقع پر امیر بے تکلفی اور شوخی سے داغ کو لکھتے ہیں:

"نواب مرزا خاں صاحب اس ملک (دکن) میں رہ کر اور پورا وقت فرصت پا کر آپ کی مشق کو تو بہت ترقی ہو گی" (۲۸)۔

داغ، امیر کی اس شوخی پر تلملا کر لکھتے ہیں:

"مہتاب کو چھپے دو برس کا زمانہ گزرا، اس دو برس میں بیس غزلیں کہی ہیں کیا اس کا نام مشق ہے" (۲۹)۔

امیر کے ایک مکتوب (۷ / جولائی ۱۸۹۴ء) سے پتا چلتا ہے کہ داغ نے اپنا کلام امیر کے پاس انتخاب کرنے اور اسے "گل چیں" (۳۰) میں شائع کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

"کیا ضرورت ہے کہ وسیم (۳۱) کو بھیجنے میں جلدی کی جائے لہذا میں یہی شق اختیار کرتا ہوں کہ پہلے انتخاب کر کے آپ کو بھیجوں اور جو شعر میرے نزدیک ہر طرح عیب سے پاک اور آپ کے رتبے پر بھیجتے ہوئے ہیں ان کو انتخاب میں لوں اور جو شعر کہ ان میں مضامین تو تازہ ہیں مگر نظر دقیق ان کو کسی عیب سے پاک نہ دیکھے ان کو انتخاب میں چھوڑ دوں اور کچھ اشارہ ان عیوب کا لکھ کر آپ کو مطلع کروں۔ یہ مجھے یقین ہے کہ اتحاد قدیمانہ کی نظر سے آپ برا نہ مانیں گے اور بطور خود اس کی اصلاح کر لیں گے" (۳۲)۔

داغ نے امیر کے اس انتخاب کو پسند نہیں کیا اور اتحاد قدیمانہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھا کہ:

"آپ کے انتخاب سے میں خوش نہ ہوا اور سبب مہاجرت کے مذاق میں مغائرت ہو گئی، آپ کے شبہات پر میں نے غور کر کے بجا اور بے جا کا لحاظ رکھ کر ملفوف رقیمۂ نیاز کیا اگر تکلیف نہ ہو تو مکرر ملاحظہ فرما کر جواب جلد لکھئے" (۳۳)۔

امیر نے نظام دکن کے حضور اپنی تحریر بھیجی تھی۔ داغ وہ تحریر کسی وجہ سے نظام دکن کی خدمت میں پیش نہیں کر سکے۔ مذکورہ خط میں مزید رقم طراز ہیں کہ :

"آپ جب میری غزل مکرر نقطۂ انتخاب کر کے بھیجیں گے تو اس غزل کے ساتھ آپ کی تحریر بھی انشاءاللہ ضرور پیش ہو گی کہ اس انتخاب کا انتظار ہے" (۳۴)۔

اس اقتباس کے مطالعے سے فوری طور پر جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ کہ داغ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے امیر پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ یہ وہ دور ہے کہ جب امیر شدید مالی بحران کا شکار ہیں اور نظام کی نظر التفات چاہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس خط کا ماحول یہ بتاتا ہے کہ دونوں کے تعلقات اس سطح پر آگئے تھے کہ بے تکلفی سے گفتگو کرنا حیرت میں مبتلا کرتا تھا۔ جس کی ایک مثال ذیل کا اقتباس ہے۔

"خدا آپ کو اچھا رکھے۔ آپ کی ذات ہندوستان میں ایک ہی ہے مگر خدا کے لیے معدے بے چارے پر اتنا زور ڈالا کیجیے جتنا وہ سہ سکے میں پہلے بھی یہی دوستانہ نصیحت کیا کرتا تھا اور اب بھی یہی کہتا ہوں اس سے بڑھ کر اور کوئی پرہیز ہی نہیں" (۳۵)۔

داغ ۱۳۰۸ھ روز چہار شنبہ کے خط میں امیر کو لکھتے ہیں :

"خدا نے حضور پر نور کو میرا قدر دان بالذات کر دیا کہ تین برس کی جاں فشانی اور دس ہزار کے خرچ کے بعد یہ صورت پیدا ہوتی ہے خدا کرے کرشمہ بھی جلد ہو۔ آمین ثم آمین۔ نہایت مقروض ہو گیا ہوں دیکھیے کیا صرف پڑے۔ یہ نہیں معلوم کہ کس تاریخ سے یہ دستخط ہوئے ہیں" (۳۶)۔

امیر اس خط کے جواب میں رقم طراز ہیں :

"آپ کے تقرر کی مسرت بھی بڑی مسرت ہے مدتوں کی امیدواری اور ہزاروں روپیہ صرف ہو جانے کے بعد یہ کامیابی آپ کو ہوئی ہے خداوند تعالیٰ مبارک کرے اور بہت جلد پوری ترقی ہو تو اور زیادہ جی خوش ہو اور خدا کرے حیدر آباد پہنچنے کی تاریخ سے تنخواہ دی جائے" (۳۷)۔

اس خط کے کچھ ہی عرصے بعد " اخبار گورکھپور" (۳۸) جس کے مدیر امیر کے ایک شاگرد ریاض خیر آبادی (۳۹) تھے انھوں نے داغ کی "استاد السلطان" ہونے کی اطلاع شائع کی تو امیر نے فوراً لکھا۔

"ارے یار استاد السلطان ہونے کی مٹھائی تو لا۔ یا استاد یا استاد برسوں کہا گیا ہے اب جو وہ وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد" (۴۰)۔

اسی خط سے کچھ پہلے داغ کا کوئی خط امیر کو موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے استاد السلطان ہونے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ امیر نے اخبار گورکھپور کو پڑھنے کے بعد جب خط لکھا تو شکایت بھی کی اور مبارک باد کے ساتھ دعائیں بھی دیں۔ یہ رویہ امیر کا اچھا انسان اور دوست ہونا بھی ثابت کرتا ہے۔ خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب بخطاب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر

ہونا چھاپا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا مگر اس تحریر میں ان دونوں اعزازوں کا ذکر نہ تھا اس وجہ سے وہ سرور کھیت گیا۔ عزت افزائی جو سرکار دولت مدار نے تملّذ سے فرمائی وہ میرے سرور اور آئندہ ترقیوں کی امیدوں کو بڑھا رہے ہیں۔ خدا جلد ظہور میں لائے"(۴۱)۔

اسی زمانے کے ایک خط میں داغ، امیر کو ان کے نئے دیوان کی بابت لکھتے ہیں کہ:

"سنتا ہوں کہ نیا دیوان آپ کا چھپا ہے وہ کہاں ہے کیا قیمت ہے، ہماری تاریخ سے داغ لگتا اس واسطے اطلاع نہ کی یہ باتیں دل پر نقش ہوتی جاتی ہیں"(۴۲)۔

داغ کے اس بیان میں شکوہ و شکایت کے ساتھ تاسف اور غصہ بھی جھلکتا ہے۔ امیر بھی اس خط کا جواب کچھ اسی انداز سے دیتے ہیں:

"شکایت جو آپ نے صنم خانہ عشق دیوان دوّم کے نہ پہنچنے کی لکھی ہے۔ وہ دیوان چھپا کہاں؟ ورنہ ممکن تھا کہ نہ پہنچتا؟ تالیفاتِ کہنہ کا حضور میں آپ کے واسطے سے نہ پہنچنا معاذ اللہ اس وجہ سے نہ تھا کہ آپ نے رشک و حسد سے نہ گزاریں۔ افسوس کہ اتنی مدت تک یک جائی اور میری طبیعت کی صفائی دیکھ کر بھی آپ کو بد گمانیاں باقی ہیں۔ میاں بوڑھے ہو گئے ہو، یہ شیوہ چھوڑ دو کہ زبردستی رکاوٹ کے لیے ایک بات قرار دی ہے"(۴۳)۔

اسی خط میں مزید رقم طراز ہیں۔

"میں ابتداء سے تمھارا دوست اور خیر خواہ ہوں میری طرف سے گمان فاسد نہ کیا کرو"(۴۴)۔

امیر اور داغ کے بعض خطوط میں کہیں کہیں اس طرح کے خیالات اور طنزیہ جملے ملتے ہیں ہماری رائے میں یہ دونوں صاحبان آپس میں پر خلوص رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ بشری کمزوری کے سبب کبھی کبھی آپس میں رنجشیں ہو جاتی ہوں لیکن اس کا سبب آپس میں بغض یا حسد کا جذبہ ہرگز نہیں تھا بلکہ لڑنے والے دونوں کے تلامذہ اور دبستان دہلی و لکھنو کا اختلاف رکھنے والے لوگ تھے۔ امیر کے شاگرد ممتاز علی آہ امیر مینائی کی سوانح میں لکھتے ہیں:

ایک بار رام پور کے مشاعرے میں طرح تھی: ع

تھوڑی سی راہ قرب الٰہی میں رہ گئی

اس زمین کی غزل میں حضرت کا ایک شعر تھا۔

ابلیس ادھر تھکا تو مرا دل ادھر تھکا
دو ہاتھ چل کے رہزن و راہی میں رہ گئی

امیر کے شاگردوں تک یہ بات پہنچی کہ جناب داغ کو اس پر اعتراض ہے وہ کہتے ہیں "رہ گئے" (یائے مجہول) چاہئے۔ یہاں اس کا جواب لکھا گیا اس کے ساتھ ہی جناب داغ کی اسی زمین کی غزل کے بعض شعروں پر اعتراض لکھے گئے۔ یہ مضمون مطبع میں پتھر پر پہنچ چکا تھا اتفاق سے حضرتؒ، سرکار سے

واپس آتے ہوئے اسی وقت مطبع میں پہنچ گئے، پوچھا آج کیا ہے جو تم سب لوگ یہاں جمع ہو؟ جب یہ کارگزاری معلوم ہوئی تو بہت ناخوش ہوئے اور اسی وقت پتھر دھلوا ڈالا" (۴۵)۔

یہ تو تھی تلامذہ امیر کی کارستانیاں اور امیر کارویہ علامہ کیفی دتاتریہ داغ کے شاگردوں میں احسن مارہروی کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں :

"میرا قیاس ہے کہ ادبی دنیا میں جو حسد اور مخالفت مرزا صاحب سے تھی وہ احسن جیسے پر جوش شاگردوں کے مبالغہ آمیز دعوؤں کی وجہ سے ہو گی" (۴۶)۔

تمکین کاظمی، داغ کے چاہنے والوں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ علامہ کیفی کے بیان پر حاشیہ لگاتے ہوئے رقم طراز ہیں :

"علامہ کا قیاس بھی بالکل صحیح ہے۔ داغؔ نہایت مرنجاں مرنج اور سلجھے ہوئے مزاج کے آدمی تھے۔ احسن وغیرہ جیسے پر جوش شاگردوں نے ان کو کانٹوں میں گھسیٹا ورنہ وہ ان ہنگاموں سے بہت دور رہتے تھے" (۴۷)۔

ہمارا خیال ہے کہ دیوان سے متعلق غلط اطلاع بھی داغ کے کسی شاگرد نے انھیں دی تھی جس پر وہ آگ بگولہ ہو گئے اور انھوں نے ایک تند و تیز خط لکھ مارا۔ اسی طرح امیر کے شاگرد بھی امیر کو اکساتے ہوں گے۔ لیکن امیر، داغ کی بہ نسبت سلجھے ہوئے انسان تھے۔ اور دیکھ بھال کر فیصلہ کرتے تھے اسی لیے کوئی معرکہ نہیں ہوا۔

تمکین کاظمی، احسن مارہروی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"یہ ابتداً حیدر آباد آئے تو داغ کو "فصیح اللغات" کی اشاعت کے لیے ابھارا۔ انھوں نے داغ کو باور کرایا کہ 'امیر اللغات' صرف لکھنو کے محاورات و متفرقات اور لکھنوی زبان کی حد تک محدود ہے اس میں دہلی اور دوسرے علاقوں کے محاورات نہیں ہیں اس لیے آپ ایک لغات دہلی کی زبان کے محاورات اور متروکات کے لیے ترتیب دیں تو زبان کی بڑی خدمت ہو گی اس میں التزام رکھا جائے کہ سند میں جتنے شعر بھی ہوں وہ آپ ہی کے ہوں ۰۰۰ داغ تصنیف و تالیف کے میدان کے مرد نہ تھے ۰۰۰ داغ کے حاضر باش شاگردوں مثلاً حسن علی خاں امیر حیدر آبادی، عزیز یار جنگ عزیز حیدر آبادی وغیرہ کو ہموار کے داغ کو بار بار مجبور کرنا شروع کیا" (۴۸)۔

بقول علامہ کیفی دتاتریہ "داغ نے اس تجویز کو پسند کیا۔ یہی نہیں اس پر عمل ہونے لگا" (۴۹)۔

داغ جب دکن میں تھے تو وہاں لکھنو کے جو اہل علم قیام پذیر تھے وہ داغ کو دہلوی ہونے کی وجہ سے تنگ کیا کرتے تھے داغ امیر کو ایک خط میں نہایت ترش انداز میں رقم طراز ہیں :

"جو ذریات لکھنو کی یہاں جمع ہیں مجھ پر چھری تیز کیے ہوئے ہیں یہیں پر کیا منحصر ہے تمام ہندوستان مخالف ہے۔ سنتا ہوں کہ آزاد لکھنوی اور 'شحنہ ہند'، میرٹھ اڈیٹر یا مالک مجھ پر یا میرے شاگردوں پر

ہاتھ صاف کر رہے ہیں، لوگ بغیر اطلاع جواب بھی دے رہے ہیں اعتراض بھی لغو اور جواب بھی پوچ ، یہ امور خلل انداز روزگار اور مانع اعتبار نہیں ہو سکتے، نہ ایسے حاسد فروغ پا سکتے ہیں، داغ کا سکہ جس کے دل پر بیٹھا وہ مٹ نہیں سکتا" (۵۰)۔

داغ کے ان بیانات کے باوجود امیر انھیں دعا دیتے ہیں ہوئے لکھتے ہیں :

"آفرین ہے آپ کے حسنِ طبیعت کو کہ باوصف تنہائی سے محاسن آپ کے کلام میں رہتے ہیں۔ بہت ہی کم معائب ہوتے ہیں۔ ۰۰۰ اور حق تعالی آپ کی عمر و اقبال میں ترقیات روز افزوں عطا فرمائے اور اس سرکار فیض آثار کو دیر گاہ قائم رکھے" (۵۱)۔

ایک اور موقع پر غالباً اسی نوعیت سے داغ دوچار ہوئے ہوں گے تو امیر نے انھیں اپنے مکتوب میں لکھا کہ :

"خداوند تعالی یوماً فیوماً آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن کو چمکائے ملک کو قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جس قدر ہے اس کو آپ کا دل خوبی جانتا ہوگا۔ آپ حاسدانِ کوتہ اندیش کا خیال نہ کریں۔ اربابِ کمال خصوصاً وہ جن سے زمانہ کچھ موافقت کرتا ہے۔ ہمیشہ محسود ہوا کرتے ہیں۔ محسود ہونا سرمایۂ فخر و ناز ہے۔ حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے۔ میرا جی یہی چاہتا ہے کہ آپ جس قدر اپنے کمال اور قدر کمال میں ترقی کریں اسی قدر انکسار و تواضع میں بھی ترقی کریں۔ اسی لیے کہ شجرِ میوہ دار کی شاخیں ہمیشہ جھکتی ہیں۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوے اوست (۵۲)"

حقیقت یہ ہے کہ امیر، داغ سے بے حد محبت کرتے تھے اور دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔ داغ جب رام پور میں تھے تو تعلقات کس نوعیت کے تھے اس کی بابت تو شاید ہم کچھ نہ کہہ سکیں لیکن ان مکتوبات کی روشنی میں تو یہی رائے بنتی ہے کہ وہ یہاں یگانوں کی طرح ملتے ہوں گے۔ امیر دوسروں کو تحریر کیے گئے خط میں بھی داغ کا نام نہایت خلوص اور محبت سے لیتے ہیں یہ چیز بلاشبہ ان کے صاف پاک باطن ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ مولوی مظہر الاسلام کو ۲/ فروری ۱۹۰۰ء کے خط میں لکھتے ہیں : "فصیح الملک داغ سا شاعر شیریں زباں وہاں موجود ہے ایسے ویسے کلام پر وہاں امید قبولیت نہیں" (۵۳)۔ اس کے بعد امیر ۷ امئی/ ۱۸۹۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ "تم تو ٹکسالی ہو تمھاری تو ماننا پڑے ہی گی" (۵۴)۔ سات سال بعد امیر پھر اسی دوستانہ اور پر تکلفانہ انداز میں لکھتے ہیں : "غزل ایسی کہا کیجیے گا کہ ہم غریبوں کو بھی کہنے کی گنجائش رہے" (۵۵)۔ ۷ ار مئی ۱۸۹۱ء کے خط میں امیر، داغ سے "امیر اللغات" پر تقریظ لکھنے کے لیے کہتے ہیں کہ :

"لغت کی پہلی جلد چھپی ہے۔ ۰۰۰ تقریظ جی لگا کر لکھنے کی ہمت کیجیے تو چھے روپے والی جلد مفت نذر کروں" (۵۶)۔

اب شوخی اور بے تکلفی کا یہ انداز دشمنی یا حسد رکھنے والوں کا تو نہیں ہو سکتا۔ امیر کے اس خط کا داغ نے نہایت دل چسپ جواب دیا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ امیر نے تقریظ کے لیے تو کہہ دیا لیکن امیر اللغات پوسٹ نہیں کی۔ داغ کا جواب ملاحظہ کیجیے :

"امیر اللغات کا کہیں پتا نہ لگا ۰۰۰ اسی شہر میں چند نسخے آتے تو چرچا ہوتا ۰۰۰ میرے پاس روپیہ نہ تھا آپ کو خدا نے توفیق نہ دی برابر ہوئے۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی نسخہ دیکھنے کو آہی جائے گا مگر اب میرے نام نہ بھیجنا ورنہ واپس کردوں گا" (۵۷)۔

امیر ۲۱ ر ستمبر ۱۸۹۱ء کے خط میں داغ کو لکھتے ہیں :

"جب آپ کو صحت ہو جائے تو "امیر اللغات" کو غور سے ضرور ملاحظہ کیجیے گا۔ اور اس کے عیوب سے مجھے مطلع فرمایے گا میں بہت ممنون ہوں گا" (۵۸)۔

امیر اس خط میں بااصرار لکھتے ہیں :

"اپنی ایک مفصل رائے امیر اللغات کی بابت ظاہر کرو تو میں اس کو کئی اخبار میں چھپواؤں گا تاکہ ملک ملک کو تشویش کا باعث ہو مجمل رائے تو اپنی تم لکھ چکے جس کا جواب اور شکریہ بھی میں نے لکھا تھا اب مفصل رائے چاہتا ہوں آپ لکھیے اور ضرور لکھیے ۰۰۰ اور ہاں اگر آپ کو اکمل الاخبار (۵۹) کے پرچے کہیں سے مل سکیں تو ان کو بھی ضرور دیکھیے اور انصاف کیجیے میرے نزدیک تو سراسر نفسانیت اور حسد ہے" (۶۰)۔

امیر "اکمل الاخبار" میں شائع ہونے والے مضامین سے سخت پریشان تھے۔ اسی پریشانی میں انھوں نے داغ کو لکھا کہ : "آپ خدا کے لیے "امیر اللغات" کہیں دیکھ بھی ڈالیے کہ ریویو لکھنے کو آپ کا جی چاہے آخر یہ عذر کب تک" (۶۱)۔

امیر چاہتے تھے کہ اگر داغ ایک اچھا تبصرہ لکھ دیں گے تو بے جا تنقیدوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن داغ کی طرف سے اس کام کی آمادگی نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ امیر اس پریشانی سے جھنجھلا جاتے ہیں۔

"امیر اللغات کو دیکھو اور ضرور دیکھو ریویو تمھیں لکھنا ضرور پڑے گا اور اگر نہ لکھو گے تو مجھے نہایت رنج ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کتاب بری ہو اور تم اس کو اچھا بتاؤ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا ظاہر کرو" (۶۲)۔

بالآخر امیر لجاجت سے کہتے ہیں : "دلی والا میں تم سا دوست کہاں سے لاؤں جس کو یہ تکلیف دوں" (۶۳)۔

ان ساری کوششوں کے باوجود ہمارے خیال میں داغ نے نہ تقریظ لکھی اور نہ ریویو لکھا۔ اس کی کیا وجہ ہے کچھ نہیں کہا جاسکتا بہت ممکن ہے داغ بشری کمزوری کے سبب امیر سے کوئی عداوت رکھتے ہوں لیکن اگر ایسا ہوتا تو اس کے بعد بھی امیر اور داغ کے تعلقات میں کوئی فرق نظر آتا۔ بقول تمکین کاظمی :

" امیر کو تو داغ نے بنارس بلوا کر کلکتے سے واپسی میں بنارس میں حضور نظام کے پاس باریاب کرایا۔ قصیدہ پیش کرایا اور پھر حیدر آباد دکن بلا کر ان کو مہمان رکھا اگر امیر یہاں آنے کے بعد انتقال نہ

کرتے، تو داغ انھیں دربار میں باریاب کرا کر تنخواہ کرا دیتے، مگر امیر تو مرنے کے لیے حیدر آباد آئے تھے۔ داغ نے ان کی مہمان داری اور تیمار داری جس محبت اور یگانگی سے کی سارا حیدر آباد جانتا ہے ••• محض امیر کی محبت میں داغ نے اختر مینائی اور حافظ جلیل حسن جلیل کو حیدر آباد ٹھہرالیا ہر قسم کی امداد و اعانت کی مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے دربار میں منسلک کرادیا۔ چناں چہ مہاراجہ بہادر نے داغ کے انتقال کے بعد جلیل کو پیش کر کے استاد السلطان بنادیا اور داغ کی تنخواہ میں سے جلیل کی تنخواہ مقرر ہوئی اور مہاراجہ ہی نے اختر مینائی کا تقرر فرمایا۔ اس طرح اختریار جنگ اور فصاحت جنگ داغ ہی کے طفیل میں بنے"(۶۴)۔

تمکین کاظمی کا یہ بیان حرف بہ حرف درست ہے۔ امیر کے شاگرد شاہ ممتاز علی آہ، داغ کی بڑائی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جنابِ داغ ••• امیر سے رسم خط و کتابت رکھتے تھے۔ حضرت کے نئے تصانیف جو سرکار (نظام دکن) میں نہ تھے۔ جناب داغ نے حسبِ ایما طلب کر کے پیش کیے اور حضرت امیر کو بھی لکھا کہ یہاں (دکن) میری اور آپ کی غزلیں ملائی جاتی ہیں اور کانٹے میں تولی جاتی ہیں"(۶۵)۔

امیر کی وفات پر داغ نے تین تاریخیں بھی کہیں۔ جو "یادگارِ امیر مینائی" سے نقل کی جاتی ہیں۔

" ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصر عالی پائے جنت میں امیر
۱۳۱۸ھ

آج اس غم کی یہ کہی تاریخ
اب ہوا دل پہ آہ داغ امیر
۱۳۱۸ھ

ملے گی تاریخ دل سے داغ کے
آہ لطفِ شاعری جاتا رہا "۔
۱۳۱۸ھ (۶۶)

الغرض یہ سارا قصہ امیر و داغ کی چشمکوں کا نہیں بلکہ دونوں کے تلامذہ کا ہے جس نے ہمارے تاریخ نویسوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ حامیانِ امیر و داغ کی معرکہ آرائیاں دونوں معزز و محترم شعراء کی وفات پر بھی ختم نہیں ہوئیں بلکہ ان میں کبھی شدت آئی اور کبھی ٹھہراؤ لیکن جاری رہی ہیں۔ ان میں امیر کے حامیوں کی کارکردگی کا بھرپور سراغ نہیں ملتا البتہ داغ کے عاشق بہت زیادہ بڑھے ہوئے نظر آتے

ہیں۔ انھی میں ایک تمکین کاظمی بھی ہیں۔ ان کی حالت ملاحظہ کیجیے کہ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی کتاب "صہبائے مینائی" پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر پر بے جا سنگین الزام لگاتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ امیر عالم، فاضل، مفتی، صوفی، فقیر، محقق زبان، انشا پرداز، نعت گو سب کچھ ہیں صرف شاعر نہیں تھے۔ اگر وہ شاعر ہوتے تو ان کا اپنا رنگ ہوتا عمر بھر شاعری کرنے کے بعد اتنے کورے نہ رہتے جیسے کہ رہ گئے" (۶۷)۔

داغ کے شاگرد کا بیان آپ نے ملاحظہ کیا اب داغ کا بیان (بصورتِ قطعۂ تاریخ) امیر کے ایک شاگرد کے لیے بھی ملاحظہ کیجیے جو اتنا پر خلوص اور محبت آمیز ہے کہ کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نعیم الحق آزاد شیخ پوری امیر کے شاگرد تھے۔ اور کبھی کبھی داغ سے بھی اصلاح لیا کرتے تھے۔ یہ بات داغ کے علم میں تھی۔ آزاد نے مثنوی "حسن و عشق" لکھی تھی جس کی تاریخ لکھنے کی فرمائش انھوں نے داغ سے کی۔ چناں چہ داغ نے نہایت خلوص سے تاریخ کہی اور "جانِ داغ و امیر" سے تاریخ نکالی۔

"رسید فیضِ سخن گستری سو آزاد
زروح ذوقِ سخن شیخ و مصحفی و امیر
چو گشت خواہش تاریخ طبع ' حسن و عشق '
بشوقِ داغ بگفتا کہ جانِ داغ و امیر" (۶۸)
۶ ۱ ۳ ۱ ھ

داغ کے اس قطعۂ تاریخ نے خلوص و محبت کی جو فضا پیدا کی اس کی بنیاد دونوں معاصرین کی حقیقی یگانگت ہے۔ اس کے بعد جب ہم تمکین کاظمی کی امیر سے متعلق رائے پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اور ان کا بیان دونوں ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔

امیر و داغ سے منسوب معرکہ آرائی میں تلامذہ امیر و داغ کے علاوہ دبستانی معرکہ آرائی کے شوقیوں نے بھی امیر اور داغ کو ایک دوسرے کا حریف بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کا کچھ پس منظر امیر اور داغ کے مکاتیب میں بھی ملتا ہے۔

اس صورتِ حال کے بعد ہمارے خیال میں اب تاریخ نویسوں کو چاہیے کہ ادبی معرکہ آرائی کی بات ہو تو اس کا عنوان تلامذہ داغ و امیر کی معرکہ آرائی ہونا چاہیے اس لیے کہ امیر مینائی اور داغ دہلوی کے مکتوبات اس بات کے گواہ ہیں کہ دونوں معاصر آپس میں پر خلوص رشتے سے بندھے نظر آتے ہیں دونوں میں ایثار، محبت، بھائی چارگی، بے تکلفی اور عاجزی وانکساری تھی۔ دونوں کے تعلقات نہایت اچھے تھے دونوں ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے اور ایک دوسرے پر احسان کرنے میں پہل کیا کرتے تھے۔ دبستانی معرکہ آرائیوں یا بشری کم زوریوں کے سبب سے ممکن ہے کبھی امیر اور کبھی داغ سے غلطیاں ہوئی ہوں یا شاگردوں کے کہنے میں آکر کوئی غلط فیصلہ ہوا ہو۔ لیکن ہمارے خیال میں ایسی سنگین غلطی کبھی بھی دونوں سے سرزد نہیں ہوئی جس پر آپسی تعلقات کشیدہ ہوئے ہوں۔ اردو کے ان اساتذہ کے لیے امتیاز علی خاں عرشی نے نہایت عمدہ بات کی ہے :

"امیر مینائی مرحوم لکھنوی اسکول کے خاصی تھے۔ اس لیے دربار خلد آشیاں میں ان دونوں میں

مسابقت کی سعی جاری رہتی تھی۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس کش مکش میں امیر مینائی مرحوم نے داغ کا رنگ اختیار کر کے اعتراف شکست کیا مگر واقعہ یہ ہے کہ دربار رام پور کے یہ تابندہ گوہر اپنی صحبتوں میں ایک دوسرے سے برابر استفادہ کرتے رہے ہیں"(۶۹)۔

(۲)

کلب علی خاں کے دورِ حکومت میں رام پور میں جو اہل علم جمع ہوئے ان میں اکثریت اہلِ لکھنؤ کی تھی۔ منیر، امیر، جلال، تسلیم، اور اسیر، ان میں بہت نمایاں تھے۔ جب کہ اہلِ دہلی میں صرف داغ نمایاں تھے۔ اس دور میں زبان وبیان کے مباحث سے متعلق متعدد رسالے لکھے گئے(۷۰) اسی زمانے میں متعدد قابلِ ذکر اردو لغات بھی تالیف ہوئے(۷۱)۔ ان سارے علمی کاموں میں پیش پیش اہلِ لکھنو ہی تھے۔ زبان وبیان، تذکیرو تانیث اور عروضی مسائل کے ضمن میں دہلی اور لکھنو کا اختلاف ایک طویل داستان ہے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں :

"سید انشا کی "دریائے لطافت" میں اس کی ابتدائی تفصیلات کے نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ امیر و جلال کے ابتدائی زمانے تک یہ اختلاف بہت سے مرحلے طے کر چکے تھے اور ان کے آخری زمانے تک معراج کمال پر پہنچ گئے تھے"(۷۲)۔

اس پس منظر کے بعد جب ہم "امیر اللغات" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ "امیر اللغات" کو خاص دبستانی پس منظر میں دیکھا جارہا ہے۔ امیر اور "امیر اللغات" پر سید احمد دہلوی مولف " ارمغان دہلی"، اور دہلی کے متعدد اساتذہ الزامات لگا رہے ہیں۔ امیر اور امیر اللغات کی مخالفت سید احمد دہلوی کی طرف سے اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی۔ جب "نمونہ امیر اللغات"(۱۸۸۶ء) کی اشاعت ہوئی تھی۔ ۱۸۹۱ء میں جب "امیر اللغات" شائع ہوئی تو اس پر متعدد الزامات لگائے گئے کہ :

۱۔ "امیر اللغات"، "ارمغان دہلی" کی نقل ہے۔

("ارمغانِ دہلی"، "فرہنگ آصفیہ" کا ابتدائی حصہ تھا جو ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا)۔

۲۔ "امیر اللغات"، "ہندوستانی لغت" کا چربہ ہے۔

("ہندوستانی لغت"، "فرہنگِ آصفیہ" کی پہلی جلد مطبوعہ ۱۸۸۷ء۔)

۳۔ "امیر اللغات" صرف لکھنو کے محاورات متروکات اور لکھنوی زبان کی حد تک محدود ہے۔ اس میں دہلی اور دوسرے علاقوں کے محاورات نہیں ہیں۔

۴۔ "امیر اللغات" فیلن صاحب کی ڈکشنری کا خاکہ ہے۔

"امیر اللغات" کے خلاف مضامین کا سلسلہ "اکمل الاخبار" دہلی میں ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اس کا سرسری ذکر ممتاز علی آہ نے امیر کی سوانح عمری "امیر مینائی" میں بھی کیا ہے(۷۳)۔ بقول ریاض خیر آبادی "اکمل الاخبار" میں سید جالبؔ دہلوی "امیر اللغات" کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے(۷۴)۔ امیر کے خلاف اہلِ دہلی کے تعصب کا اندازہ اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جو سید احمد دہلوی نے "فرہنگ آصفیہ" جلد اول کے دیباچے میں دیا ہے۔ یہ بیان امیر کی وفات کے بعد شائع ہونے والے "فرہنگ آصفیہ" کے تیسرے ایڈیشن کا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں

"فرہنگ آصفیہ" جلد اول میں یہ بیان شامل نہیں ہے۔

"نامی گرامی شاعروں، عربی فارسی کے ماہروں، فنِ لغت سے نا آشناؤں نے ارمغانِ دہلی کا چربہ اتار کر لغت تراشی پر کمر باندھی، آبِ ضو، طرفِ ضو وغیرہ اس قسم کے الفاظ درج لغات فرما کر بزعم خود فنِ لغت کو ترقی دینی چاہی مگر درحقیقت اپنی مسلم استادی پر حرف آنے کا ایک بین موقع دیا ہے"(۷۵)۔

اس موقع پر ہم امیر اللغات کا دفاع کرنے سے گریز کرتے ہیں کیوں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں اس پس منظر کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ صورتِ حال امیر کے مکاتیب میں کس طرح ملتی ہے۔ سید احمد دہلوی سے امیر کی مراسلت کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور نہ سید احمد دہلوی کے خلاف امیر یا ان کے کسی شاگرد کا کوئی مضمون ملتا ہے۔ ممتاز علی آہ، "امیر مینائی" میں لکھتے ہیں کہ :"حضرت نے کہا کہ میری نسبت یا میرے کلام پر جس کا جو دل چاہے لکھے جواب دینے کی ضرورت نہیں"(۷۶)۔

"نمونہ امیر اللغات" کی اشاعت کے بعد ہی سے امیر کی مخالفت کی جو سلسلہ شروع ہو گیا تھا تو میر نے یہ وطیرہ بنالیا تھا کہ کسی کو بھی جواب نہ دیا جائے البتہ جوبات درست ہو اسے قبول کر لیا جائے۔ ۱۹ر جولائی ۱۸۸۸ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں :

"اخباروں میں جو کچھ میری نسبت کبھی کبھی کسی مہربان کی مہربانی سے چھپتا ہے میں نہ خود کبھی اس کا جواب دیتا ہوں نہ کسی دوست کسی شاگرد کو اجازت دیتا ہوں۔ مشرب یہ ہے کہ اگر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہئے اور آئندہ احتراز کرنا چاہئے اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی ہے تو صبر کرنا چاہیے ردو قدح میں طول عمل ہوگا"(۷۷)۔

"امیر اللغات" کے خلاف مضامین کو امیر محض تعصب اور نفسانیت قرار دیتے ہیں۔ وہ داغ کو لکھتے ہیں۔

"تمھارے ریویو کے بغیر دلی والوں کے تعصب آمیز اعتراضات سے چھٹکارا دشوار ہے۔ مجھے نفسانیت تو ہے نہیں۔ معترض دلی کا ہو یا لکھنو کا یا کہیں کا۔ میں ایرادت واقعی کو قبول کرنے پر ضرور مستعد ہوں تم امیر اللغات کو دیکھ کر بااعتبار واقفیت و تحقیق زبان دہلی جو کچھ لکھو گے میں دوسرے حصۂ لغت کے آغاز میں ضرور ان کی اصلاح کروں گا مجھے ملک کو فائدہ پہنچانا ہے نہ اپنی استادی جتانا"(۷۸)۔

اسی خط میں "اکمل الاخبار" کی بابت نہایت بے زاری سے لکھتے ہیں کہ :"اکمل الاخبار کی حاسدانہ باتوں کا میرے پاس کیا جواب ہے میں تو اب اسے دیکھتا بھی نہیں"۔ "فرہنگ آصفیہ" کے بارے میں مہدی حسن خاں کو لکھتے ہیں :

"وہ لغت جو سید احمد دہلوی لکھ رہے ہیں اس میں نظائر و اسناد کا التزام نہیں ہے ایک ٹکڑا اس کا جس میں صرف الف ممدودہ کے الفاظ ایک سو چھپن صفحے میں ہیں معہ نظائر و امثلہ لکھا تھا اس کے بعد جملہ رسائل انھوں نے بغیر التزام سند لکھے ہیں جس کا نام پہلے ہندوستانی اردو لغات میں تھا اور ہر رسالے کے ورق لوح پر یہی چھپتا تھا تخمیناً ۵ ربرس ہوئے "فرہنگ آصفیہ" کہا ہے اور بعض اخبار سے معلوم ہوا ہے کہ چار ہزار روپے کی کتابیں

خرید فرمانے کا سرکار آصفیہ سے وعدہ ہوا تھا۔ یہ لغت جس کو میں ترتیب دے رہا ہوں چالیس برس میں وقتاً فوقتاً اس کا ذخیرہ ہوتا رہا اب کے برس سے اس کی تہذیب وترتیب ہو رہی ہے"(۷۹)۔

۲۶/ اپریل ۱۸۹۱ء کے خط میں مولانا شبلی نعمانی سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ الطاف حسین حالی کو ریویو لکھنے پر مجبور کریں۔

"مولوی الطاف حسین صاحب نے ریویو لکھنے سے عذر کیا کہ سچا لکھوں تو اگر آپ برا نا مانیں تو بھی آپ دوستوں کی مطاعن سے نجات نہیں اور اگر جھوٹا لکھوں تو ملک دھوکا دہی کی شکایت کرے سید احمد خان دہلوی کی کتاب پر ان کی خطیات سے چشم پوشی کر کے ریویو دیا تو ملک کے طعنے سننا پڑے یہاں تک کہ لوگوں نے کہا قصباتی آدمی زبان کا جج نہیں ہو سکتا فقط آپ مولوی صاحب کو رام کیجیے آپ ہی لوگوں کی رفتار قلم مجھ کو سر منزل مقصود پر پہنچا سکتی ہے"(۸۰)۔

امیر کی تمام تر کوششوں کے باوجود نہ داغ دہلوی نے ریویو لکھا نہ مولانا شبلی نے لکھا اور، نہ الطاف حسین حالی نے۔ البتہ سر سید احمد خان نے لکھا اور اس میں امیر اور "امیر اللغات" کا بہت حد تک فاعجبیا (۸۱)۔ اور اس کے باوجود امیر نے سید احمد دہلوی کے خلاف کوئی بات اپنے قلم سے نہ مضمون کی صورت میں لکھی اور نہ مکتوب میں کسی کو تحریر کی۔ یہ امیر کی برتری کی بات ہے کہ اذیت ناک الزامات کے بعد بھی انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ ۱۵/ جون ۱۸۹۲ء کے خط میں حکیم برہم کو لکھتے ہیں :

"اکمل الاخبار ایک دوست کے پاس سے اکثر یہاں آجاتا ہے میں کبھی دیکھتا نہیں ہوں اس لیے کہ مفت رنج ہوگا مگر آہ کی نظر اکثر پڑ جاتی ہے"(۸۲)۔

۲۷/ ستمبر ۱۸۹۲ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں :

"مجھے یہ نہیں معلوم ہے کہ کون کون سے اخبار اس زمانے میں امیر اللغات کی نسبت لڑتے جھگڑتے ہیں 'اکمل الاخبار' نے تھوڑے دنوں سے لکھنا چھوڑ دیا۔ آزاد، ریاض الاخبار، نجم الاخبار، سر مور، گزٹ اور وفادار اس دفتر میں بھی آتے ہیں۔ ان اخباروں میں مدت سے کوئی بحث اس قسم کی نہیں چھپی"(۸۳)۔

زاہد حسین زاہد کے نام اسی خط میں مزید رقم طراز ہیں :

"یہ الزام بے جا ہے اس کا دعوی کبھی نہیں کیا گیا کہ امیر اللغات میں کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے گا۔ کیوں کہ یہ محال ہے۔ بڑے بڑے فارسی اور عربی کے لغات موجود ہیں جن میں روز مرہ کے صدہا الفاظ نہیں ملتے 'صراح' وغیرہ پر دس ہزار لغات، صاحب قاموس نے بڑھائے۔ صاحب 'غیاث اللغات' نے کیا کچھ کوشش نہیں کی پھر بھی صدہا الفاظ نہیں ملتے۔ اردو میں اس وقت جتنے لغت لکھے گئے ہیں ان کا یہی حال ہے"(۸۴)۔

مذکورہ خط میں لگائے گئے الزام سے پہلے ہی امیر نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جو لغات چھپنے کے بعد چھوٹے ہوئے معلوم ہوں گے وہ سب

ایک جگہ جمع ہوتے جائیں گے اور ختم کتاب کے بعد ان کا ایک ضمیمہ لغت کے آخر میں لگادیا جائے گا جیسا کہ صاحبِ برہان قاطع نے کیا ہے۔

الغرض امیر مینائی کے دوسرے اہم معاصر سید احمد دہلوی سے امیر کے تعلقات یقیناً کشیدہ تھے۔ ہماری رائے میں تو قصور سید احمد دہلوی اور ان کے حامیوں کا تھا۔ انھوں نے امیر یا "امیر اللغات" پر جو بھی الزامات لگائے وہ محض دبستانی تعصب کی بناء پر تھے۔ اور بس۔ مکاتیب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس سارے جھگڑے میں امیر نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا یوں یہ معرکہ آرائی یک طرفہ رہی۔ البتہ ممتاز علی آہ کا ایک غیر مطبوعہ خط ملتا ہے۔ جو مدیر "اکمل الاخبار" کے نام ہے یہ خط امیر کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس لیے کہ وہ زاہد حسین زاہد کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "میں نہ خود اس کا جواب دیتا ہوں نہ کسی دوست، شاگرد کو اجازت دیتا ہوں" (۸۵)۔ امیر کے اس بیان کی روشنی میں ہماری رائے یہ ہے کہ یہ خط امیر سے چھپا کر لکھا گیا لیکن اسے "امیر اللغات" کے معرکے کی ایک دستاویز قرار دیا جاسکتا ہے اور اس سے دونوں طرف کے ارادے اور خیالات سامنے آتے ہیں اس لیے پیش کیا جاتا ہے۔

"بعالی خدمت مولوی محمد فخر الدین صاحب اڈیٹر اکمل الاخبار

دہلی

جنابِ من تسلیم و تکریم

میں نے ضمیمہ 'اکمل الاخبار' میں اپنے مراسلے کا جواب دیکھا اس لیے مجھے اس نیاز نامے کے ذریعے سے چند باتیں عرض کرنا ضرور ہوا۔

۱۔ میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ میں نے 'اکمل الاخبار' کی نسبت یہ فقرے لکھے ہیں' یہ اسی کا قول ہے، آستین چڑھائے ہوئے ہے، مہینوں لکھے گا، اور ہر پرچے میں کئی کئی صفحے سیاہ کرے گا، اور نہ کیوں لکھوں گا، الخ، اگر میں اڈیٹر "اکمل الاخبار" لکھتا تو میرے قلم سے صیغہ واحد کبھی نہ نکلتا اور اگر "اکمل الاخبار" کی نسبت یہ صیغہ واحد ناگوار عالی ہوا تو معاف فرمائیں، مگر میں تو برابر اخباروں میں، کتابوں میں، بول چال میں اخبار کی نسبت صیغہ واحد غائب ہی دیکھتا اور سنتا ہوں۔ یہ میں نے نہ کہیں دیکھا نہ سنا کہ اکمل الاخبار آستین چڑھائے (ہوئے) ہیں، 'اکمل الاخبار' مہینوں لکھیں گے، اکمل الاخبار کئی کئی صفحے سیاہ کریں گے۔

۲۔ میں نے تو مولف 'ارمغان' کا نام ہی نہیں لیا کہ وہ مضمون لکھتے ہیں اور آپ اپنی طرف سے چھاپتے ہیں۔ پھر آپ نے کیوں کر سمجھ لیا کہ مہربان قدیم سے وہی مراد ہیں۔ گستاخی معاف، جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔

۳۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ منشی امیر احمد کی طرف کن مہذب اور نا ملایم فقروں کو آپ محمول فرماتے ہیں۔ اور آپ تعجب ظاہر فرماتے ہیں۔ جناب آپ اتنی جلد بھول گئے! امیر کے قلم سے تو ان الفاظ کا اعادہ بہت دشوار ہے۔ ناظرین "اکمل الاخبار" دیکھ چکے ہیں اور آپ اپنا وہ پرچہ نکال کر خود پھر دیکھ لیجیے جس پرچے سے آپ نے "امیر اللغات" اور "سید اللغات" کا مقابلہ شروع کیا ہے۔ لیکن بندہ نواز آپ کے مکرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے گلہ بیکار تھا اور بیکار ہے اور بیکار ہو گا۔

۴۔ آپ کے نزدیک اگر ریویو اسی کا نام ہے جو آپ تحریر فرمارہے ہیں اور مہذب ملک یورپ میں اسی طرح لکھنے والے ہیں تو چشم ما روشن دلِ ماشاد آپ ضرور تحریر فرمائیں لیکن ہمارے خیال میں ملک سر سید، آزاد اور "اودھ پنچ" کے ریویو پر اعتبار کرے گا جنھوں نے "امیر

اللغات" کی اچھائی اور برائی دونوں باتوں پر نظر ڈالی ہے اور ہم بھی ایسے ہی منصف مزاج لوگوں کے رویو، دماغ کے خزانے میں لکھ کر اور حصے نکالیں گے۔ زیادہ نیاز

آپ کا خیر اندیش

۳۰؍ اگست ۱۹۹۱ء (بربنائے تسلسل)　　　　**محمد ممتاز علی**

(۳)

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب "جلال لکھنوی" (۸۶) میں لمبی چوڑی تمہید کے بعد یہ الزام لگایا ہے کہ "امیر مینائی کے ذہن میں لغات لکھنے کا خیال "سرمایہ اردو" (مولف جلال لکھنوی) کی طباعت نے پیدا کیا پھر دونوں کے احاطہء کمال پر نظر ڈالنے سے یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے کہ امیر مینائی نے اسی زبان احاطے میں ذرا وضاحت اور تفصیل سے کام کرنے کی کوشش کی ہے" (۸۷)۔ وہ مزید رقم طراز ہیں کہ "۱۸۸۴ء میں ایک عجیب و غریب شہادت ہمیں ملتی ہے" (۸۸)۔ اس کے بعد "امیر اللغات" کے مقدمے سے وہ اقتباس درج کیا ہے۔ جس میں امیر نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح ۱۸۸۴ء میں سر الفرڈ لائل نے نواب خلد آشیاں سے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد حسن قیاسات شروع کرتے ہیں :

> "سرمایہ زبان اردو ۱۳۰۴ھ میں چھپی سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ کوئی سال ہو سکتا ہے" (۸۹)۔
>
> "ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی دوران کی بات ہے کہ، جب 'سرمایہ زبان اردو' اس زمانے میں تصنیف ہو رہی ہوگی یا تصنیف ہو چکی ہوگی اور بہت بڑی حد تک 'سرمایہ زبان اردو' کی طباعت نے لوگوں کی توجہ عموماً اور امیر مینائی کی توجہ خصوصاً اس طرف مبذول کرائی ہوگی" (۹۰)۔

ڈاکٹر محمد حسن نے سب سے پہلے تو امیر کے اس بیان کو (جس میں کہا گیا ہے کہ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدرداں سر الفرڈ لائل صاحب بہادر لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اردو زبان کی ایک جامع لغت کی فرمائش کی) عجیب و غریب کہہ کر پیش کیا۔ جب کہ "امیر اللغات" کے پورے مقدمے میں کوئی بات عجیب و غریب نہیں۔ پھر موصوف کو یہ بھی نہیں معلوم کہ "سرمایہ زبان اردو" کس زمانے میں لکھی گئی اور کب طبع ہوئی۔ امیر کا یہ بیان تاریخ کا حصہ ہے اس کی تفصیل کے لیے حکیم نجم الغنی کی کتاب "اخبار الصنادید" (۹۱) کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جو رام پور کی ایک مستند تاریخ ہے۔ آپ نے یہ بھی ثابت کرنا چاہا کہ ایک سال ہجری کا برابر ہوتا ہے تین سال عیسوی کے بات یہیں ختم نہیں کرتے بلکہ پاورقی حواشی میں کاوش لکھنوی کے صاحب زادے کا بیان بھی تحریر کرتے ہیں کہ :

> "حضرت جلال، امیر مینائی سے اس بنا پر ناراض ہو گئے تھے کہ امیر نے ان کی اپنی تجویز کو ان سے لے کر خود جامۂ عمل پہنایا"۔

اس بیان سے تو یہ ثابت ہوا کہ تجویز امیر نے اڑائی اور جلال منہ تکتے رہ گئے اور پھر امیر نے لغت شائع کرالی۔ جب کہ حقیقت تو یہ ہے

کہ جلال کی لغت بھی طبع ہوئی اور امیر کی بھی، دونوں کی لغت کے خاکے میں بھی نمایاں فرق ہے۔ڈاکٹر ابو محمد سحر نے ڈاکٹر محمد حسن کے اس الزام کو اس بیان سے رد کیا ہے۔

"سرمایہ زبان اردو ۱۳۰۴ھ میں شائع ہوا جو ۲۸ر ستمبر ۱۸۸۶ء سے شروع ہو کر ۱۸ر ستمبر ۱۸۸۷ء کو ختم ہوتا ہے ۰۰۰ نمونہ امیر اللغات ۱۸۸۶ء ہی میں شائع ہو چکا تھا اور "امیر اللغات" کا پورا منصوبہ ان کے ساتھ منظر عام پر آگیا تھا۔ ۱۳۰۴ھ میں ۱۸۸۶ء کے کل تین مہینے آتے ہیں اگر یہ مان لیا جائے کہ جلال کا لغت ۱۸۸۶ء ہی میں شائع ہو گیا تھا تو بھی یہ ممکن نہیں کہ امیر نے لغت کی پوری اسکیم سرمایہ زبانِ اردو سے اڑائی اور تین ماہ کے اندر اسے مع نمونہ کے شائع بھی کر دیا" (۹۲)۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر کو الفاظ کی چھان بین کا شروع ہی سے شوق تھا اور "امیر اللغات" اسی کا نتیجہ تھا وہ محض شہرت حاصل کرنے یا اپنی استادی چمکانے کے لیے اس میدان میں نہیں کودے تھے۔ "امیر اللغات" کے مقدمے میں رقم طراز ہیں :

"اگرچہ لکھنو میں ہوش سنبھالتے ہی ترتیبِ لغت کا شوق بے چین کرنے لگا تھا۔ لیکن رام پور پہنچنے سے قبل اس کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں ملا" (۹۳)۔

ممتاز علی آہ نے "امیر مینائی" میں الفاظ کی تحقیق کی بابت تین واقعات درج کیے ہیں (۹۴)۔ حکیم ابو العلاء ناطق لکھنوی بھی اپنے مضمون میں اسی نوعیت کی معلومات فراہم کرتے ہیں کہ :

"امیر لکھنو تشریف لایا کرتے تو اپنے خاندان کی عورتوں سے ضرب المثلیں اور محاورے پوچھا کرتے تھے اور ان کے محلِ استعمال اور صحتِ استعمال کی بابت سوالات کیا کرتے تھے" (۹۵)۔

یہ واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ امیر، لغت نویسی کا شعور رکھتے تھے۔ اس بات کی شہادت ان کے مکاتیب سے بھی ملتی ہے۔ ۸ر دسمبر ۱۸۸۴ء کے خط میں میر مجاور کو لکھتے ہیں :

"بہت سی کتابیں مبسوط میری کم فرصتی سے غیر مہذب پڑی ہیں ۰۰۰ اور ایک کتاب بہار ہند، بہار عجم فارسی قطع پر اردو زبان کی تحقیق میں لکھی ہے۔ اس میں محاورات و اصطلاحات و امثال وغیرہ متعلق بہذا اللسان مع اسناد اساتذہ لکھنو و دہلی ہے وکئی سو جز ہیں" (۹۶)۔

۱۲ر اپریل ۱۸۸۵ء کے ایک خط میں مہدی حسن خاں شاداب رسول پوری کو رقم طراز ہیں :

"ایک لغت میں نے زمانہ غدر سے شروع کیا تھا مگر وہ میری کم فرصتی سے مہذب و مکمل نہ ہو سکا مسودہ غیر مہذب اس کا اب بھی موجود ہے۔ وہ ۰۰۰ اگر خدا اطمینان دے تو دو برس کی محنت میں وہ تکمیل پا سکتا ہے" (۹۷)۔

ان مکتوبات سے کئی نکات سامنے آتے ہیں مثلاً :

۱۔ امیر نے زبان و بیان یا الفاظ و محاورات یا لغت سے متعلق کئی کتابیں تحریر کی تھیں جو ان کی مصروفیت کے باعث مکمل نہیں ہو سکیں۔

۲۔ یہ دونوں خط "سرمایہ زبان اردو" کی اشاعت سے پہلے کے ہیں۔

۳۔ امیر نے زبان سے متعلق جو بھی کتابیں لکھیں وہ صرف لکھنو کے لیے نہیں تھیں بلکہ دہلی اور لکھنو دونوں سے متعلق تھی۔

۲۶؍ ستمبر ۱۸۹۱ء کے مکتوب میں زاہد حسین زاہد کو تحریر کرتے ہیں۔

"میرے پاس الف سے ی تک مسلسل معنی و مثل کے ساتھ لغت موجود ہے جس کا نام میں نے "بہار ہند" رکھا تھا مگر وہ فارسی عبارت "گلشنِ فیض" کی قطع کا ہے" (۹۸)۔

۱۴؍ جون ۱۸۹۳ء میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ "سرمہ بصیرت چھپی نہیں قلمی ہے" (۹۹)۔

الغرض جائزوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر فطری طور پر لغت نویسی کی طرف مائل تھے لیکن انھیں وہ وقت میسر نہ آسکا جس میں وہ لغات کی ترتیب و نظر ثانی کرتے اور طبع کراتے لیکن جب سرکاری سطح پر امیر سے اس کام کی فرمائش ہوئی تو وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ کیوں کہ یہ خود ان کے ذوق ور جحان کی چیز تھی۔ اس موقع پر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اس وقت رام پور میں امیر کے علاوہ داغ، جلال، تسلیم اور دیگر بھی موجود تھے۔ جلال کے دو لغات تو شائع بھی ہو چکے تھے۔ لیکن پھر امیر ہی سے یہ فرمائش کیوں کی گئی۔ اس کے علاوہ کہیں بھی پڑھنے میں نہیں آتا کہ "ارمغان اردو"، "فرہنگ آصفیہ" یا "سرمایہ زبان اردو" کی تالیف میں ہندی الفاظ کی تحقیق میں کسی ہندو عالم سے مدد لینے کا اہتمام کیا گیا ہو۔ جب کہ امیر نے نظام لغت نویسی میں اس کا بطور خاص اہتمام کیا۔ یہ نقالی ہرگز نہیں تھی۔ انھوں نے اردو کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سائنٹیفک لغات کی بنیاد رکھی جو تنہا انھی کی کاوش ہے۔ امیر پر نقالی کا الزام غلط فہمی کے باعث ہے۔ اور رہا کاوش لکھنوی کے صاحب زادے کا بیان جس کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر ان برادرانہ تعلقات کو کہاں چھپایا جائے گا جو امیر اور جلال کے درمیان تھے جس کی ایک جھلک ریاض خیر آبادی (شاگرد امیر مینائی) کے اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے جو انھوں نے جلال کی وفات پر کہا:

داغ کے بعد رہ گئے تھے جلال
نہ رہا کوئی بھی جلال کے بعد

ممتاز علی امیر مینائی میں لکھتے ہیں:

"جناب جلال مرحوم کو والد مبرور کی رحلت کے بعد برسوں دیکھا ہمیشہ ان کے لیے روتے اور ان کا ماتم کرتے دیکھا" (۱۰۰)۔

جلال لکھنوی کے نام امیر کا صرف ایک خط ملتا ہے۔ چناں چہ یہ خط دونوں کے تعلقات کی نوعیت جاننے کے لیے بہت اہم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس خط کے مطالعے سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں میں اگر دوستی نہ بھی سہی لیکن دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ جلال لکھنوی نے نواب عالم گیر کے توسط سے کچھ قصیدے ریاست بھوپال میں باریابی کے لیے بھیجے تھے۔ لیکن وہ سرکار بھوپال میں پیش نہیں ہوئے۔ چناں چہ جلال نے امیر سے مدد مانگی جس کے جواب میں امیر نے انھیں تفصیلی خط تحریر کیا: وہ ۸؍ دسمبر ۱۸۹۹ء کو جلال کے نام اپنے مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ: "میرے دل پر آپ کی پریشانی کا اثر ایسا پڑا کہ میں ہرگز تدبیر سے غافل نہ رہوں گا" (۱۰۱)۔ اسی خط میں مزید رقم طراز ہیں:

"میری کام یابی نواب عالم گیر محمد خاں کے ذریعے سے جو آپ نے سنی یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر نواب ممدوح میں کچھ بھی اس کی صلاحیت پاتا تو آپ کی حالت سے جیسا میرا دل دکھا ہے اس کا مقتضیٰ ضرور یہ تھا کہ ہر گز کوشش میں دریغ نہ کرتا واللہ علی ما نقول شہید" (۱۰۲)۔

امیر جلال لکھنوی کو سرکار بھوپال میں باریابی کی بابت یہ مشورے دیتے ہیں کہ :

"اس سرکار (بھوپال) میں جب تک کوئی اندرونی ذریعہ نہ ہو کارروائی کی امید نہیں اور اندرونی ذریعہ اس پر موقوف ہے کہ آدمی برسوں وہاں پڑا رہے اور گوناگوں کوششیں کرتا رہے" (۱۰۳)۔

جلال کی بابت زاہد حسین زاہد کے نام یکم اکتوبر ۱۸۹۹ء کے خط میں امیر لکھتے ہیں کہ :

"جلال سلمہم کی ملاقات کی کیفیت آپ نے مہمل اور مختصر الفاظ میں لکھی ذرا تفصیل و توضیح کی محتاج تھی۔ یہ ان کے حسن ہنر و کمال کی بات ہے کہ مجھ بے ہنر و بے کمال کی اس قدر تعریف فرمائی ورنہ میں اس کا سزا وار و مستحق اپنے آپ کو نہیں پاتا عالم ہمہ افسانہ ءما وارہ وما ہیچ" (۱۰۴)۔

امیر کی وفات پر جلال لکھنوی نے نہایت عمدہ قطعہ کہا، ملاحظہ کیجیے۔

کجا امیر کجا سر زمیں ملک دکن
کہاں قیام تھا مدفن کہاں ہوا ہے نصیب
جلال لکھدو یہ تاریخ ان کی رحلت کی
امیر ہوگئے صد وائے ایک مرد غریب

امیر کے ایک بیان معین الحق آزاد شیخ پوری سے پتا چلتا ہے کہ فنِ تاریخ گوئی کے ضمن میں امیر اور جلال کچھ اختلاف رکھتے تھے۔

"میں نے تو اب یہ مشرب اختیار کر لیا ہے کہ "آئی" اور "گئے" سب میں دہری "ے" خیال کیا جائے اور ۲۰ عدد لیے جائیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ "آئے میں" ۱۰ عدد اور "آئی" میں ۲۰ عدد شمار کیے جائیں مگر اب بعض وجوہ سے ہائے معروف اور یائے مجہول دونوں کے ۲۰ عدد قرار دیے گئے ہیں ۰۰۰ اور جلال نے آئی میں ۱۰ عدد نہیں لیے ہیں بلکہ ۲۰ عدد لیے ہیں۔ البتہ ہوئی میں "ی" نہیں لکھی ہے واؤ کو اضافت دی ہے۔ چناں چہ دیوان میں بھی بغیر "ی" کے چھپوایا ہے اور افادہ تاریخ میں بھی اس سے بحث کی ہے مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا" (۱۰۵)۔

اس کے علاوہ زاہد حسین زاہد کو ۱۰ ر فروری ۱۸۹۳ء کے خط میں چرنجی لال کی "مخزن المحاورات" کے ساتھ جلال کی "گلشن فیض" کے لیے لکھتے ہیں کہ "غیر محقق کو دھوکہ دینے میں بھی یہ کتابیں استاد ہیں" (۱۰۶)۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں علمی اختلافات ہیں اور غالباً امیر نے اس اختلاف کا اظہار کبھی سرِ عام نہیں کیا ہو گا۔

مجموعی طور پر امیر صلح جو اور حقیقت پسند انسان تھے۔ یہ بات ان کے مکاتیب میں بالکل عیاں ہیں۔ وہ اپنے معاصرین سے کبھی معرکہ

آراء نہیں ہوئے۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں۔

"تمام عمر زبان کو کسی کی ہجو سے آلودہ نہ کیا اور نہ کسی سے اپنی ہجو کرائی نہ برا کہا نہ برا سنا" (۱۰۷)۔

ایک اور موقع پر آہ رقم طراز ہیں کہ :

"صلح کل ان کا مشرب تھا کبھی کسی جھگڑے بکھیڑے بحث مباحثے میں پڑنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ عزیزوں شاگردوں کو بھی اس سے مانع رکھتے اور ناخوش ہوتے تھے" (۱۰۸)۔

ممتاز علی آہ کے اس بیان کی شہادت امیر کے ایک خط سے دے کر اب اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔ یہ خط عابد علی کوثر خیر آبادی کے نام ہے۔

"خانہ کعبہ کا ترجمہ کعبے کا گھر بالکل مستعمل نہیں اور نہایت برا معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ ترکیب اضافی نہیں ہے ترکیب توصیفی یا بدل مبدل منہ ہے پھر کعبے کا گھر کیوں کر درست ہو گا آپ کسی سے تو لڑیے نہیں اور سمجھئے کہ غلط ہے ہاں معتبرین کے کلام میں نکلے تو خیر اگر کوئی آپ سے پوچھتا ہے تو سمجھا دیجیے کہ میرا تو یہ خیال ہے پھر وہ تاویلات کرے تو چپ ہو رہیے" (۱۰۹)۔

حواشی

(۱) رام بابو سکسینہ، "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں : نواب مرزا خاں داغ ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲۴۶ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں، نواب ضیاء الدین خاں والی لوہارو کے بھائی تھے۔ داغ ذوق کے شاگرد تھے۔ ۰۰۰ ابتداء میں فارسی اور عربی کی تعلیم بھی کچھ حاصل کی ۰۰۰ داغ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے ان کی زبان میں فصاحت و سادگی اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانکپن ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر، جلال اور تسلیم وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے ۰۰۰ چار دیوان ان سے یادگار ہیں۔ "گلزارِ داغ"، "آفتابِ داغ"، "مہتابِ داغ"، "یادگارِ داغ"، (گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۴۶ تا ۳۴۹)۔

(۲) حامد حسن قادری، "داستانِ تاریخ اردو" میں رقم طراز ہیں : مولوی سید احمد دہلوی، ۸ر جنوری ۱۸۴۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ سید عبدالرحمٰن ہے ۰۰۰ ۱۸۶۸ء ۰۰۰ میں ان کو اپنی عظیم الشان لغت "فرہنگ آصفیہ" کی تالیف کا خیال پیدا ہوا اور اس کی تیاری شروع کی۔ مولوی صاحب نے بڑی کثرت سے کتابیں تصنیف کیں ۰۰۰ (جس کی تعداد ۲۲ر بنتی ہے) "فرہنگ آصفیہ" اس کا نام سب سے آخر میں لیا گیا ہے، لیکن اہتمام و عظمت میں سب پر مقدم ہے۔ مولوی صاحب اپنے نام سے زیادہ اس کتاب کے نام سے "مولف فرہنگ آصفیہ" مشہور ہیں۔ (طبع چہارم، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء۔ ص ۹۰۱ تا ۹۰۳)۔

(۳) حکیم ضامن علی جلال، حکیم اصغر علی کے صاحب زادے اور خاص لکھنو کے باشندے تھے۔ ۰۰۰ جب غدر ہوا تو حکیم صاحب رام پور چلے گئے۔ اور نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ ۰۰۰ آخری زمانہ لکھنو میں بہت پریشانی میں بسر ہوا ۰۰۰ ان کے چار دیوان (۱) "شاہد شوخ طبع" (۲) "کرشمہ گاہ سخن" معروف بہ زبان حال (۳) "مضمون ہائے دل کش" خیالات بے مثال (۴) "نظم

نگارِیں حسنِ مقال" شائع ہو چکے ہیں۔ نثر اور فن پر (۱) سرمایہء زبانِ اردو (۲) قواعد المنتخب (۳) مفید الشعراء (۴) دستور الفصحا، اور (۵) گلشنِ فیض موجود ہیں۔ جلال کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ ("داغ اور ان کے معاصرین" از پروفیسر نفیس سندیلوی، مضمون مشمولہ "نگار"، لکھنو، "داغ نمبر"، جنوری فروری ۱۹۵۳ء، ص ۵۴۔۵۵)

۴) "تاریخ ادب اردو": ص ۳۵۳۔

۵) ایضاً، ص ۳۴۴۔

۶) ابو سلمان الہندی: "امام الہند"، کراچی، مکتبہء اسلوب، ۱۹۶۲ء، ص ۱۷۰۔

۷) ڈاکٹر انور سدید: "اردو کی مختصر تاریخ"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء، ص ۳۲۸۔

۸) "نقوش خطوط نمبر"، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ص ۴۲۳۔

۹) غیر مطبوعہ خط مورخہ ۱۷ر مئی ۱۸۹۱ء۔

۱۰) خط مورخہ ۶ر ذی قعد ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء، ماہ نامہ "نگار"، کراچی، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۳۔

داغ کے اس خط پر تاریخ غلط ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں:

الف۔ جس خط کا یہ جواب ہے وہ خط ۱۷ر مئی ۱۸۹۱ء کا ہے۔ ظاہر ہے داغ ۱۸۹۱ء کے خط کا جواب ۱۹۰۰ء میں تو تحریر نہیں کریں گے۔ ب) جنرل اعظم الدین خاں کا انتقال ۳ر اپریل ۱۸۹۱ء کو ہوا امیر نے اس خط میں انھیں اطلاع دی ہے۔ ج) امیر نے داغ سے "امیر اللغات" پر تبصرہ لکھنے کی درخواست کی ہے۔ "امیر اللغات" مارچ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔

ہمارے خیال میں یہ خط ۶ر ذی قعد ۱۳۱۸ھ کے بجائے ۶ر ذی الحج ۱۳۱۰ھ کا ہے۔

۱۱) نعیم الحق آزاد شیخ پوری: "حیات الشعراء" میر پور خاص سندھ، بلدیہ میر پور خاص، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵۹۔

۱۲) ایضاً ۲۵۸۔

۱۳) خط مورخہ ۱۱ر محرم شریف، ۱۳۱۲ھ، ماہ نامہ نگار، کراچی، نومبر، ۱۹۵۰ء، ص ۴۰۔

۱۴) خط مورخہ ۸ ۱۳۰ھ۔ مشمولہ "زبان داغ" از سید رفیق مارہروی، نسیم بک ڈپو، لکھنو، سنہ ندارد، ص ۱۲۲۔

۱۵) "نگار" کراچی، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۔

۱۶) غیر مطبوعہ خط، ۲۱ر ستمبر ۱۸۹۱ء۔

۱۷) "نگار"، کراچی، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۳۔

۱۸) ایضاً، ص ۳۵۔

۱۹) غیر مطبوعہ خط ۱۴ر اکتوبر ۱۸۹۱ء۔

۲۰) مطبع عزیز حیدر آباد دکن، ۱۸۹۴ء۔

۲۱) نعیم الحق آزاد شیخ پوری، "حیات الشعراء" میں لکھتے ہیں: "یہ اشارہ اس تاریخ کی طرف ہے جو حضرت منشی صاحب نے "مہتاب

داغ" کے طبع میں فرمائی تھی۔اس کا مصرع آخر یہ ہے۔

شاعر نکالیں حوصلہ متاب داغ سے

تاریخ صرف متاب داغ میں ہے۔جس میں سے حوصلے کے عدد نکال کر تعمیہ خارجی کیا ہے اور ۱۳۰۹ھ نکالے ہیں۔(ص ۹۲)

۲۲) "نگار"، کراچی، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۵۔خط مورخہ ۱۶/ ذی الحج ۱۳۰۹ھ۔

۲۳) حیات الشعراء، ص ۲۵۴۔خط مورخہ ۳۰/ جولائی ۱۸۹۲ء۔

۲۴) "نگار"، کراچی، نومبر، ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۔خط مورخہ ۶/ ذی الحج ۱۳۰۹ھ۔

۲۵) حیات الشعراء، ص ۲۵۵۔خط مورخہ ۳۰/ جولائی ۱۸۹۲ء۔

۲۶) نگار، کراچی نومبر، ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۔خط مورخہ ۶/ ذی الحج ۱۳۰۹ھ۔

۲۷) ایضاً، ص ۳۳۔خط مورخہ ۱۴/ شعبان ۱۳۱۶ھ۔

۲۸) ایضاً، ص ۳۶۔خط مورخہ ۷/ جولائی ۱۸۹۶ء روز یک شنبہ۔اس خط میں سنہ غلط شائع ہوا ہے۔"دفتر امیر اللغات" کے ریکارڈ کے مطابق ۱۸۹۴ء ہے۔

۲۹) ایضاً، ص ۳۹۔خط مورخہ ۱۱/ محرم ۱۳۱۲ھ۔

۳۰) "گل چیں" ابتداء میں لکھنو سے شائع ہوتا تھا پھر ۱۸۹۲ء میں وسیم خیر آبادی گور کھپور سے نکالنے لگے۔(دبستانِ امیر مینائی ص ۳۸۳)۔

۳۱) وسیم خیر آبادی امیر کے نامور شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔وسیم کا حلقۂ تلامذہ نہایت وسیع تھا انھوں نے "بزم وسیم" بھی قائم کی تھی۔۷/ مارچ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

۳۲) "نگار" نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۶، خط مورخہ ۷/ جولائی ۱۸۹۴ء۔

۳۳) ایضاً، ص ۳۹۔خط مورخہ ۱۱/ محرم ۱۳۱۲ھ۔

۳۴) ایضاً، ص ۴۰۔

۳۵) غیر مطبوعہ خط، مورخہ ۲۱/ ستمبر ۱۸۹۱ء۔

۳۶) "نگار"، کراچی، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۵۔خط مورخہ ۱۳۰۸ھ۔

۳۷) غیر مطبوعہ خط، مورخہ ۱۴/ اکتوبر ۱۸۹۱ء۔

۳۸) ریاض خیر آبادی نے گورکھپور سے "ریاض الاخبار" کا اجراء کیا تھا۔امیر نے روانی میں اخبار گورکھپور تحریر کر دیا ہے۔

) امیر کے نامور شاگرد، مدیر "ریاض الاخبار"، روزنامہ "تار برقی"، "گل کدۂ ریاض"، "ریاض الاخبار" گورکھپور۔ہفتہ روزہ "صلح کل"، ہفتہ وار "عطر فتنہ"۔

۴۰) "نقوش" مکاتیب نمبر نومبر ۱۹۵۷ء ص ۱۲۵۔خط مورخہ ۳۱/ مارچ ۱۸۹۱ء۔

۴۱) ایضاًص ۱۲۶۔

۴۲) "نگار"، کراچی، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۶۔ خط مورخہ ۱۳۰۸ھ۔

۴۳) نقوش مکاتیب نمبر، ص ۱۲۵۔

۴۴) ایضاً، ص ۱۲۶۔

۴۵) ممتاز علی آہ: "امیر مینائی" (سوانح)، لکھنو، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء، ص ۱۹۔

۴۶) "داغ خطوط کی روشنی میں"، مضمون مشمولہ "نقوش" ادبی معرکہ نمبر حصہ دوم، ستمبر ۱۹۸۱ء ص ۲۰۸۔

۴۷) ایضاً

۴۸) ایضاً، ص ۲۱۰۔

۴۹) ایضاً، ص ۲۰۹۔

۵۰) "نگار"، کراچی نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۹۔ خط مورخہ ۱۱؍ محرم ۱۳۱۲ھ۔

۵۱) ایضاً، ص ۳۷، خط مورخہ ۷؍ جولائی ۱۸۹۴ء۔

۵۲) "حیات الشعراء"، ص ۲۵۴۔

۵۳) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۳۶۰۔

۵۴) غیر مطبوعہ خط، مورخہ ۱۷؍ مئی ۱۸۹۱ء۔

۵۵) حیات الشعراء، ص ۲۶۱۔ خط مورخہ ۲۱؍ نومبر ۱۸۹۸ء۔

۵۶) غیر مطبوعہ خط، ۱۷؍ مئی ۱۸۹۱ء۔

۵۷) "نگار"، کراچی، نومبر، ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۔ خط مورخہ ۶؍ ذی قعد ۱۳۱۸ھ۔

۵۸) غیر مطبوعہ خط، ۲۱ ستمبر ۱۸۹۱ء۔

۵۹) "ہنگامۂ دل آشوب" کے مرتب سید قدرت نقوی حواشی میں لکھتے ہیں: اکمل الاخبار دہلی کا ہفتہ وار اخبار تھا خطوط غالب میں اس کا جابجا ذکر ہے۔ غالباً جنوری ۱۸۶۶ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ (انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۸) غالب، بہاری لال مشتاق کو ایک خط میں "اکمل المطابع" کے متعلق لکھتے ہیں: یہاں سچ تو یوں ہے کہ اکمل المطابع، اجمل المطابع بھی ہے حکیم غلام نبی خاں منجملہ خوباں روزگار ہیں نکو خوئے اور نکو کردار ہیں۔ میر فخر الدین آزاد منش اور سعادت مند نوجوان ہیں۔ کم گفتار اور مرنجان مرنج ہیں۔ (غالب کے خطوط" مرتب خلیق انجم، جلد سوم، کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۹۰ء ص ۱۰۳۸) سید قدرت نقوی کے بقول "مطبع غلام رضا خاں کا تھا مہتمم میر فخر الدین تھے۔ غالب کی کئی کتابیں یہاں چھپی تھیں۔ (ہنگامہ دل آشوب ص ۱۷۸)

۶۰) غیر مطبوعہ، خط مورخہ ۲۱؍ ستمبر ۱۸۹۱ء۔

۶۱) غیر مطبوعہ، خط مورخہ ۱۴؍ اکتوبر ۱۸۹۱ء۔

۶۲) ایضاً

۶۳) ایضاً

۶۴) نقوش، ادبی معرکہ نمبر، حصہ دوم، ص ۲۱۱۔

۶۵) امیر مینائی، ص ۵۲۔

۶۶) شمس الحق سجاد علی شاہ، "یادگار امیر مینائی"، دہلی، مطبع رحمانی، ۱۹۰۳ء، ص ۱۸۔

۶۷) ماہ نامہ "قومی زبان"، کراچی، ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۔

۶۸) حیات الشعراء، ص ۳۰۴۔

۶۹) "مکاتیبِ غالب"، بمبئی، مطبعہ قیمہ، ۱۹۳۷ء، ص ۱۷۔

۷۰) "تلخیص معلّٰی" مولف کلب علی خاں نادر، "رشحاتِ صفیر" مولف صفیر بلگرامی، "مفید الشعراء" اور "قواعد المنتخب" مولف جلال لکھنوی، "اصلاح" اور الواحۃ الاغلاط" مولف شوق نیموی اور "دستور الفصحا" مولف کمال۔

۷۱) "نفس اللغۃ" مولف میر علی اوسط رشک، "فرہنگ آصفیہ" مولف مولوی سید احمد دہلوی، "امیر اللغات" مولف امیر مینائی "گلشنِ فیض" اور "سرمایہ اردو، مولف جلال لکھنوی، "بہار ہند" مولف مرزا محمد بیگ عاشق لکھنوی، "مخزن المحاورات" مولف چرنجی لال، "مخزن الفوائد" مولف نیاز بیگ۔

۷۲) صحیفہ، اکتوبر، ۱۹۶۴ء ص ۱۱۔

۷۳) امیر مینائی، ص ۱۹۔

۷۴) حوالہ "مطالعہ امیر" ص ۴۴۳۔

۷۵) فرہنگ آصفیہ المعروف لغات اردو، طبع اول، دہلی، دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۹۱۸ء، ص ۱۱۔

۷۶) امیر مینائی، ص ۱۹۔

۷۷) مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۵۷۔

۷۸) غیر مطبوعہ خط، مورخہ ۱۴/ اکتوبر ۱۸۹۱ء۔

۷۹) غیر مطبوعہ خط، مورخہ ۲۱/ ستمبر ۱۸۹۱ء۔

۸۰) غیر مطبوعہ خط، مورخہ ۴/ فروری ۱۸۹۱ء۔

(۸۱) سر سید احمد خاں کا یہ تبصرہ بعد ازاں امیر اللغات جلد اول اور جلد دوم کے درمیان شامل کر دیا گیا۔ ملاحظہ کیجیے "امیر اللغات، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔

۸۲) مکاتیب امیر مینائی: صفحہ ۱۱۰۔

۸۳) ایضاً، ص ۱۷۶۔

(۸۴) ایضاً، ص ۱۷۷۔

(۸۵) ایضاً، ص ۱۵۷۔

(۸۶) مطبوعہ، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۶ء۔

(۸۷) ایضاً، ص ۱۳۹۔

(۸۸) ایضاً، ص ۱۳۸۔

(۸۹) ایضاً، ص ۱۳۹۔

(۹۰) ایضاً، ص ۱۳۸۔

(۹۱) لکھنو، مطبع نول کشور، ۱۹۱۸ء۔

(۹۲) "معرکہ امیر اللغات" مضمون مشمولہ سہ ماہی الزبیر، ادبی معرکہ نمبر، ۱۹۷۴ء ص ۳۳۷۔

(۹۳) "امیر اللغات"، ص ۳۔

(۹۴) "امیر مینائی" ص ۵۲۔

(۹۵) رسالہ "نیرنگ"، "امیر نمبر"، فروری مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۶۱۔

(۹۶) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۵۱۔

(۹۷) "صہبائے مینائی"، ص ۲۶۷۔

(۹۸) "صہبائے مینائی"، ص ۲۶۷۔

(۹۹) مکاتیب امیر مینائی، ص ۱۶۹۔

(۱۰۰) "امیر مینائی"، ص ۳۰۔

(۱۰۱) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۳۵۸۔

(۱۰۲) ایضاً،

(۱۰۳) ایضاً، ص ۲۳۷۔

(۱۰۴) ایضاً، ص ۲۹۷۔

(۱۰۵) ایضاً، ص ۴۲۴۔

(۱۰۶) ایضاً، ص ۱۳۴۔

(۱۰۷) "امیر مینائی"، ص ۱۵۔

(۱۰۸) ایضاً، ص ۱۸۔

(۱۰۹) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۸۱۔

باب ششم

تلامذہ امیر

(مکتوبات کے حوالے سے)

امیر مینائی کے حوالے سے ایک روایت مشہور ہے کہ متاخرین کے زمانے میں دنیائے شاعری کا آدھا حصہ، امیر مینائی کے قبضے میں آگیا تھا۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو، لیکن اس سے ملتے جلتے بیانات، امیر کی تقریباً تمام سوانح عمریوں میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ امیر کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں اور دیگر ادبی تاریخوں میں ان کے تلامذہ کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔ کہیں کہیں شاگردوں کی فہرست بھی پیش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے امیر کی شخصیت اور ان کی علمیت کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا اور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا، جب تک شاگردوں سے متعلق خطوط کو زیرِ بحث نہ لایا جائے۔ اور نہ ہم ان عوامل کو جان سکتے ہیں، جس کی وجہ سے امیر کا مسلکِ شاعری "قابل پیروی قرار پایا۔ اسی لیے ہمارے ذہنوں میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ، تربیت کا وہ کون سا راز تھا، جس کی بدولت امیر کے تلامذہ ایک عرصے تک اردو شاعری پر چھائے رہے۔ یا امیر کی شخصیت کا وہ کون سا پہلو ہے کہ جس کے سحر میں ہزاروں طالب علم گرفتار رہے۔ ان تمام سوالات کے جوابات ہمیں آسانی سے امیر کے خطوط میں ملتے ہیں۔ بلا شبہ اگر مکتوباتِ امیر منظر عام پر نہیں آتے، تو امیر مینائی کے استادانہ مرتبے اور تلامذہ کی بابت بہت سے گوشے تشنہ رہ جاتے۔ اس لیے کہ امیر کے اعلیٰ مرتبے اور شاگردوں کی تربیت سے متعلق بہ کثرت معلومات، ہمیں امیر کے خطوط میں ملتی ہیں۔ چناں چہ اس باب میں امیر کے سلسلۂ طریقہ اصلاح اور تلامذہ کے حوالے سے مکتوباتِ امیر کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس سے یقیناً اردو ادب میں امیر کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آئے گا اور ہم اس تحریک یا مکتبۂ فکر یا نظامِ فکر سے بھی آگاہ ہوں گے جس کے بانی امیر مینائی ہیں۔ جس نے متاخرین کے دور میں اردو شاعری کو فنی اور فکری اعتبار سے نئے معنی و مفہوم دیے۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد لکھتے ہیں کہ :۔

> "امیر نے اپنی شخصیت سے ایک اسکول یا تحریک کی بناڈالی۔ ان کی وفات کے بعد بھی کوئی تیس برس تک یہ تحریک ترقی کرتی رہی۔ اگر پچھلی دو جنگیں اسے صدمہ نہ پہنچاتیں تو شاید بہت دنوں تک یہ تحریک چلتی رہتی لیکن نئے معاشرتی تقاضوں اور یورپی اصولِ شعر کے سامنے اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا"۔(۱)

بلا شبہ نقشِ اوّل سے نقش ثانی بہتر ہوتا ہے۔ امیر کا رنگ پھیکا ضرور پڑ گیا۔ لیکن ختم نہیں ہوا۔ وہ نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر، ابھرا اس لیے کہ شاعری اور زبان سے متعلق جو اصول و قواعد انھوں نے بنائے اور برتے وہ اردو شاعری کی روایت بن گئے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی پیروی سے شاعری کا ایک معیار تو قائم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اچھی مثال، ڈاکٹر ابو محمد سحر نے پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "وسیم خیر آبادی کے توسط سے ان (امیر) کا خاندانِ تلمذ فراق گورکھپوری تک پہنچتا ہے۔ جو دورِ حاضر کے اہم ترین غزل گویوں میں سے ہیں" (۲)۔

اس کے علاوہ جلیل کے توسط سے کسری منہاس اور دل شاہ جہاں پوری کے توسط سے شبنم رومانی تک پہنچتا ہے جو موجودہ دور میں

نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ امیر کے تلامذہ میں متعدد صاحبِ سلسلہ استاد ہوئے ہیں۔ کسری منہاس اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"بلاخوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ معاصرینِ امیر مینائی میں سے کوئی ایسا نہیں گزرا ہے، جس کے شاگردوں کو شاگردانِ امیر کے مقابلے میں رکھا جاسکے"۔ (۳)

سید محمد عبدالحکیم حکمت لکھتے ہیں کہ :

"جیسے باستعداد و باوقار تلامذہ حضرت کو دستیاب ہوئے۔ ویسے ان کے ہم عصروں کو ہرگز میسر نہیں ہوسکے"۔ (۴)

کسری منہاس، حکمت کے علاوہ احسن اللہ ثاقب نے بھی خطوط "منشی امیر احمد" کے مقدمے میں اسی بات اظہارِ خیال کیا ہے۔ (۵) حقیقت یہ ہے کہ امیر نے اپنے شاگردوں پر خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے تربیت کا ایسا نمونہ پیش کیا جو عموماً مدرسوں یا خانقاہوں میں رائج ہوتا ہے۔ جس میں ہر شاگرد پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اور جب تک شاگرد پہلا سبق یاد نہ کرلے نہیں دیا جاتا۔ یہاں نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم پر توجہ بھی تربیت کا حصہ ہوتی ہے۔ اور وہ علم جو سینہ بہ سینہ منتقل کیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاگرد علم اور عمل دونوں میں کامل ہوجاتا ہے اور عملی زندگی میں اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ امیر نے بھی بعینہٖ یہی انداز اپنایا۔ اس کی وجہ سے ان کے شاگرد فرماں بردار بھی تھے اور بہ صلاحیت بھی۔ انھی خوبیوں کے باعث امیر کے متعدد شاگرد صاحبِ سلسلہ بھی ہوئے۔ ان میں سے بعض کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جو رتبہ امیر کے تلامذہ کو نصیب ہوا وہ ان کے معاصرین میں سے کسی کے شاگردوں کو حاصل نہیں ہوسکا۔ یہاں تک کہ داغ کی وفات کے بعد ان کی جگہ امیر کے جانشین جلیل مانک پوری استاد السلطان ہوئے۔

اب اگلے صفحات میں امیر کے شاگردوں کی تعداد کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہے۔

(۲)

امیر کے شاگردوں کی تعداد کے بارے میں کوئی واضح صورتِ حال نہیں ملتی۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ "تلامذہ امیر کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ سب کو احاطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے"۔ (۶) ایک موقعے پر نعیم الحق آزاد شیخ پوری نے، امیر سے ان کے شاگردوں کی تعداد کے بارے میں دریافت کیا تھا، تو امیر نے ۲۴/ جنوری ۱۸۹۲ء کے خط میں انھیں لکھا کہ :

"آپ میرے تلامذہ کی تعداد کیا دریافت فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی اسماضبط نہیں کیے۔ ایک زمانے میں میرے فرزند اکبر محمد احمد قمر نے کچھ نام لکھے تھے۔ یاد پڑتا ہے سو سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد سیکڑوں اور ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں اور زندگی باقی ہے تو ہوتے جائیں گے۔ ان سب کی فہرست تیار ہونا محال ہے۔ پہلے سے التزام کیا جاتا تو البتہ ممکن تھا"۔ (۷)

ڈاکٹر ابو محمد سحر، "پیامِ یار"، لکھنؤ، اگست ۱۸۹۰ء میں، جلیل مانک پوری کی جانب سے شائع ہونے والے ایک اشتہار کی بنیاد پر رقم طراز ہیں کہ :

"جلیل مانک پوری نے امیر کے تلامذہ کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اور اپنے برادرانِ خواجہ تاش سے مختصر حال اور کلام بھیجنے کے لیے التماس کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کام آگے نہیں بڑھ سکا"۔ (۸)

۱۹۳۰ء میں رسالہ "نیرنگ"، دہلی کے "امیر نمبر" میں تلامذہ امیر کی ایک فہرست شائع ہوئی جس میں صرف انتیس [۲۹] کا ذکر ہے۔ اسی فہرست کو ۱۹۴۱ء میں شاہ ممتاز علی آہ نے اضافے کے ساتھ اپنی کتاب "امیر مینائی" (۹) میں شائع کیا ہے جس میں تلامذہ کی تعداد پنتالیس [۴۵] ہے۔ یہ فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ابر، منشی واحد علی قدوائی۔ برہم، حکیم محمد عبدالکریم خاں فتح پوری۔ بسمل، منشی عبدالرحمٰن۔ بسمل منشی واحد علی کاکوری۔ بسمل، منشی محمد حسین خیر آبادی۔ بے نظیر، بے نظیر شاہ وارثی۔ ثاقب، احسن اللہ خاں۔ جاہ، نواب سید بنیاد حسین۔ جگر، حکیم محمد افتخار علی بسوانی۔ جلیل، حافظ جلیل حسن مانک پوری۔ حسرت، مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی۔ حسن، منشی محمد حسین صاحب فیض آبادی۔ حفیظ، حافظ محمد علی جونپوری۔ خلیل، حافظ خلیل حسن صاحب مانپوری۔ خیال، دانش، مولوی محمد ریاض حسن خاں۔ [قاضی عبدالودود ("اصول تحقیق" جلد دوم، مقتدرہ قومی زبان اسلام، ۱۹۸۸ء ص ۳۹) لکھتے ہیں "دبدبہ امیری" جو پٹنہ میں لکھی گئی ہے۔ ریاض حسن خاں خیال کو جو اس کی اشاعت کے وقت زندہ اور مقیم پٹنہ تھے۔ مرحوم کہا اور شاگردِ امیر بتایا ہے۔ وہ خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں امیر نہیں داغ کا شاگرد ہوں"۔] دل، منشی ضمیر حسن خاں شاہجہاں پوری۔ راز، منشی امتیاز احمد خاں رام پوری۔ رضا، مولانا برکت اللہ فرنگی محلی۔ ریاض، سید ریاض احمد خیر آبادی۔ زاہد، سید زاہد حسین سہارن پوری۔ سحر، سراج میر خاں بھوپالی۔ سرشار، پنڈت رتن ناتھ۔ شاداب، مولوی مہدی حسن خاں۔ شرر، مولوی عبدالحلیم۔ شفق، سید حسن مرتضیٰ عماد پوری۔ شمیم، سید ولایت احمد خیر آبادی۔ شوق، منشی احمد علی قدوائی۔ صبا، مولوی محمد مظفر حسین امیٹھوی۔ صفا، مولوی عبدالواسع امیٹھوی۔ صفدر، نواب صفدر علی خاں رام پوری۔ عابد، سید عابد حسین سہسوانی۔ فدا، حافظ شاہ محمود علی امیٹھوی۔ فصیح، مولوی فصیح الزماں۔ قرار، سید تصدق حسین شاہجہاں پوری۔ قمر منشی قمر الدین سندیلوی۔ قمر، منشی بال کرشن لکھنوی۔ کوثر، حکیم عابد علی خیر آبادی۔ مذاق، نواب احمد حسین خاں پریانواں۔ ناظم، نواب یوسف علی خاں بہادر رام پوری۔ نایاب رسول پوری۔ نثار، منشی نثار حسین۔ نعیم، حکیم نعیم الزماں خاں۔ نواب، نواب کلب علی خاں۔ نیر مولوی نورالحسن کاکوروی، وسیم، سید محمد عسکری خیر آبادی۔

آہ نے شعراء کے نام اور تخلص کے علاوہ مختصر کوائف بھی درج کیے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے مقالے "مطالعہء امیر" (۱۰) میں امیر کے چار صاحب زادوں (محمد احمد صریر مینائی، لطیف احمد اختر مینائی، ممتاز احمد آرزو مینائی، مسعود احمد ضمیر مینائی) اور ممتاز علی آہ کے علاوہ اڑسٹھ [۶۸] تلامذہ کے نام پیش کیے ہیں۔ جو ممتاز علی آہ کے پیش کردہ تلامذہ کے علاوہ ہیں۔

آز، محمد احمد۔ آزاد، نعیم الحق شیخ پوری۔ آغا، عبدالاحد رام پوری۔ آہ، عبدالعزیز امیٹھوی۔ احمد، سہہ احمد علی۔ اخگر، ہادی یار خاں۔ اخلاص، عبدالشکور بھوپالی۔ اصغر، اصغر علی خاں رام پور۔ اصغر، محمد فیاض احمد جھنجھانوی۔ اعجاز، محمد عبدالحئی۔ انداز، نظام احمد۔ بخت، قیام الدین جونپوری۔ بشیر، بشیر ملیح آبادی۔ بسمل، افضال احمد۔ بیتاب، بشارت اللہ۔ مجال، خیالی رام پوری۔ جوہر، عبدالعزیز غازی پوری۔ جوہر، مرزا احمد شاہ بیگ۔ حسام، حسام الدین کاکوروی۔ حسرت، محمد علی خاں۔ حسن، شاہ محمد حسن صابری۔ حیدر، حیدر

علی خاں۔ فرد، محمد مرتضیٰ خاں۔ ذکا، منشی محمد رام پوری۔ ڈاکٹر، ڈاکٹر بھولا ناتھ۔ ساجد، ساجد علی۔ سرخوش، حلیم الزماں خاں۔ شاداں، جمیل احمد شیخ پوری۔ شریف، شریف الزماں۔ شوق، لکھن لال بریلوی۔ ضابط، احمد علی خاں۔ ضو، نعیم الحق شیخ پوری۔ عاشق، عاشق الزماں خاں۔ عاصی، گوہر علی خاں۔ عاقل، عطاءاللہ گورکھپوری۔ عتیق، دوست محمد خاں حسن پوری۔ عجیب، لالہ دامودر سین عرف ڈوری لال۔ غریب، الٰہی بخش مرجان رقم۔ فدا، شاہزادہ مرزا ولی الدین۔ خدا، عبدالحکیم فریدی مانکپوری۔ فصیح، عبدالرحیم خاں۔ فضا، محمد عالی خاں۔ فیض، محمد ابوالفیض مجددی عرف ممن۔ قمر، مان سنگھ دیوبندی۔ کیف، محمد عالم گیر خاں ٹونکی۔ لطافت، سید لطافت علی۔ لائق، لالہ کنج بہاری لال۔ محمد ابوالشرف مجددی عرف اچھن صاحب۔ محمد الجاز حسن خان۔ مخزون، محمد علی خاں ماہونوی۔ مرتضیٰ، سید محمد مرتضیٰ۔ مظہر، مظہر الاسلام۔ مغموم، علی محمد خاں۔ ممتاز، سید ممتاز احمد ممتاز شاہجہاں پوری۔ ممتاز، نواب مہدی حسین خاں۔ موج، امیر احمد مانکپوری۔ مہر، محمد شفیع کاکوروی۔ مہر، محمد مہر شاہ۔ مہر، میر سعادت علی۔ ناطق، لکھنوی۔ نفیس، اچھے صاحب۔ نیاز سید نیاز احمد خیر آبادی۔ وزیر، وزیر علی خاں۔ وفا، عبدالہادی خاں رام پوری۔ ہوش، کالی چرن۔

۱۹۸۵ء میں عرفان عباسی کی "دبستانِ امیر مینائی" (۱۱) کے نام سے قابل قدر کتاب شائع ہوئی۔ جس میں بہ حیثیت مجموعی دو سو چار [۲۰۴] تلامذہ کو شامل کیا گیا ہے۔ ان میں ایک سو ستر [۱۷۰] کے حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام بھی دیا گیا ہے جب کہ بقیہ کے صرف نام ہیں۔ اب ذیل میں ان شاگردوں کے نام پیش کیے جاتے ہیں جو مذکورہ فہرست میں نہیں ہیں۔ جن کی تعداد اٹھاسی [۸۸] بنتی ہے۔

اثر، حسین الادین احمد۔ اثر، محمد یوسف ردولوی۔ اثر، الٰہی بخش ریوائی۔ آثم، حضور احمد خاں بریلوی۔ احمد، علی الدین احمد اٹاپی۔ اختر، نذر محمد خاں خیر آبادی۔ اخگر، رضی علی کاکوروی۔ آرام، سید نجف علی شاہ آبادی۔ آزاد، شاہ امراؤ علی امیٹھوی۔ اشک، محمد صادق۔ اظہر، اظہر علی سہسوانی۔ اعجاز، عبدالعزیز سہسوانی۔ انجم، نجم الدین احمد سندیلوی۔ انور، نورالحسن بلگرامی۔ برق، محمد علی حسین خان۔ برق، جوالا پرشاد مددی۔ برق، حکیم الدین کاکوروی۔ بسمل، شیخ محمد زماں بجنوری جلانوی۔ بسمل، اشرف لال رام پوری۔ بہار، سید علی قادری مدراسی۔ بیدل، واحد نور خاں باندوی۔ ثابت، سید افضل حسین لکھنوی۔ ثروت، مشرف جہاں بیگم بھوپالی۔ حامد، محمد حامد علی خاں شاہ آبادی۔ حسرت، سید ذاکر اللہ کڑوی۔ حیف،، وجیہ الدین احمد خان رام پوری۔ خستہ، غلام حضرت خاں رام پوری۔ خلیق، محمد نصر اللہ خاں حسن پوری۔ خیال، محمد صفدر علی خاں۔ خیال، سید محمد علی شاہ جہاں پوری۔ دلگیر، عبدالوہاب۔ راز، فیاض احمد خیر آبادی۔ رفعت محمد داؤد مہئوی۔ رفیق ہاپوڑوی، روش، عنایت اللہ روش بدایونی۔ زار، بانکے لال بریلوی۔ سائل، عبدالحق مونگیری۔ سحر، سراج منیر خاں بھوپالی۔ سلیم، فیض الحسن فاروقی سہسوانی۔ شرر، عبدالکریم بھولپوری، شرر، ارتضیٰ علی کاکوروی۔ شمس، تصدق حسین خاں لکھنوی۔ شوخ، سید اقتدار علی بلگرامی۔ شوخ، محمد حسین علی خاں۔ شوق، شاہ جہاں پوری۔ شیدا، سید علی منداخاں۔ صفا، عبدالحق رام پوری۔ ضبط، نیاز علی خان۔ عاصی، احمد علی خاں نارنوی۔ عبرت، سید ظفر حسین کراروی۔ عبرت، گورکھ پرشاد گورکھپوری۔ عجیب، محمد حسن گورکھپوری۔ عیش، مجتہد الدین بدایونی۔ فروغ، ریاض الرضا خاں شاہ جہاں پوری۔ فصیح، محمد عبدالکریم۔ قدیر، غلام حسین خاں۔ قمر، سید ہادی حسین بریلوی۔ قیصر، علیگ۔ کوثر، حکیم عابد علی خیر آبادی۔ گستاخ، کرامت اللہ رام پوری۔ لطیف، اکرام احمد بدایونی۔ محسن، دیوان امرناتھ امرتسری۔ محو، شفیع بدایونی۔ مسرت منور جہاں بیگم بھوپالی۔ مشتاق، غلام رسول خاں رام پوری۔ مشتاق، اشتیاق احمد سلونوی۔ مضطر، افتخار احمد خیر آبادی۔ مغموم، علی محمد خاں لاچوری۔ مفتون،

فصیح اللہ خاں۔ منظر، مولوی محمد اصغر سیتاپوری۔ ناطق، سید اشتیاق حسین بریلوی۔ نگہت، ظہور حسن کاکوری۔ نوح، محمد نوح ناروی۔ عاقل، عطااللہ گورکھپوری۔ محمد ابوالحسن خاں رسول پوری۔ مست، عبدالمجید بنارسی۔ اظہر، مودودی۔ برق لکھنوی۔ بہار مدراسی۔ وحید، سید وحید حسن۔ صغیر گورکھپوری۔ ضیاء اکبر آبادی۔ معنوی شاگردوں میں تین نام ہیں :

۱۔ قمر جلالوی، ۲۔ سوزبارہ بنکوی، ۳۔ شفق امروہوی۔

سرفراز علی رضوی نے احوال شعراء و مشاہیر جلد سوم (۱۲) میں امیر کے ایک سو تین [۱۰۳] تلامذہ کی فہرست دی ہے۔ ان میں چودہ [۱۴] نام پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

ابرو، مچھلی شہری، احمد حسن حافظ۔ ادیب، لکھنوی۔ تفصیل حسین منشی سید۔ اسلم، کانپوری۔ سلامت اللہ۔ خوش دل، مظفرپوری۔ محمود علی خاں۔ رضا لکھنوی، رضا حسین۔ رنگین حیدر آبادی، محمد ایوب۔ صابر، قادر شریف۔ ضعف لکھنوی، غلام عباس شیخ۔ فرہاد بہاری، نظیر حسین حکیم سید۔ قدیر رام پوری، غلام حسین خاں۔ گستاخ رام پوری، کرامت اللہ خاں۔ نشتر مچھلی شہری، محمد طہ۔ واحد رام پوری، واحد علی شیخ۔ ہاشمی صفی پوری، نورالحسن محمد۔

ان تلامذہ کے علاوہ تلاش و جستجو سے آٹھ [۸] کا اور پتا چلتا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں :

عابد، منشی عابد حسین صدیقی سہسوانی (۱۳) شرر، ارتضی علی (۱۴) رخشاں، مطیع احمد (۱۵) پردیسی، مولانا قطب الدین برہمچاری (۱۶) بدر، بدرالحسن (۱۷) احقر، کاان کنور (۱۸) بے چین، منشی عبدالحی بدایونی (۱۹) راز پیارے خاں (۲۰) اور وفا پیارے خان۔ یوں مجموعی طور پر دو سو تیئس (۲۲۳) تلامذہ کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ توقع ہے کہ تلاش و جستجو سے اور بھی شاگردوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائے گی۔ یہ تو تھی امیر کے شاگردوں کی تفصیل اب امیر کے طریقہء اصلاح کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہے۔

(۳)

تلامذہ کے کلام پر امیر کے طریقہء اصلاح کے بارے میں معلومات ان کے خطوط میں بکھری ہوئی ہیں۔ جن کو مربوط کیا جائے تو ایک مکمل نظام ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان بھر سے روزانہ شاگردوں کا کلام اصلاح کے لیے آیا کرتا تھا۔ "دفتر امیر اللغات" قائم ہونے کے بعد سے معتمد خطوط کو علیحدہ بستے یا صندوقچے میں جمع کرتا جاتا تھا۔ جیسا کہ امیر کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ :"جو کلام یہاں پہنچا وہ نذر و سیم ہوا"۔ (۲۲) روزانہ لغت کے کام سے فارغ ہونے کے بعد امیر کلام پڑھ کے اصلاح تحریر کردیتے تھے۔ ہر خط کا جواب عموماً باری آنے پر دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی بعض چہیتے شاگردوں کا جواب فوراً بھی ارسال کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مقامی شاگرد، جن میں "دفتر امیر اللغات" میں کام کرنے والے بھی شامل تھے۔ لغت کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنا کلام سناتے اور امیر کو کلام میں جہاں اصلاح دینا ہوتی متوجہ کر دیتے تھے۔ اس دوران اپنا کلام بھی شاگردوں کے سامنے پڑھتے یا تلامذہ کی فرمائش پر تازہ کلام کہتے اور قریبی شاگرد جیسے ریاض، وسیم آویا جلیل وغیرہ اسے لکھتے جاتے۔ تلامذہ ان کے کلام پر کبھی اعتراض کرتے تو دلیل کے ساتھ ان کی رائے مانگتے اگر اعتراض میں وزن ہوتا تو خوش دلی سے قبول کر لیتے۔ اس بحث و مباحثے سے شاگرد محظوظ ہوتے اور ان کی علمی بصیرت میں اضافہ بھی ہوتا تھا۔ امیر کے ایک شاگرد نعیم الحق آزاد شیخ پوری نے امیر کے طریقہء اصلاح کے بارے میں جو معلومات اپنی کتاب "حیات الشعراء" میں تحریر کی ہیں انھیں

اقتباس کیا جاتا ہے جس سے امیر کے اصلاح کے نظام پر روشنی پڑتی ہے۔

''بیرونی کلام کی اصلاح جلد ہو جاتی تھی۔باوجود اس کے کہ امیر اللغات کی تالیف کی دھن لگی تھی ••• مقامی تلامذہ کی اصلاح کی حالت تو ایک خاص حالت رکھتی تھی۔ پھر بھی بیرونی تلامذہ کے کلام پر کچھ توجہ کم نہیں کی جاتی تھی۔ اصلاح کی حالت میں کلام پر گہری نگاہ ڈالی جاتی •••

وجوہِ اصلاح جو ضروری سمجھے جاتے بدست حاشیہ پر لکھے جاتے۔ خواہ مخواہ ہر شعر پر معمولی وجہ اصلاح نہیں ظاہر کی جاتی، جو شعر زیادہ پسند ہوتا، اس پر صاد بنادیا کرتے۔ اگر معمولی سے زیادہ پسندیدگی تو دو صاد بنادیے جاتے تھے۔ •••

جو شعر اصلاح طلب نہ ہوتا بہ جنسہ چھوڑ دیا جاتا۔ بعض مصرع پورا ایسا بھی لگا دیا جاتا، جو شاگرد کی پسند پر رہتا اور اس کا اصل مصرع بھی بہ جنسہ رہتا•••

نمونہ اصلاح میں صرف وہی اشعار درج کیے جاتے جن پر اصلاح ہوتی''۔(۲۳)

امیر کے جانشین جلیل مانک پوری کے شاگرد کسری منہاس اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

''امیر کا طریقہ ء اصلاح یہ تھا کہ ان کے غیر مقامی شاگرد ڈاک کے ذریعے انھیں اپنا کلام ارسال کرتے تھے اور امیر ڈاک کے ذریعے حک واصلاح کے بعد یہ کلام واپس بھیج دیتے تھے''۔(۲۴)

دورانِ گفتگو کسریٰ منہاس نے بتایا کہ استاد محترم جلیل کا طریقہ اصلاح بھی بعینہ امیر کے ڈھب پر تھا۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ :

''۱۸۸۹ء سے اصلاح کا طریقہ میں نے یہ دیکھا کہ شاگردوں کی غزل کبھی خود دیکھ کر اصلاح دیتے تھے۔ کبھی منشی سید محمد عسکری وسیم •••اور ان کے بعد جلیل القدر نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل سے سنتے جاتے اور اصلاح لکھواتے جاتے''۔(۲۵)

پروفیسر نفیس صدیقی مولانا اطہر پوڑی کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ :

''میں منشی صاحب کی خدمتِ اقدس میں اکثر آتا جاتا، نہایت منکسر المزاج متواضع، متین و سنجیدہ بزرگ تھے۔ شام کو ان کے مکان پر احباب اور تلامذہ کا مجمع رہتا۔ منشی صاحب پیرانہ سالی کے سبب چھپر کھٹ پر تشریف رکھتے اور ان کے چاروں طرف مونڈھے اور کرسیاں بچھی ہوتیں۔ جن پر ہر شخص قرینے سے بیٹھا ہوتا۔ چھپر کھٹ کے قریب ایک چھوٹی میز اور کرسی بچھی ہوتی جس پر حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری بیٹھتے اور میز پر غزلیات کا بستہ ہوتا جو اصلاح کے لیے آتیں۔ وہ غزل پڑھتے جاتے اور منشی صاحب سنتے جاتے اور اصلاح دیتے۔ مشکل سے کسی غزل میں پانچ، چھے منٹ صرف ہوتے۔ اصلاح بہت عمدہ اور جلد دیتے''۔(۲۶)

کلام پر اصلاح درج کرنے کے دو طریقے تھے۔ کبھی تو الگ کاغذ پر لکھ دیتے تھے اور اس میں، جیسا کہ نعیم الحق آزاد لکھتے ہیں کہ :

"صرف وہی اشعار درج کیے جاتے جن پر اصلاح ہوتی"۔ یا پھر اسی خط پہ جس پر کلام لکھا ہوتا، اصلاح درج کر دی جاتی۔ جیسا کہ حفیظ جون پوری کے نام خط سے ظاہر ہے:

"غزل آپ صاف اور خوش خط لکھا کیجیے۔ بین السطور بھی زیادہ چھوڑا کیجیے کہ دیکھنے میں نگاہ کو تکلیف نہ ہوا کرے اور اصلاح لکھنے کی جگہ بھی رہے"۔ (۲۷)

امیر کے مزاج میں نفاست پسندی اور نظم و ضبط کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ وہ اپنے کاموں میں سلیقہ مندی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور یہی توقع وہ اپنے تمام تلامذہ سے بھی رکھتے تھے۔ امیر کا رسم الخط بھی نہایت عمدہ تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ خطوط تحریر کرتے تو رموز و اوقاف کا بہت خیال رکھتے تھے۔ امیر کی نفاست پسندی، نظم و ضبط اور سلیقہ دیکھنا ہو تو "امیر اللغات" اور ان کے دواوین کا مطالعہ و مشاہدہ ضرور کرنا چاہیے۔ امیر اپنے ایک نہایت عزیز شاگرد زاہد حسین زاہد کو بھی اسی نوعیت کی روک ٹوک کرتے دیکھائی دیتے ہیں:۔

"غزل میں شعر اس قدر گنجان اور جگہ تنگ کر کے آپ لکھتے ہیں کہ اصلاح دینے اور وجوہ لکھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ آئندہ سے واضح ہونا چاہیے"۔ (۲۸)

اسی نوعیت کی ایک اور معلومات کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں بھی ملتی ہے:

"یہ غزل آپ کی سن کر میں نے بنائی۔ شعر اس کثرت سے اور تنگی کے ساتھ آپ لکھتے ہیں کہ کہیں اصلاح دینے اور وجوہ لکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ مجبوراً وجوہ قلم انداز ہوتی ہیں"۔ (۲۹)

(۴)

امیر صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ریاست رام پور کے ایک فرض شناس ملازم، خاندان کے ذمہ دار سرپرست، باعمل و صاحبِ سلسلہ صوفی اور دفتر "امیر اللغات" کے مہتمم بھی تھے۔ خیال کرنا چاہیے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ بر ہوتے ہوں گے۔ اور ان تمام فرائض کے ساتھ سیکڑوں شاگردوں پر کس طرح توجہ دیتے ہوں گے۔ امیر کی دیگر مصروفیات صرفِ نظر کر کے صرف شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے پہلو کا جائزہ لیا جائے تو حیران کن صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ امیر کے مکتوبات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اصلاح کے لیے اس کثرت سے کلام آتا تھا کہ اس کے لیے دیگر کاموں کے علاوہ علاحدہ سے ایک دفتر درکار تھا۔ نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں کہ: "روز مرہ دو چار، دس پانچ غزلیں ڈاک میں آتی ہیں"۔ (۳۰) زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں کہ: "اصلاح طلب کے بستے پر ہو گئے ہیں ایک انبار لگا ہوا ہے"۔ (۳۱) کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ: "ممالک نزدیک و دور سے کلام اس کثرت سے آتا ہے کہ میرا دل چھوٹ جاتا ہے"۔ (۳۲) نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں کہ: "صدہا احباب کا کلام بندھا پڑا ہے"۔ (۳۳) برہم کو لکھتے ہیں کہ: "بستے کے بستے شاگردوں کے کلام سے بھرے پڑے ہیں"۔ (۳۴)

امیر کی دیگر مصروفیات اور کثرت کار کی وجہ سے یہ کثرت خطوط جمع ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال میں کبھی کبھی کسی شاگرد کا کلام گم بھی ہو جاتا تھا۔ زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ: "تمھاری غزل مثلِ جام شراب کھو گئی"۔ (۳۵) خط یا غزل گم ہونے کی مختلف وجوہات بھی امیر کے مکتوبات میں ملتی ہیں۔ مثلاً پہلی یہ کہ، ڈاک اتنی زیادہ آتی تھی کہ بہت جلد صندوقچہ بھر جاتا، جو مہینے میں کئی مرتبہ صاف کیا جاتا،

ضروری کاغذات تو محفوظ کر لیے جاتے ،بقیہ ضائع کر دیے جاتے تھے۔ تو غالباً بے خیالی میں یہ خطوط یا کلام ضائع ہو جاتے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈاک کی کثرت میں کسی کا کلام فوری طور پر تلاش کرنا محال ہو تا تھا۔ تیسری وجہ یہ بھی ہوتی کہ مال واسباب کئی مرتبہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا، اس میں بھی ڈاک ضائع ہو گئی یا غلطی سے کسی مٹھے میں رکھ دی گئی۔ اور چوتھی صورت یہ تھی کہ کلام روزانہ بہ کثرت آتا، اس لیے امیر بھول جاتے کہ کس کا کلام آیا اور کس کا اصلاح ہو کر چلا گیا۔ امیر ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

"چوں کہ ڈاک میں کاغذ بکثرت آتے ہیں اور صندوقچہ معمور ہو جاتا ہے۔ لہذا مہینے میں کئی بار صاف کیا جاتا ہے کہ ضروری کاغذ مٹھوں میں بندھ کر بستوں میں بندھ جاتے ہیں۔ باقی چاک ہوتے ہیں"۔(۳۶)

زاہد حسین کو لکھتے ہیں کہ :"کلام اصلاح طلب کے مٹھے، جس بستے میں رکھے تھے وہ بستہ ہی غائب ہے۔ نقل و تحویل اسباب میں اکثر چیزیں پریشان ہو گئی ہیں"۔ دل شاہجہاں پوری کو لکھتے ہیں :"مختلف کلام کثرت سے جمع ہے۔ اس میں کہیں بے ترتیبی سے (غزل) ادھر ادھر ہو گئی، جواب ڈھونڈھے سے نہیں ملتی"۔ کوثر خیر آبادی کے نام امیر کے خط میں مذکور ہے کہ :

"وہ محبت نامے جس میں حضرت تسنیم کی تاریخیں تھیں۔ پیشی کے مٹھے میں رکھ لیا تھا۔ مگر اسی مٹھے میں رکھنے کے خطوط اس زمانے میں اتنے ہو گئے کہ یہ خط بھول گیا"۔

کلام گم ہو جانے کی وجہ سے بعض شاگرد ناراض ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال میں امیر استادانہ کروفر کے بر خلاف نہایت عاجزی سے شاگرد کو اپنی مجبوریاں بتاتے اور معذرت خواہ ہوتے۔ ذیل میں زاہد کے نام خط کا جو اقتباس پیش کیا جارہا ہے وہ اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اس میں امیر کی مصروفیات کی ایک بھی جھلک ملتی ہے۔

"کلامِ تلامذہ نزدیک و دور اس کثرت سے آتا ہے کہ میں ان کو کسی طرح دیکھ نہیں سکتا، قدر دانانِ عذر شنو، مجھ کو تاخیر اصلاح پر معاف رکھتے ہیں۔ آپ بھی یہی شیوہ اختیار کیجیے۔ ••• بستے میں سو سے زیادہ وہ خطوط ہیں، جس میں مختلف اقسام کا کلام اصلاح طلب ہے۔ اب دیکھنا شروع کروں گا اور اس مہم کو جب تک سر کروں گا تب تک اور کلام آجائے گا۔ ••• نصف شب تک ہمت کروں تو یہ کام ہو سکے۔ دل و دماغ ضعیف ہو گیا"۔(۳۷)

امیر اپنی شدید مصروفیات کے باوجود نہایت ذوق و شوق اور خلوص کے ساتھ تلامذہ کے خطوط کے جوابات دیتے۔ کلام کی اصلاح کرتے اور تاخیر ہو جانے پر معذرت بھی کرتے۔ امیر کا یہ رویہ اتنا مخلصانہ تھا کہ شاگرد ان سے متاثر ہوئے بہ غیر نہیں رہتا تھا۔ اور پھر یہی تاثر گہرا ہو تا جاتا، گویا آہستہ آہستہ استاد کا رنگ شاگرد پر چڑھنا شروع ہو جاتا، یوں ان کا شاگرد ان کی تصویر نظر آتا۔ امیر کے نظامِ اصلاح کا یہ بھی ایک قابلِ ذکر پہلو ہے۔

(۵)

امیر انتہائی شفیق اور شاگردوں سے محبت کرنے والے استاد تھے۔ وہ اپنے تلامذہ پر خاص توجہ دیا کرتے تھے۔ اور انھیں آگے بڑھانے

کی فکر میں رہتے۔ حالاں کہ امیر کو ذمہ داریوں اور فرائض کی بجا آوری نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بیرونی اور مقامی شاگردوں کا اولاد کی طرح خیال رکھتے۔ شاگرد مصیبت میں ہوتا تو وہ رنجیدہ ہوتے سب کام چھوڑ کر اس کی ہمت بندھاتے اور اسے حوصلہ دیتے اور شاگرد خوش ہوتا یا کسی امتحان میں کام یاب ہوتا، یا نوکری میں ترقی پاتا تو خوشی سے جھوم جاتے اور دعا پر دعا دیتے۔ احسن اللہ ثاقب کو امتحان کی کام یابی پر رقم طراز ہیں :

"امتحان انگریزی، درجہ اول میں کام یاب ہونا معلوم ہوا اور ایسا جی خوش ہوا کہ اپنی کام یابی کا مزا ملا۔ حق تعالیٰ وہ دن لائے کہ مژدہ صدر آرائی سننے میں آئے"۔(۳۸)

سید محمد نوح کو مشاعرے میں کام یاب غزل پڑھنے پر اس طرح مبارک باد دیتے ہیں :

"برخوردار بسمل کی تحریر سے لکھنؤ کے مشاعرے میں آپ کی گہر افشانی و شرکت کا حال معلوم ہو کر خوش ہوا۔ آپ موید من اللہ ہیں۔ حسرت ہوتی کہ میں اپنے کانوں سے آپ کا کلامِ فصاحتِ التیام آپ کی زبانی نہ سنا۔ والدعا"۔(۳۹)

سید محمد عبدالحکیم حکمت "دبدبہ امیر" میں لکھتے ہیں کہ : "حضرت خدائے سخن اپنے تلامذہ کے ساتھ نہایت الفت و محبت رکھتے تھے۔ اور انھیں اولاد کی طرح دل سے چاہتے تھے"۔(۴۰) حکمت کی رائے امیر کی بابت بالکل درست ہے۔ اس کا اندازہ اس مذکورہ اقتباسات کے علاوہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امیر تلامذہ کی وہ غزلیں جو مشاعروں میں پڑھنے یا کسی گلدستے میں اشاعت کے لیے ہوتی تھیں۔ ان پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اس عرصے میں، وہ اپنی زیادہ تر مصروفیات ترک کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کریم الدین، امیر کے شاگرد فدا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"جن دنوں سرکاری مشاعرے ہوتے تھے۔ حضرت کو بہت کم فرصت ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی خود غزل نہ کہہ سکتے تھے۔ تاہم یہ معمول تھا کہ شاگردوں کی غزل پر اصلاح دے کر فرماتے، صاف کر کے پھر دکھالینا۔ اس کے بعد جس دن مشاعرہ ہوتا اس روز غزلوں کو پھر ایک نظر دیکھ لیتے تھے"۔(۴۱)

مقامی شاگردوں کے بر خلاف، مشاعرے کے لیے بیرونی شاگردوں کے کلام کی اصلاح جلد ہو جاتی تھی۔ بشیر ملیح آبادی کے نام خط میں لکھتے ہیں : "دو غزلیں آئیں۔ مشاعرے کی غزل دیکھ کر بھیجتا ہوں۔ دوسری بسبب علالت نہیں دیکھ سکا"۔(۴۲) عابد کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ : مشاعرے کی غزل میں نے فوراً دیکھ کر بھیجی"۔(۴۳) ایک اور خط میں امیر کی جلدبازی اور پریشانی ملاحظہ کیجیے :

"آپ کا خط کھولا، بہت افسوس ہوا کہ شاید غزل وقت پر نہ پہنچے گی۔ مگر جلدی میں سن کر کچھ کچھ بنایا۔ خدا کرے مشاعرے تک پہنچے"۔(۴۴)

امیر وہ غزلیں جو مشاعرے کے لیے یا کسی گلدستے کی اشاعت کے لیے ہوتی تھیں۔ انھیں احتیاطاً بیرنگ بھیجتے تھے۔ اس طرح ان کے

خیال میں گم ہونے کا امکان کم ہو جاتا تھا۔ حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں : "غزل کے خیال سے خط بیرنگ بھیجتا ہوں"۔(۴۵) زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں کہ : یہ خط محض بہ نظر احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں"۔(۴۶) عابد کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں کہ : "ٹکٹ ملفوف نہ تھا اور ہوتا بھی تو احتیاطاً بیرنگ بھیجتا"۔(۴۷) احسن اللہ ثاقب کو رقم طراز ہیں کہ :اب کے بیرنگ خط بھیجنے کا قصور معاف ہو ٹکٹ لگا کر بھیجا تھا، وہ نہ پنچاب کے جل کر بیرنگ روانہ کیا"۔(۴۸)

امیر ، مشاعرے کے علاوہ گلدستہ "گل چیں" اور "پیام یار" میں شائع ہونے والی غزلیات کی اصلاح بھی جلد کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں گلدستے ان کے شاگرد نکالا کرتے تھے۔ اور "دامن گل چیں" تو ایک زمانے میں امیر کی زیرِ نگرانی ہی نکلا کرتا تھا۔ ابو محمد سحر کے مطابق فروری ۱۸۸۵ء میں اس کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تھا۔(۴۹) ۱۴مئی ۱۸۸۵ء کے خط میں احسن اللہ ثاقب کو لکھتے ہیں کہ : "دامنِ گل چیں سے میرا خاص تعلق نگرانی کا ہے اور امور میں قمر باتفاق رائے کمیٹی کار بند ہوتے ہیں "۔(۵۰) فروری ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ ، جب امیر کو نواب کلب علی خاں نے رام پور میں دوبارہ طلب کیا تو انھوں نے یہ گلدستہ اپنے ایک شاگرد واحد علی بسمل کے حوالے کر دیا اور خود رام پور تشریف لے آئے۔ لیکن نگرانی کا کام جاری رہا۔ ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ کے خط میں امیر لکھتے ہیں کہ :

> "جب پار سال میں لکھنؤ سے رام پور چلنے لگا تو اپنے ایک عزیز شاگرد واحد علی بسمل کو سپرد کیا کہ وہ اپنے شوق سے بقدر امکان اس کو سنبھالتے ہیں مگر سنبھل نہیں سکتا۔ اس لیے کہ مجھے یہاں مطلق فرصت نہیں جو کچھ کہوں یا شاگردوں کا کلام بنا سکوں"۔(۵۱)

۲۴ر نومبر ۱۸۹۸ء کے تحریر کردہ امیر کے خط سے پتا چلتا ہے کہ "دامنِ گل چیں" ۱۸۹۹ء سے رام پور سے نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

> "گلدستہ دامن گل چیں جنوری سے باہتمام نور چشم لطیف احمد اختر پھر نکلے گا۔ یہ وہی پرچہ ہے جو ۱۸۸۵ء میں، میری زیر نگرانی نکل کر مقبول عام ہو چکا ہے"۔(۵۲)

امیر باوجود دیگر ذمہ داریوں اور مکروہاتِ دنیاوی کے بسمل کی مدد کرتے تھے۔ جس کی نوعیت یہ تھی کہ وہ تلامذہ "گل چیں" میں کلام بھیجنے کی تاکید کرتے اور وہ کلام جو "گل چیں" میں اشاعت کے لیے آتا اس کی اصلاح میں جلدی کرتے۔ اس کے علاوہ خود بھی کوشش کر کے جیسے تیسے اپنا کلام بھیجتے۔ یہاں تک کہ داغ سے بھی اصرار کرتے۔ برہم کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ : میں نے بعض احباب کے اصرار سے غزل کہی ہے اب تک "دفتر گل چیں" میں نہیں بھیجی"۔(۵۳) کوثر کو لکھتے ہیں : "غزل آج دیکھ لی بھیجتا ہوں آپ صاف کر کے گل چیں میں بھیجیے"۔(۵۴) ایک اور خط میں کوثر خیر آبادی کو رقم طراز ہیں :

> "افسوس کہ طرح، گل چیں گذشتہ ، جس دن آئی، اس دن خیال ہوا کہ ضرور دیکھ کر بھیجوں گا۔ پھر ایسے حالات رہے کہ آج تمھارے لکھنے پر غزل کا آنا یاد آیا۔ عذر خواہ ہوں اور غزل اسی وقت دیکھ کر بھیجتا ہوں"۔(۵۵)

۱۷ر نومبر ۱۸۹۲ء کے خط میں منشی جمیل احمد شاداں کو غزل کی اصلاح کے ساتھ رقم طراز ہیں :

فقیر ناتواں بیمار ہے۔ کئی بیماریوں کا پرستار ہے۔ شاعری صحت و طاقت کی طرح پیرانہ سالی میں رخصت ہو گئی۔ آپ کی غزل دیکھ کر بھیجتا ہوں"۔(۵۶)

ایک اور موقعے پر بیماری کے باوجود منشی جمیل احمد شاداں کی غزل کی اصلاح اس وجہ سے جلد کی کہ "گل چیں" کے لیے تھی۔ امیر لکھتے ہیں :

"میں آج کل مریض ہوں اور امراض ایسے ہیں کہ سخت بے چین ہوں۔ چوں کہ یہ غزلیں "گل چیں" کی تھیں اس لیے میں نے اس حالت میں بھی دیکھ کر اصلاح دی"۔(۵۷)

نعیم الحق آزاد نے اپنے کلام کی اصلاح کی بابت دریافت کیا تو امیر انھیں تسلی کے لیے لکھتے ہیں کہ :

"آپ کی غزل اگر پہنچی ہو گی، تو اصلاح کے بستے میں رکھی ہو گی۔ مجھے اب تک اس کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی جب "گل چیں" کے چھپنے کا وقت آئے گا۔ دیکھ کر بھیج دی جائے گی"۔(۵۸)

الغرض "گل چیں" کی اشاعت تک امیر، اپنا اور تلامذہ کا کلام لکھنؤ ارسال کر دیتے تھے۔ اگر امیر یہ سب کچھ نہیں کرتے، تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن وہ فطرتاً نیک خصلت، ادب دوست اور ادب نواز تھے۔ شاگردوں کے کلام کو دیکھنا، اسے سنوارنا، روک ٹوک کرنا اور شائع کرانا امیر کا فطری شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس کام میں گہرا خلوص نظر آتا ہے۔ اگر ذرا سی وقت کی جائے اور امیر کی زندگی کے اس دور کے حالات کا مطالعہ کر لیا جائے، جس زمانے کے خطوط سے اقتباس راقم نے پیش کیے ہیں۔ تو امیر کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ ہمارے خیال میں امیر کی شخصیت کا یہ رخ بھی ان کے نظام تربیت کا نہایت اہم پہلو قرار دیا جا سکتا ہے۔

(۶)

امیر پر مسائل تو اسی وقت سے ٹوٹنا شروع ہو گئے تھے۔ جب انھوں نے "امیر اللغات" کی تالیف کی حامی بھری تھی۔ پھر نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد اس میں اضافہ ہوا۔ اور اس کے بعد ہر روز اس میں ایک نئی علت شامل ہوتی گئی۔ لغت کی زیر باری، لغت پر اعتراضات عزیز رشتے داروں کی بیماریاں، اموات، خود کی پیرانہ سالی نے امیر کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا۔ ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۳ء کا عرصہ مسائل کی بے پناہ شدت کا تھا۔ جس کی تمام کیفیات ان کے مکاتیب میں جزئیات کے ساتھ ملتی ہیں۔ ۶/ اگست ۱۸۹۲ء کا خط ملاحظہ کیجیے۔ جس میں ان کی زندگی کی ایک جھلک ملتی ہے :

"پیارے کوثر! مجھے بیماریاں و بیمارداریاں خصوصاً اور مکروہات دنیاوی عموماً نہیں چھوڑتے کہ میں احباب سے سرخرو ہوں ••• کتابِ لغت ("امیر اللغات") کی بدولت زیر باری حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ خدا رحم فرمائے۔ پیشاب کا مرض سخت مکلف ہے۔ چوکی پر جاتے جاتے پاؤں تھک جاتے ہیں اور ہر بار رک رک کر ہوتا ہے۔ دیر ہوتی ہے تو عسر بول بڑھ جاتا ہے۔ آنکھوں کو جب سے روگ لگا ہے۔ تب سے لکھنا اور کتاب دیکھنا گویا چھوٹ ہی گیا ہے۔ دوسرے کی محتاجی اور زیادہ مکلف ہے اور اکثر ہرج بھی ہوتا ہے۔ اب دو سطریں لکھیں اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کڑوانے لگیں۔ بصارت میں بھی کمی ہونے لگی"۔(۵۹)

مذکورہ خط میں امیر نے اپنی جو حالت لکھی، اس میں اضافہ ہی ہو تا گیا۔ لیکن آفرین کا مقام ہے کہ شاگردوں کا خیال اسی موقعے پر بھی جان گزیں تھا۔ ۱۴ر نومبر ۱۸۹۱ء کے خط میں نعیم الحق آزاد کو رقم طراز ہیں کہ :"محبی غزلیں آئیں۔بیماری اور بیماروں کی پرستاری کی حالت میں دیکھیں۔ ماشاء اللہ طبیعت آپ کی اچھی ہے"۔(۶۰) حالات کے سبب سے شاگردوں کو کلام بھیجنے میں اکثر تاخیر ہو جاتی تھی۔ تو بعض شاگرد ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ جیسے برہم۔ ملاحظہ کیجیے امیر کس محبت سے مناتے ہیں اور غزلیں اصلاح کر کے بھیجتے ہیں :

"یہ غزلیں جواب آپ نے بھیجیں باوجود تغیر حالات اور کمزوری طبیعت کے دیکھ کر بقدر ضرورت بنائیں"۔(۶۱)

"غصے میں ترے میں نے عجب لطف اٹھایا۔ اب تو عمداً اور بھی تقصیر کروں گا۔ تمھاری تحریر آئی اسی وقت غزل دیکھی۔ بہت اچھے اچھے شعر ہیں"۔(۶۲)

۱۲ر اپریل ۱۸۹۳ء کے خط میں کوثر خیر آبادی کو نہایت عاجزی اور انکساری سے رقم طراز ہیں کہ :

"آپ سے مجھ کو بہت ہی ندامت ہے کہ باوجود آپ کی محبت اور خصوصیت کے میری طرف سے خدمت گزاری میں نہایت کمی ہوتی ہے۔ بلکہ ہوتی ہی نہیں۔ یہ دونوں غزلیں جو آخر میں آئیں ان میں ایک گیا کے مشاعرے کی ہے۔ دوسری 'گل چیں' کی طرح میں۔ 'گیا'، کا مشاعرہ تو اب ہو ہی گیا۔ 'گل چیں' میں البتہ وقت باقی ہے۔ اسی نظر سے میں نے گل چیں کی غزل دیکھی ۰۰۰ آپ سے میں اپنی کم خدمتی کی معافی چاہتا ہوں"۔(۶۳)

امیر کے مکتوبات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ شاگردوں سے بے حد لاڈ کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے اکثر شاگرد بار بار ناراض ہوتے اور امیر ہر بار عاجزی اور انکساری سے معذرت خواہ۔ ۹ر اگست ۱۸۹۳ء کے خط میں امیر، برہم سے پھر معذرت چاہتے ہیں : "میں سخت نادم ہوں کہ نہ آپ کی غزل دیکھ سکا نہ خط کا جواب لکھ سکا ۰۰۰ غزل دیکھ کر وقت پر نہ بھیج سکنے کی آپ سے معافی چاہتا ہوں"۔(۶۴) اسی طرح حکیم کوثر خیر آبادی سے بھی امیر عذر خواہ نظر آتے ہیں :"پریشانیوں کے ہجوم سے آپ کی غزل اور جواب خط نہ بھیج سکا۔ انفعال کے ساتھ عذر خواہ ہوں"۔(۶۵) ایک موقعے پر امیر، برہم سے ناراض نظر آتے ہیں اور سخت لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ برہم، امیر کو بہت زچ کیا کرتے تھے۔ نافرمانی کا عنصر اس کے مزاج میں بہت تھا۔ پہلی بار امیر کا تند و تیز انداز ملاحظہ کیجیے۔ امیر کے تند و تیز لہجے کی بھی اپنی ایک شان ہے :

"میں جس حال میں ہوں وہ مشغلہ شعر و سخن کے بالکل مخالف ہے۔ محض تمھاری خاطر سے تمھاری غزلیں دیکھیں ہیں ۰۰۰ تم پہلے مجھے مطمئن کر دو پھر جتنا کلام چاہو بھیجو۔ حکیم صاحب حکمت کی باتیں تم کو بہت آتی ہیں۔ کام کی بات ایک نہیں آتی۔ سچی بات لکھی ہے۔ برہم نہ ہو جانا"۔(۶۶)

امیر کی اس ناراضگی میں بھی بے زاری یا نفرت کا عنصر نظر نہیں آتا۔ بلکہ امیر ڈانٹنے کے بعد بھی ڈر رہے ہیں کہ برہم کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ یہی وہ انداز ہے جسے امیر کا لاڈ لکھا ہے۔ امیر کے اکثر سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ جیسا لائق فائق اور فرمانبردار شاگرد امیر کے تھے

ان کے کسی معاصر کو ایسے شاگرد میسر نہیں آئے۔ اس موقعے پر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ امیر، جس طرح اپنے تلامذہ کے ناز اٹھاتے تھے کیا ان کا کوئی معاصر ان کا ہم سر نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بالکل بھی نہیں۔

(۷)

امیر ایک محتاط محقق، ذمہ دار استاد، ماہر زبان، اعلیٰ لغت نویس اور بلند پایہ شاعر تھے ان تمام خوبیوں نے انھیں اپنے دور کا ایک معتبر اور پر وقار عالم بنا دیا تھا۔ امیر کی اصلاح میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں جن پر ہم بعد میں اظہار خیال کریں گے۔ اس سے پہلے امیر کی اصلاح کے حوالے سے ان کا ایک اصول ضرور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہے انتخاب کلام۔ جس کی امیر اپنے خطوط میں بار بار تنبیہہ کرتے ہیں۔

امیر کا اصول تھا کہ شاگرد اپنا جو کلام اصلاح کے لیے پیش کرے، پہلے خود اس کا انتخاب کرے اس سے وہ کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

۱۔ شاگرد میں چھپی ہوئی ناقدانہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا۔

۲۔ جو معمولی کلام ہو شاگرد اپنی فکر سے اسے خود مسترد کر دے۔

۳۔ اصلاح میں بہتر شعر کی اصلاح کی جا سکے۔

۴۔ کم وقت میں زیادہ شعر کو بہترین کیا جا سکے۔

امیر خود بھی اپنے کلام کے انتخاب پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ داغ نے بھی اپنا کلام انتخاب کے لیے ان کے پاس بھیجا۔ امیر اسی بابت رقم طراز ہیں کہ :

> "جو شعر میرے نزدیک ہر طرح عیب سے پاک اور آپ کے رتبے پر پھبتے ہوئے ہیں ان کو انتخاب میں لوں اور جو شعر کہ ان میں مضامین تو تازہ ہیں، مگر نظر دقیق ان کو کسی عیب سے پاک نہ دیکھے ان کو انتخاب سے چھوڑ دوں اور کچھ اشارہ ان عیوب کا لکھ کر آپ کو مطلع کروں (۶۷)۔

امیر کا یہ مکتوب کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ خاص کر انتخابِ کلام سے متعلق اس میں کئی بصیرت افروز خیال ملتے ہیں۔ مثلاً :

۱۔ انتخابِ کلام کرتے وقت پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ شعر فنی اور فکری اعتبار سے اعلیٰ پائے کا ہے یا نہیں۔ صرف اعلیٰ پائے کا شعر انتخاب کرنا چاہیے۔

۲۔ وہ شعر انتخاب میں لینا بہتر ہوتا ہے۔ جو شاعر کی عمر اور اس کی معاشرتی رتبے کے مطابق ہو۔ جیسا کہ امیر نے زاہد حسین زاہد کو اصلاح دیتے وقت ٹوکا تھا کہ : "چشم بد دور ابھی تمھارا آغاز شباب ہے۔ بڑھاپے کے مضمون کا ابھی کیا موقع"۔

۳۔ انتخابِ کلام میں ان اشعار کو چھوڑ دینا چاہیے۔ جس میں فنی سقم پایا جائے بے شک خیالات نئے ہوں۔

انتخابِ کلام سے متعلق یہی وہ نکات ہیں۔ جن کی بابت امیر اپنے شاگردوں کو بار بار متوجہ کرتے تھے۔ اور بعض مواقع پر خطوط میں یہ پہلو بھی ملتا ہے کہ جب شاگرد انتخاب کیے بغیر کلام بھیج دیتے۔ تو امیر کبھی کبھی سزا کے طور پر کلام نہیں دیکھتے اور نہایت عمدگی سے کہ شاگرد پر گراں بھی نہ ہو، ٹوک دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ برہم کے نام مکتوب میں ہے کہ : "کبھی تمھارا مختصر و منتخب کلام آتا تو با اخمہاس کے دیکھنے کا قصد کرتا"۔ (۶۸) کچھ کچھ یہی بیان کوثر خیر آبادی کے نام خط میں بھی ملتا ہے :

> "سب کام چھوڑ کر غزلیں دیکھیں۔ بنانا تو کہاں ہو سکتا ہے، ایک دو جگہ عیوب پر آگاہ کر دیا۔ ایک دو

جگہ آہستہ آہستہ والی غزل میں نیا بھی بتادیا اور انتخاب کے صاد کر کے وسیم کو غزلیں دے دیں کہ لکھوا کر شاعر کو آج ہی بھیج دیں"۔(۶۹)

اکثر شاگرد ابتدائی کلام کی ذمہ داری بھی امیر پر ڈال دیا کرتے تھے۔ اس صورتِ حال کے باعث ان شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیر سے ہوتی تھی۔ امیر تلامذہ کی اس عادت سے پریشان تھے۔ لیکن اس کے باوجود حوصلہ شکنی نہیں کرتے تھے۔ البتہ تنبیہ ضرور کرتے رہتے تھے۔ اس صورتِ حال کا تفصیل سے علم، زاہد حسین زاہد کے نام مکتوب سے ہوتا ہے:

"آپ کی غزل دیکھنے میں جو دیر ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کی غزلیں طویل ہوتی ہیں۔ جو کچھ آپ کہتے ہیں سب لکھ دیتے ہیں۔ انتخاب نہیں کرتے۔ میرے نزدیک مناسب ہے کہ آپ مکرر سہ کرر، نظر ڈال کر شعر منتخب کر لیا کریں۔ تاکہ مجھے آسانی ہو"۔(۷۰)

مکتوباتِ امیر کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ امیر اپنا کلام انتخاب کرنے کے بعد، اسے کسی شاگرد کے حوالے کر دیتے تھے کہ اب وہ انتخاب کرے۔ امیر کے ایک خط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے "گل چیں" کے لیے احباب کے اصرار سے اشعار کہے تھے۔ لیکن اسے دفتر "گل چیں" بھیجنے سے پہلے ممتاز علی آہ کو انتخاب کے لیے دیے:

"میں نے بعض احباب کے اصرار سے غزل کہی ہے، اب تک دفتر گل چیں میں نہیں بھیجی۔۔۔۔ اس میں سے بار بار انتخاب کر کے، ممتاز نے صرف پچیس شعر کی دو غزلیں رکھی ہیں۔ اور یہی رائے ہے کہ اسی قدر گلدستے میں چھپنے کو بھیجی جائیں مگر میں ان کو بھی زیادہ سمجھتا ہوں"۔(۷۱)

امیر شاگردوں کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ ان پر اس طرح اعتبار کرتے تھے جس طرح اپنی اولاد پر۔ یہی وجہ تھی کہ جب شاگرد امیر کے کلام کے کسی کمزور پہلو کی طرف اشارہ کرتے، تو امیر اسے اہمیت دیتے تھے۔ اسی بابت ممتاز علی آہ لکھتے ہیں:

"اگر کبھی کوئی شاگرد بھی آپ کے شعر میں شبہ کر کے کچھ عرض کرتا تو محض بہ نظرِ احتیاط، ردوبدل فرما دیتے"۔(۷۲)

آہ کے بیان کی تصدیق، مذکورہ بالا خط کے اقتباس سے بھی ہوتی ہے۔ کہ ممتاز پچیس پچیس اشعار کی دو غزلیں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن امیر اس تعداد کو بھی زیادہ لکھ رہے ہیں۔ باوجود اپنی ناپسندگی کہ امیر نے ممتاز کی رائے کو اہمیت دی اور فیصلے کو قبول کر لیا۔

شاگرد، امیر کو جو کلام اصلاح کے لیے بھیجتے تھے اس حوالے سے ایک اور پہلو امیر کے خطوط میں ملتا ہے۔ جو ان کے مزاج اور ذوق کا آئینہ دار بھی ہے۔ امیر نفاست اور اعلیٰ معیار کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ چاہے وہ کلام ہو یا لباس یا زندگی کے دیگر برتاوے۔ شاگردوں سے بھی یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی ہم ہنر ہوں۔ یہاں تک کہ اصلاح کے لیے جو غزل ارسال کی جاتی تھی۔ امیر کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی عمدہ کاغذ پر ہو۔ نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں کہ: "کاغذ آپ نے بہت برا اور کھرا اختیار کیا ہے۔ آئندہ سے سفید اور چکنے کاغذ پر لکھا کیجیے"۔(۷۳) شاگردوں کے ساتھ امیر کا رویہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی کو بھی خالی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ امیر کو اپنی حیثیت اور رتبے کا اندازہ تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ برصغیر میں طرزِ جدید کے نت نئے انداز، آنے والے وقتوں میں اسلاف کی عمدہ روایات کو بھی بہا کر لے جائیں گے۔ چناں چہ انھوں

نے اپنی شخصیت کے بڑے پن اور اپنے علمی رتبے سے شاگردوں کو شعوری طور پر متاثر کیا اور ایک ایسی نسل تیار کی جس نے لگ بھگ پچاس سال تک ان علمی و ادبی اور تہذیبی روایات کو برقرار رکھا، جو امیر کو عزیز تھیں۔ لیکن اس کام کے لیے امیر کو کتنے جتن کرنا پڑے اس کا مکمل ریکارڈ امیر کے مکتوبات میں موجود ہے۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے امیر کے اس تعلیمی نظام کے کچھ حصوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اب آئندہ صفحات میں طرزِ اصلاح کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ جس میں ایک کو چھوڑ کر تمام کے تمام نمونے زاہد حسین زاہد کے نام خطوط سے مستفاد ہیں۔ اس موقعے پر صرف ایک شاگرد کو شامل کیا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ امیر کے مطبوعہ خط سب سے زیادہ زاہد کے نام ہیں۔ دوسرے یہ کہ اصلاح کے نمونے بھی سب سے زیادہ زاہد کے خطوط میں ملتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس شاگرد کے یہاں اصلاح کا ایک تسلسل ہے۔ ہر موقعے پر ایک نئی بات ملتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس طریقے سے زیادہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

(۸)

امیر کی طرزِ اصلاح کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ جو "زمانہ" کانپور میں مسیح نے شائع کرایا تھا۔ (۴۷) یہاں یہ صراحت موجود نہیں ہے کہ یہ کس کے کلام پر ہے۔ لیکن کیوں کہ نہایت بصیرت افروز اور دل چسپ ہے۔ اس لیے ملاحظہ کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

عالی جناب کے اصلاحی چند اشعار ناظرین با تمکین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ جو خالی از لطف نہیں :

- کیا حسد تھا کہ رقیبوں نے پس مرگ کبھی — ہڈیاں میری، سگِ یار کو کھانے نہ دیا
- کیا حسد تھا کہ رقیبوں نے پس مرگ کبھی — استخوان میرا سگِ یار کو کھانے نہ دیا

اصلاح : ہڈیاں جمع مؤنث۔ فعل واحد مذکر۔

- ہجر میں جو دیدۂ تر ابر سا برسا کیسا — یہ دل بیتاب بھی بجلی ہی سا تڑپا کیسا

اصلاح : اس مطلع میں ایطا ہے۔ ایک مطلع ایسا کہنا چاہیے کہ ایک قافیہ اس میں عربی یا فارسی کا ہو تو ایطا سے بچ جائے۔

- ہزاروں دل ہیں ترے غم کی چوٹ کھائے ہوئے — نہ اک ہمیں ہیں فقط آہ دل دکھائے ہوئے
- ہزاروں دل ہیں ترے غم کی چوٹ کھائے ہوئے — نہیں ہیں ایک ہمیں تیرے دل دکھائے ہوئے

اصلاح : نہ کی جگہ تھی

- جو آج کا کولیں اپنی ہیں وہ بنائے ہوئے — مرے ہی سر پہ تو ہین وہ بلا یہ لائے ہوئے

اصلاح : اشارہ مصرعہ اول میں معشوق کی طرف ہو چکا ہے۔

- جو آج کا کولیں۔ الخ — مرے ہی سر پہ تو ہیں یہ بلائیں لائے ہوئے
- کچھ انتہا ہے مری سخت جانی کی اللہ — پڑا تڑپتا ہوں چرکے پہ چرکے کھائے ہوئے

اصلاح : ترکیب کی یاے تحتانی کا تقطیع سے گرنا نہ چاہیے۔

- کچھ انتہا ہے بھلا میری سخت جانی کی — پڑا تڑپتا ہوں۔ الخ
- جو قتل نامہ پہ میرے نہ مہر کی اس نے — نگار ہاتھوں میں مہندی تھا کیا لگائے ہوئے

اصلاح : پاؤں میں مہندی لگی ہونا محاورۃً کنایہ معذوری رفتار سے ہے۔ ہاتھوں میں مہندی لگائے ہونا اگرچہ مانع کار ہے مگر محاورہ نہیں ہے۔(۷۳)

اسی نوعیت کی اور بھی اصلاحیں " مکاتیب امیر مینائی"، " مشاطہ سخن " جلد اول (۷۵) " مشاطہ سخن " جلد دوم(۷۶)، "امیر مینائی"(۷۷)، "حیات الشعراء"(۷۸)، اور "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"(۷۹) میں پیش کی گئی ہیں۔ جس سے امیر کے طریقہ اصلاح کی وضاحت ہوتی ہے۔ لیکن ذیل میں زاہد حسین زاہد کے کلام پر امیر کی اصلاح کے جو نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ " مکاتیب امیر مینائی "اور" مشاطہ سخن " حصہ دوم میں موجود ہیں۔ خط کے ذریعے اصلاح دینے کے امیر کے دو طریقے تھے۔ پہلا یہ کہ اصلاح کے ساتھ عموماً خط بھی ملفوف ہوتا تھا۔ بعض اوقات وہ اصلاح اسی کاغذ پر کر دیا کرتے تھے۔ جس پر شاگرد کی غزل تحریر ہوتی۔ لیکن اس سے متعلق دیگر امور خط میں تحریر کیے جاتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اصلاح اور دیگر معلومات بھی اسی کاغذ پر لکھ دی جاتی۔ جس پر کلام ہوتا تھا۔ ذیل میں جو نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔ وہ پہلے طریقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس سے امیر کی اصلاح کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔ چناں چہ خط کا متن "مکاتیب امیر مینائی" سے اور اصلاح کا نمونہ " مشاطہ سخن "مستفاد ہے۔

(i) **مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۸۸۹ء۔**

" غزل آپ نے خوب کہی ہے۔ ماشاء اللہ ثم ماشاء اللہ۔ زمین بھی نئی تھی۔ شعر بھی مزے کے نکلے۔ اپنا حق ثابت کرنے کو میں نے کچھ دخل دیا ہے۔"(۸۰)

زاہد: "گیا جو وقت اسے سمجھو گیا۔ پھر کر نہیں آتا
نپاؤ گے نپاؤ گے کہیں دیکھو کہیں ڈھونڈھو

اصلاح: گیا جو وقت وہ پھر کر نہیں آتا نہیں آتا
نہ پاؤ گے نہ پاؤ گے ۔ الخ

مصرعہ ثانی میں جو (نپاؤ گے) کی تکرارِ مفید تاکید ہے اس کے مقابل مصرعہ اولیٰ میں (نہیں آتا) کی تکرار زیادہ مناسب و موزوں ہے"(۸۱)

(ii) **مکتوب مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۹۱ء۔**

" سلام و نیاز کے بعد التماس ہے کہ ماشاء اللہ کیا اچھے اچھے شعر آپ نے کہے ہیں۔ خدا آپ کی عمر و اقبال میں برکت دے۔ غزل اور خط ایک ہی کاغذ پر ہے خط کا واپس کرنا بہت ہی شاق ہوتا ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ آیندہ ایسی پیاری چیز دیکھ کر پھیر لینے کا ارادہ نہ کیا کیجیے۔

انشا کی غزل کے سوا پسلا لیلا، کے قافیوں میں، میں نے کوئی غزل اب سے پہلے نہیں دیکھی۔ کیا عمدہ غزل آپ نے کہی ہے۔ آپ کی طبیعت کا حسن ہر شعر سے ظاہر ہے۔ افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے قاصر رہتا ہوں ورنہ آپ کا شوق چمک جاتا۔ پیرانہ سالی کے علاوہ اور بہت سے

اسباب ہیں۔ جو مجھ کو شاعری کی طرف متوجہ ہونے سے روکتے ہیں۔ چھیلا کا قافیہ کہنے کا ہے۔ شوخ لفظ ہے ضرور لکھیے ..." (۸۲)۔

زاہد: بدن میں آگ بھڑک جائے جس سے وہ شے لا
دو آتشہ کوئی کھنچوا کے ساقیا ے لا

اصلاح: بدن میں الخ
دو آتشہ کوئی سر جوش ساقیا سے لا

ترکیب زرا اور تیز ہو گئی" (۸۳)۔ (۱۱۱) مکتوب مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء۔

"آج ایک خط ملا جس میں یہ غزل تھی جوش نقش پا (مشاطہ سخن حصہ دوم ص ۵۹ میں "ہوشِ نقشِ پا ہے۔) ہجومِ انتشار میں غزل دیکھی اور اپنے گمان میں بنائی۔ واقعی خدا جانے بگاڑی ہے یا بنائی ہے۔ جو الفاظ کاٹ دیے کاٹنے کے وجوہ آپ غور سے سمجھ لیجیے گا۔ زمین مشکل اور پامال ہے شعر آپ نے اچھے اچھے کیے ہیں۔ میں نے جن شعر پر صاد ہیں۔ وہی رکھیے گا۔ مجھے فرصت واطمینان نہیں ہے۔ ورنہ وجوہ بھی حواشی پر لکھ دیتا۔ ماشاء اللہ آپ خود ذہین ہیں۔ سمجھ لیں گے۔ سبحان اللہ کیا غزل کہی ہے اور کس ٹیڑھی زمین میں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے عمر واقبال میں برکت دے اور خیال میں اور وسعت"۔ (۸۴)

"زاہد: یہ ضعف ہے کہ پاؤں مرا اب تو راہ میں
اٹھا ہے ہاتھ رکھ کے سر دوشِ نقشِ پا

اصلاح: یہ ضعف ہے کہ پانو مرا اب قدم قدم
اٹھتا ہے۔ الخ

تناسب الفاظ کے علاوہ قدم قدم دوسرے کے دوش پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا غایتِ ضعف کو ظاہر کرتا ہے۔

زاہد: روزی گرے پڑوں کو پہنچتی ہے ان کے گھر
ہے میرے آبلوں کا لہو نوش نقشِ پا

نوش کا قافیہ خوب کہا ہے۔ ماشاء اللہ اور مصرعہ بھی خوب لگایا سبحان اللہ۔ خورونوش زیادہ مستعمل ہے۔ فقط نوش اس محل پر زبان نہیں اور کوئی عیب بھی نہیں۔ مضمون بہت اچھا ہے اور معناً درست ہے۔ لہذا رہنے دیجیے۔

زاہد: زاہد نے نقش پائے صنم کو مٹا دیا
کچھ ایسے ہوش اڑے نہ رہا ہوش نقش پا

اصلاح: زاہد نے نقشِ پائے صنم کو مٹا دیا
کچھ شوق سجدہ میں نہ رہا ہوشِ نقش پا
نقش پائے صنم کو مٹانے کی علت پوشیدہ تھی۔ شوقِ سجدہ نے ظاہر کر دیا اور احترامِ نقش پا اور پرستش بے خودی، شوق سے ثابت ہو گئی"۔(۸۵)

iv مکتوب مورخہ ۳۰ جون ۱۸۹۲ء۔

"پیارے زاہد۔ زہد مشرب 'جام شراب' والی غزل اس وقت میں نے دیکھی اور مست ہو کر جھومنے لگا۔ مشکل زمین تھی مگر تم نے بہت اچھے اچھے شعر کہے اللہ تمہاری عمر میں برکت دے اور اقبال بڑھائے"(۸۶)

"زاہد: ہاتھ تک اس کے جو ہو دسترس جام شراب
کیوں نہ اس ہاتھ سے ہو پھر ہوس جامِ شراب
اصلاح: ہاتھ تک الخ
کیوں نہ مے خواروں کو ہو پھر ہوسِ جام شراب

دوسرے مصرع میں (ہاتھ سے) کی جگہ مے خواروں بنا دیا ہے۔ کیوں کہ لطف اسی قدر مے نوشی میں ہے کہ جب جام شراب کو یہ فخر حاصل ہو کہ اس کے ہاتھ تک پہنچا ہے۔ تو ایسے جام شراب کی ہوس، مے خواروں کو کیوں نہ ہو اور جب (اس ہاتھ) کہیے گا تو جام شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا کیا فائدہ رہے گا۔

زاہد: قافلے ہوش کے رخصت ہوئے مے خواروں سے
سب جو میخانے میں کھڑکا جرسِ جام شراب
اصلاح: قافلے ہوش کے۔ الخ
سن کے میخانے میں شور جرسِ جام شراب
جرس کا کھڑکنا فصحا نہیں کہتے اس لیے بدلا گیا"۔(۸۷)

v- مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۹۳ء۔

غزلیں دیکھیں بقدر ضرورت بنائیں۔ بارک اللہ ایسی پتھر زمین میں کیا نازک شعر کہے ہیں اور کتنے کہے ہیں کہ جی ہی جانتا ہے اگر اجازت دو اور چاروں غزلیں لکھوا کر مجھے بھیج دو تو میں 'ریاض الاخبار' وغیرہ میں چھپوا دوں تا کہ لوگ دیکھیں کہ ایسی پامال اور سنگلاخ زمینوں میں اب بھی ایسے ایسے پھولنے پھلنے والے موجود ہیں"۔(۸۸)

زاہد: ساقیا لاکھ پلا جامِ پس جام شراب
نہ مٹے گی نہ مٹے گی ہوس جامِ شراب
ساقیا لاکھ پلا۔ الخ

اصلاح: نہ مٹی ہے نہ مٹے گی ہوس جامِ شراب
نہ مٹے گی نہ مٹے گی، سے محض زمانہ آیندہ پایا جاتا تھا۔ اب گذشتہ وحال و آیندہ سب زمانے آگئے۔

زاہد: چاٹتا رہتا ہے پیالے ہی کو مے خانے میں
بن گیا شیخ تو بالکل مگسِ جامِ شراب

اصلاح: کیا بری چاٹ ہے چاٹے ہی چلا جاتا ہے
بن گیا شیخ۔ الخ

مصرعہ اول میں پیالے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ معہذا بندش بھی ذرا چست ہو گئی"۔(۸۹)

"مستوں کی چشمِ مست کی مژہ کو مگسِ جامِ شراب سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ لیکن ایسی تشبیہات میرے نزدیک کراہت سے خالی نہیں۔ شعراء نے خال کو مگس سے تشبیہ دی ہے اور بحر نے باعتبار نیش کے زنبو کے ساتھ تشبیہ دے لی ہے"۔(۹۰)

vi- مورخہ ۳۰ جون ۱۹۹۳ء

"تم نے تو 'فرس جامِ شراب' اور 'قفسِ جام شراب' میں دریا بہا دیے۔ اب ذرا طبع رواں کو روکو، فرصت کے وقت دو دو چار چار شعر کر کے دیکھ لوں گا۔ خاطر جمع رکھو۔ مکرر یہ کہ اب قفس جامِ شراب سے اپنے مرغِ فکر کو رہائی دو۔ ہر زمین میں اشعار کی تعداد غزل سے نہ بڑھ جانا چاہیے۔ ہر زمین کا ایک پیمانہ ہوا کرتا ہے۔ جہاں اس سے بڑھ جاتی ہے۔ بد نمائی آجاتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ سنگلاخ زمینوں میں لاکھ کوشش کی جائے مگر مزے دار شعر ایسے نہیں ہوتے کہ سننے والے چٹخارے بھرنے لگیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمھارا سا مزے دار شاعر، اپنا وقت کیسی شور و لاحاصل زمینوں میں صرف نہ کرے۔ لوچ دار زمین اختیار کرو، دیکھو کیا مزا آتا ہے۔ تمھاری غزلیں بہت اچھی ہو گئی ہیں اور کلام میں ماشاء اللہ صفائی آگئی ہے۔ اب اس زمین کو بھی چھوڑو اور ہمیشہ کے لیے ایسی زمینوں کو ترک کرو"(۹۱)۔

"زاہد: کم نہیں دردِ مے صاف ساقی ہرگز
شیشہ قلب پہ زنگِ ہوسِ جامِ شراب

اصلاح: دُردِ مے سے عالم مستی میں نظر آتی ہے
شیشۂ قلب پہ گردِ ہوسِ جام شراب
مئے صاف دُرد کہاں۔ اور زنگ کو آئینے سے علاقہ ہے نہ کہ شیشے سے"۔
زاہد: مست و مدہوش سے امید ہدایت عبث ہے
راہ نما کب ہے صدائے جرسِ جام شراب
اصلاح: کیا خرابات نشینوں سے ہدایت کی امید
راہ نما کب۔ الخ
جام تو دوسروں کو مست کرنے والا ہے۔ خود مست و مدہوش نہیں"۔(۹۲)

vii مکتوب مورخہ ۲۵ اگست ۱۸۹۳ء،

"مدت کے بعد آج اس کی نوبت آئی کہ میں نے آپ کی یہ غزلیں دیکھیں اور آپ کی طباعی اور زور آوری فکر پر آفریں کہی۔ خداوند تعالیٰ عمر واقبال میں برکت دے۔
... غزل میں شعر اس قدر گنجان اور جگہ تنگ کر کے آپ لکھتے ہیں کہ اصلاح دینے اور وجوہ لکھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ آیندہ سے واضح ہونا چاہیے۔ چند شعروں پر بے اختیار قلم سے صاد نکل گیا ہے۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہی چند شعر انتخاب ہیں۔ ان غزلوں میں بہت سے شعر انتخاب ہیں"(۹۳)۔

viii مکتوب مورخہ ۱۳ جون ۱۸۹۴ء۔

"پیارے زاہد شعر کے مشرب میں زاہد کی صفت خشک مستعمل ہے۔ مگر تمھاری نظم ونثر کی تروتازگی دیکھ کر روح تازہ ہو جاتی ہے اور زہد کی صفت خشک درست نہیں معلوم ہوتی۔ خدا تمھاری شیریں بیانی غذایتِ لسانی میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)
پیارے زاہد آگ لگی والی غزل پر مصرع لگانے کے واسطے تم نے مجھ دل جلے کو تجویز کیا۔ یہ بھی تمھاری طبیعت کی گرما گرمی کا ایک نتیجہ ہے ... غزل کسی وقت دیکھ کر بھیجوں گا۔ سرسری نظر سے دیکھ گیا۔ اصلاح کی حاجت تو معلوم نہیں ہوتی۔ شاید ایک آدھ جگہ کچھ ہے (۹۴)"۔
زاہد: وفور سوزشِ دل سے بدن میں آگ لگی
یہ آگ گھر کی جو پھیلی وطن میں آگ لگی
اصلاح: بڑھی جو قلب کی سوزش بدن میں آگ لگی
یہ آگ گھر کی۔ الخ"(۹۵)

ix مکتوب مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۹۴ء۔

"بد حواسی میں غزل دیکھی۔ اس سنگلاخ زمین میں ایسے شعر کہنا آپ ہی کا کام ہے"۔ (۹۶)

زاہد: عرقِ جبیں بتِ شعلہ رنگ پر یوں ہے
عیاں ہو آگ میں جیسے طلائے خام کی بوند

اصلاح: عرقِ جبیں۔ الخ
بھڑکتی آگ میں جیسے طلائے خام کی بوند

'عیاں ہو' سے بھڑکتی آگ میں، زیادہ گرمی وزور ہے۔

زاہد: ہوا ہو سرد بجھے سوزِ دل شراب چلے
پڑے اگر کوئی ابرِ سیاہ فام کی بوند

مینہ کی بوند۔ پانی کی بوند۔ سب درست مگر ابر کی بوند مستعمل نہیں"(۹۷)

x مکتوب مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۵ء۔

"ابر کی بوند بے شک شعراء نے اور شاہ نصیر اور داغ نے کہا ہے۔ اس سے یہ غلط نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اپنی اپنی پسند ہے۔ زمانوں پر مستعمل نہ ہونے سے میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی اور اگر آپ اپنے کلام میں لکھنا چاہتے ہیں تو چنداں مضائقہ بھی نہیں"۔ (۹۸)

زاہد: جگر کو گرمی بنتِ عنب نے پھونک دیا
حلال کر دے گی زاہد کو یہ حرام کی بوند

اصلاح: جگر کو گرمی۔ الخ
حلال کر گئی زاہد کو یہ حرام کی بوند

'کر دے گی' کی یاے اول کا گرنا ناپسند کر کے اس کی جگہ (کر گئی) بنانا ٹھیک ہے۔ اب اپنے وجدانِ سلیم سے کام لیجیے اور اس مصرع کو یوں ہی رکھیے جیسا میں نے بنایا ہے"(۹۹)۔

xi مکتوب مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۵ء۔

ماشاء اللہ کیا کیا شعر کہے ہیں۔ چشم بد دور جس زمین میں انشا نے چار شعر نکالے آپ نے اس میں دریا بہا دیے بارک اللہ فی عمرکم"۔ (۱۰۰)

"زاہد: ٹپک ٹپک کے نہ سر عندلیب مرجائے
صبا قفس میں نہ پیغام بہمن و دے لا

اصلاح : ٹپک ٹپک کے۔ الخ

صبا چمن میں نہ پیغام و بہمن و دے لا

بہمن و دے خزاں کے مہینے میں شعر کے معنی اس صورت میں بھی درست ہو سکتے ہیں۔ مگر ماہہائے بہار اگر ہوتے تو وہ بلبل کی بے تابی کے واسطے زیادہ تر مناسب ہوتے۔ جیسا کہ شعرا کہا کرتے ہیں۔ اب بجائے قفس کے چمن کر دیا گیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ بلبل جو چمن میں مصروف عیش بہار ہے۔ اس کو آکر پیامِ خزاں نہ سنا۔ مبادا سر پٹک پٹک کر مر جائے"۔ (۱۰۱)

xii مکتوب مورخہ مارچ ۱۸۹۶ء۔

"تمھارے ایک شعر کے معنی میں نہیں سمجھا کہ بلغم کی طرح دوش و سر کی پوٹ کیا چیز ہے۔ یہ مضمون غالباً کسی قصے سے متعلق ہو گا۔ جو مجھے معلوم نہیں"۔ (۱۰۲)

"زاہد : سنگِ در حرم پہ اسے جا کے کیا رکھیں
جو سر کہ کھا چکا ہے ترے سنگِ در کی چوٹ

اصلاح : سنگِ درِ حرم پہ اسے کیا جھکایئے
جو سر کہ - الخ۔

رکھیں میں اب تخفیفِ کاف کو فصحا خلافِ فصاحت جانتے ہیں۔

زاہد : خالق جو عمر دے تو قوی بھی عطا کر
بلغم کی طرح سے فکرے دوش و سر کی چوٹ "(۱۰۳)

xiii مکتوب مورخہ ۱۴ جولائی ۱۸۹۷ء۔

"غزلیں تمھاری ابتدائی شاعری کی کہی ہوئی مل گئیں۔ ان کو بھی سرسری نظر سے دیکھ کر صحیح کر دیا۔ ان کو خود بھی تم اپنے ذوقِ سلیم سے درست کر سکتے تھے"(۱۰۴)۔

" زاہد : وہ جو رنگ رنگ کے قصر تھے وہ عمارتیں تو عجب تھیں
وہاں صرف اب کھنڈر پڑے نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے۔

اصلاح : وہ جو رنگ کے۔ الخ
کھنڈر اب وہاں نظر آتے ہیں ۔ نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے۔

الفاظ ہندیہ میں سے آخر کار حرف گرتا ہے۔ بیچ کا نہیں گرتا۔ فلہذا وہاں کی تصحیح کر دی گئی"(۱۰۵)

" نشے میں 'ی' سے پہلے ہمزہ متروک چاہیے۔"(۱۰۶)

"زاہد: تری بات کا بت بے وفا کوئی کیا یقین کرے بھلا
کبھی اس سے وعدہ و عید ہیں کبھی اس سے قول و قرار ہے

قرار بہ معنی اقرار، عربی و فارسی میں تو نہیں ملتا۔ البتہ بغیر واو عطف قول و قرار کو جس طرح آپ نے اردو کرلیا ہے۔ اس کا مضائقہ نہیں"۔

زاہد: جنھیں شوق نام و نشان تھا یہی فکر تھی یہی دھیان تھا
انھیں یوں فلک نے مٹا دیا نہ نشان ہے نہ مزار ہے

اصلاح: جنھیں شوق تھا کہ نشان رہے کوئی یادگارِ مکاں رہے
انھیں یوں۔ الخ

اضافت کی حالت میں اعلانِ نون جائز نہیں۔

زاہد: ارم ہو حرم ہو یا دیر ہو
ہمیں صرف ذوقِ نظر چاہیے

اصلاح: ارم ہو حرم ہو کہ بت خانہ
ہمیں صرف۔ الخ

'دیا' اب بالکل متروک ہے۔ اس جگہ صرف یا بولتے ہیں یا 'کاف' سے کام لیجیے جو 'یا' کے معنی میں آتا ہے۔

زاہد: حقیقت ہی ہے فی الحقیقت مجاز
۱۔ نگاہِ حقیقت نگر چاہیے
۲۔ مگر دیدۂ حق نگر چاہیے

یہ دونوں مصرعے اچھے ہیں۔ مگر تناسب الفاظ کے لحاظ سے مصرعہ اوّل، اوّل ہے۔ (۱۰۷)

"یہ شعر مجھ کو جی سے پسند آیا بارک اللہ خوب خوب کہا ہے۔

وہ آنکھوں میں ہے پتلیوں کی طرح
مگر دیکھنے کو نظر چاہیے" (۱۰۸)

xiv مکتوب مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۷ء۔

"اب غزل دیکھنے کی نوبت آئی۔ آپ کی قوتِ فکر اس سے پیدا ہے کہ ایسی پامال زمین میں سوا سو شعر آپ نے موزوں کیے ہیں۔ اللھم زد فزد۔ میں نے بقدر ضرورت ایک آدھ جگہ محو و اثبات کیا اور جو شعر قابلِ انتخاب نظر آئے ان پر صاد کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ جو اشعار دائرہ تغزل سے باہر نہیں ان پر "مت" بنا دی ہے۔ یہ اشعار بھی سب غزل میں رکھنے کے قابل ہیں۔ باقی اشعار کے رکھنے میں اختیار ہے"۔ (۱۰۹)

XV ۱۲مارچ ۱۸۸۹ء ص ۲۳۴۔

" استفتے سے متعلق میں نج کے طور پر آپ کو اپنا مشرب لکھتا ہوں کہ میں ہدفِ سہامِ ملامت ہونے کی طاقت نہیں رکھتا اور تمام عمر تجربہ ہوا کہ اول تو مناظرہ جو احقاقِ حق سے عبارت ہے ہوتا ہی نہیں اور بالفرض ابتداء میں کہیں ہوتا بھی ہے تو انجامِ کار مکابرے اور مجارے کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ لہٰذا میں کبھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا اور کسی استفتے پر فتوی نہیں دیتا۔ البتہ میرے سچے دوست جو بات مجھ سے پوچھتے ہیں۔ اپنی رائے ناقص کے موافق ان کو بتا دیتا ہوں۔ اسی مشرب کی بنا پر میں تاریخ مبحوث عنہ سے بحث نہیں کرتا اور آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بے فائدہ یہ دردِ سر مول نہ لیا کیجیے۔ جب خصوصیت مباحث متعلقہ تاریخ سے قطع نظر کی گئی تو اب بتانے کی بات یہ رہی کہ مشتری ستارہ مذکر ہے یا مونث واضح ہو کہ یہ ستارہ مونث ہے اور جہاں کہیں سخن دانوں اور سخنوروں نے استعمال بہ تذکیر کیا ہے وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے۔ جس کو مشتری سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے ناسخ کے اس مطلع پر :

شعر :

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

ان کے شاگردِ رشید مرزا محمد رضا برق نے جو مصرے لگائے ہیں۔ اس میں قمری کو جس کی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں۔ بہ تذکیر استعمال کیا ہے۔ تو بات یہی ہے کہ وہاں قمری طائر مقصود نہیں ہے وہ تضمین یہ ہے :

پروانہ ہوں ازل سے سراجِ منیر کا
قمری ہوں سرو باغ علی کبیر کا
میں نغمہ سنج ہوں چمنِ بے نظیر کا
بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیر کا

جہاں تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ آئے گا۔ وہاں مشتری سے دولہا ہی مقصود ہوگا۔ جیسے قمری سے برق کے شعر میں عاشق یا خود متکلم و مصنف مراد ہے۔ زیادہ آپ سے ذکی اور فہمیدہ سخنور کو لکھنے کی حاجت نہیں۔ اگر تتبع کلام اساتذہ سے آپ کو کوئی سند مشتری، کوکب کی تذکیر کی پایئے تو مجھے بھی لکھیے۔ بحث تمام ہوئی" (۱۱۰)۔

''مادۂ تاریخ میں لفظ 'ایجاب'، محض اور بجائے 'قران' لفظ 'وصل' لانا اور اسی سے معنی ایجاب و قبول اور 'قران و اجماع'، لینا بہت تکلف ہے۔ اس باب میں مجھے بھی آپ کی رائے سے اتفاق کلی ہے۔ ''دامنِ گلچیں'' کی غزل دیکھی اور کمیٹی انتخاب میں منتخب ہوگئی۔ غزل آپ نے بہت اچھی کہی ہے۔ اصلاح کی فی الحقیقت ضرورت و گنجائش نہ تھی۔ بے شبہہ آپ نے حذاقت سے غور کر کے منالیا کیجیے۔ اگر کبھی کوئی شعر مشکوک ہی رہ جائے تو اس کو لکھ بھیجا کیجیے۔'' (۱۱۱)۔

''زاہد: کیا وصف ہو اس خالق بے چون و چرا کا
یہاں درد ہے سبحانک لاعلم لنا کا

یاں اور واں یا یہاں اور وہاں بر وزن فاع، فصحائے لکھنؤ اب نہیں لکھتے۔ لیکن آپ چوں کہ دہلی کی زبان پسند کرتے اور اسی کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لیے آپ لکھیے:

زاہد: واقف نہیں کوئی مرے اندازِ بیان سے
جو ہے وہ یہاں بولتا ہے اپنا ہی بھاگا

اصلاح: واقف نہیں۔ الخ
ہر شخص یہاں بولتا ہے اپنی ہی بھاگا

بیان و ترکیب ذرا صاف ہوگئی (۱۱۲)۔

''لفظ 'ساگا' کی اصل 'ساگھا' بمعنی جنگ و جدل ہے۔ میر تقی میر مرحوم کے شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متوسطین و متاخرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔ 'بھاکا' اصل میں 'بھاشا' ہے۔ اور ہندی میں 'شا' اور 'کھا' کا بدلا ہوتا ہے۔ اردو میں فصحا کی زبان پر بیشتر 'بھاکا' اور کمتر 'بھاشا' مستعمل ہے'' (۱۱۳)۔

(۹)

امیر اپنے دور کے ایک باشعور استاد تھے۔ وہ تعلیمی نفسیات سے بھی آگاہ تھے اور علم کی فلاسفی سے بھی، وہ ادبی تاریخ سے بھی آشنا تھے اور ادبی رویوں سے بھی۔ وہ ایسے استاد تھے، جن کا طریقہ یا انداز سماجی کارکن جیسا تھا۔ گویا امیر اپنی تمام علمی، ادبی اور سماجی حیثیتوں کے ساتھ شاگردوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شاگرد ان کا گرویدہ تھا۔ بشیر ملیح آبادی، امیر کے علاوہ داغ سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ لیکن امیر کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بشیر ملیح آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے بشرطِ خیریت و امکان آپ کی خدمت گزاری اور آپ کی خوشی سے کام ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں کہ آپ شاگرد کس کے کہے جائیں''۔ (۱۱۴)

زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں کہ : "آپ کی عنایت وسیادت سے امید عفو جرم کی رکھتا ہوں"۔(۱۱۵)ایک اور خط میں امیر کا جذبہ خدمت ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں : "آپ کی خدمت گزاری کو اپنا فخر سمجھتا ہوں"۔(۱۱۶)ثاقب کے نام خطکو توجہ سے دیکھیے کہ ایک استاد، شاگرد سے کس عاجزی وانکساری سے مخاطب ہے۔ یہ ہے ایک سماجی کارکن کے بھید میں چھپا ہوا ایک استاد اور ایک عالم :

"میرے دل نواز! مجھے آپ سے مطلق شکایت نہیں، بلکہ بدستور آپ کی محبتِ قدیمانہ پر بھروسہ ہے۔ حجاب ہے تو اپنے تساہل کی بدولت ہے اور شکایت ہے تو اپنی کم نصیبی سے ہے کہ احباب کی خدمت گزاری سے بھی قاصر رہتا ہوں۔ مکروہات کا ہجوم رہتا ہے"۔(۱۱۷)

امیر باوجود اپنی بیماریوں اور دیگر مصروفیات کے، شاگردوں پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ ہر ممکن مدد کے لیے تیار رہتے اور چاہتے تھے کہ ان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص ممتاز ہو۔ امیر کی یہ عادت ان کے صوفیانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں صوفی سے بڑھ کر کوئی باشعور سماجی کارکن نہیں ہوتا، اور کیوں کہ امیر بھی بنیادی طور پر صوفی ہی تھے۔ اسی وجہ سے کہ وہ بھی انسانیت کی خدمت کے لیے اپنے میدان میں بہت آگے تھے۔ بلاشبہ امیر، علم کی شمع جلانا بھی جانتے تھے اور طالبِ علم کی پیاس بجھانا بھی۔ اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں کہ :

"جوبات مجھے لکھ بھیجنے کے قابل ہو، وہ ضرور لکھیے اور حسبِ وعدہ ہمیشہ صلاح نیک سے شاد کام رکھیے"۔(۱۱۸)

امیر کے مزاج اور عادات کا مطالعہ کرنے کے بعد جب شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ اپنے رویوں کی وجہ سے ایک منفرد استاد کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اس کی مثال گذشتہ صفحات میں زاہد حسین کے نام سولہ خطوط کے وہ اقتباسات ہیں۔ جن میں جا بجا امیر کے علمی جوہر ملتے ہیں اور استاد کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں اور شاگردوں کے ساتھ برتاؤ کا پتا چلتا ہے۔

(۱۰)

امیر کا طریقہ یہ تھا کہ جو کلام اصلاح کے لیے موصول ہوتا، اسے توجہ کے ساتھ ملاحظہ کرتے۔ اور درستگی کی وجوہ بیان کرنے سے قبل کلام کے محاسن گنواتے، کلام کی خوب تعریف کرنے کے بعد دعاؤں سے سرفراز کرتے۔ مثلاً غزل آپ نے خوب کہی ہے۔ ماشاء اللہ تم ماشاء اللہ۔ زمین بھی نئی تھی، شعر بھی مزے کے نکلے"۔ یا ایک اور موقع پر لکھتے ہیں : "ماشاء اللہ کیا اچھے اچھے شعر آپ نے کہے ہیں۔ خدا آپ کی عمر واقبال میں برکت دے"۔ امیر کا یہ رویہ صرف مخصوص شاگردوں کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ ان کی اصلاح کے نظام کا حصہ تھا۔ محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو رقم طراز ہیں :

"پیاری نظم ونثر نے مسرور کیا۔ سر کے پاؤں بری زمین تھی۔ آپ نے غزل زورِ طبیعت سے بہت اچھی کہی۔ ایسی زمین میں تکلف اور بناوٹ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ 'اثرباقی' مزے کی زمین تھی، اس میں مزے کے شعر نکلے"۔(۱۱۹)

امیر نے اس تعریف میں نہایت خوب صورتی سے تعریفی کلمات کے ساتھ شعر کے لیے اچھی اور بری زمین کی تعریف بھی

پیش کر دی۔ امیر کے نزدیک ایسی زمین میں جس میں، تکلف اور بناوٹ کے اشعار نکلیں، وہ بری زمین ہے۔ اس لیے کہ ان اشعار کا تاثر وقتی طور پر اچھا ہوتا ہے۔ اسے اشعار مشاعرے میں پڑھے جائیں تو خوب واہ واہ ہو جاتی ہے، لیکن اشاعت کے بعد روکھے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح کاایک اور تعریفی پیرایہ ملاحظہ کیجیے امیر کس عمدگی سے شاگرد کو حوصلہ اور اعتماد دیتے ہیں :

"پیارے زاہد! شعر کے مشرب میں زاہد کی صفت خشک مستعمل ہے۔ مگر تمھاری نظم و نثر کی تروتازگی دیکھ کر روح تازہ ہو جاتی ہے اور زہد کی صفت خشک درست نہیں معلوم ہوتی۔ خدا تمھاری شریں بیانی اور غذائیتِ لسانی میں روزافزوں ترقی عطا فرمائے۔ آمین"۔(۱۲۰)

زاہد کے کلام سے امیر نے جو دل چسپ نکات اخذ کیے ہیں، وہ اس بات کے غماز ہیں کہ امیر، شاگرد اور اس کے کلام کا مطالعہ دقتِ نظر سے کیا کرتے تھے۔ اور تعریف کسی نہ کسی خوبی کی بنیاد پر کیا کرتے تھے۔ امیر خیالی یا بے جا تعریف سے گریز کرتے تھے۔ ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ کلام میں خوبی نہیں ہے۔ لیکن کیوں کہ شاگرد ایک بڑے منصب پر فائز ہے، اس لیے اس کی بڑائی کر دی، اگر کبھی ایسی کوئی صورت آپڑتی، تو پھر تعریف شاگرد کے کسی اور کارنامے کی کرتے تھے۔ مثلاً احسن اللہ ثاقب کے نام خط کو ملاحظہ کیجیے، جس میں امیر نے کلام کے بہ جائے، ان کی سعادت مندی کی تعریف کی ہے اور دعا دی ہے :

"اللہ آپ کی عمر میں ایسی برکت دے کہ میرے اس مطلع کے مصداق ہو جائیں ~

باقی نہ کوئی دل میں الٰہی ہوس رہے
بارہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے"۔(۱۲۱)

ثاقب کے مقابلے میں منشی ولایت علی صفی پوری کی تعریف، ان کے کلام پر ہے اور جو ایک استاد کی طرف سے عطا کردہ سند سے کم نہیں :

"الحق آپ جوہر قابل ہیں اور ہر رنگ میں مذاق آپ کا اچھا ہے۔ کیسی کیسی مشکل زمینوں میں آپ نے نعت کی غزلیں کہی ہیں کہ ان زمینوں میں شاعر سے عاشقانہ شعر بھی مشکل سے نکل سکتے ہیں۔ بارک اللہ عمر کم"۔(۱۲۲)

امیر نے خود بھی ایک نعتیہ دیوان کہا تھا۔ وہ یہ بات عمدگی سے جانتے تھے کہ کس زمین میں نعت کہنا آسان اور کس میں مشکل۔ امیر کے متعدد بیانات سے پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک سب سے پہلے یہ انتخاب کرنا ضروری ہے کہ کس زمین میں اشعار کہے جائیں۔ امیر کے خیال میں اچھی اور لوچ دار زمین ایسی ہوتی ہے جس سے بامعنی اور پر تاثیر اشعار نکلتے ہیں۔ اگر زمین ست ہو تو وقت برباد ہوتا ہے۔ بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں کہ : "زمین کے ست ہونے سے اکثر شعر ست ہیں"۔(۱۲۳) امیر کے بیانات سے زمین کے انتخاب کی بابت تعریف کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ جب شاگرد کسی نئی زمین، کسی استاد کی مشہور زمین یا مشکل پامال یا سنگلاخ زمین میں اشعار کہنے میں کام یاب ہو جاتا تو امیر جھوم اٹھتے اور تعریف کرتے نہ تھکتے۔

زاہد حسین زاہد کو ایک خط (گذشتہ صفحات میں مذکور خط نمبر ۱۰) میں رقم طراز ہیں : "پیارے زاہد، زہد مشرب، جام شراب

والی غزل اس وقت میں نے دیکھی اور مست ہو کر جھومنے لگا۔ مشکل زمین تھی مگر تم نے بہت اچھے اچھے شعر کہے"۔ زاہد ہی کے نام ایک اور خط (گذشتہ صفحات میں مذکور خط نمبر ۷) میں لکھتے ہیں کہ :بارک اللہ ایسی پتھر زمین میں کیا نازک شعر کہے ہیں اور کتنے کہے ہیں کہ جی ہی جانتا ہے"۔ ایک اور خط میں امیر لکھتے ہیں کہ : آپ کی قوتِ فکر اسی سے پیدا ہے کہ ایسی پامال زمین میں سوا سو شعر آپ نے موزوں کیے ہیں۔ اللھم زِد فزِد"۔

امیر ہر شاگرد کے مزاج اور عادت و اطوار سے واقف تھے۔ ان کی حیثیت اس چرواہے کی سی تھی، جو دور کسی درخت کے نیچے بیٹھا ہر جانور پر نظر رکھتا ہے کہ کون سا جانور کون سی گھاس کھاتا ہے؟ کون سا جانور کتنی دور جاسکتا ہے؟ کون ایک آواز میں اپنی جگہ واپس آجائے گا اور کون سا جانور کس قسم کی آواز یا ڈانٹ سے ڈر کر آجائے گا؟ کس کو پوچکارنے کی ضرورت ہے اور کس کو نہیں۔ الغرض امیر کا برتاؤ ہر شاگرد کے مزاج کے مطابق تھا۔

(۱۱)

امیر لکھنوی شاعری کے علم بردار تھے۔ لیکن ان کے بعض شاگرد دہلوی طرز کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ امیر کسی شاگرد کو پابند نہیں کرتے تھے کہ وہ بھی لکھنوی شعری روایات کا اتباع کریں۔ بلکہ امیر کا طریقہ یہ تھا کہ دوران اصلاح دہلی اور لکھنو کے اساتذہ کے کلام سے اسناد پیش کر کے فیصلہ، عموماً شاگرد ہی پر چھوڑ دیتے تھے۔ زاہد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں :"چوں کہ آپ دہلی کی زبان پسند کرتے اور اسی کا اتباع کرتے ہیں، اس لیے آپ لکھیے"۔ ایک اور خط سے بھی پتا چلتا ہے کہ امیر مشورے یا کسی شاگرد کو مجبور نہیں کیا کرتے تھے۔ زاہد کے نام ایک خط میں مذکور ہے کہ :

"ابر کی بوند بے شک شعراء نے اور شاہ نصیر اور داغ نے کہا ہے۔ اس سے یہ غلط نہیں کہا جاسکتا، لیکن اپنی اپنی پسند ہے۔ زبانوں پر مستعمل نہ ہونے سے میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی اور اگر آپ اپنے کلام میں لکھنا چاہتے ہیں تو چنداں مضائقہ بھی نہیں"۔

ایک اور خط میں لکھا کہ :"قرار بہ معنی اقرار عربی و فارسی میں تو نہیں ملتا۔ البتہ واؤ عطف قول و قرار کو جس طرح آپ نے اردو کر لیا ہے۔ اس کا مضائقہ نہیں"۔ یا روک ٹوک اس طرح بھی کرتے تھے کہ :"رکھیں میں، اب تخفیفِ کاف کو فصحا خلافِ فصاحت جانتے ہیں"۔

امیر کے مزاج میں یہ لچک اس لیے تھی کہ وہ فطرتاً انتہا پسند نہیں تھے، عاجزی و انکساری کا نمونہ تھے، انانیت بھی نہیں تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے طریقۂ تربیت میں خلوص تھا اور ہر اصلاح میں حکمت پوشیدہ ہوتی تھی۔ وہ امیر اچھے کلام کے دلدادہ تھے۔ کلام شاگرد کا ہو یا کسی معاصر کا تعریف کا حق ضرور ادا کرتے اور تعریف ہی میں کلام کے معائب و محاسن کی نشان دہی بھی کرتے جاتے۔ اسی طرح مشورہ، کوئی شاگرد مانگے یا معاصر، وہ عاجزی و انکساری سے ذمہ داری پوری کرتے۔ کسی بھی موقع پر اپنے بڑے پن کی رونمائی نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی شاگرد یا معاصر اپنے کلام پر رائے طلب کرتا تو غیر جانب داری سے کلام پر رائے دیتے اور کلام، انتخاب کر دیتے۔ مثلاً زاہد کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ :"چند شعروں پر بے اختیار قلم سے صاد نکل گیا ہے۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہی چند شعر انتخاب

ہیں۔ان غزلوں میں بہت سے شعر انتخاب ہیں"۔ ملاحظہ کیجیے کہ امیر نے کس حکمت کے ساتھ کچھ اشعار کو صاد کیا اور بقیہ کا اختیار یہ کہہ کر دے دیا کہ "آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہی چند شعر انتخاب ہیں"۔ گویا چند اشعار پر بے اختیار صاد نکل گیا وہ تو بہترین ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بہتر اشعار بھی ہیں۔ جنھیں اب آپ انتخاب کر لیجیے۔

(۱۲)

امیر کی اصلاح کے نظام کا ایک اہم عنصر یہ بھی تھا کہ اچھا شعر جو معمولی اصلاح سے درست ہو سکے اسے رد نہیں کیا کرتے تھے۔ مثلاً داغ کو لکھتے ہیں :

میری عادات ہے کہ کسی کا اچھا شعر جو اندک تصرف سے درست ہو سکے، بے دردی سے اس پر چھری نہیں پھیرتا"۔(۱۲۴)

امیر کے اس بیان کی تصدیق ان کے متعدد مکاتیب سے ہوتی ہے۔ مثلاً بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں : غزل ۰۰۰ سرسری نظر سے دیکھ کر انتخاب کر دی۔ تمھارا حسن طبیعت آرائشِ اصلاح کا محتاج نہیں خال خال کہیں کہیں کچھ بنا دینا کافی ہے"۔(۱۲۵) حبیب الرحمٰن شروانی کو رقم طراز ہیں کہ :یہ سب شعر اچھے ہیں۔ایک آدھ جگہ دخل دیا۔باقی ضرورت اصلاح کی نہ تھی"۔(۱۲۶) ایک اور موقع پر لکھتے ہیں : غزلیں دیکھیں، دو تین جگہ تصرف کیا"۔(۱۲۷) اور خط میں شروانی کو رقم طراز ہیں :"ضروری تصرف کیا، زیادہ حاجت بھی نہیں"۔(۱۲۸) زاہد کو (مذکورہ خط نمبر ۷) لکھتے ہیں "غزلیں دیکھیں بقدر ضرورت بنائیں"۔ بعض اوقات شاگرد کا اصرار ہوتا تھا کہ استاد لازماً اصلاح کریں تو اسی صورتِ حال میں، امیر شاگرد کے اطمینان کے لیے کہ کہیں کہیں اصلاح کر دیتے تھے۔ جیسے زاہد کو لکھتے ہیں کہ :"اپنا حق ثابت کرنے کو میں نے کچھ دخل دیا"۔ امیر کے کئی خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ شعر، انتخاب کرنے کے بعد جو اشعار رکھنے کے نہیں ہوتے اس کی وضاحت بھی بہت واضح انداز میں کیا کرتے تھے۔ مثلاً بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں کہ :

> "غزل آپ کی میں نے دیکھ لی۔ ۲۲ شعروں پر انتخابی صاد کر دیا ہے۔ یہی چھپنے کو دیے جائیں۔ تو بہتر ہے اور شعر بھی صحیح ہیں مگر وہ اس مرتبے کی نہیں ہیں"۔(۱۲۹)

بشیر ملیح آبادی کے نام خط میں مذکور ہے کہ :

> "پوری غزل اچھی ہے۔ جو شعر قابلِ انتخاب نظر آئے ان پر صاد کر دیا ہے۔ان کے علاوہ جو اشعار دائرہ تغزل سے باہر نہیں ان پر "مت" بنا دی ہے۔ یہ اشعار بھی سب غزل میں رکھنے کے قابل ہیں باقی اشعار کے رکھنے میں اختیار ہے"۔(۱۳۰)

امیر شاگردوں کا کلام نہایت توجہ سے دیکھتے۔ بناتے۔ انتخاب کرتے، وجوہ لکھتے اور پھر شاگرد کے حوالے کر دیتے اور یہ اختیار بھی اسے دے دیتے تھے کہ اصلاح قبول کرے یا نہ کرے۔ اصلاح کے بعد بھی شاگرد کسی مسئلے میں وضاحت چاہتا تو تسلی بخش جواب تحریر کرتے۔ مستند کتب و رسائل کے حوالے دیتے اور یہ بھی وضاحت کرتے کون سی کتابیں شاگردوں کے لیے مفید ہیں اور کون سے مضر، زاہد حسین زاہد کو تحریر کرتے ہیں :

> "مخزن المحاورات چرنجی لال کا کیا اعتبار، اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہیں"۔(۱۳۱)

اسی خط میں مزید رقم طراز ہیں کہ :

"بات دیکھنا،، راہ دیکھنے کے معنی فصحائے لکھنؤ و دہلی کی زبان نہیں۔ میر کا کہنا اس وقت سند نہیں ہو سکتا، اس وقت بولتے ہوں گے۔ اب کوئی نہیں بولتا"۔(۱۳۲)

مذکورہ معلومات کے تسلسل میں احسن اللہ ثاقب کے نام ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے امیر کی تربیت کے ایک اور پہلو کا پتا چلتا ہے :

"جو قسم شعر کہیے ابتداء میں کسی استاد سے اصلاح لیجیے۔ اس کی محو اثبات سے چند روز میں خود راہ راست پر آجائے گا۔ لغزش جاتی رہے گی۔ رہا منزلِ مقصود پر پہنچ جانا، یہ بہت مشکل ہے۔ اسباب سب فراہم ہوں، تب بھی :

عمرے باید کہ یار آید کنار

عروضِ عربی کے رسائل بہت ہیں۔ بعضے چھپ بھی گئے ہیں۔ 'معیار الاشعار' محقق نصیر الدین طوسی، جامع عروضِ عربی و عروضِ پارسی ہے اور اگر عروضِ عربی زبان، عربی میں مقصود ہو تو شرح قصیدہ خزجیہ دیکھیے اور مولوی محمد سعد اللہ صاحب مرحوم نے عروض یا قافیہ ایک متن مع شرح لکھا ہے۔ وہ چھپ گیا ہے۔ وہاں نہ ملے تو میں تلاش کر کے بھیج دوں"۔(۱۳۳)

امیر کو عربی و فارسی لغات اور عروض سے متعلق رسائل کا گہرا ادراک تھا۔ فارسی اور اردو کی شعری روایات پر بھی گہری نگاہ تھی۔ ان کے عہد تک جو لغات اور عروض، تذکیر و تانیث و محاورات سے متعلق کتابیں تالیف ہوئی تھیں۔ وہ امیر کی دسترس میں تھیں۔ اور جو باتیں کتابوں میں نہیں ملتی، وہ ان کے سینے میں محفوظ تھیں۔ گویا امیر علم کا ایک دفتر تھے۔ یہاں آنے کے بعد شاگرد کندن ہو کر نکلتا۔ جو شاگرد آنہیں سکتے وہ خط و کتابت کرتے اور فیض یاب ہوتے۔ شاگرد، امیر سے جو پوچھتے اس کا وہ اطمینان بخش جواب دیتے۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی حاشیے لکھتے اور سند میں اساتذہ کے اشعار پیش کرتے۔ جہاں بحث مطلوب ہوتی، تو تفصیل سے ہر ہر پہلو پر نظر کرتے۔ اس کی مثال میں زاہد حسین زاہد کے نام وہ خطوط پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جو گذشتہ صفحات میں مندرج ہیں۔ اس کے علاوہ "مشاطہ سخن" حصہ اول اور دوم میں بھی امیر کی جو اصلاحیں یکجا کی گئیں ہیں وہ بھی قابلِ توجہ ہیں۔

(۱۳)

اب ذیل میں زاہد حسین زاہد کے کلام پر لکھے گئے کچھ حاشیے پیش کیے جاتے ہیں، جو امیر کے استادانہ مرتبے کو اجاگر کرتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امیر، تلامذہ کے کلام کو کس کس زاویے سے جانچتے تھے۔

۱۔ مصرعہ ثانی میں جو (نپاؤ گے) کی تکرار مفید تاکید ہے اس کے مقابل مصرعہ اولیٰ میں (نہیں آتا) کی تکرار زیادہ مناسب و موزوں ہے۔

۲۔ چھیلا کا قافیہ ضرور کہنے کا ہے۔ شوخ لفظ ہے، ضرور لکھیے۔

۳۔ تناسبِ الفاظ کے علاوہ قدم قدم دوسرے کے دوش پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا غایتِ ضعف کو ظاہر کرتا ہے۔

۴۔ نقشِ پائے صنم کو مٹانے کی علت پوشیدہ تھی۔ شوقِ سجدہ نے ظاہر کر دیا اور احترام نقشِ پا اور پرستش بے خودی شوق سے ثابت ہو گئی۔

۵۔ دوسرے مصرع میں (ہاتھ سے) کی جگہ سے خواروں بنا دیا ہے۔ کیوں کہ اسی قدرے نوشی میں ہے کہ جب جام شراب کو یہ فخر حاصل ہو کہ اس کے ہاتھ تک پہنچا ہے۔ تو ایسے جامِ شراب کی ہوش بے خواروں کو کیوں نہ ہو۔ اور جب (اس ہاتھ) کہیے گا تو جام شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا کیا فائدہ رہے گا۔

۶۔ جرس کا کھڑکنا فصحا نہیں کہتے، اس لیے بدلا گیا۔

۷۔ مصرعہ اول میں "پیالے" کی چنداں ضرورت نہ تھی معہذا بندش بھی ذرا چست ہو گئی۔

۸۔ مئے صاف دُرد کہاں۔ اور زنگ کو آئینے سے علاقہ ہے نہ کہ شیشے سے۔

۹۔ جام تو دوسروں کو مست کرنے والا ہے۔ خود مست و مدہوش نہیں۔

۱۰۔ عیاں ہو، سے بھڑکتی آگ میں، زیادہ گرمی و زور ہے۔

۱۱۔ کردے گی، کی "ے" اول کا گرنا ناپسند کر کے اس کی جگہ (کر گئی بنانا) ٹھیک ہے۔

۱۲۔ الفاظِ ہندیہ میں سے آخر کا حرف گرتا ہے بیچ کا نہیں گرتا۔ فلہذا وہاں کی تصحیح کر دی گئی۔

۱۳۔ نشے میں "ی" سے پہلے ہمزہ متروک ہے۔

۱۴۔ اضافت کی حالت میں اعلانِ نون جائز نہیں۔

۱۵۔ دیا اب بالکل متروک ہے۔ اس جگہ صرف یا بولتے ہیں یا کاف سے کام لیجیے جو "یا" کے معنی میں آتا ہے۔

۱۶۔ یہ دونوں مصرعے اچھے ہیں۔ مگر تناسبِ الفاظ کے لحاظ سے مصرعہ اوّل، اوّل ہے۔

مذکورہ حاشیوں کے علاوہ امیر کے خطوط سے علمی وادبی نکات باب دوّم اور سوم میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تمام نکات شاگردوں کے نام خطوط سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے نکات وہ ہیں جو امیر کے دور میں ہونے والی شعر وادب سے متعلق مباحث سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت سے ایسے ہے جو اس دور میں شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے ہیں۔ گویا امیر کے خطوط میں اٹھارویں صدی کے آخری ربع میں ہونے والی علمی، ادبی اور لسانی مباحث کی بازگشت بھی ملتی ہے۔ اس موقعے پر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ امیر کے دور میں ہونے والی شعر و سخن سے متعلق بحث و مباحثے میں امیر اور ان کے تلامذہ کا کردار کیسا رہا۔ اس سلسلے میں بھی شاگردوں کے نام ان کے خطوط ہماری بے حد معاونت کرتے ہیں۔ امیر نے تلامذہ کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ اختلافی باتوں سے گریز کریں، اس حوالے سے امیر کے کچھ اصول زاہد کے نام خط میں ملتے ہیں :

> "تمام عمر تجربہ ہوا کہ اوّل تو مناظرہ جو احقاق۔ حق سے عبارت ہے ہوتا ہی نہیں اور بالفرض ابتداء میں کہیں ہوتا بھی ہے، تو انجامِ کار مکابرے اور مجادے کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ لہذا میں کبھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا اور کسی استفتے پر فتویٰ نہیں دیتا۔ البتہ میرے سچے دوست جو بات مجھ سے پوچھتے ہیں۔ ایسی رائے ناقص کے موافق ان کو بتا دیتا ہوں"۔

۴۔ نقشِ پائے صنم کو مٹانے کی علت پوشیدہ تھی۔ شوقِ مسجد نے ظاہر کر دیا اور احترام نقشِ پا اور پرستش بے خودی شوق سے ثابت ہو گئی۔

۵۔ دوسرے مصرع میں (ہاتھ سے) کی جگہ سے خواروں بنا دیا ہے۔ کیوں کہ اسی قدر مے نوشی میں ہے کہ جب جام شراب کو یہ فخر حاصل ہو کہ اس کے ہاتھ تک پہنچا ہے۔ تو ایسے جامِ شراب کی ہوش بے خواروں کو کیوں نہ ہو۔ اور جب (اس ہاتھ) کہیے گا تو جام شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا کیا فائدہ رہے گا۔

۶۔ جرس کا کھڑکنا فصحا نہیں کہتے، اس لیے بدلا گیا۔

۷۔ مصرعہ اول میں "پیالے" کی چنداں ضرورت نہ تھی معہذا بندش بھی ذرا چست ہو گئی۔

۸۔ مئے صاف دُرد کہاں۔ اور زنگ کو آئینے سے علاقہ ہے نہ کہ شیشے سے۔

۹۔ جام تو دوسروں کو مست کرنے والا ہے۔ خود مست و مدہوش نہیں۔

۱۰۔ عیاں ہو، سے بھڑکتی آگ میں، زیادہ گرمی و زور ہے۔

۱۱۔ کردے گی، کی "ے" اول کا گرنا نا پسند کر کے اس کی جگہ (کر گئی بنانا) ٹھیک ہے۔

۱۲۔ الفاظِ ہندیہ میں سے آخر کا حرف گرتا ہے بیچ کا نہیں گرتا۔ فلہٰذا وہاں کی تصحیح کر دی گئی۔

۱۳۔ نشے میں "ی" سے پہلے ہمزہ مقرو چاہیے۔

۱۴۔ اضافت کی حالت میں اعلانِ نون جائز نہیں۔

۱۵۔ دیا اب بالکل متروک ہے۔ اس جگہ صرف یا بولتے ہیں یا کاف سے کام لیجیے جو "یا" کے معنی میں آتا ہے۔

۱۶۔ یہ دونوں مصرعے اچھے ہیں۔ مگر تناسبِ الفاظ کے لحاظ سے مصرعہ اوّل، اوّل ہے۔

مذکورہ حاشیوں کے علاوہ امیر کے خطوط سے علمی و ادبی نکات باب دوّم اور سوم میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ تمام نکات شاگردوں کے نام خطوط سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے نکات وہ ہیں جو امیر کے دور میں ہونے والی شعر و ادب سے متعلق مباحث سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت سے ایسے ہے جو اس دور میں شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے ہیں۔ گویا امیر کے خطوط میں اٹھارویں صدی کے آخری ربع میں ہونے والی علمی، ادبی اور لسانی مباحث کی بازگشت بھی ملتی ہے۔ اس موقعے پر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ امیر کے دور میں ہونے والی شعر و سخن سے متعلق بحث و مباحثے میں امیر اور ان کے تلامذہ کا کردار کیسا رہا۔ اس سلسلے میں بھی شاگردوں کے نام ان کے خطوط ہماری بے حد معاونت کرتے ہیں۔ امیر نے تلامذہ کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ اختلافی باتوں سے گریز کریں، اس حوالے سے امیر کے کچھ اصول زاہد کے نام خط میں ملتے ہیں :

> "تمام عمر تجربہ ہوا کہ اوّل تو مناظرہ جو احقاقِ حق سے عبارت ہے ہوتا ہی نہیں اور بالفرض ابتداء میں کہیں ہوتا بھی ہے، تو انجامِ کار مکابرے اور مجادے کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ لہٰذا میں کبھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا اور کسی استفتے پر فتویٰ نہیں دیتا۔ البتہ میرے سچے دوست جو بات مجھ سے پوچھتے ہیں۔ ایسی رائے ناقص کے موافق ان کو بتا دیتا ہوں"۔

امیر ہمیشہ جھگڑے فساد سے بچتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کے نتائج کچھ اچھے نہیں ہوں گے، اس لیے وہ شاگردوں کو بھی لڑنے جھگڑنے پر روک ٹوک کرتے اور نصیحتیں بھی۔ زاہد کے نام خط میں لکھتے ہیں: "آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بے فائدہ یہ دردِ سر مول نہ لیا کیجیے"۔ ایک اور خط میں زاہد کو رقم طراز ہیں کہ: جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہیے اور آئندہ احتراز کرنا چاہیے اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی ہے تو صبر کرنا چاہیے"۔(۱۳۴) عابد علی کو شر خیر آبادی کو لکھتے ہیں۔ آپ کسی سے تو لڑیے نہیں ... سمجھا دیجیے ... میرا تو یہ خیال ہے پھر وہ تاویلات کرے تو چپ ہو رہیے"۔(۱۳۵) امیر کی یہ حکمتِ عملی غیروں اور اپنوں کے ساتھ یکساں تھی۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ:

"اگر کبھی کوئی شاگرد بھی، آپ کے شعر میں شبہ کر کے کچھ عرض کرتا تو محض بہ نظر احتیاط ردو بدل فرما دیتے"۔(۱۳۶)

ایک اور موقع پر ممتاز علی آہ طراز ہیں:

"جس دن فنِ شعر میں کچھ بحث آپڑتی تو پھر استاد اور شاگرد دونوں کی آستین مباحثے پر چڑھ جاتیں۔ گھنٹوں بحث رہتی"۔(۱۳۷)

امیر کا اصول یہ تھا کہ جو اعتراض کیا جائے اس سے متعلق دلیل ضرور پیش کی جانا چاہیے۔ چنانچہ شاگرد جب امیر کے کلام پر صائب دلیل کے ساتھ اعتراض کرتے، تو وہ اسے قبول کر لیا کرتے تھے۔ اور کبھی شاگرد کے کلام میں کوئی ایسی بات ہوتی جو امیر کی سمجھ سے بالاتر ہوتی تو اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ زاہد نے اپنے کسی شعر "بلعم" کا لفظ استعمال کیا تھا امیر اس کی بابت لکھتے ہیں کہ: تمھارے ایک شعر کے معنی میں نہیں سمجھا کہ 'بلعم' کی طرح دوش وسر کیا چیز ہے"۔(۱۳۸) زاہد نے "بلعم" کی وضاحت لکھی، جس کے جواب میں امیر رقم طراز ہیں کہ: بلعم باعور کا حال جو تم نے لکھا، میں نے دیکھا۔ اب وہ شعر بے تکلف رکھنے کے قابل ہے۔(۱۳۹) زاہد نے خط میں کسی موقع پر "دنبل" لفظ لکھا تھا۔ امیر نے اس لفظ پر اعتراض کیا اور لکھا کہ "دمل لفظ عربی ہے۔ 'دمامیل' اس کی جمع ہے۔ 'دنبل' صحیح نہیں"۔(۱۴۰) زاہد نے اس اعتراض کو قبول نہیں کیا اور جواب میں اس کی مزید وضاحت چاہی۔ امیر نے انھیں لکھا کہ: "دنبل کی صحت میں اس لیے کلام ہے کہ کہیں فارسی میں پایا نہیں جاتا"۔(۱۴۱) زاہد نے پھر اس اعتراض کو قبول نہیں کیا اور امیر کو سند لکھ بھیجی۔ چناں چہ امیر نے اسے قبول کیا اور جواب لکھا: "دنبل کا فارسی میں صحیح ہونا آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا۔ آپ نے جن لغات کا یعنی 'ہفت قلزم' و 'تمۂ برہان قاطع' کا حوالہ دیا ہے۔ میں بھی اس میں انشاء اللہ دیکھوں گا"(۱۴۲)۔

امیر کے مزاج میں تحقیق و جستجو کا مادہ بہت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قدم قدم پر احتیاط ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ علم لسان سے انھیں خصوصی شغف تھا اور وہ لغت نویسی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ اسی لیے لفظوں کے استعمال میں احتیاط ان کے مزاج کا حصہ ہو گئی تھی۔ یہی صفت وہ اپنے شاگردوں میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جس میں وہ کام یاب ہوئے۔ احسن اللہ ثاقب کو لکھتے ہیں کہ:

"احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ شبہے کی بات سے جہاں تک ممکن ہو۔ بچنا ہی چاہیے"۔(۱۴۳)

امیر کی بار بار توجہ سے احتیاط، تلامذہ کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ چناں چہ بعض وقت شاگرد امیر کے جوابات سے متفق نہیں ہوتے تو وہ مزید وضاحت کے طلب گار ہوتے۔ اور امیر نہایت توجہ سے ان شبہات یا اعتراضات کے جواب ارسال کرتے۔ کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں :

"جو شبہات آپ نے لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض تو میں رفع کیے دیتا ہوں اور بعض اس پر موقوف ہیں کہ پورا شعر اپنا اور اصلاح میری لکھیے۔ واضح ہو کہ 'کھائے پھرتے اور ادبار ہم بھی ہیں، محاورہ فصحا کا نہیں ہے۔ اور بندش بھی تعقید سے خالی نہیں۔ کھائے پھرتے ادھر اور ہیں ادھر اور بیچ میں ادبار ہم بھی، خوش نما نہیں۔ جا ہو رہنے دو۔

سیہ بختی میں عدیم المثل، سیہ بختی میں یائے تحتانی کا اسقاط نہ چاہیے۔ ترکیب فارسی ہے۔ اگر چہ بعض اساتذہ اردو کے کلام میں سند ملتی ہے۔ مگر کیا ضرور ہے"۔ (۱۴۴)

امیر کی اصلاح کی یہ خوبی ہوتی تھی کہ شاگرد صاحبِ نظر ہونے کے ساتھ ساتھ پر اعتماد بھی ہو جاتا اور اس میں تلاش و جستجو کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حد تک کہ وہ استاد سے بھی بحث و مباحثے میں گریز نہیں کرتا۔ یہ امیر کا کمال تھا کہ وہ ہر شاگرد کو باکمال بنانے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کرتے تھے۔ خود بھی عاجزی انکساری کا دامن نہیں چھوڑتے اور اپنے رویے سے شاگرد کو بھی انکساری پر مجبور کر دیتے۔ اصل میں امیر انسانی نفسیات سے آگاہ تھے۔ وہ شاگردوں سے لاڈ پیار کرتے۔ لیکن علمی معاملات میں وہ اکثر مواقع پر روایاتی استاد تھے۔ شبہے کو دلیل سے رد کرتے اور دلیل ہی سے قبول کرتے۔ جلیل، "سوانح امیر" میں لکھتے ہیں کہ :

"شاگردوں کی اصلاح و تعلیم کی جانب خاص توجہ تھی اور وہی توجہ اس کا باعث ہوئی کہ کثرت سے لوگ فیض یاب ہوئے"۔ (۱۴۵)

امیر، تلامذہ کے کلام پر اصلاح دیتے وقت کچھ باتوں کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ مثلاً :

۱۔ جو زمین شعر میں استعمال ہوئی ہے، اسے اساتذہ نے بھی استعمال کیا ہے یا نہیں ؟ اگر استعمال کیا تھا، تو کیا اچھے شعر نکلے تھے ؟ اور کیا اس میں اچھے شعر کی گنجائش ابھی ہے یا نہیں ؟ اگر اس زمین، جس میں اب اچھے شعر نہیں نکل سکتے، تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی شاگرد اپنی ذہانت سے اچھے شعر نکالنے میں کام یاب ہو جاتا تو امیر اس کی بے حد تعریف کرتے۔ جس طرح زاہد کی تعریف کی : "جس زمین میں انشا نے چار شعر نکالے آپ نے اس میں دریا بہا دیے۔ بارک اللہ فی عمر کم"۔ (۱۴۶) انشا کی غزل کا موازنہ کرتے ہوئے امیر نے ایک مرتبہ زاہد کو پھر لکھا کہ :

"انشا کی غزل کے سوا لیلا، میلا کے قافیوں میں، میں نے کوئی غزل اب سے پہلے نہیں دیکھی۔ کیا عمدہ غزل آپ نے کہی ہے۔ آپ کی طبیعت کا حسن ہر شعر سے ظاہر ہے"۔ (۱۴۷)

۲۔ امیر اپنے تلامذہ کو فصحا کی روایات پر عمل کرنے پر زور دیا کرتے تھے۔ اگر کسی موقع پر شاگرد اس کے بر خلاف جاتا تو ٹوک دیا کرتے۔ ایک خط میں ہے کہ : "جرس کا کھڑ کنا فصحا نہیں کہتے"۔ (۱۴۸) ایک اور موقع پر ہے کہ : "گھڑنا اور گھڑھنا دونوں

صحیح ہیں، مگر گڑھنا شعراء کے کلام میں نہیں پایا"۔(۱۴۹) "مہیں" کے لیے لکھتے ہیں: "میں ہی کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا، ہو مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گزرا، حکم اس کو استعمال کا نہیں دیا جاسکتا"۔(۱۵۰)

۳۔ کوئی ایسا لفظ جیسے قدما نے تو استعمال کیا تھا، لیکن متوسطین یا متاخرین نے ترک کر دیا، تو اس لفظ کو بدلنے کا مشورہ دیتے۔ جیسے احمد حسین مذاق کو رقم طراز ہیں:

"حالتِ اضافت میں اعلانِ نون مضاف الیہ میری رائے میں جائز نہیں ۰۰۰ اردو زبان میں قدما تو کہتے ہیں، مگر طبقہ متوسطین و متاخرین کے محققین نے ترک کر دیا"۔(۱۵۱)

۳۔ امیر شاگردوں کے کلام میں محاورے کے استعمال پر بھی خصوصی نگاہ رکھتے تھے۔ اس سے غرض نہیں تھی کہ محاورہ لکھنؤ کا ہے یا دہلی کا۔ البتہ یہ ضرور دیکھتے تھے کہ دہلی یا لکھنؤ کے فصحا محاورہ گفتگو میں تو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی کلام میں بھی استعمال کیا ہے۔ امیر اس وقت تک اسے محاورے کے استعمال کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ جب تک کسی استاد کے کلام سے سند نہ مل جائے۔ مثلاً نواب عالم گیر کو لکھتے ہیں:

"پھر اپنی جگہ بھاری ہے۔ کلام میں میری نظر سے نہیں گزرا، مگر اکثر فصحائے دہلی کو میں نے بولتے ہوئے سنا ہے۔ خیال رکھوں گا، اگر کہیں کلام میں پاؤں گا تو سند بھیجوں گا"۔(۱۵۲)

ایک اور موقعے پر محاورہ "جامہ سے باہر ہونا" کی بابت لکھتے ہیں:

"جامہ سے باہر ہونا اور اس کی امثال میں بے خودی ضروری ہے۔ مگر بے خودی کی علل بہ اختلاف مواقع مختلف ہوتی ہے۔ کہیں غضب، کہیں کمال سرور، کہیں کمالِ رشک و قس علیٰ ھذا۔ ناسخ کے اس شعر میں:

تجھ کو جس گلِ پیراہن نے اک نظر دیکھا وہی
نکہتِ گل کی طرح جامے سے باہر ہوگیا

منشائے بے خودی رشک ہے۔ اور اس شعر ناسخ میں:

اپنے جامے سے وہیں ہوگئے باہر لاکھوں
گھر سے پوشاک بدل کر جو وہ باہر آیا

منشائے بے خودی و خود سرور ہے۔ اور اس فقرے میں کہ تم سے کوئی کیا دردِ دل کہے۔ تم تو ذرا ذرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتے ہو۔ منشائے بے خودی فرطِ غضب ہے۔ بہر حال آپ کے اس شعر میں:

جامے سے باہر ہے جب سے چھولیا تیرا لباس
عطر کی بو ہر طرف پھرتی ہے اترائی ہوئی

منتہائے بے خودی و خود سرور ہے۔ ۰۰۰چوں کہ مقصود آپ کے شعر کا صحیح اور اس میں محاورے کا
بر محل ہونا ظاہر کرتا تھا۔ لہذا جلدی میں میں نے اسی قدر اس وقت لکھا تھا کہ فصحا نے اس
محاورے کو کمال خوش ہونے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اور یہ توضیح نہیں کی تھی کہ منشائے بے
خودی ہر جگہ مختلف ہوا کرتا ہے"۔(۱۵۳)

امیر نے اپنے مذکورہ خط میں محاورے کے استعمال اور اس کے مفہوم کی بابت تفصیل سے اظہار کیا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی وضاحت کی ہے کہ فصحا کے نزدیک اس کا استعمال کس نوعیت کا تھا۔

۴۔ امیر اپنے تلامذہ کو درست زبان کے استعمال اور متروکات سے بچنے کی بار بار تنبیہ کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شعر کا حسن درست زبان اور غیر متروک الفاظ کے استعمال ہی سے سامنے آتا ہے اور فصاحت کا لطف بھی۔ مثلاً: ایک شاگرد کو لکھتے ہیں: "تیروں کا گنجان ہو کر بیٹھنا، یہ زبان نہیں ہے"۔(۱۵۴) ایک اور اصلاح میں لکھتے ہیں: "پہ بہ معنی لیکن و مگر واجب الترک ہے"۔(۱۵۵) ایک شاگرد کو رقم طراز ہیں: "منہ کی بوند، منہ کے پانی کی بوند یہ سب درست ہے۔ مگر ابر کی بوند مستعمل نہیں"۔(۱۵۶) امیر ایک اور اصلاح میں لکھتے ہیں: "پرے لکھنؤ میں بالکل متروک ہے اور دہلی میں بھی، اب فصحا کے کلام میں پایا نہیں جاتا"۔(۱۵۷)

امیر کی اصلاح کے حوالے سے سر دست چار نکات پیش کیے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی نوعیت کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً: یہی کہ مفہوم کے اعتبار سے کلام پر کشش ہے یا نہیں۔ فنی اعتبار سے کلام میں کیا کیا خوبیاں اور خامیاں ہیں، لفظوں کی نشست و برخاست میں درستگی ہے یا نہیں، شعر کی روانی میں کیا بات مانع ہے، خیال میں بلندی کا معیار کیسا ہے؟ تذکیر و تانیث کے برتنے میں احتیاط ہے یا نہیں۔ تشبیہ و استعارات کا معیار کیسا ہے۔ معیار سخن کا خیال رکھا ہے یا نہیں۔ گویا اس جائزے سے امیر کی اردو دانی کا بھی پتا چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امیر کن کن امور کو شاعری میں اہم تصور کرتے تھے اور یہ کہ وہ اصلاح پر حاشیے کس نوعیت کے لکھا کرتے تھے۔ ان کا یہ انداز کس حد تک مفید تھا۔

اس مقالے کے باب دوم اور سوم میں امیر کے خطوط سے جو علمی تصریحات پیش کی گئی ہیں، وہ تلامذہ کے نام خطوط یا ان کے کلام پر دی گئی اصلاح ہی سے مستفاد ہیں۔ جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امیر اردو زبان اور اردو شاعری کے بارے میں کس حد تک معلومات شاگردوں کو بہم پہنچانے کی تگ و دو کیا کرتے تھے۔

الغرض امیر کے خطوط میں شعر و سخن کی اصلاح کے حوالے ایک نظام ملتا ہے۔ ہمارے علم کے مطابق اردو شاعری کی تاریخ میں امیر کے علاوہ کوئی دوسرا شاعر نہیں گزرا، جس نے اپنے شاگردوں کی تربیت کا کوئی نظام وضع کیا ہو۔ بلاشبہ امیر ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ہی نہیں، زبان داں بھی تھے اور ایک وسیع النظر استاد بھی۔ ان کی خاص تربیت ہی تھی، جس کی وجہ سے تلامذہ امیر نے اردو شاعری میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

امیر ایک وضع دار استاد تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے منصب کا غلط استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ جو استاد شاگردوں کی ایک بڑی فوج

رکھتا ہو۔ خود بھی عالم ہو اور شاگرد بھی صاحبِ علم ہوں۔ وہ کسی معاصر کو کب سکون سے رہنے دیتا۔ امیر چاہتے تو "امیر اللغات" کی مخالفت میں اٹھنے والے اہل دہلی کے خلاف ایک محاذ کھول دیتے۔ لیکن انھوں نے اس برے کام کی نیت کا ارادہ بھی نہیں کیا۔ اردو کی ادبی تاریخیں ہی نہیں ان کے خطوط بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ امیر نے کبھی بھی تلامذہ کو معرکہ آرائی کے لیے نہیں اکسایا۔ بلکہ اس سے دور رکھا۔ اس لیے کہ امیر جانتے تھے کہ یہ کام ان کا نہیں ہے وہ تو نہایت اعلیٰ مقصد رکھتے تھے اسی لیے انھوں نے تمام تر برے حالات کے باوجود اپنے تلامذہ کو علم سے سرفراز کیا۔ اس کا کیا فائدہ ہوا۔ یہ ڈاکٹر کریم الدین احمد سے ملاحظہ کیجیے :

> "داغ کے شاگردوں کی طرح، امیر کے شاگردوں نے مختلف راستے اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ امیر کی شاعری اور شخصیت نے ہر موڑ پر ان کی راہ نمائی کی اور وہ قریب قریب اسی راستے پر گامزن رہے۔ جس پر امیر انھیں چلانا چاہتے تھے۔ کسی شاعر کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے شاگرد اس کا مسلکِ شاعری زندہ رکھیں"۔ (۱۵۸)

امیر نے اپنے تلامذہ کی شعر و سخن کے حوالے سے بھی تربیت کی اور دنیاوی معاملات میں بھی ان کی راہ نمائی کی۔ گویا امیر نے اپنے شاگردوں کو تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ تہذیب یافتہ بھی کیا۔ جس کے لیے انھوں نے نت نئے طریقے اختیار کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے شاگرد صرف امیر کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے قریب آئے۔

گزشتہ صفحات میں امیر کے مکتوبات کی مدد سے، بہ حیثیت استاد، امیر کی شہرت کے اسباب اور ان کے اس نظامِ تربیت کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ جس کی بدولت وہ اپنے عہد کے ممتاز شاعر اور استاد قرار پائے۔ اب امیر کے مکتوبات میں تلامذہ سے متعلق ان امور کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ جس کی بدولت امیر کی شخصیت شاگردوں کے لیے پرکشش اور قابلِ تقلید قرار پائی۔

(۱۰)

امیر اپنے شاگردوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ خطوط لکھ کر ان کی خیریت دریافت کرتے، ان کے بچوں کے بارے میں فکر مند رہتے، انھیں دعائیں دیتے۔ خط لکھتے تو نہایت خلوص و محبت اور انکساری سے مخاطب کرتے۔ مثلاً "پیارے برہم"، "داغِ دل کے مرہم" پیارے برہم، نورِ چشم ممتاز، "پیارے کوثر ارحم الراحمین بہ طفیلِ ساقی کوثر تم کو دونوں جہاں میں جامِ مراد سے سراب کرے"، پیارے کوثر اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں برکت دے اور دولت کونین سے مالا مال کرے"، وغیرہ۔

امیر فطرتاً محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ شاگردوں کی دل جوئی کرتے اور ہر ممکن کوشش کرتے کہ ان کی ذات سے انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور جس حد تک فائدہ پہنچا سکتے، اس کی تگ و دو کرتے۔ شاگرد بیمار ہوتا تو نسخے لکھوا کر بھیجتے اور اس پر عمل کرنے کی سخت تاکید لکھتے :

> "میں نے لطیف احمد سلمہ کے خط میں سری لال پیارے لال کے یہاں سے عرق منگوا کر استعمال کرنے کو لکھوا دیا تھا۔ آپ ضرور استعمال کریں۔ ضلع ایٹہ میں ان کے یہاں اس عرق کی شیشیاں بکتی ہیں ۰۰۰ چار مہینے کے بچے سے لے کر بڈھوں تک میں نے استعمال کرایا ہے۔ بار بار تپ کا

آجانا اچھا نہیں۔ اس کے ازالہ کی فکر ضروری ہے اور یہ عرق میرے تجربے میں ہے کہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے"۔(۱۵۹)

امیر کے چہیتے شاگرد، زاہد حسین بیمار ہو گئے تھے۔ جس کے باعث وہ امیر کو خط نہ لکھ سکے اور نہ امیر کے خطوط کا جواب دیا۔ زاہد نے صحت مند ہونے کے بعد امیر کو اپنی خیریت سے مطلع کیا تو امیر نے جواباً لکھا کہ :

شافی مطلق تم کو شفائے کامل عطا فرمائے اور اصلی طاقت و توانائی جلد عود کر آئے۔ اتنے دنوں تک تمھارا خط نہ آنے سے جو دھڑکا بار بار دل میں سماتا تھا، آخر تمھارے خط سے تفصیل کے ساتھ اس کی اصلیت معلوم ہوئی اور بیمار اور زار نزار دل کو بہت ہی افسوس ہوا، میں کہتا ہی تھا کہ زاہد سا محب دیرینہ میرے خطوط کا جواب نہ لکھے اس کے کیا معنی۔ ہو نہو کوئی مانع قوی ضرور ہے۔••• افسوس تم نے بہت تکلیف اٹھائی مجھ بوڑھے سے اور کیا ہو سکتا ہے۔ سوا اس کے کہ تمھاری صحت اور تندرسی کے لیے یہیں سے دعا کروں"۔(۱۶۰)

حکیم برہم کی بہن کے گھر اور حکیم برہم کی کچہری میں چوری ہو جانے کی اطلاع امیر کو ملتی ہے۔ چناں چہ امیر برہم کے نام ایک مکتوب میں اس طرح افسوس کرتے ہیں :

"پیارے برہم ••• آپ کی بہن کے یہاں چوری ہو جانا اور آپ کی کچہری سے سامان مہمانی احباب اٹھ جانا ، باعث افسردگی دل ہوا۔ خداوند تعالیٰ حسنِ نیت کے اثر سے نعم البدل عطا فرمائے"۔(۱۶۱)

امیر شاگردوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے۔ جب شاگردوں کے خطوط سے خیریت معلوم ہوتی، تو بے حد خوش ہوتے اور دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے۔ ۲۹ر نومبر ۱۸۸۱ء کے خط میں ثاقب کو لکھتے ہیں کہ :"میں آپ کی کس کس عنایت کا شکر کروں کہ مجھ سے ناچیز کو بایں خوبی و اخلاق یاد فرماتے ہیں"۔(۱۶۲) زاہد کو ۱۳ر اپریل ۱۸۹۱ء کے خط میں مختصر خط لکھنے کی شکایت کرتے ہیں :"آپ نے مراسلت کیوں ترک کی۔ حمد اللہ آج آپ کی تحریر پر تو یر دیکھنے میں آئی چوں کہ اختصار کی وجہ سے تسکین خاطر پورے طور سے نہیں ہوتی لہٰذا مفصل تحریر کا خواستگار ہوں"۔(۱۶۳) برہم کو ۱۵ جون ر ۱۸۹۲ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں :" میاں برہم اب خط لکھا ہے تو لکھتے رہو۔ پھر ایسا غوطہ نہ لگانا کہ مہینوں خبر نہ لو، ماشاء اللہ جوان ہو ، میری کوتاہ قلمی کو معاف کر دیا کرو"۔(۱۶۴) ۲۲ر نومبر ۹۵ء کے خط میں پھر برہم کو لکھتے ہیں۔ اس مرتبہ کچھ سرزنش کی کیفیت ملتی ہے :

"تمھارے نزدیک یہ ضروری کام میں داخل نہیں کہ داعی خیر کو دو کلمہ خیریت کبھی کبھی مطمئن کرو۔ خیر! ہم کو یاد کرو یا نہ کرو ہم تو دعا سے یاد کرتے ہیں۔ شعر

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں "۔(۱۶۵)

عرصہ دراز کے بعد مولوی محمد اعجاز حسن خاں کا خط آیا، جسے پڑھ کر امیر جذباتی ہو گئے۔ جواب میں انھیں رقم طراز ہیں :

"مدت کے بعد تمھارا نمیقۂ سعادت سرور نمور افزائے دل ودیدہ ہوا۔

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

اگر اپنا بوڑھا، دعا گو سمجھ کر کبھی کبھی پوچھتے رہو تو تمھاری محبت و سعادت ہے۔ ورنہ کیا شکایت ہے ... صرف تم لوگوں کے تصور سے اپنے دل کو خوش کر لیا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ زندہ اور خوش رکھے۔ باقی دعا کے سوا کیا لکھوں"۔(۱۶۶)

امیر کے بہ کثرت شاگرد تھے۔ جن کے خطوط پر خطوط آیا کرتے تھے۔ امیر ممکن حد تک جوابات ارسال کرتے، اس کے باوجود بہت سے خطوط کے جوابات لکھنے سے رہ جاتے تھے۔ لیکن امیر، شاگردوں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کی کوتاہ قلمی معاف کرتے ہوئے اپنی خیریت سے ضرور مطلع کرتے رہیں۔ اس لیے کہ امیر کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ وہ تمام شاگردوں سے باخبر رہیں۔ دل شاہجہاں پوری کو لکھتے ہیں :

"آپ اپنی خیریت سے کبھی کبھی مسرور کرتے رہیں۔ ادھر سے اگر جواب میں تاخیر ہو تو مجھے رنجور و معذور سمجھ کر بے التفاقی سے محمول نہ کریں"۔(۱۶۷)

منشی امتیاز احمد خاں راز کے خط آنے پر امیر کی کیفیت ملاحظہ کیجیے :

"نامۂ سعادت شامہ آیا، میں نے تمھاری جگہ اس کو پیار کیا۔ آنکھوں سے لگایا، خداوند تعالیٰ تمھارے عمر واقبال میں برکت دے اور صحت وعافیت و اوین نصیب کرے"۔(۱۶۸)

خط کے نہ آنے پر حکیم کوثر خیر آبادی سے دوستانہ انداز میں شکوہ کرتے ہیں :

"حکیم صاحب دل کے بڑھانے والے، اگلی صحبتوں کے یاد دلانے والے خطوط، آپ کے کم آتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ زیادہ آئیں۔ بشرطیکہ غزلیں ان میں نہ ہوں"۔(۱۶۹)

شاگردوں کے خطوط امیر کے لیے ایک نعمت سے کم نہ ہوتے تھے۔ وہ ان مکاتیب کو اپنے لیے ایک نادر تحفے سے کم تصور نہیں کرتے تھے۔ اسے آنکھوں سے لگاتے، چومتے اور اپنے پاس رکھتے۔ اکثر شاگرد یہ کیا کرتے تھے کہ جب خط بھیجتے تو اس کی پشت پر کلام بھی اصلاح کے لیے لکھ دیتے۔ امیر کو یہ عادت سخت ناپسند تھی۔ امیر کبھی محبت سے اور کبھی ترشی کے ساتھ شکایت کرتے کہ وہ یہ حرکت نہ کیا کریں۔ بشیر ملیح آبادی کو لکھے ہیں کہ :

"خط آپ ہمیشہ غزل کی پشت پر لکھا کرتے ہیں، جس سے مجھے بہ مجبوری واپس کرنا پڑتا ہے۔ اس کی میں شکایت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ علیحدہ محبت نامہ تحریر ہوا کرے کہ میرے پاس رہے"۔(۱۷۰)

محمد حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں :

"آپ نے غزل اپنے خط کی پشت پر لکھی تھی اور وہ پیارا خط میں کیوں کر پھیر دیتا"۔(۱۷۱)

زاہد حسین زاہد کو راقم طراز ہیں کہ :

"محبت نامہ آیا۔ مسرور کیا، مگر غزل اس کی پشت پر ہے لہذا بہ مجبوری اس سرمایہ سرور کو پھیرنا پڑا۔ چیز دیکھ کر پھیر لینا آپ نے کس سے سیکھا ہے۔ یہ روش چھوڑ دیجیے اور آئندہ ایسا ستم نہ کیجیے گا"۔(۱۷۲)

زاہد کو ایک بار پھر لکھتے ہیں :

"غزل اور خط ایک ہی کاغذ پر ہے۔ خط کا واپس کرنا بہت شاق ہوتا ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ آئندہ ایسی پیاری چیز دے کر پھیر لینے کا ارادہ نہ کیجیے گا"۔(۱۷۳)

امیر کی عادت تھی کہ وہ اپنے تمام دکھ درد شاگردوں کو لکھتے۔ اور ان سے مشورے طلب کرتے، اور پھر انھی پر عمل کرتے۔ ریاست کے حالات ہوں۔ یامالی پریشانیاں، بیماریاں ہوں، یا کثرت کام کے مسائل وہ شاگردوں کو لکھتے اور دعا کے طلب گار ہوتے۔ یوں وہ اولاد کی طرح تلامذہ کو بھی اہمیت دیتے۔ خود ان کے بن کے رہتے اور انھیں اپنا بنا کر رکھتے۔ شاگرد کسی مسئلے پر الجھ جاتا تو بے تاب ہو جاتے، اسے دعا دیتے۔ احسن اللہ ثاقب نے اپنے انگلستان جانے کا تحریر کیا تو، امیر تڑپ اٹھے :

"آپ نے انگلستان جانے کی بری خبر سنائی یہ بار عظیم مہاجرت کا مجھ ناتواں سے کیوں کر اٹھے گا۔ خیر خداوندِ عالم ایسا کرے کہ آپ کو یہ سفر وسیلۂ ظفر ہو اور فائز المرام وہاں سے آکر ہندوستان میں وہ مرتبہ پائیں کہ آپ کے خیر طلب اس پر فخر کریں"۔(۱۷۴)

امیر شاگردوں کو اپنا احوال لکھتے تو خواہش مند ہوتے کہ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا جائے اس طرح کہ بہت سے خطوط زاہد حسین زاہد کے پاس تھے۔ احسن اللہ ثاقب جب امیر کے خطوط مرتب کر رہے تھے تو زاہد حسین زاہد ہی نے سب سے زیادہ خطوط انھیں اشاعت کے لیے فراہم کیے۔ لیکن وہ خطوط نہیں دیے جو بقول زاہد حسین زاہد! "جناب مرحوم نے ان کو نظر اغیار سے محفوظ رکھنے اور کسی کو نہ دکھلانے کی تاکید کر دی تھی"۔(۱۷۵) اس بات کی شہادت امیر کے ایک اور خط سے بھی ملتی ہے۔ یہ بھی زاہد حسین کے نام ہے۔ "آپ کو اپنا دل سوز سمجھ کر کچا چٹھا اپنا لکھ گیا ہوں، یہ خط نظر اغیار سے محفوظ رہے"۔(۱۷٦)

خط کے معاملے میں ایک عجیب کیفیت سامنے آتی ہے کہ انسان کے خارجی اور داخلی تمام ہی پہلو اس سے عیاں ہو جاتے ہیں۔ خط لکھنے والے کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہی خطوط کبھی اس کی برتری ثابت کرنے کے لیے پیش کر دیے جائیں۔ یا کبھی اپنے انھی خطوط کی بدولت وہ گرفت میں بھی آجائے گا۔ جس شخص کو یہ خطوط لکھے جا رہے ہوتے ہیں وہ عموماً بہت مخلص دوست ہوتا ہے۔ لیکن وہی مخلص، مکتوب نگار کے مرنے کے بعد، بے خیالی یا عدم احتیاط کا شکار ہو جاتا ہے اور خط کھل جاتا ہے۔ یہی امیر کے خطوط کے ساتھ بھی پیش آئی۔ جانے کتنی باتیں ہوں گی، جو امیر نے چھپا کر کہی ہوں گی۔ لیکن آج ہم انھیں سامنے رکھ کر امیر کی شخصیت کردار اور علمیت، اخلاق اور ان کی بشری کمزوریوں پر قلم اٹھا رہے ہیں اور اپنے معیارات پر ان کی مجبوریوں سے صرف نظر کر کے ادب یا معاشرے میں مقام متعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً امیر کی تلامذہ سے محبت کے اس انداز کو دیکھیے کہ وہ حکیم محمد جعفر بیمار کے نام خط میں کیا فرما رہے ہیں :

"اب آپ کو سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں کہ اپنے مصرع کی نسبت الزام تقدیر و تاخیر کو کاتب
کے سر رکھیے اور ظاہر کیجیے کہ میں نے یوں کہا تھا"۔(۱۷۷)

جس طرح بعض اوقات اولاد کی غلطیوں کو معاف کرنے پر والدین مجبور ہوتے ہیں یا ان کی غلطیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ تو یہ ان کی وہ حقیقی محبت ہوتی ہے، جس کے آگے وہ مجبور ہوتے ہیں۔ امیر بھی اپنے شاگردوں سے اسی قسم کی محبت سے دوچار تھے۔ مذکورہ بالا اقتباس اس ہی کی مثال ہے۔ بلاشبہ اردو شاعروں میں اتنا وضع دار محبت کرنے والا استاد امیر کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جو شاگردوں پر اتنی جان دے یا ان کے خط کے لیے تڑپے ان کے دیدار کے لیے ترسے زاہد کو لکھتے ہیں:

پیارے زاہد اب تو ریل راج پور تک ہو گئی ہے۔ موقع ملے تو کبھی ادھر بھی آنکلو۔ اب تو مدت ہو گئی کہ
نہیں دیکھا مجھ کو اپنے دیدار سے مسرور کرو"۔(۱۷۸)

حبیب الرحمٰن شروانی کو کس حسرت سے لکھتے ہیں:

"سفر کی فرصت مطلق نہیں ملتی اور آپ کا سفر کرنا معلوم نہیں آسان ہے یا مشکل دیکھا چاہیے
حسرت ملاقات کیوں کر بر آتی ہے"۔(۱۷۹)

ایک اور خط میں شروانی کو لکھتے ہیں کہ: "میں بھی آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں"۔(۱۸۰) منشی ولایت علی خاں صفی کو رقم طراز ہیں کہ: ایک عمر ہو گئی کہ وطن جانا نہیں ہوا۔ ورنہ میں خود آکر تم سے ملتا اور بالمشافہ تمھارے کلام کی داد دیتا۔ تم اگر چلتے پھرتے رہتے ہو تو، کبھی ادھر بھی آنکلو کہ حسرتِ دیدار میرے دل میں نہ رہ جائے"۔(۱۸۱) عابد کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں:

"حکیم صاحب گیا کے سفر سے پہلے، اب کے بار دو چار دن کے لیے آپ رام پور کو ضرور آئیں اور
اپنے دیدار فرحتِ آثار سے مسرور کریں اگر ایسا نہ ہو تو مجھے نہایت حسرت رہے گی اور ملال رہے
گا"۔(۱۸۲)

خطوط سے پتا چلتا ہے کہ عابد کوثر خیر آبادی امیر کی خواہش پوری نہ کر سکے تھے۔ یہ بات ۱۱/ دسمبر ۱۸۹۲ء کی ہے۔ تقریباً تین سال بعد ۱۲/ اکتوبر ۱۸۹۵ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ کوثر نے امیر سے ملاقات کا ارادہ کیا ہے۔ امیر ایک انوکھی خوشی اور حسرت کے ملے جلے جذبات سے لکھتے ہیں کہ:

"مدت کے بعد آپ کا یہاں آنے کا اور مجھے اپنے دیدار فرحتِ آثار سے مسرور فرمانے کا ارادہ ہوا۔ یہ وہ
آرزو ہے کہ ہمیشہ اللہ سے چاہتا تھا۔ خداوند تعالیٰ آپ کے ارادے اور میری آرزو کو پورا کرے۔ آپ
خیر و عافیت کے ساتھ آئیں اور جلد آئیں کہ دل بے قرار اور آنکھیں محوِ انتظار ہیں"۔(۱۸۳)

امیر کے کردار کی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ ان کا رویہ تمام شاگردوں کے ساتھ یکساں تھا۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں جو بھی اقتباس پیش کیے ہیں وہ مختلف شاگردوں کے نام خطوط سے ہیں سب کے ساتھ ایک سی محبت ایک سا برتاؤ ثابت کرتا ہے امیر نیک سیرت اور باکردار استاد تھے۔ وہ تلامذہ سے شکوے بھی کرتے اور ان کی ناز برداری بھی۔ ناراض ہو جاتے تو انھیں لاڈ و پیار سے بھی

مناتے۔ ان کا یہ رویہ بھی سب کے ساتھ یکساں تھا۔ برہم کے نام ۲۸ مارچ ۱۸۹۱ء کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ امیر کی نازبرداری یا لاڈو پیار کا یہ انداز کتنا پر اثر ہے :

"پیارے برہم لکھ کر پچھتارہا ہوں کہ برہمی پیارے ہونے کی چیز کہاں ہے کہ میں نے پیارے برہم القاب میں لکھا پھر یوں دل کو تسکین دیتا ہوں کہ کسی کی برہمی بھی تو کسی کو مزا دے جاتی ہے"۔(۱۸۴)

اب برہم کے نام ۲۳ اگست ۱۸۹۵ء کے خط میں امیر کا شکوہ بھی ملاحظہ ہو :

"تم نے بے شک مجھے اپنے دل سے بھلاڈالا ہے کہ مجھے برسوں یاد نہیں کرتے ہو۔ مگر اس پر بھی میرا محبت منزل دل تم کو نہیں بھولا، گو یہاں سبب موانع قویہ تحریر کی نوبت نہیں آتی۔ مگر تمھاری یاد بالکل نہیں جاتی۔ تم سے اور تمھارے خطوط سے تمھاری یاد ہی اچھی۔ اب جو تم نے اپنی ملاقات سے مسرور کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ خدا تمھارے وعدے کو پورا کرے جو تمھارا وعدہ ہے وہی میری تمنا ہے"۔(۱۸۵)

یہ تھی استاد کی ناراضگی اور شکوہ کہ ایک لمحے میں راضی بھی ہو گئے۔ اب امیر کے لاڈو پیار کا ایک اور انداز ملاحظہ کیجے۔ یہ ۸ ستمبر ۱۸۹۷ء کا ہے :

"پیارے برہم! اس وقت سلام و دعا سب ندارد، اس لیے کہ ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ رائے سین کے انسپکٹر ہو گئے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم سخت ناچار و مضطر ہو گئے۔ اب دردِ دل کس کو لکھیں، کس کی رسائی ذہن کے امیر گاہ میں رسائی تقدیر کی امید رکھیں :خدا سے دعا ہے کہ آپ جہاں رہیں خوش رہیں اور ہمیشہ اپنی خوشی سے خوش ہونے والوں کا دل خوش کیا کریں"۔(۱۸۶)

انسپکٹر ہونے کے بعد برہم نے کوئی خط نہیں لکھا تو امیر خود ان کی خیریت حاصل کرنے کے لیے رقم طراز ہیں :

"اب آپ کس حال میں ہیں، کیسا مزاج ہے ؟اور میں آپ کی صحت کے لیے ہر وقت دست بہ دعا ہوں اور کچھ کیفیت دریافت نہ ہونے سے متردد ہوں"۔(۱۸۷)

امیر کا اپنے تلامذہ کے ساتھ انسیت و محبت کا یہ رویہ ان کی فطرت کے علاوہ اس نظامِ تربیت کا حصہ تھا، جو خانقاہوں کی دین ہے۔ چوں کہ امیر بھی اسی ماحول کے پروردہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی اسی ماحول میں ڈھال لیا۔ اصل میں یہی وہ تہذیب یافتہ نظام ہے۔ جو ہر دور کے ترقی یافتہ نظام کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس لیے وہ شاگرد جو امیر جیسے اساتذہ کے زیر اثر رہتے ہیں انھیں پر آشوب حالات بھی علم و ادب کی حقیقی روح سے جدا نہیں کر سکے۔

(۱۱)

تلامذہ امیر کے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بیشتر شاگردوں کا شمار امراء میں ہوتا تھا اور بہت سے صاحبِ حیثیت اور

صاحبِ ثروت تھے۔ لیکن امیر دیگر شعراء کی طرح تلامذہ سے کبھی وظیفہ حاصل کرنے کے خواہش منداور بے قرار نہیں ہوئے۔ حالانکہ دربار رام پور سے جتنی آمدنی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ ان کا خرچ تھا۔ ان کے داماد سمیت تمام صاحب زادے بے روزگار تھے۔ لیکن امیر کے خطوط گواہ ہیں کہ وہ ایک باوقار اور اعلیٰ ظرف استاد تھے۔ ہوا و ہوس ان کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اسی کسمپرسی میں بھی انھوں نے شرافت اور عزت و قار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے حالات سے تنگ آکر یہ طریقہ اپنایا تھا کہ بعض شاگردوں کے توسط سے امراء تک رسائی حاصل کرتے تھے۔ اور صاحبِ ثروت اشخاص سے تعلقات کو اہمیت دیتے تھے۔ لیکن اس سے امیر کا مقصد وہ نہیں تھا جو عموماً شعراء کا رہا ہے۔

امیر، ایسے افراد سے رسائی کی کوششیں کرتے، جنھیں شعروادب کا شوق ہوتا تاکہ وقتِ ضرورت "امیر اللغات" کے لیے مالی امداد حاصل کی جا سکے۔ یا لغت اور اپنی کتابیں فروخت کی جا سکیں۔ امیر، تعلقات مراسم پیدا کرنے کے لیے یہ کرتے تھے کہ خوشی یا غمی کے موقع پر قطعات لکھ کر شاگردوں کے توسط سے انھیں بھیجتے۔ کیوں کہ امیر کو اپنے منصب اور مرتبے کا ادراک تھا۔ اور امراء، امیر کے منصب اور مرتبے کی وجہ سے ان کے اس برتاؤ سے متاثر ہوتے بغیر تھے۔ اس لیے یہ تدبیر زیادہ ترکارگر ہوتی تھی۔ برہم کے نام خط میں امیر رقم طراز ہیں کہ :

> "باوجود تپِ لرزے میں مبتلا ہونے کے، دو تاریخیں ایک فارسی اور ایک اردو لکھ کر قاضی صاحب کی خدمت میں بھیج دیں"۔ (۱۸۸)

برہم کے نام ایک اور خط میں امیر لکھتے ہیں :

> "جناب قاضی صاحب کے مژدۂ صحت سے آپ نے سامعہ نوازی کی۔ میں بہت خوش ہوا۔ میری طرف سے تہنیتِ صحت کسی موقع پر ادا کی جائے گی"۔ (۱۸۹)

امیر مختلف ریاستوں یا امراء سے تعلقات مراسم کے لیے جن شاگردوں کو ذریعہ بناتے تھے۔ اس کے لیے وہ ان شاگردوں پر خصوصی توجہ بھی کرتے تھے۔ خاص کر کلام پر اصلاح جلد ہو جاتی تھی۔ بلکہ امیر، برہم کو ایک مرتبہ یہاں تک لکھ گئے کہ : "تم پہلے مجھ کو مطمئن کرو پھر جتنا کلام چاہو بھیجو"۔ (۱۹۰) امیر کہ ایک اور خط میں مذکور ہے کہ : غزل پر اصلاح توجہ سے ہوگی۔ بشرطیکہ اصلاح مثنوی معلومہ کا عمدہ نتیجہ تمھاری کوشش سے ظہور پذیر ہو"۔ (۱۹۱) اس موقع پر یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ "دفتر اللغات" کا بجٹ امیر کی تنخواہ سے کہیں زیادہ تھا۔ جس کی بابت تفصیل سے معلومات باب چہارم میں پیش کی گئی ہیں۔) اور پھر ایک بہت بڑے کنبے کا خرچ (بقول اسمٰعیل احمد مینائی مرحوم : " ستر سے زیادہ افراد پر امیر کا خاندان مشتمل تھا۔) یہ سب کچھ آسان نہ تھا۔ اور پھر اس پر امیر کی حد درجہ بیماریاں ان تمام حالات کے سبب سے وہ شعروشاعری سے بے زار ہو گئے تھے۔ ہر علمی کام طبیعت پر جبر کر کے انجام دیتے تھے۔ الغرض امیر کی زندگی کی یہ تمام روداد و کیفیات ان کے مکاتیب میں ملتی ہیں۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خط میں مذکور ہے کہ : "شاعری کا مشغلہ بہت دنوں سے ترک تھا۔ اب تلامذہ کے کلام کی اصلاح بھی متروک ہے۔ الاماشاء اللہ رعشہ اپنے ہاتھ سے لکھنے نہیں دیتا"۔ (۱۹۲) زاہد کو اپنے حال کی بابت لکھتے ہیں : "میں ایک پیرانہ سال شکستہ حال ہیچمدان بعض ہوں اور شاعری سے بیگانہ ہو گیا ہوں"۔ (۱۹۳) حفیظ جون پوری کو لکھا کہ :

"اب شاعری نے مجھ کو اور میں نے شاعری کو چھوڑ دیا آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر آپ کی ضرورت پر نظر کر کے میں نے اپنی طبیعت پر جبر کیا اور دونوں غزلیں دیکھ لیں"۔(۱۹۴)

اسی نوعیت کی کیفیات کوثر خیر آبادی کے نام خط میں بھی ملتی ہیں : "شعر و سخن کا مشغلہ قطعی ترک ہو گیا۔ بلکہ اس کے ذکر سے نفرت ہوتی ہے"۔(۱۹۵) حافظ غلام احمد فروغی کے نام خط میں رقم طراز ہیں :

"آپ اپنے مشاعرے کے لیے مجھ سے غزل فرماتے ہیں۔ میں اس زمانہ میں بہت ہی رنجور اور معذور ہو رہا ہوں۔ خود بیمار اور کئی بیماروں کا پرستار رہتا ہوں ••• شعر و سخن کا مشغلہ مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ آپ کے حسنِ اخلاق سے امید ہے کہ عذر میرا قبول کر کے مجھ کو معاف فرمائیں گے"۔(۱۹۶)

امیر کا ان حالات میں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنا، ایک معجزہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں اگر امیر شاگردوں کی مدد لیتے تھے اور امراء سے بہ ضرورت مراسم رکھتے تھے تو یہ ان کی انتہائی مجبوری تھی۔ اور یہ ایسی کوئی اخلاقی برائی بھی نہیں تھی۔ امیر کے اس دور میں بہت سے شاگردوں نے بھرپور معاونت کی اور بعض قریبی شاگردوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ جن کی وجوہات کا پتا نہیں چلتا۔ جس کا امیر کو بڑا رنج رہتا تھا۔ امیر کے ایک خط سے مہدی حسن شاداب کے متعلق صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ : "احباب نے جو کچھ کہا وہ نہ کیا۔ حضرتِ شاداب نے رسمِ قدیمہ یک قلم ترک کر دی"۔(۱۹۷) وسیم خیر آبادی "دفتر امیر اللغات" میں ملازم تھے۔ امیر کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کسی بات پر وہ بھی ملازمت چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ غالباً تنخواہ کا کوئی مسئلہ تھا۔ وسیم کے نام امیر کے ایک خط سے اس طرف کچھ اشارہ ملتا ہے :

"میاں وسیم! تمھاری پریشانی سے مجھ کو بھی پریشانی ہوئی۔ سوائے کام چھوڑ کر چلے جانے کے اور جو بات امکانی ہو۔ تم مجھ کو بتاؤ تو میں کروں۔ میں کسی حالت میں اپنے عزیز، اپنے دوست کا نقصان نہیں چاہتا۔ مگر تم خود سمجھتے ہو کہ (امیر اللغات) کا ایک حصہ مکمل ہونے تک تمھارے جانے سے اس کام کو نقصان سخت پہنچے گا۔ آئندہ تم کو اختیار ہے، تم بجائے خود خوب سوچ کر جو درخواست، قابلِ قبول ہو، مجھ سے کرو۔ اس میں حاضر ہوں اور تمھاری راحت سے بہ حلف لکھتا ہوں کہ مجھے راحت ہوتی ہے۔ اور تمھاری تکلیف سے تکلیف"۔(۱۹۸)

اس خط کے بعد غالباً وسیم دفتر آ گئے تھے۔ لیکن پھر ڈیڑھ سال گزار کر چلے گئے۔ (ہو سکتا ہے امیر سے ان کا یہی معاہدہ طے پایا ہو۔) برہم کے نام ۷ جون ۱۸۹۱ء کے خط میں لکھتے ہیں : "وسیم ایک برس سے اس دفتر میں نہیں ہیں۔ راجہ جونپور کی سرکار میں نوکر ہیں۔ سال بھر کے بعد کل ان کا ایک خط آیا"۔(۱۹۹) ۲۲ جولائی ۱۸۹۴ء کے خط میں حفیظ جون پوری کو نہایت حسرت سے امیر لکھتے ہیں : وسیم کا حال مجھے بھی مدت سے معلوم نہیں کہ کہاں ہیں اور کس فکر میں ہیں۔ اب مجھے وہ خط بھی نہیں لکھتے"۔(۲۰۰) امیر کے ایک خط سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ شاداب نے بعد میں رابطہ کر لیا تھا۔ لیکن وسیم کے متعلق اس طرح کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔

امیر کے ایک اور شاگرد نواب عالم گیر محمد خان (جنھیں امیر نے جلال کے نام خط میں جانے کیوں لکھا کہ "میرے شاگرد نہیں"۔) نے بھی امیر سے وفا نہیں کی۔ جلال لکھنوی کے نام خط میں امیر لکھتے ہیں :

"نواب عالم گیر محمد خان میرے شاگرد نہیں۔ کئی برس سے رسمِ مراسلت تھی۔ جب بھوپال جانے کا اتفاق ہوا تو دو ایک ملاقاتیں ہوئیں۔ واپسی کے بعد سے رسمِ قدیمہ مراسلت میں بھی فرق آیا۔ اب جو خط جاتا ہے۔ جواب نہیں آتا•••

میرے چار قصیدے جو میں نے نواب عالم گیر محمد خان کے ذریعے سے پیش کرنے کے لیے بھیجے تھے۔ آخر میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک سرکارِ عالیہ تک پہنچا اور تین کا پتا نہیں کہ کیا ہوئے"۔(۲۰۱)

امیر کے نواب عالم گیر سے تعلقات ممکن ہے، اسی لیے متاثر ہوئے ہوں کہ وہ ذمہ دار فرد ثابت نہیں ہوئے۔ ورنہ امیر تو تلامذہ اور دوستوں کے ناز اٹھانے والے انسان تھے۔ شاداب، وسیم، نواب عالم گیر کے علاوہ برہم کے نام مکاتیب سے پتا چلتا ہے کہ ان کے یہ شاگرد بھی کچھ غیر ذمہ دار واقع ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے امیر اکثر پریشان رہتے تھے۔ برہم کے نام مکاتیب میں، امیر کی کسمپرسی اور تنگ دستی کی ایک اذیت ناک صورتِ حال ملتی ہے۔ جنھیں پڑھ کر برہم کی غیر ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ امیر کے بعض سخت جملے ان کے ذہنی کرب اور برہم کی بے پروائی کے آئینہ دار ہیں۔ مثلاً :

"باتوں میں خوش کر دینا تو تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جانِ من ایسی کوشش کرو کہ کام نکلے۔ ہاتھ چلے۔ تنگ دستی نے تنگ کر رکھا ہے•••

در خانہ اگر کس مست
یک حرف بس ست" (۲۰۲)

ایک اور خط میں مذکور ہے :

"میرے بہلا دینے کی تو تم کو ہزار راہیں آتی ہیں، جب قلم اٹھاؤ گے بہلا لو گے ••• حکیم صاحب حکمت کی باتیں تم کو بہت آتی ہیں۔ کام کی بات ایک نہیں آتی۔ سچی بات لکھی ہے۔ برہم نہ ہو جانا"۔(۲۰۳)

شاگردوں کے اس رویے کے باوجود، امیر ان سے بدگمان نہیں تھے۔ جب موقع ملتا اپنے ناراض شاگردوں کی دل جوئی کرتے اور ان کی بابت باخبر رہنے کی کوشش کرتے۔ خاص کر حکیم برہم کے امیر نے بہت ناز اٹھائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برہم امیر سے محبت تو بہت کرتے تھے۔ لیکن تھے وہ کچھ غیر ذمہ دار۔ امیر اپنے اس شاگرد کے مزاج کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے ان سے نرم گرم رویہ رکھتے تھے اور ایسا رویہ اکثر بڑوں کا چھوٹوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ امیر کے زیادہ تر شاگرد فرماں بردار اور مخلص تھے۔ برہم کا شمار بھی انھی تلامذہ میں ہوتا ہے۔

امیر شاگردوں سے ''امیر اللغات'' کی تالیف کے علاوہ مالی معاونت، فروخت اور اپنی کتابوں کی فروخت میں بھی مدد لیا کرتے تھے۔ اور اکثر شاگرد بہت توجہ اور دیانت داری سے یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ ان میں بعض شاگرد تو ایسے تھے کہ امیر کے کہنے پر بصدِ خلوص آگے بڑھتے تھے اور بعض مثلاً زاہد حسین زاہد، احسن اللہ ثاقب، امتیاز احمد خاں راز اور برہم وغیرہ از خود آگے بڑھ کر استاد کی معاونت کرتے تھے۔ امیر، ۲۸ مارچ ۱۸۹۱ء کے خط میں برہم کو لکھتے ہیں: ''صنم خانہ کو چندے ابھی اور رہنے دو''۔ (۲۰۴) اس کے بعد پھر ۲۲؍ نومبر ۱۸۹۵ء کے خط میں دیوان کے مرتب ہونے کی اطلاع اور ''امیر اللغات'' کی رقم کا تقاضہ لکھتے ہیں:

> ''صنم خانہ عشق'' کو نظر ثانی سے میں نے مکمل و مہذب کر لیا ہے۔ کچھ کسر باقی ہے ••• اس کو اشاعت وغیرہ میں مدد دینے اور خریدار بہم پہنچانے کی نسبت تمھیں کچھ لکھنے کی حاجت نہیں ••• اور ہاں اب ''امیر اللغات'' کے روپے تو بھیج دو۔ تم نے بڑی دیر کی۔ بڑی ضرورت ہے''۔ (۲۰۵)

امیر اپنے دیوان کی فروخت کے لیے مولوی محمد اعجاز کو لکھتے ہیں:

> ''دیوان چھپ کر مطبع سے آگیا۔ اب جس پتے سے کہو پانچ جلدیں تمھارے لکھنے کے موافق تمھارے نام سے بھیجی جائیں۔ ••• مکرر یہ کہ کوشش کر کے خریدار بہت سے پیدا کرو، ہزار جلدیں چھپوائی گئی ہیں، بغیر اس کے کہ تم سے دل سوز دل سے کوشش کریں، ان کا نکلنا دشوار ہے''۔ (۲۰۶)

امیر کے دیوان کی فروخت کا ذمہ، منشی امتیاز احمد خاں راز نے اٹھایا تھا۔ کسی وجہ سے وہ اس کی قیمت وقت پر نہ بھیج سکے۔ امیر اپنے ایک خط میں قیمت کا تقاضا کرتے ہیں: ''قیمت دیوان کے واسطے پھر مکلف ہوں کہ جس قدر فراہم ہوگئی ہو جلد بھیج دو''۔ (۲۰۷)

امیر اللغات کی تالیف، تدوین، اشاعت اور فروخت کے لیے بھی تلامذہ کی مدد حاصل کرتے تھے اور شاگرد پر جوش ہو کر معاونت تھے۔ امیر اللغات کی دھوم اشاعت سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ چناں چہ شاگرد اپنے خطوط میں اس کی اشاعت کی بابت دریافت کیا کرتے تھے۔ اسی نوعیت کے کسی سوال کے جواب میں امیر برہم کو لکھتے ہیں کہ: ''امیر اللغات'' کی تکمیل جلد منظور ہے تو کسی حکمت سے ایک لاکھ روپیہ دلوایئے، پھر دیکھیے کتنے جلد حصے نکلتے ہیں''۔ (۲۰۸) الغرض ''امیر اللغات'' کی اشاعت کے بعد شاگردوں نے اس کی فروخت میں بھرپور شرکت کی یہی وجہ ہے کہ چند ہی سال میں ''امیر اللغات'' کے دونوں حصوں کی طباعت دوسری مرتبہ بھی ہوئی۔

اس موقعے پر اس امر پہ بھی توجہ ضرور مرکوز کرنا چاہیے کہ ''امیر اللغات'' کاروبار کی غرض سے شائع نہیں کی گئی تھی۔ یہ تو نوابینِ رام پور کی خواہش و منشا کا کام تھا۔ لیکن امیر نے یہ اپنے خرچ سے کیا۔ حالاں کہ ریاست رام پور نے امیر سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی اشاعت کا بندوبست، سرکار کرے گی۔ لیکن لغت کے لیے معاونت اس طرح ہوئی کہ امیر کو قرض دیا گیا یہ کہہ کر کہ اس کی ادائیگی لغت فروخت کر کے کی جائے۔ لیکن بعض وجوہ کی بناء پر لغت کے کام میں تعطل آیا اور قرض بڑھتا گیا۔ امیر کی اس مجبوری سے تقریباً ان کے تمام تلامذہ واقف تھے۔ چنانچہ شاگردوں نے حقِ شاگردی ادا کرتے ہوئے استاد کی مدد کی۔ ظاہر ہے یہ امیر کا رویہ ہی تھا، جس کی بدولت شاگردوں کے دل میں بھی ان کے لیے درد تھا۔ اسی لیے تلامذہ نے لغت کی فروخت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جہاں تک

دیوان کی اشاعت کا تعلق ہے، تو یہ بھی شاگردوں کی باربار فرمائش اور تعاون ہی سے ممکن ہوا۔ ورنہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس عظیم شاعر کے دواوین بھی غیر مطبوعہ ہی رہ جاتے۔ امیر برہم کو لکھتے ہیں : ''صنم خانہ عشق کو نظرِ ثانی سے میں نے مکمل و مہذب کرلیا ہے۔ کچھ کسر باقی ہے بعض احباب سخت مصر ہیں کہ چھپے''۔(۲۰۹) زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ : ''صنم خانہ عشق''، نظرِ ثانی سے مہذب و مکمل ہو گیا ہے۔ کچھ کسر باقی ہے۔ بعض تلامذہ کا اصرار اس کے طبع کی نسبت بدرجہ غایت ہے، جس سے امید کی جاتی ہے کہ اب کے چھپ ہی کے رہے گا''۔(۲۱۰)

الغرض امیر کا دیوان شاگردوں ہی کی کوششوں سے شائع بھی ہوا اور فروخت بھی۔ یہی صورتِ حال ''امیر اللغات'' کی اشاعت اور فروخت کی بھی رہی۔

امیر کو لغت کی تالیف میں کتابوں کی بھی اشد ضرورت رہتی تھی۔ ''دفتر امیر اللغات'' کے وسائل اتنے نہ تھے کہ بہ کثرت کتابیں خریدیں جائیں۔ چنانچہ امیر، کتابوں کے حاصل کرنے میں بھی تلامذہ سے مدد لیتے تھے۔ وہ شاگردوں کے کتب خانوں کی فہرستیں منگاتے اور حسبِ ضرورت کتاب مستعار منگوا لیتے اور پڑھنے کے بعد واپس کر دیتے۔ کسی خاص کتاب کی تلاش ہوتی تو اس میں بھی امیر اپنے تلامذہ سے مدد حاصل کرتے اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے شاگردوں سے کتاب تلاش کراتے۔ کتاب مل جانے کی صورت میں کسی شاگرد کے ذریعے سے اس کی نقل حاصل کرتے۔

امیر اس نوعیت کے کاموں سے اپنے تلامذہ میں علم کی لگن پیدا کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرح ان کے شاگرد بھی کتابوں کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ امیر کے نزدیک کتاب عمدہ خوش خط ہونے سے نہیں بلکہ اچھے مواد اور موضوع سے ہوتی ہے۔ زاہد کے نام خط میں رقم طراز ہیں :

> ''اگر عمدہ کتابیں ہوں تو اپنے کتب خانہ میں غور کر کے اچھی اچھی کتابوں کی فہرست ضرور بھیجیے اور عمدہ کتاب میرے نزدیک مطلقاً مذہب اور بہت خوش خط ہونے سے نہیں ہوتی، بلکہ فی نفسہ مافی الکتاب کے حسن پر نظر رہے''۔(۲۱۱)

ایک اور موقع پر زاہد کو لکھا کہ :

> ''ذرا مہربانی کر کے اپنے کتب خانہ کی فہرست بھجوایے، شاید کوئی کتاب مجھے مطلوب ہو تو مستعار لینے کی درخواست کروں اور نقل لے کر بااحتیاط بھیج دوں''۔(۲۱۲)

حبیب الرحمٰن شروانی کے نام خط میں ہے : ''اپنے کتب خانہ کی فہرست بھیجیے تو شاید کوئی کتاب مفید مجھ کو مستعار مطلوب ہو''۔(۲۱۳)

امیر شاگردوں کے علاوہ دیگر فضلاء کے کتب خانوں کی فہرستیں بھی منگواتے تھے اور ضرورت کی کتابوں کی نقل حاصل کرتے۔ صفیر بلگرامی کی کتاب ''جلوہ خضر''، حصہ دوم کی تلاش تھی۔ وہ منشی محمد اعجاز حسن کے ذریعے سے حاصل ہو گئی۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کے دو حصے مزید ہیں۔ چنانچہ امیر نے اعجاز کو لکھا کہ جو دو حصے غیر مطبوعہ ہیں اگر نقل کے لیے مل جائیں تو بہت اچھا ہو اور اگر نہ مل سکیں تو وہیں سے نقل لینے کا بندوبست کیا جائے :

"جلوہ خضر کے دو حصے اور ہونا اس حصۂ دوم سے معلوم ہوا۔ شاید ان کے چھپنے کی نوبت نہ آئی ہو گی۔ اگر آپ کی کوشش سے، قلمی دونوں حصے نقل کے واسطے مل سکیں تو بہت ہی جی خوش ہو اور اگر صغیر مرحوم کے جانشین مستعار نہ دیں تو وہیں نقل لینے کا بند وبست کیا جائے اور ان کے کتب خانے کی فہرست بہم پہنچانے میں بھی سعی کرنا باعثِ سنت ہو گا"۔(۲۱۴)

ایک اور خط میں منشی محمد اعجاز حسن کو "مقاصد حسنہ" کے لیے لکھتے ہیں کہ :"مقاصد حسنہ" کا نسخہ اب تک مجھے نہیں ملا، تلاش میں ہوں"۔(۲۱۵) پھر "سخن دانِ پارس" کے لیے لکھتے ہیں :"سخن دانِ پارس کا ذکر آگے آپ نے لکھا تھا۔ چونکہ دفتر "امیر اللغات" میں اس کی حاجت ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ جس مطبع سے اس کا ملنا ممکن ہو مجھے آگاہ کیجیے"۔(۲۱۶) مولوی محمد ریاض حسن خاں کے نام امیر کا ایک مکتوب اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سے امیر کا کتابوں سے شوق و اشتیاق اور شاگرد کی فرماں برداری کا پتا چلتا ہے۔

"صغیر مرحوم کے پاس شاعری سے متعلق کتابیں خصوصاً کلیات و دواوین شعرائے سلف بہت تھے۔ معلوم نہیں ان کے اعقاب میں کوئی ان سے مفتنفع ہوتا ہے یا نہیں اور مجھ سا مشتاق ان کتابوں میں سے کوئی کتاب مستعار پا سکتا ہے یا نہیں خیر۔ اگر ممکن ہو تو ان کے کتب خانے کی فہرست منگوا کر ایک نقل اس کی مجھے بھیج دیجیے اور بعد مطالعہ فہرست جن کتابوں کا میں طالب ہوں اپنی ذمہ داری سے ان کو مستعار دلوانے میں کوشش کیجیے۔ "دفتر اللغات" میں کم یاب و نایاب دواوین سے شعرائے گذشتہ کی بہت حاجت رہتی ہے۔ آپ لوگوں کی سعی جمیل بہت باعثِ شکر گزاری ہو گی"۔(۲۱۷)

الغرض امیر کی تربیت اور شاگردوں کی امیر سے حقیقی انسیت۔ نے ایک ایسا علمی حلقہ پیدا کر دیا تھا، جو معاشرے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جس کے لیے اجتماع کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس اجتماع کا کسی ایک نکتے پر متفق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بالخصوص اجتماع تو ہو جاتا ہے لیکن متفق نہیں ہو پاتا۔ اس لیے چھوٹے اور بڑے کام جو معاشرے کے لیے ضروری تھے ہو ہی نہیں سکے۔ کام نہ ہونے کی بڑی وجہ نیت بھی ہے۔ عموماً ناکامی کی ایک صورت سالار کی بدنیتی بھی ہوتی ہے۔ امیر مینائی کی شخصیت و کردار نے ایک ایسا بڑا علمی قبیلہ تیار کیا جو امیر پر کلی طور پر اعتماد کرتا تھا۔ یہ ایک بڑی مثال بھی ہے اس حوالے سے کہ ادیب و شاعر بھی فلاحی مملکت میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بہ شرطیکہ نیک نیت ہوں۔ اور بلاشبہ امیر نے یہ کر دکھایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے قومی شاعری کا ایسا کوئی تصور پیش نہیں کیا، جو ملک و قوم کے لیے راستے متعین کرتا۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنی شخصیت کے سحر سے ایسے لوگ تیار کیے جو معاشرے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ایسے اساتذہ تیار کیے جو مکتب کے لیے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے معاشرے میں استاد و شاگرد کی اس روایت کو زندہ رکھا جو ہماری قابلِ فخر شناخت ہے۔ جس کے ڈانڈے اہل صفہ سے جا ملتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اہل صفہ کی روایات پر عمل کی بدولت معاشرے میں اچھے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ امیر کا کردار اور تربیت کا انداز ثابت کرتا ہے کہ وہ اچھی روایات کے امین تھے۔ چنانچہ امیر کی کامیابیوں میں یہ بھی ایک بڑا محرک قرار دیا جا سکتا ہے۔

امیر اور ان کے شاگرد خلوص اور محبت کے جس رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا بیان مشکل تو نہیں، لیکن اتنا آسان بھی نہیں۔ کیوں کہ جس طرح امیر، شاگردوں کے لیے تڑپ رکھتے تھے اس طرح ان کے شاگرد بھی۔ گذشتہ صفحات میں امیر کے علاوہ شاگردوں کا امیر سے برتاؤ بھی پیش کیا گیا۔ جس میں خود غرضی نہیں ایثار ہی نظر آیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خلوص و محبت اور ایثار کی شہادتیں مکاتیبِ امیر میں جابجا بکھری ہوتی ہیں۔ اب ذیل میں استاد اور شاگرد کے تعلقات اور خلوص و محبت کا اور رخ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱۳)

امیر ریاست رام پور میں ایک اہم منصب پر فائز تھے۔ پھر انھیں نواب کلب علی خاں کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ لکھنؤ کے ایک بااثر خاندان سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ریاست سمیت ملک بھر میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اس کی وجہ سے امیر کا دیگر روسا اور نوابین وغیرہ میں تحفے و تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ امیر کے پاس بھی قیمتی تحفے آیا کرتے تھے، اس لیے امیر کی بھی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی عمدہ تحفے کا جواب بہترین تحفے کی صورت میں دیں۔ امیر فطرتاً نفاست پسند اور سلیقے مند انسان تھے ایسی ویسی اشیاء تو ان کی نظر میں جچتی ہی نہ تھیں چنانچہ وہ قیمتی یا منفرد چیزوں کے لیے شاگردوں سے مدد لیا کرتے اور ادائیگی پر زور دیا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ تلامذہ بھی قیمتی اشیاء تحفے میں اپنے استاد حضرت امیر مینائی کی خدمت میں پیش کرتے۔ جو امیر اکثر کسی اور کو تحفے میں بھیج دیتے تھے۔ بشیر ملیح آبادی کے نام خط میں اسی نوعیت کی بہت سی باتوں کا پتا چلتا ہے :

> "ادھر امسال آم بہت کم ہیں اور مجھے حسبِ مراسم قدیم بعض عالی مرتبہ روٗسا کو ہدیتاً بھیجنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان آموں کو بہت سمجھ کر ایک جگہ روانہ کر دیا۔ اب آپ سے یہ بات دریافت کرنا ہے کہ عمدہ لنگڑا آپ کے باغوں میں کچھ مل سکتا ہے یا نہیں یا اور باغوں میں بہ قیمت کس نرخ سے خرید ہو سکتا ہے۔ اپنے کھانے کو اور ہدیہ کرنے کو مطلوب ہے"۔ (۲۱۸)

زاہد حسین زاہد کو چاول، بھینس اور سر کا خریدنے کے لیے رقم طراز ہیں کہ :

> "جس جس قسم کے چاول وہاں اچھے ہوتے ہیں، وہ تھوڑے تھوڑے سے بھجوا دیجیے ...
> ایک عمدہ بھینس جو غریب و شائستہ قوم کی اچھی۔ کم سے کم سات سیر دودھ دیتی ہو۔ اور کمال صلاحیت و غریب سے گھر میں پل سکتی ہو۔ قیمت چالیس پچاس تک دینا منظور ہے۔ بشرطیکہ مال زیادہ کا ہو ...
> چار پانچ گھڑے سر کے، کے بھی اچار کے واسطے درکار ہیں ...
> روپیہ چاولوں کی قیمت کا اور بھینس کی قیمت کا یہاں فوراً ملے گا..."۔ (۲۱۹)

امیر کو بیماری کے باعث اکثر دواؤں کی ضرورت رہتی تھی اور بعض نسخوں کے لیے جڑی بوٹیوں کی بھی۔ چنانچہ وہ خط لکھ کر شاگردوں کے ذریعے منگوا لیتے تھے۔ اور شاگرد بصدِ خلوص و احترام امیر کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ امیر کو ایک نسخے کے لیے پیٹھے کی ضرورت تھی، جو احسن اللہ ثاقت کے علاقے میں ملتا تھا۔ اس لیے انھوں نے ثاقب کو لکھا کہ : "روحی فداک! ایک پیٹھے کی مجھے ضرورت ہے۔ ایک عرق کا نسخہ اس کے بغیر کھینچ نہیں سکتا ... خیال آیا کہ آپ کو تکلیف دوں"۔ (۲۲۰) امیر کے شاگرد حفیظ جون

پوری کا مشغلہ عطر کی تجارت کا تھا۔ امیر ان سے قیمتاً عطر لینے کی بابت لکھتے ہیں :

"سنتا ہوں کہ آپ کو کچھ عطر کی تجارت کا مشغلہ رہتا ہے، چوں کہ یہاں عطر کی اکثر حاجت رہتی ہے، اس لیے آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ دو تین قسم کے عمدہ عمدہ عطر اس موسم کے موافق بطور روانہ کیجیے اور قیمت بھی لکھیے، پسند آنے پر پھر بقدر حاجت آپ سے منگوایا جائے گا"۔(۲۲۱)

مولوی محمد اعجاز حسن خاں سے قفلی دار نیچوں کی فرمائش میں لکھتے ہیں کہ : مجھے قفلی دار چند نیچے مطلوب ہیں اور ایک نیچہ پیچوان کا"۔(۲۲۲) امیر نے ایک اور خط پھر نیچوں کی فرمائش لکھی اس لیے کہ یہ چیز رسول پور ضلع مظفر پور ہی میں ملتی تھی۔

"تاروں سے بنے ہوئے نیچے، جو خاص اسی ملک میں بنتے ہیں مجھے درکار ہیں۔ اگر آپ مہربانی کر کے بھیج دیں تو باعثِ منت پذیری ہے"۔(۲۲۳)

زاہد حسین زاہد کو میران پوری کملوں کے لیے لکھتے ہیں کہ : خدا آپ کو اطمینان دے تو میرانی پوری عمدہ کملوں کی فکر کیجیے"۔(۲۲۴)

ایک اور خط میں میووں کی فرمائش کرتے ہیں :

"میووں کی فہرست میں نے دیکھی، بالفعل مجھ کو عمدہ اناناس اگر بڑے ہوں تو بیس اور چھوٹے ہوں تو چالیس مطلوب ہیں۔ ایک عالی شان امید گاہ کو مربہ تیار کروا کے بطور پیش کش بھیجنا ہیں"۔(۲۲۵)

قیام لکھنؤ کے زمانے میں اسیر، امیر کے ہاں مہمان آنے والے تھے۔ اسیر تمباکو کا استعمال کرتے تھے، اس لیے تمباکو کی ضرورت ہوئی تو امیر نے کوثر خیر آبادی کو لکھا کہ :

"عمدہ خوشبودار دو سیر تمباکو کو خرید فرما کر باحتیاط ان کی ٹکیاں بند ھوا کر، ہوا سے محفوظ کر کے، منشی صاحب کو تفویض کیجیے کہ ان کے ساتھ چلے آنا با آسانی ممکن ہے"۔(۲۲۶)

کوثر خیر آبادی، امیر سے ملاقات کے لیے لکھنؤ ہو کر آنے والے تھے۔ امیر کو 'عطر دانوں' اور 'قارورئے' کی شیشیوں کی ضرورت تھی۔ جو لکھنؤ میں معیاری ملتی تھیں۔ چنانچہ امیر نے انھیں لکھا کہ : لکھنؤ ہو کر آنا ہو تو عطر دانوں کی شیشیاں اور چار شیشیاں قارورے کی بڑے منہ کے پائے تالہ سے لیتے آیئے گا"۔(۲۲۷) مختار شاہجہاں پوری کو لکھتے ہیں : "چاقو بڑے چھوٹے دونوں قسم کے مطلوب ہیں"۔(۲۲۸) ایک خط میں سنک اور نیچے وصول کرنے کے بعد لکھتے ہیں : سنک اور نیچے تیار ہو کر آپ کے پاس سے آگئے"۔(۲۲۹) دل شاہجہاں پوری کو بھی رسیدی خط میں لکھتے ہیں : "محبت نامہ سعادتِ شامہ آیا۔ شکر کی تھیلی بھی پہنچی"۔(۲۳۰) برہم کو پان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رقم طراز ہیں : دوبارہ پان بھیجنے کا شکریہ ۰۰۰ پان بھیجنے کی تکلیف بار بار تمھیں دی گئی ہیں نہایت محجوب ہوں"۔(۲۳۱) دل شاہجہاں پوری کے ذریعے شاہ عبدالقدیر کو پیغام بھجواتے ہیں کہ :"حسبِ وعدہ بچے املی کے کولے جو چٹکتے نہ ہوں میرے پاس بھجوا دیں"۔(۲۳۲) ایک مرتبہ منشی امتیاز احمد خاں راز سے امیر نے کولوں کی فرمائش کی۔ جس کی تعمیل میں راز کو تاخیر ہوئی تو امیر نے انھیں پر لطف انداز میں لکھا کہ :

" پیارے راز ایک مطلع تھر تھرائے ہوے دل سے کہا ہے اور کپکپائے ہوئے ہاتھوں سے لکھا ہے۔ سنواور اس کی قدر کرو۔ شعر :

نہیں کچھ تاپنے کو ، دست و پا سردی سے اولے ہیں
نہ کھورا ہے ، نہ کنڈے ہیں ، نہ سینٹھے ہیں ، نہ کولے "۔(۲۳۳)

الغرض تلامذہ کے نام امیر کے مکتوبات کئی اعتبار سے اہم ہیں۔ ان میں امیر کے کردار کے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جس سے اُن کی شخصیت مکمل ہوتی ہے۔ اور اسے سوالات کے جوابات بھی مل جاتے ہیں، جو ہمارے ذہنوں میں یہ کرید پیدا کرتے ہیں کہ امیر کے شاگردوں کی کامیابی کے راز کیا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر کے تلامذہ کی کامیابی امیر کی شخصیت میں پوشیدہ تھی، یہ پہلا بڑا راز ہے۔ جو شاگرد جتنا امیر کے قریب رہا وہ اتنا زیادہ کام قرار پایا۔ اس لیے کہ امیر نے تلامذہ کی تربیت کے لیے اپنی زندگی کو نمونہ بنایا، کتابی درس و تدریس کا عمل تو بعد میں شروع ہوتا ہے۔ مکاتیب کےمطالعہ سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ امیر کے بہت سے شاگرد ان کے اخلاق و کردار کی بلندی کے باعث پہلے ان کے گرویدہ ہوئے اور بعد میں شاگرد اور پھر ایسے اسیر ہوئے کہ رہائی نہ پاسکے اور امیر یے کہلائے۔

دوسرا راز "دفترِ امیر اللغات" کے ماحول میں پوشیدہ ہے۔ یہ بظاہر ایک دفتر تھا۔ جس میں بیس پچیس افراد کام کرتے تھے۔ جن میں امیر کے صاحب زادے، داماد قریبی عزیز اور بعض شاگردوں اور اس کے علاوہ بھی لوگ ملازم تھے۔ مکتوبات کی دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ دفتر اصل میں ایک مدرسہ یا ایک خانقاہ تھی۔ جس کے سربراہ امیر مینائی تھے۔ جو حضرت شاہ میناؒ کی اولاد میں سے تھے۔ مفتی بھی تھے اور شاعر بھی، لغت نویس بھی تھے اور تذکرہ نگار بھی دبستانِ لکھنؤ کی شعری روایات کے سرگرم نمایندہ بھی تھے اور نوابین رام پور کے استاد بھی۔ یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر تھا، ہر شخص بشمول امیر یہاں کے نظم و ضبط کے پابند تھے۔ امیر اپنی تمام حیثیتوں کے ساتھ اراکین "دفترِ امیر اللغات" کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ چناں چہ دیکھیے کہ ریاض، وسیم، جلیل وغیرہ ایک عرصے تک امیر کے زیرِ سایہ رہے بظاہر وہ دفتر کے معتمد تھے۔ لیکن اصل میں وہ طالبِ علم تھے۔ امیر کا ان پر ایسا رنگ چڑھا کہ ان لوگوں کا بھی سلسلہ تلمذ آج تک جاری ہے۔

تیسرا راز امیر کی مکتوب نویسی میں پوشیدہ ہے۔ امیر کے مکاتیب میں ان کی شخصیت کے اسرار اور دفتر کا پاکیزہ ماحول میں واضح نظر آتا ہے امیر کا طریقہ یہ تھا کہ جو شاگرد دوسرے شہروں میں مقیم تھے۔ انھیں مصروف رکھنے کے لیے ان سے رابطہ رکھتے تھے۔ ان کی خیریت دریافت کرتے اگر جواباً شاگردوں کے خطوط نہیں آتے تو بھی بُرا نہیں مناتے اور اپنی خط لکھنے کی روش تبدیل نہیں کرتے۔ امیر ان خطوط میں خیریت معلوم کرنے کے ساتھ شاگردوں کی کتابوں کی تفصیل معلوم کرتے۔ ضرورت کی کتابیں تلاش کراتے، اس کی نقل حاصل کرنے کی ترکیبیں بتاتے، امیر اللغات کے لیے الفاظ کی فہرستیں بنواتے، الفاظ کی سندیں تلاش کراتے، ضرورت کی چیزوں کی فرمائش کرتے، پہلے چیزوں کا تخمینہ لگواتے پھر اشیاء خریدتے، شاگردوں کا کلام پڑھنے کے لیے منگواتے، اصلاح کے لیے کلام منگاتے جسے توجہ سے ملاحظہ کرتے اچھے کلام کی تعریف کرتے اور کلام میں نقص ہوتا تو علمی پیرائے میں نشان دہی کرتے۔ حواشی لکھتے پھر بھی شاگردوں کی تشفی نہیں ہوتی تو لغات سے اور تاریخوں سے اسناد لکھتے، معرکہ آرائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے، غرض کہ خلوص و محبت کا ایسا شاندار نمونہ پیش کرتے کہ

شاگرد میں بھی زندگی کا سلیقہ آجاتا اور ایسا علمی رنگ چڑھتا جس پر حیرانی ہوتی۔ گویا امیر نے اپنی مکتوب نگاری سے شعر و ادب اور زندگی کا ایسا شعور پیدا کیا۔ جس سے ہزاروں لوگ متاثر ہوئے اور امیر ایک ایسا حلقہ بنانے میں کامیاب ہو گئے جس نے ان کی شعری و ادبی روایات کو بھی پروان چڑھایا۔

امیر کے یہی رویے اور طریقے تھے۔ جس کی بدولت امیر کے شاگرد اپنے دور میں بڑے بڑے استادوں پر بھاری رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں جو استادانہ شان امیر کی شخصیت میں تھی وہ ان کے کسی معاصرین میں نظر نہیں آتی اس کے سب سے بڑے گواہ شاگردوں کے نام امیر کے مکتوبات ہیں۔

حوالے

(۱) ڈاکٹر کریم الدین احمد : "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۵۰۵۔

(۲) ڈاکٹر ابو محمد سحر : "مطالعہ امیر"، لاہور، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء، ص ۴۵۲۔

(۳) کسریٰ منہاس : "تحقیقاتِ امیر مینائی : خطوط کی روشنی میں"، مضمون مشمولہ "نقوش"، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔

(۴) سید عبدالحکیم حکمت : "دبدبۂ امیر"، پٹنہ، برقی مشین پریس، ۱۹۳۷ء، ص ۱۳۳۔

(۵) احسن اللہ ثاقب : "خطوط منشی امیر احمد"، طبع اوّل، علی گڑھ، اردو پریس، ۱۹۱۰ء، ص ۳۱۔

(۶) شاہ ممتاز علی آہ : "امیر مینائی"، لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء، ص ۱۴۵۔

(۷) "نقوش"، خطوط نمبر، حصہ اوّل، ص ۴۲۴۔

(۸) "مطالعۂ امیر"، ص ۴۶۱۔

(۹) "امیر مینائی"، ص ۱۴۵ تا ۱۴۸۔

(۱۰) "مطالعہ امیر"، ص ۴۵۵ تا ۴۶۱۔

(۱۱) عرفان عباسی : "داستانِ امیر مینائی"، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۵ء۔

(۱۲) سرفراز علی رضوی : "ماخذات احوال شعراء و مشاہیر"، جلد سوم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۱ تا ۲۷۲۔

(۱۳) وزیر الحسن سعید زبیری، ہاشمی، سہسوانی : "تذکرہ ناموران سہسوان"، کراچی، راشد زبیر اکیڈمی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۔

سید نظیر حسنین زیدی : "تذکرہ منتخب روزگار سہسوان"، کراچی، مکتبۂ مسعود، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۵۹۔

(۱۴) حکیم نثار احمد علوی : "سخنورانِ کاکوروی"، کراچی، میخانہ ادب، ۱۹۷۸ء، ص ۷۰۔

(۱۵) سید شہید حسین شہید بدایونی : "تذکرہ شعرائے بدایوں"، حصہ اوّل، کراچی، مطبوعاتِ بدایوں، ۱۹۸۷ء۔

(۱۶) "تذکرہ ناموران سہسوان"، ص ۴۹۔

(۱۷) "تذکرہ شعرائے بدایوں"، حصہ اوّل، ص ۱۵۶۔
(۱۸) یکتاجودھپوری: "بہار سخن"، حیدر آباد، محبوب پریس، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۸۔
(۱۹) "تذکرہ شعرائے بدایوں"، حصہ اوّل، ص ۱۷۷۔
(۲۰) رازیزدانی: مضمون، "رام پور کا ماحول شعر و سخن"، لکھنؤ، نگار، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۳۴۔
(۲۱) ایضاً
(۲۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۷۴۔
(۲۳) نعیم الحق آزاد، شیخ پوری: "حیات الشعراء"، میرپور خاص، بلدیہ میرپور خاص، سندھ، ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۶۔
(۲۴) "تحقیقاتِ امیر مینائی: خطوط کی روشنی میں"، ص ۶۳۔
(۲۵) "امیر مینائی"، ص ۹۵۔
(۲۶) پروفیسر نفیس صدیقی: "داغ اور ان کے معاصرین"، مضمون مشمولہ "نگار" لکھنؤ، ۱۹۵۳ء، ص ۵۸۔
(۲۷) ہفت روزہ "ہماری زبان"، علی گڑھ، یکم نومبر ۱۹۶۳ء، ص ۸۔
(۲۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۳۹۔
(۲۹) ایضاً، ص ۱۸۹۔
(۳۰) ایضاً، ص ۲۹۶۔
(۳۱) ایضاً، ص ۲۲۱۔
(۳۲) ایضاً، ص ۱۲۷۔
(۳۳) ایضاً، ص ۲۹۸۔
(۳۴) ایضاً، ص ۱۱۷۔
(۳۵) ایضاً، ص ۱۷۸۔
(۳۶) ایضاً، ص ۱۶۰۔
(۳۷) ایضاً، ص ۱۵۵۔
(۳۸) ایضاً، ص ۲۴۴۔
(۳۹) ایضاً، ص ۲۶۶۔
(۴۰) "دبدبہ امیری"، ص ۱۳۳۔
(۴۱) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۵۱۶۔
(۴۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۵۳۔

(۴۳) ایضاً، ص ۱۵۱۔

(۴۴) ایضاً، ص ۱۴۶۔

(۴۵) ایضاً، ص ۲۹۱۔

(۴۶) ایضاً، ص ۱۶۱۔

(۴۷) ایضاً، ص ۱۴۱۔

(۴۸) ایضاً، ص ۲۴۳۔

(۴۹) "مطالعہ امیر"، ص ۹۰۔

(۵۰) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۵۱۔

(۵۱) ایضاً، ص ۳۳۱۔

(۵۲) ایضاً، ص ۲۳۳۔

(۵۳) ایضاً، ص ۱۱۳۔

(۵۴) ایضاً، ص ۱۲۹۔

(۵۵) ایضاً، ص ۱۲۸۔

(۵۶) ایضاً، ص ۲۹۹۔

(۵۷) ایضاً

(۵۸) ایضاً، ص ۲۹۷۔

(۵۹) ایضاً، ص ۱۲۷۔

(۶۰) ایضاً، ص ۲۶۹۔

(۶۱) ایضاً، ص ۱۳۴۔

(۶۲) ایضاً، ص ۱۱۱۔

(۶۳) ایضاً، ص ۱۳۵۔

(۶۴) ایضاً، ص ۱۳۷۔

(۶۵) ایضاً، ص ۱۴۱۔

(۶۶) ایضاً، ص ۱۱۷۔

(۶۷) "نگار"، لکھنؤ، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۶۔

(۶۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۱۴۔

(۶۹) ایضاً، ص ۱۴۴۔

(۷۰) ایضاً، ص ۱۹۳۔

(۷۱) ایضاً، ص ۱۱۲۔

(۷۲) "امیر مینائی"، ص ۲۰۔

(۷۳) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۹۹۔

(۷۴) "زمانہ"، کانپور، فروری ۱۹۰۶ء، ص ۹۱۔

(۷۵) صفدر مرزاپوری: "مشاطہ سخن"، جلد اوّل، لکھنؤ، صدیق بک ڈپو، ۱۳۳۶ھ، ص ۵۵ تا ۸۵۔

(۷۶) صفدر مرزاپوری: "مشاطہ سخن"، جلد دوّم، لاہور، سنہ ندارد، ص ۵۹ تا ص ۶۶۔

(۷۷) امیر مینائی، ص ۹۵ تا ص ۹۶۔

(۷۸) "حیات الشعراء"، ص ۲۳۶ تا ص ۲۴۲، ۲۴۶ تا ۲۵۱۔

(۷۹) امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۵۱۷ تا ص ۵۳۳۔

(۸۰) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۰۔

(۸۱) "مشاطہ سخن"، حصہ دوّم، ص ۵۸۔

(۸۲) "مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۱۶۶۔

(۸۳) "مشاطہ سخن"، حصہ دوّم، ص ۶۰۔

(۸۴) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۸۔

(۸۵) "مشاطہ سخن"، حصہ دوم، ص ۵۹۔

اس اصلاح پر ۲۶ فروری ۱۸۹۱ء درج ہے۔ جب کہ اس سے متعلق خط جو "مکاتیب امیر مینائی" (ص ۱۶۸) میں ہے، اُس پر ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء ہے۔ اس کے علاوہ "مکاتیب امیر مینائی" میں ۲۶ جولائی ۱۸۹۱ء کے مکتوب میں اسی غزل (ہوسِ نقشِ پا) سے متعلق وضاحتیں ہیں، جس کا ذکر ۲۰ جولائی والے خط اور ۲۶ فروری ۱۸۹۱ء (مشاطہ سخن) کی اصلاح میں ملتا ہے۔

غالباً ہوا یہ ہے کہ امیر نے ۲۰ جولائی والے خط کے ساتھ اصلاح بھیج دی تھی۔ بقول امیر: "ہجومِ انتشار میں غزل دیکھی ... مجھے فرصت واطمینان نہیں ہے ورنہ وجوہ بھی حواشی پر لکھ دیتا"۔ (ص ۱۴۸) بعد میں جب امیر کو فرصت ہوئی تو انھوں نے ۲۶ جولائی ۱۸۹۱ء کو وجوہات بھی لکھ بھیجیں۔ چناں چہ ۲۰ جولائی اور ۲۶ جولائی والے خط موضوع کی مناسبت سے مربوط ہیں اور دونوں پر سال ۱۸۹۱ء ہے۔ لہٰذا اب "مشاطہ سخن" میں اس خط پر جولائی کے بجائے فروری کا لکھا جانا کتابت کی غلطی قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۸۶) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۱۷۱۔

(۸۷) "مشاطہ سخن"، حصہ دوم، ص ۶۰۔

اس اصلاح پر تاریخ ۲۰ جنوری ۱۸۹۲ء درج ہے۔ جب کہ اس اصلاح سے متعلق خط جو کہ "مکاتیب امیر مینائی" میں شامل ہے اس پر ۳۰ جنوری ۱۸۹۲ء (ص ۱۷۱) درج ہے۔ یہ اصطلاح جس غزل پر ہے۔ اس کی ردیف "جام شراب" ہے۔ اسی غزل سے متعلق ایک خط (مکاتیبِ امیر مینائی) میں ۱۳ جنوری ۱۸۹۲ء کا بھی ملتا ہے۔ جس میں امیر اپنی بیماری کے باعث غزل نہ دیکھنے کی معذرت کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ۲۰ جنوری ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔

(۸۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۸۱۔

(۸۹) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۰۔

(۹۰) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۸۲۔

(۹۱) ایضاً، ص ۱۸۷۔

(۹۲) "مشاطہ سخن" حصہ دوم، ص ۶۱۔

امیر کی اس اصلاح پر ۲۵ اگست ۱۸۹۳ء درج ہے۔ جب کہ اس اصلاح سے متعلق خط جو "مکاتیب امیر مینائی" میں شامل ہے۔ اس پر ۳۰ جون ۱۹۹۳ء ہے۔ یہی درست ہے۔ کیوں کہ اسی تاریخ کے خط میں اس اصلاح سے متعلق امیر کی تصریحات ہیں جب کہ ۲۵ اگست ۱۸۹۳ء کے خط میں جو "مکاتیبِ امیر مینائی" میں شامل ہے۔ اصلاح والی غزل سے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی۔

(۹۳) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۸۸۔

(۹۴) ایضاً، ص ۱۹۷۔

(۹۵) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۱۔

اس اصلاح پر ۲۲ جون ۱۸۹۴ء کی تاریخ درج ہے۔ جب کہ اس سے متعلق خط پر ۱۳ جون ۱۸۹۴ء ہے۔ امیر نے اس مکتوب میں زاہد کو لکھا ہے کہ: "غزل کسی وقت دیکھ کر بھیجوں گا"۔ چناں چہ امیر نے ۱۳ جون کو صرف خط ارسال کیا جب کہ ۲۲ جون کو اصلاح۔

(۹۶) "مکاتیبِ امیر مینائی" حصہ اول، ص ۱۹۹۔

(۹۷) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۱۔

(۹۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۱۲۔

(۹۹) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۱۔

(۱۰۰) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۱۳۔

(۱۰۱) "مشاطہ سخن حصہ اول، ص ۶۲۔

(۱۰۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۱۶۔

(۱۰۳) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۲۔

(۱۰۴) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۲۳۔

(۱۰۵) "مشاطہ سخن"، حصہ اول، ص ۶۳۔

(۱۰۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۲۴۔

(۱۰۷) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۶۳۔

(۱۰۸) "مکاتیبِ امیر مینائی" ص ۲۲۵۔

(۱۰۹) ایضاً، ص ۲۳۰۔

(۱۱۰) ایضاً، ص ۲۳۱۔

(۱۱۱) ایضاً، ص ۲۳۵۔

(۱۱۲) "مشاطہ سخن" حصہ اول، ص ۶۵۔

(۱۱۳) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۳۶۔

(۱۱۴) ایضاً، ص ۳۴۳۔

(۱۱۵) ایضاً، ص ۱۵۵۔

(۱۱۶) ایضاً، ص ۲۱۸۔

(۱۱۷) ایضاً، ص ۲۵۴۔

(۱۱۸) ایضاً، ص ۱۱۶۔

(۱۱۹) ایضاً، ص ۲۸۹۔

(۱۲۰) ایضاً، ص ۱۹۷۔

(۱۲۱) ایضاً، ص ۲۴۹۔

(۱۲۲) ایضاً، ص ۲۷۳۔

(۱۲۳) ایضاً، ص ۳۳۷۔

(۱۲۴) ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ، نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۶۔

(۱۲۵) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۳۹۔

(۱۲۶) ایضاً، ص ۲۹۱۔

(۱۲۷) ایضاً

(۱۲۸) ایضاً، ص ۲۹۲۔

(۱۲۹) ایضاً، ص ۳۴۱۔

(۱۳۰) ایضاً، ص ۳۴۳۔

(۱۳۱) ایضاً، ص ۲۱۲۔

(۱۳۲) ایضاً

(۱۳۳) ایضاً، ص ۲۴۹۔

(۱۳۴) ایضاً، ص ۱۵۷۔

(۱۳۵) ایضاً، ۱۴۷۔

(۱۳۶) "امیر مینائی"، ص ۲۰۔

(۱۳۷) ایضاً، ص ۵۱۔

(۱۳۸) ایضاً، ص ۲۱۶۔

(۱۳۹) ایضاً، ص ۲۱۷۔

(۱۴۰) ایضاً، ص ۲۲۷۔

(۱۴۱) ایضاً، ص ۲۲۸۔

(۱۴۲) ایضاً، ص ۲۲۹۔

(۱۴۳) ایضاً، ص ۲۶۳۔

(۱۴۴) ایضاً، ص ۱۵۰۔

(۱۴۵) "سوانحِ امیر"، ص ۱۷۔

(۱۴۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۱۳۔

(۱۴۷) ایضاً، ص ۱۶۶۔

(۱۴۸) ایضاً، ص ۱۷۲۔

(۱۴۹) ایضاً، ص ۱۳۱۔

(۱۵۰) ایضاً، ص ۱۴۲۔

(۱۵۱) غیر مطبوعہ خط بنام: احمد حسین خاں مذاق، مورخہ ۴ دسمبر ۱۸۹۱ء۔

(۱۵۲) غیر مطبوعہ خط بنام: نواب عالم گیر خاں، مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۹۰ء۔

(۱۵۳) صہبائے مینائی، ص ۲۲۶۔

(۱۵۴) "نقوش" مکاتیب نمبر، نومبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۹۔

(۱۵۵) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۲۶۔

(۱۵۶) ایضاً، ص ۲۰۰۔

(۱۵۷) ایضاً، ص ۲۲۶۔

(۱۵۸) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۴۶۳۔

(۱۵۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۹۲۔

(۱۶۰) ایضاً، ص ۱۸۰۔

(۱۶۱) ایضاً، ص ۱۱۶۔

(۱۶۲) ایضاً، ص ۲۴۵۔

(۱۶۳) ایضاً، ص ۱۶۶۔

(۱۶۴) ایضاً، ص ۱۱۰۔

(۱۶۵) ایضاً، ص ۱۱۵۔

(۱۶۶) ایضاً، ص ۳۰۴۔

(۱۶۷) "نقوشِ مکاتیب نمبر"، ص ۱۲۶۔

(۱۶۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۰۸۔

(۱۶۹) ایضاً، ص ۱۴۷۔

(۱۷۰) ایضاً، ص ۳۵۰۔

(۱۷۱) ایضاً، ص ۲۹۳۔

(۱۷۲) ایضاً، ص ۱۵۹۔

(۱۷۳) ایضاً، ص ۱۶۶۔

(۱۷۴) ایضاً، ص ۲۴۶۔

(۱۷۵) ایضاً، ص ۱۵۳۔

(۱۷۶) ایضاً، ص ۱۶۵۔

(۱۷۷) غیر مطبوعہ خط مورخہ ۶ جون ۱۹۹۲ء۔

(۱۷۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۱۶۔

(۱۷۹) ایضاً، ص ۲۹۰۔

(۱۸۰) ایضاً، ص ۲۹۱۔

(۱۸۱) ایضاً، ص ۲۷۱۔

(۱۸۲) ایضاً، ص ۱۳۲۔

(۱۸۳) ایضاً، ص ۱۴۰۔

(۱۸۴) ایضاً، ص ۱۰۷۔

(۱۸۵) ایضاً، ص ۱۱۴۔

(۱۸۶) ایضاً، ص ۱۱۸۔

(۱۸۷) ایضاً، ص ۱۱۹۔

(۱۸۸) ایضاً، ص ۱۱۳۔

(۱۸۹) ایضاً، ص ۱۱۷۔

(۱۹۰) ایضاً، ص ۱۱۸۔

(۱۹۱) ایضاً، ص ۱۲۱۔

(۱۹۲) ایضاً، ص ۲۹۲۔

(۱۹۳) ایضاً، ص ۱۵۴۔

(۱۹۴) ہفت روزہ "ہماری زبان"، علی گڑھ، ص ۸۔

(۱۹۵) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۳۵۔

(۱۹۶) ایضاً، ص ۳۱۱۔

(۱۹۷) ایضاً، ص ۱۴۴۔

(۱۹۸) "نقوش"، مکاتیب نمبر، ۱۲۵۔

(۱۹۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۰۹۔

(۲۰۰) ہفت روزہ "ہماری زبان" علی گڑھ، ص ۸۔

(۲۰۱) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۵۷۔

(۲۰۲) ایضاً، ص ۱۲۱۔

(۲۰۳) ایضاً، ص ۱۱۷۔

(۲۰۴) ایضاً، ص ۱۰۸۔

(۲۰۵) ایضاً، ص ۱۱۵۔

(۲۰۶) ایضاً، ص ۳۱۶۔

(۲۰۷) ایضاً، ص ۳۱۰۔

(۲۰۸) ایضاً، ص ۱۱۰۔

(۲۰۹) ایضاً، ص ۱۱۵۔

(۲۱۰) ایضاً، ص ۲۲۷۔

(۲۱۱) ایضاً، ص ۱۶۱۔

(۲۱۲) ایضاً، ص ۱۶۸۔

(۲۱۳) ایضاً، ص ۲۹۱۔

(۲۱۴) ایضاً، ص ۳۲۱۔

(۲۱۵) ایضاً، ص ۳۲۲۔

(۲۱۶) ایضاً، ص ۳۲۴۔

(۲۱۷) ایضاً، ص ۳۲۷۔

(۲۱۸) ایضاً، ص ۳۵۴۔

(۲۱۹) ایضاً، ص ۲۵۶۔

(۲۲۰) ایضاً، ص ۲۵۵۔

(۲۲۱) ہفت روزہ "ہماری زبان"، علی گڑھ، ص ۹۔

(۲۲۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۱۹۔

(۲۲۳) ایضاً، ص ۳۲۴۔

(۲۲۴) ایضاً، ص ۱۹۹۔

(۲۲۵) ایضاً، ص ۲۲۷۔

(۲۲۶) "اردو معلیٰ"، علی گڑھ، ص ۲۸۔

(۲۲۷) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۳۲۔

(۲۲۸) "نقوش"، خطوط نمبر، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۶۔

(۲۲۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۴۰۔

(۲۳۰) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۲۹۔

(۲۳۱) ایضاً، ص ۱۲۴۔

(۲۳۲) "نقوش" مکاتیب نمبر، ص ۲۱۷۔

(۲۳۳) ایضاً، ص ۱۲۷۔

☆☆☆

باب ہفتم

مکتوباتِ امیر کی سوانحی اہمیت

مکتوبات کا ذخیرہ بہت دل چسپ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انکشافات کی دنیا ہے۔ مکتوبات الیہ کی ذاتی زندگی، اس کے دور کا احوال، اس کی قابلیت کے موتی، اس کی سوچ، فکر بدلتے ہوئے علمی، ادبی مذہبی، سیاسی، معاشی،، معاشرتی رجحانات صرف ایک شخص ہی کہ نہیں بلکہ ایک دور کی تاریخ کو پیش کرتے ہیں۔ مکتوباتِ امیر بھی اپنی بعض گوناگوں خوبیوں کی بدولت قیمتی معلومات سے پر ہیں۔ ان میں امیر کے علمی خیالات و نظریات اور ادبی کارناموں کے علاوہ زندگی گزارنے کا ایک مسلسل جزئیات کے ساتھ ملتا ہے۔ امیر کے یہ مکاتیب ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے شواہد بھی پیش کرتے ہیں اور ان کی سیرت و کردار کی نقاب کشائی بھی کرتے ہیں۔ ان میں عہد رفتہ کے حکمرانوں کی علم پروری اور قدر دانی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور بر صغیر میں بدلتے ہوئے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کی کڑیاں بھی۔ ان مکاتیب میں کہیں کہیں ہمارے مسلم معاشرے کی انحطاطی بھی ہمیں منہ چڑاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور کہیں کہیں ہمارے قدیم نظامِ تعلیم کی یرغمالی بھی۔ امیر کا عہد نہایت پر آشوب تھا۔ امیر نے اس دور میں کیسی زندگی گزاری۔ یہ بے حد معلوماتی، بصیرت افروز اور تاریخی اعتبار سے نہایت مفید باب ہے۔ جسے مکتوبات کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔

امیر کی سوانح عمریوں میں، امیر سے متعلق متعدد معلومات ادھوری ہیں۔ جنھیں امیر کے مکتوبات مکمل کرتے ہیں۔ اسی طرح مکاتیب میں امیر کی زندگی کی جو کڑیاں ملتی ہیں، انھیں سوانح عمریاں نتیجہ خیز بناتی ہیں۔ اس کے علاوہ امیر پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ شاگردوں یا عقیدت مندوں نے تحریر کی ہیں۔ اس لیے ان میں پیش کی گئی اکثر معلومات کو قبول کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا تامل ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکاتیبِ امیر نے ان سوانح عمریوں کو سند کا درجہ دے دیا ہے۔

امیر کی سوانح عمریوں میں ان کی زندگی کے اہم واقعات اور دیگر معلومات کثرت سے ملتی ہیں۔ لیکن زندگی کا زمانی تسلسل جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ خطوط اس کمی کا ازالہ کرتے ہیں۔ ذیل میں امیر کے حالاتِ زندگی سوانح عمریوں اور خطوط کی مدد سے پیش کیے جاتے ہیں۔ زیادہ معلومات مکتوبات سے مستفاد ہیں۔ اس باب میں حالاتِ زندگی کے علاوہ امیر کے مزاج، عادت و اطوار مشاغل، مصروفیات، احباب سے رویے اور سیرت و کردار وغیرہم کے دیگر پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

امیر کی ابتدائی زندگی کا احوال تو عموماً سوانح عمریوں ہی میں ملتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ کڑیاں خطوط میں بھی مل جاتی ہیں۔ لیکن ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کی زندگی تو بالتفصیل مکتوبات ہی میں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امیر کی سوانح عمریوں میں بھی ابتدائی حالات تشنگی کا شکار ہیں۔ جب کہ آخری بیس سال یعنی ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کے حالاتِ زندگی نسبتاً تفصیل سے ہیں۔ یہی آخری بیس سال امیر کی زندگی کے اہم ترین قرار دیے جاسکتے ہیں۔ جس پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

(۱)

امیر کی عملی زندگی کا آغاز" ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء" میں نواب واجد علی شاہ اختر کے دربار میں باریابی سے ہوتا ہے۔ امیر کا یہ زمانہ خوش فکری اور بے فکری کا تھا، لیکن اس زمانے میں جو علمی کام انھوں نے کیے وہ یا تو ضائع ہو گئے یا پھر آج تک منظر عام پر نہیں آئے۔ اسی زمانے

میں جو کلام مرتب ہوا، وہ بھی ۱۸۵۷ء کے خلفشار میں تلف ہوگیا۔ بر ہم کو لکھتے ہیں کہ : ''عہد شاہی تک جو کلام مرتب ہوا تھا وہ غدر میں تلف ہوگیا''۔(۱) امیر نے یہ کلام مدون کر کے خوشنویس سے لکھوا بھی لیا تھا، لیکن ضائع ہوگیا۔ البتہ ''مرآۃ الغیب'' میں جو کلام پایا جاتا ہے، اس میں ابتدائی دور کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ امیر محمد نوح کور قم طراز ہیں کہ :

''غدر میں میرا بھی کلام جس قدر اس زمانے تک مرتب ہوا تھا اور میں نے اس کو خوشنویس سے لکھوا کر مطلا اور مذہب کرایا تھا۔ سب تلف ہوگیا، مگر کچھ اپنی یاد سے کام لے کر کچھ پھر موزوں کیا کہ 'مراۃ الغیب' کی صورت بندھی''۔(۲)

لکھنؤ کی تباہی میں امیر کا کیا حال ہوا، اس کی ایک کیفیت امیر اپنے ایک قدیمی دوست طاہر فرخ آبادی کو لکھتے ہیں کہ :

''غدر میں اموال بھی تلف ہوگئے، جانیں بھی سیکڑوں ضائع ہوگئیں۔ یہ تو ادنی کیفیات تھے۔ مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ غارت گروں نے ہمیں بھی لوٹ لیا۔ صفاتِ قدیمہ بھی خیر باد کہہ کر سدھار گئے۔ محبت کا نشان بھی نہ باقی رہا۔ ہمدردی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی، قوتیں سلب ہوگئیں، حافظے کام کے نہیں باقی رہے، میرا بھی یہی حال ہوا، مجھ میں مطلق قوت نہیں رہی۔ اسی زمانے میں ریاست رام پور کو چلا جانا ہوا''(۳)

لکھنؤ کی تباہی کے بعد ''امیر، کاکوری، کانپور، مین پوری، ہمیر پور (ضلع باندہ)''(۴) میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد نواب یوسف علی خاں ناظم کی طلبی پر رام پور چلے گئے۔

(۲)

نواب یوسف علی خاں ناظم نے ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں ''سو روپے ماہوار پر عدالتِ دیوانی کا مفتی مقرر کردیا''۔(۵) جلیل مانک پوری کے بیان کے مطابق : ''سرکاری مکان رہنے کو دیا اور خدام و سپاہی مقرر کردیے''۔(۶) بعد ازاں : ''۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں محکمہء رجسٹری کا افسر مقرر کیا گیا''(۷) غرض کہ نواب یوسف علی خاں نے امیر کی بڑی قدر و منزلت کی۔ واجد علی شاہ کی معزولی اور غدر کے حالات میں امیر نے جو مصائب اٹھائے تھے، اس کا ازالہ نواب کے حسنِ اخلاق نے کردیا۔

نواب یوسف علی خاں ناظم کا انتقال ۱۴ر اپریل ۱۸۶۵ء کو ہوا اور اسی روز نواب کلب علی خاں مسند آرا ہوئے۔ امیر کا یہ زمانہ زندگی کا بہترین دور قرار دیا جاسکتا ہے۔ نواب یوسف علی خاں کی طرح نئے نواب نے بھی امیر کی دل سے نازبرداری کی، وہ امیر کے حاکم بھی تھے اور شاگرد بھی، امیر کے دل میں بھی ان کی بڑی قدر تھی۔ نواب صاحب امیر کو اپنا خادم سے زیادہ استاد، رازداں اور دوست سمجھتے تھے۔

نواب کلب علی خاں نے اقدار میں آنے سے کچھ ہی عرصہ بعد امیر کو مفتی عدالت سے سبکدوش کر کے صرف کلام کی اصلاح اور پرائیوٹ سکریٹری کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ جلیل مانک پوری لکھتے ہیں :

''عہدۂ مفتی سے سبکدوش فرما کر آپ کے بڑے بھائی مفتی طالب حسن صاحب کو مفتی عدالت کردیا۔ سب سے زیادہ خدمت خاص شعر و سخن کی تھی۔ اور اس کے ساتھ حضرات امیر ہی سے وہ اہم خدمات

بھی متعلق تھی، جو ایک فارن سیکریٹری اور پرائیوٹ سیکریٹری انجام دیا کرتا ہے"۔(۸)

آہ نے امیر کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ: "۱۲۸۹ (مطابق ۱۸۷۲ء) میں خلد آشیاں نے پہلے پہل غزل کہی"۔(۹) آہ، امیر مینائی کی ذمہ داریوں اور نواب کلب علی خاں کے مشغلہ شاعری کی بابت یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"نواب صاحب کو شعر گوئی کا شوق ہوا۔ دن کو تو زیادہ تر امور ملکی و مالی میں مصروف رہتے تھے۔ رات کو شعر کہتے تھے اور ہرکاروں کی ڈاک لگی رہتی تھی۔ ادھر شعر کہا اور ادھر لفافے میں بند ہو کر استاد کے پاس پہنچ گیا۔ کسی کسی دن تو پچھلی رات تک یہی سلسلہ رہتا تھا۔ حضرت رات ہی کو غزل پر اصلاح دیتے اصلاح کے وجوہ لکھتے اور صبح کی نماز سرکار ہی میں جاکر پڑھتے تھے۔ پہلے یہ اصلاح شدہ غزل پیش کرتے، اس کے بعد مصاحب منزل میں دربار شروع ہوتا۔ برسوں نواب صاحب شعر گوئی کے ذوق میں اور استاد کلام کی درستی اور اصلاح میں راتوں کو بہت کم سوئے۔"(۱۰)

نواب کلب علی خاں امیر کی اس محنت اور بھاگ دوڑ کی اجرت بھی توقعات سے کہیں زیادہ دیا کرتے تھے۔ ممتاز علی آہ، امیر کی سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ:

"یوں تو خلد آشیاں کی داد و دہش اور انعام و اکرام جس کا شہرہ عرب و عجم میں تھا سب ہی کی دست گیری اور کاربر آری کیا کرتا تھا۔ مگر حضرت (امیر) کے ساتھ اس میں بھی ایک تخصیص رہتی تھی۔ ... بکس کھولتے اور دو ایک گڈیاں نوٹوں کی نکال کر سامنے رکھ دیتے۔ اب یہ ان کی قسمت تھی۔ چاہے چار پانچ سو کے نوٹ نکلیں چاہے ہزار دو ہزار کے۔ دو چار مہینے کے بعد پھر کسی دن یوں ہی پوچھتے اور اسی طرح کی دو ایک گڈیاں نوٹوں کی عنایت ہو جاتیں۔"(۱۱)

ممتاز علی آہ کے اس بیان کی تصدیق امیر کے ایک مکتوب بنام شاداب رسول پوری سے بھی ہوتی ہے:

"میرے ساتھ خاص جوان کا برتاؤ تھا، وہ سوا میرے اور ان کے کسی کو معلوم نہ تھا۔ دو سو سولہ ماہوار، تنخواہ وہ مجھ کو دیا کرتے تھے اور ہر سال ختم سال پر چار پانچ ہزار روپیہ دیتے تھے اور اس طرح دیتے تھے کہ وہ جانتے تھے اور میں اور خدا بس اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ یوں پانچ چھے سو روپیہ ماہوار مجھے ملتے تھے۔ جس میں، میں بسر کرتا تھا۔ اگر کسی وجہ سے کچھ مقروض ہو جاتا تھا تو میری ناواقفی میں وائن کو ادا کر کے دستاویز پھیر لیتے تھے۔ پھر مجھے علم آتا تھا۔

جلوت کی ملاقات میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم نوکر اور یہ آقا ہیں مگر خلوت میں وہ برتاؤ تھا کہ جیسے بے تکلف سچے احباب میں ہوتا ہے۔"(۱۲)

اس خط کے آخری پیرائے کی تصدیق، ممتاز علی آہ کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ:

"مچھی بھون میں ایک اچھوتا سا مکان جس کو سرد خانہ کہتے تھے۔ تمام ضروری سامانِ آسائش کے ساتھ

حضرت کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ظہر کی نماز آپ وہیں پڑھتے اور خلد آشیاں جب تلاوت قرآن مجید کر لیتے تو بلا لیتے۔ اس وقت سے چار بجے تک، صحبتِ تخلیہ رہتی۔ اس کے بعد دربار ہوتا تھا۔" (۱۳)

امیر کے مکتوبات اور سوانح عمریوں میں نواب کلب علی خاں اور امیر کے درمیان تعلقات کی جو فضا ملتی ہے۔ اس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی نازبرداری کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ دونوں میں بد مزگی پیدا ہو گئی۔ ممتاز علی آہ اس واقعہ کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ :

"۱۲۹۶ھ میں خلد آشیاں کسی بات پر مفتی طالب حسن مرحوم سے ناراض ہو گئے اور مفتی صاحب ترکِ ملازمت کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ایک روز نواب صاحب نے حضرت سے فرمایا۔ میں سنتا ہوں آپ اپنے بھائی سے خط و کتابت رکھتے ہیں۔ عرض کی حضور یہ صحیح ہے اور اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ فرمایا! آپ کو اس کا خیال نہیں ہے کہ میں ان سے ناراض ہوں۔ عرض کیا، حضور اس کا تو افسوس رہتا ہے، لیکن بڑا بھائی اور وہ بڑا بھائی جس نے باپ کی طرح میری پرورش کی، بھلا مجھ سے کب چھوڑا جاسکتا ہے۔ کیا اب میں اتنے سے بھی گیا ہوا کہ ان سے خط و کتابت نہ رکھوں بات کچھ نہ تھی، مگر رئیس تو رئیس۔ اس وقت خدا جانے کس خیال میں تھے، فرمایا مگر اس کو گوارا نہیں کر سکتا یا اپنے بھائی سے قطع تعلق کیجیے۔ یا مجھ سے ترک تعلق کیجیے۔ کچھ سکوت کر کے عرض کی اس کا جواب میں پھر دوں گا۔" (۱۴)

امیر کو نواب صاحب سے اس رویے کی توقع نہ تھی۔ چناں چہ انھوں نے اس بات کا بہت گہرا اثر لیا۔ اس واقعے سے انھیں ایسا دھچکا لگا کہ وہ پے در پے بیماریوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ ایک طرف بھائی کی محبت اور دوسری طرف آقا کی فرمانبرداری، امیر کڑے امتحان میں پڑ گئے۔ انھوں نے بیماریوں کے باوجود ہر ممکن طریقے سے نبھانے کی کوشش کی۔ یکم جولائی ۱۸۸۰ء کے خط میں کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ :

"جب تک صحیح رہتا ہوں، سرکاری خدمتوں سے فرصت نہیں ہوتی اور جب مریض ہوتا ہوں، تو سۃ ضروریہ میں بھی فتور ہوتا ہے۔" (۱۵)

۱۸ر نومبر ۱۸۸۰ء کے خط میں امیر، ثاقب کو رقم طراز ہیں کہ :

"میں خود بیمار ہوں اور کئی مریضوں کا پرستار ہوں سب پر طرہ یہ کہ سرکار دولت مند کے احکام کی تعمیل سے مطلق فرصت نہیں۔" (۱۶)

ایک وقت وہ آیا کہ امیر اپنی بیماریوں اور ریاست کے حالات سے تنگ آگئے اور وہ یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ امیر کے ایک خط محررہ مارچ ۱۸۸۱ء، بنام احسن اللہ ثاقب سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی تیاریاں بالکل مکمل تھیں۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بناء پر سفر موقوف کرنا پڑا۔

"میرے سفر میں چند روز کا توقف معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت جو ڈاک آئی اس نے متوقف کر دیا۔ دوسری تحریر کا انتظار کرنا پڑا جو ایک ہفتے سے کم متصور نہیں اور مکرر یہ کہ اس وقت کی ڈاک سے رکنا

پڑا، ورنہ تہیہ سامان سب ہو چکا تھا صبح کو کل قصد حتما تھا۔"(۱۷)

۲۳ر فروری ۱۸۸۲ء کے خط بنام کوثر خیر آبادی سے پتا چلتا ہے کہ امیر ابھی رام پور ہی میں ہیں اور ان کی بیماریوں میں بدستور اضافہ ہو رہا ہے۔

"میں ڈیڑھ مہینے سے بیمار، دونوں شانوں اور بازوؤں کے درد میں گرفتار ہوں پہلے کم تھا رفتہ رفتہ بڑھ گیا اب حرکتِ قلم تک میں تکلیف ہوتی ہے۔ لکھنا تکلیف ہوتا ہے اور شب کو تو ذرا چین نہیں آتا کسی کروٹ لیٹا نہیں جاتا۔"(۱۸)

اب امیر حالت یہ ہو گئی تھی کہ امراض میں ازالہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ امیر ۱۶ر جمادی الآخر ۱۳۰۰ھ کے خط میں خسرو آرا بیگم کو لکھتے ہیں کہ "ازالہ کسی مرض کا نہیں۔"(۱۹) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب کلب علی خاں اور امیر کے درمیان رنجش بڑھ گئی اور نواب نے امیر کے ذمے کام بھی بڑھا دیے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے امیر ذہنی اذیت اور یاسیت کا شکار ہو گئے۔ یہاں تک کہ شاعری اور مشاعروں سے بھی طبیعت اکتا گئی ہے۔ منشی واحد علی کے نام خط، محررہ ۱۰ر ذیقعد ۱۳۰۰ھ میں رقم طراز ہیں کہ :

"اس زمانہ میں جس افکار مولمہ میں مبتلا ہوں وہ ہرگز مجھ کو رخصت نہیں دیتے کہ شعر کی طرف متوجہ ہوں۔ انشاء اللہ بعد کسی قدر حصول اطمینان کے یہ مشغلہ کبھی کبھی ہوا کرے گا۔ مشاعروں میں لکھنؤ کے برسوں پڑھ چکا، دیوان چھپ گئے۔ اکثر اخباروں اور گلدستوں میں بھی کلام مطبوعہ ہوا۔ اب کوئی حوصلہ ایسی باتوں کا نہیں رہا۔ جوانی کے ساتھ وہ سب حوصلے چل بسے۔ اپنی شاعری تو جو ہونا تھی وہ ہو چکی۔ دعویٰ کسی بات کا نہ تھا، نہ اب ہے۔"(۲۰)

۲۵ر فروری ۱۸۸۳ء کو حبیب الدین سوزاںؔ کو نہایت قلق کے ساتھ لکھتے ہیں :

"افسوس کہ عمر مفت ضائع ہوئی۔ ایک جگہ پابند ہو کر آبِ مقید کی طرح گندہ ہو گیا۔ اللہ ہی پر و بال دے تو پرواز کروں۔"(۲۱)

مذکورہ مکاتیب سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ امیر ریاست سے کس قدر بددل ہو چکے تھے۔ یہی بددلی اصل میں ان کی بیماریوں کا اصل سبب بھی تھی۔ امیر کے امراض کی شدت کا اندازہ باسط علی خاں کے نام مکتوب سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ :"ہمارے پلنگ کے گرد کسی کا بیٹھنا کسی وقت ممکن نہیں، اس لیے کہ دغدغہ اجابت اور غلبہ ریاح یاسوی سے باربار چوکی پر جانا ہوتا ہے۔"(۲۲) امیر زندگی سے اس حد تک مایوس ہو چکے تھے کہ اب وہ مایوسی تحریر بھی نظر آنے لگی تھی۔ ۲۱ر ذیقعد ۱۳۰۰ھ کے خط میں مولوی حبیب اللہ کو لکھتے ہیں :

"عمر اب اخیر ہے۔ ہر نفس نفسِ واپسیں نظر آتا ہے۔ تلافی مافات اور عوض تصیع اوقات ہوئے ؎

کیا کہوں گا کوئی محشر میں جو پوچھے گا امیر
کیوں نہ بگڑی ہوئی باتوں کو بناتے آئے۔"(۲۳)

۱۶ر مئی ۱۸۸۳ء کا خط، جو ارشد گورگانوی کے نام ہے۔ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس میں امیر کی داخلی اور خارجی کیفیات کا نہایت واضح عکس ملتا ہے۔

"اب نہ دل ہی میں طاقت ہے نہ دماغ میں قوت، نہ مکروہات سے فرصت، نہ شوق نہ ذوق۔ بوڑھے پہلوانوں کی طرح دور سے داؤ پیچ کشتی کے بتا رہ گیا ہے۔ اس پر بھی یقین نہیں کہ وہ داؤ پیچ صحیح بتاتا ہوں یا دھوکا کھاتا ہوں۔ کیوں کر کہوں کہ میری غزل گلدستہ میں شامل ہو گی۔ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر چہ چہ نہیں ہیچ مدان محض ہوں۔ مگر عام جو بہ نکوئی نکل گیا ہے۔ اور نزدیک دور سیکڑوں ہزاروں آدمی استاد جاننے لگے ہیں، تو اب یہ گوارا نہیں کہ سست کلام مشہور ہو اور چست ہو تو کہاں سے ہو۔ چست تو جب ہو کہ محنت کی جائے اور محنت کی نہ فرصت نہ طاقت۔ گفتن صد عیب و نگفتن یک عیب۔" (۲۴)

امیر کے حالات ابتر تھے کہ اوائل ستمبر ۱۸۸۳ء میں کلب علی خاں کو، امیر کا ایک جعلی خط پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ بد گمانیوں میں اضافہ ہو۔ امیر رقم طراز ہیں کہ :

"کوئی عرض کہیں سے آئی اور اس میں کوئی خط جعلی میرا ملفوف ہے۔ جس میں حضور کو میری طرف سے برہمی ہوئی۔ یہ خبر سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔" (۲۵)

امیر نے ۲۱ر ستمبر ۱۸۸۳ء کو ایک خط نواب کلب علی خاں کی خدمت میں ارسال کیا، تاکہ بد گمانی دور کی جا سکے۔ ڈاکٹر کریم الدین کا خیال ہے کہ "یہ خط کسی نے کلکتہ سے بھیجا تھا۔" (۲۶) امیر نے نواب صاحب کو لکھا کہ :

"ادبار غلام کا زمانہ ہے، کسی صاحب نے محض بغض للہ یہ جعل کیا ہو گا اور غلام جہاں تک اپنا ذہن دوڑاتا ہے، تو کوئی ایسا دشمن بھی ذہن میں نہیں آتا ہے۔ اس لیے کہ غلام کو کسی کے ساتھ کبھی بدی مذکور خاطر نہیں ہوئی۔ غلام کے ساتھ کیوں کوئی بدی کرے۔ جب حضور کی پرورش اور حق شناسیوں کا یہ حال ہے کہ ایک غلام بے دست و پا کے تمام متعلقین و متعلقات کو گھر بیٹھے وظیفہ عطا فرما کر پالتے ہیں، اس سے کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اپنے ایسے آقائے ولی نعمت کی بے علت بد خواہی کرے۔ غلام کا تو یہ حال ہے کہ 'اودھ پنچ' میں ایک سطر غلام کے باب میں چھپی تھی۔ اتفاقاً ایک شخص نے فدوی سے ذکر کیا اور فدوی نے اخبار دیکھتے ہی انتہائی شکایت کا خط مالک اخبار کو اسی وقت بھیجا کہ انھوں نے اپنی خطا کا اعتراف کیا۔ چناں چہ وہ اعتراف نامہ حضور میں پیش کرتا ہے۔" (۲۷)

جعلی خط والے واقعے سے، امیر بے حد دل برداشتہ ہوئے۔ کئی مکاتیب کی داخلی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ بلا آخر اکتوبر ۱۸۸۳ء کے اوائل میں لکھنو چلے گئے۔ ممتاز علی آہ کے مطابق : "رات کو پوشیدہ طور سے پنس میں سوار ہو کر مراد آباد اور وہاں سے ریل پر لکھنؤ چلے

گئے۔"(۲۸)امیر بہت پہلے لکھنؤ چلے جاتے، اس لیے کہ حاسدوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے بھی خصوصی مالی مراعات بند کر دی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ پریشانیوں میں گھر گئے تھے۔ امیر نے انھیں دنوں مہاجن سے بھی قرض لینے کی کوشش کی۔ جس کے لیے انھوں نے کلکتہ میں مقیم اپنے ایک دوست، مولانا علی عبدالقادر کو لکھا۔ لیکن غالباً انھوں نے مہاجن سے قرض لینے کو منع کر دیا اور لکھا کہ دوستوں سے قرض لینا بہتر ہے۔ چناں چہ امیر انھیں رقم طراز ہیں کہ :

"جب معاملہ مہاجن سے نہیں ہے، دوستوں سے منظور ہے تو اپنی رسید ان کو لکھ دیجیے گا۔ میری رسید جو بعد میں بھیجوں گا، اپنے پاس رکھ لیجیے گا۔ زیادہ توثیق کی کیا حاجت۔"(۲۹)

بہر کیف جب امیر کے خلاف سازشیں بڑھ گئیں۔ تو پھر ان سے رام پور میں نہ رہا گیا اور وہ لکھنؤ چلے گئے۔ اس موقع پر ممتاز علی آہ کا بیان جو رام پور سے ترک ملازمت اور لکھنؤ میں قیام سے متعلق ہے۔ یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ جیسے نواب کلب علی خاں نے ایک دن طالب حسن کے مسئلہ پر امیر سے باز پرس کی امیر گھر آئے اور چپکے چپکے تیاری میں مشغول رہے اور اسی رات کو چھپ کر لکھنؤ چلے گئے۔ گویا چوبیس گھنٹے کی کہانی ہوئی، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ نواب کلب علی خاں ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۸ء۔۱۸۷۹ء) میں امیر کے بڑے بھائی طالب حسن سے ناراض ہو گئے۔ نواب کی اس ناراضگی کی بنا پر طالب حسن ملازمت چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد نواب کو کسی طرح پتا چلا کہ امیر اپنے بڑے بھائی سے خط و کتابت رکھتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے امیر کو بلا کر باز پرس کی، امیر نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھر آ گئے، لکھنؤ جانے کی تیاری کرتے رہے یہاں تک کہ اکتوبر ۱۸۸۳ء شروع ہو گیا یوں طالب حسن سے ناراضگی کے تقریباً چار سال بعد وہ لکھنؤ گئے۔

(۳)

امیر لکھنؤ جا کر گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ یہاں پہلا مسئلہ رہائش کا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ، بہت سے عزیز و اقارب جو رام پور میں مقیم تھے، ان کی کفالت اور نگہداشت پر پوری توجہ نہیں ہو رہی تھی۔ تیسرا روزگار کا تھا۔ ۲۵ر محرم ۱۳۰۱ھ بمطابق ۲۷ر اکتوبر ۱۸۸۳ء کو امیر، لکھنؤ سے سید علی قادری کو اپنے مسائل کے ذیل میں رقم طراز ہیں :

"محمد احمد رام پور گئے ہیں کہ وہاں کئی عزیز بیمار ہیں اور میں یہاں خود بیمار، بڑی بیماری یہ ہے کہ بہت سے بیماروں کا خدمت گزار ہوں"۔(۳۰)

میر مجاور کو لکھتے ہیں :

"میں خود صاحبِ فراش، گھر میں بھی یہی حال اور کئی عزیز بیمار ان سب کا تیمار دار میں، اگر نہ ہوں تو خدا کو کیا جواب دوں۔"(۳۱)

امیر کے ایک خط محررہ ۲۸ر نومبر ۱۸۸۳ء سے پتا چلتا ہے کہ، امیر لکھنؤ میں ایک بڑا مکان قسطوں پر لینا چاہتے تھے۔ جس کے لیے انھیں مالی مسائل کا سامنا تھا۔ سید علی قادری کو رقم طراز ہیں کہ :

"دو ہزار روپیہ کی شدید ضرورت ہے۔ ایک مکان لکھنؤ میں، قسطوں سے بہت عمدہ مقام پر متصل

چوک مل سکتا ہے۔ جو دس ہزار کی پختہ عمارت ہے اور امید ہے کہ چار ہزار میں بالفعل مل جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ دو ہزار تک رہے اس کو لوں۔ ۔۔۔۔ اس کی بھی کمال فکر ہے کہ وہ نکل جائے گا تو ایسا مکان ایسی لاگت کا ایسی قیمت کو نہ ملے گا۔ پس ایسے وجوہ سے مجھ کو چار ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ ایک اشد ہے اور دوسری شدید۔" (۳۲)

غالباً امیر، یہ مکان حاصل نہیں کر سکے۔ ۱۴ر جنوری ۱۸۸۴ء کے مکتوب میں میر مجاور کو لکھتے ہیں کہ :اب میں لکھنؤ میں تجمل حسین خاں کی بارہ دری کے قریب فرو کش ہوں۔" (۳۳) ۱۴ر مئی ۱۸۸۵ء میں جو خط وہ احسن اللہ ثاقب کو تحریر کرتے ہیں۔ اس پر "لکھنؤ گڑھ ابو تراب خاں (۳۴)، تحریر ہے۔ ۱۲ر اگست ۱۸۸۴ء کے خط بنام میر مجاور سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر "گڑھ ابو تراب خاں، لکھنؤ میں منتقل ہو گئے ہیں۔" (۳۵) جب کہ ۳۰ر ستمبر ۱۸۸۵ء کے خط بنام احسن اللہ ثاقب میں "یحیٰ گنج قریب شوالہ بھوانا سنگھ مکان ڈپٹی وحید الزماں خاں صاحب مرحوم" مندرج ہے۔ (۳۶) گویا امیر لکھنؤ جا کر دربدر ہی رہے۔

قیام لکھنؤ کے دوران امیر نے کاروبار بھی کیے۔ جس کا کچھ تجربہ انھیں رام پور میں بھی ہو چکا تھا۔ ایک مطبع 'تاج المطابع' کے وہ مالک تھے"۔ (۳۷) جہاں انھوں نے مصحفی کے چار قلمی دیوانوں کی تصحیح کی جو بعد میں تاج المطابع سے شائع ہوا۔" (۳۸) اس بابت کم از کم دو مکتوبات سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ مسائل تجارت میں بہت سچے کھرے تھے اور صلح صفائی کے ساتھ کاروبار کرتے تھے۔ حکیم عابد کوثر خیر آبادی کے نام خط محررہ ۲۳ر فروری ۱۸۸۲ء میں امیر کے کاروباری مزاج اور طریقہ تجارت کی بابت بہت کچھ مفید معلومات اخذ کی جا سکتی ہیں۔

"عبد الستار خاں ۶ر فی نسخہ دیوانِ مصحفی کو مانگتے ہیں۔ مجھ کو اس تجارت میں سراسر نقصان ہے۔ منشی صاحب قبلہ (امیر لکھنوی) نے جو چند، ۸ر فی نسخہ فروخت فرمائے وہ بھی بہ مجبوری اس لیے کہ یہاں سے وہاں گئے تھے۔ وہاں سے پلٹ کر یہاں آنا اور طول امل تھا۔ میں نے بھی یہی گوارا کیا۔ اب تین سو نسخے جو باقی ہیں اس قیمت پر دینے کو جی نہیں چاہتا۔ آیندہ آپ سے دوستوں کی جو رائے ہو، میں نے منشی ریاض احمد سے بھی ان کی رائے پوچھی ہے۔ آپ بھی اپنی رائے لکھیں اگر نفع قلیل بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ یہ تو سراسر نقصان ہے۔" (۳۹)

۱۳ر مئی ۱۸۸۳ء کے خط میں ارشد گورگانوی کو لکھتے ہیں :

"چار دیوان مصحفی مرحوم کا 'تاج المطابع کا چھپا ہوا یہاں موجود ہے۔" (۴۰)

امیر نے لکھنؤ آ کر کاروبار کا ایک بالکل نیا تجربہ کیا۔ ممکن ہے کہ مطبع قائم کرنے اور کتابوں کو مرتب کر کے شائع کرنے میں نقصان ہوا ہو۔ یا ہو سکتا ہے، پریشانیوں میں اور کچھ سوچا ہی نہ ہو، چناں چہ انھوں نے لکھنؤ پہنچنے کے تقریباً ایک ماہ بعد ہی آغا باقر شیرازی کے ساتھ مل کر روئی کا کاروبار کیا۔ ۲۸ر نومبر ۱۸۸۳ء کے خط میں سید علی قادری کو لکھتے ہیں :

"مشغلے تجارت، بظر عواقب اندیش معرفت آغا صاحب کی شروع کرنا اور ابتداء میں دو ہزار روپیہ اس

میں لگانا، تو آپ سے کہہ چکا ہوں۔ اس کے بعد اسی قدر روپیہ اور لگایا۔" (۴۱)

آغا باقر شیرازی نے پھر دو ہزار روپے کا مطالبہ کیا، امیر سخت پریشان ہوئے اور انھوں نے راجہ بستی سے قرض لینے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اس میں ناکامی ہوئی، اس کے بعد اپنے دوست غافل سے رقم کے طلب گار ہوئے۔ غافل کے نام کیم اپریل ۱۸۸۴ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"سنو! بستی سے امید پوری کیا ادھوری بھی بر نہ آئی، ہاں تمھاری رقم کے کسی عمدہ حکمت، عمدہ رسائی، عمدہ تدبیر سے یہ دو ہزار روپیہ، جس کے دینے کا دعدہ گزر گیا اور جس کام پر موقوف تھا، وہ تحریر کر دیا گیا۔ مل جائے تو تمھارا احسان ورنہ مجھے تو ملنے سے یاس ہے۔ بد عنوانی سے مجھے لینا منظور نہیں۔" (۴۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غافل سے، مطلوبہ رقم حاصل ہو گئی، لیکن اس کے بعد آغا باقر شیرازی رقم لے کر کلکتہ فرار ہو گیا۔ اس واقعے کی شہادت امیر کے ایک خط بنام میر مجاور میں ملتی ہے :۔

"ایک پیر مرد، مومن جس کے ساتھ بہت سلوک کیے تھے چھ ہزار روپیہ لے گیا۔" (۴۳)

ممتاز علی آہ نے میرزا محمد باقر شیرازی کے ساتھ روئی کی تجارت والے منصوبے اور اس کی ناکامی کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"خلد آشیاں کے عہد میں میرزا محمد باقر شیرازی بھی آئے اور نوکر ہو گئے چوں کہ شاعر بھی تھے اور ایک سن آدمی، برسوں ایک رفیق کی طرح حضرت ہی کے یہاں ان کی نشست برخاست زیادہ رہی۔ ••• جب حضرت، خلد آشیاں سے کچھ کشیدہ ہو کر لکھنؤ چلے آئے تو آغا صاحب سمجھانے بجھانے پر بھی رام پور میں نہ ٹھہرے اور حضرت ہی کے پاس آرہے۔ دو چار مہینے کے بعد حضرت سے کہا کہ آپ کہیں سے آٹھ دس ہزار روپے کی فکر کر دیجیے۔ تو میں آپ کے لیے تجارت کروں۔ دو برس آپ کو کچھ نہ دوں گا۔ راس المال بڑھاتا رہوں گا۔ اس کے بعد اتنا منافع ملے گا کہ اچھی طرح آپ کی بسر ہو سکے گی۔ حضرت نے کسی نہ کسی طرح فکر کر کے روپیہ آغا صاحب کے حوالے کیا اور آغا صاحب نے چند دن میں روئی کی تجارت شروع کی۔ وقتاً فوقتاً معاملات و مناسبات تجارت کا اظہار کر کے اور اس پر زور دے کر پانچ سات ہزار روپیہ حضرت سے اور لیا اور کل روپے کی روئی کلکتے بھیج کر آپ بھی وہیں گئے اور سب روپیہ وصول کر کے دبا بیٹھے خط و کتابت بھی بند کر دی۔" (۴۴)

امیر مینائی کے بڑے صاحب زادے محمد احمد صریر مینائی کلکتہ گئے۔ اور انھوں نے وہاں میرزا باقر شیرازی کو تلاش کر لیا۔ لیکن ان سے نہ رقم ملی اور نہ وہ خود لکھنؤ آنے پر تیار ہوا۔ اس کے باوجود امیر ان کے ساتھ مل کر تجارت کرنے پر آمادہ تھے، حکیم غلام نصرت خاں کو ۲۸ر اگست کے خط میں آغا باقر شیرازی کے متعلق تفصیل سے رقم طراز ہیں :

"محمد احمد کے (کلکتہ سے) ناکام آنے سے دو طرح کے ملال ہوئے۔ ایک تو سراپا نقصان زر اور

رضاعت اموال اور بربادی محبت اور تضییع اوقات اور شرکاء سے انفعال اور معاندین ہم چشم کی خندہ زنی اور سال بھر کی امیدوں کے یاس سے مبدل ہونے کا ملال۔ جب استطاعت ہو تو سرکار کا روپیہ ادا کیا جائے۔

آغا صاحب کے اختیار میں ہے۔ بشرطیکہ خودداری اور زرپسندی ان کو دوسرے کی بات قبول کرنے دے کہ جہاں جہاں اس کارخانے کا کچھ بھی تعلق تھا ان سے صفائی نامہ حاصل کرلیں۔ بمبئی کا حساب تو حاصل ہی ہو چکا ہے۔ اس کو آغا صاحب نے بھی سمجھ لیا ہوگا۔ اگر صاف صاف ہمارے سمجھنے کے لائق لکھوادیں تو ہم بھی سمجھ لیں۔ رہا کلکتہ اور چند دس، ان کو حاصل کرنے کے بعد ہم تو حرکت نہیں کرسکتے۔ آغا صاحب یہاں آجائیں اور باہم ہم اور وہ بیٹھ کر نئے سرے سے کوئی بندوبست جدید کریں۔ اگر اس کا سامان خدا کردے تو اب کی بار وہ صورتیں جن میں نقصان کا تجربہ ہو چکا ہے نہ کی جائیں۔ بلکہ بہ اتفاق رائے یک وگر ایسا طریقہ، جو حفظ مایہ میں بہت مستحکم اور نفع دینے میں غالب ہو، کیا جائے تاکہ شاید تلافی مافات مرہم داغ پارینہ ہو کر ہم کو آلام مالیہ خصوصاً فکر روح فرسائی کی ادائے زر شرکاء سے نجات دے اور آئندہ تو سبیل ہمارے اور آغا صاحب کے اس پیرانہ سالی میں بسر کی نکلے ••• حکیم صاحب میں نے جو بات، میرے دل میں تھی، وہ صاف صاف لکھ دی ••• میں آپ سے امید رکھتا ہوں کہ اس مضمون کو آغا صاحب سے بیان کر کے کہیں، بلکہ قسم دیں جو اس کے جواب میں آپ کو منظور ہو بلا تصنع وتردید آپ لکھ دیں۔" (۴۵)

روئی کی تجارت میں ناکامی کے بعد، امیر نے گزربسر کے لیے ایک مطبع قائم کرنے اور اخبار نکالنے کا ارادہ کیا۔ جس کے مالک وہ خود اور مدیر ان کے بڑے صاحب زادے محمد احمد صریر مینائی مقرر ہوئے۔ محمد احمد ۷رستمبر ۱۸۸۴ء کے خط میں حکیم غلام حضرت خاں کو رقم طراز ہیں کہ:

"رائے قرار پائی کہ مطبع کی ٹھہرے 'آزاد' نام اخبار نکلے۔ سردست تو آپ کا نسخہ جاری کیا جائے گا۔ یعنی اور جگہ چھپوالیں گے۔ جب امیدیں بڑھیں گی، سہارا ہوگا تو کارخانہ کرنا بھی دشوار نہیں ••• اشتہار لکھ گیا ہے۔ مالک ابا جان ہیں۔ باقی کاموں میں سب کی رائے سے اگود میں ہوں، مہتمم میں ہوں۔ ایڈیٹر میں ہوں ••• جلد ہی پچاس اشتہار آپ کی خدمت میں ارسال کردیں گے۔" (۴۶)

۲۰ر ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۹ر دسمبر ۱۸۸۴ء کے خط، بنام طاہر فرخ آبادی سے پتا چلتا ہے کہ امیر نے احباب اور محمد احمد کے اصرار سے، اخبار کے علاوہ گلدستہ شائع کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا اور اس کے اشتہار بھی شائع ہو گئے تھے۔

"رہنما اخبار" بندہ زادہ کلاں نے بے شغلی سے تنگ آکر جاری کرنے کا قصد کیا ہے۔ دو اشتہار اس کے بھی بھیجتا ہوں اور گلدستہ بعض احباب نے شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے، میں نے بھی بتقاضائے۔ شعر

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

فقیر زادہ یعنی منشی محمد احمد میرے حکم کے موافق اس کے انصرام کا کفیل ہوا ہے۔ اس کے بھی چند قطعہ اشتہار بھیجتا ہوں۔"(۴۷)

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "آزاد" اخبار اور مطبع کا خیال ترک کر دیا گیا اور صرف گلدستہ "دامنِ گلچیں" پر توجہ مرکوز کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں قباحتیں ہوں اس لیے کہ امیر کو مطبع اور اخبار کے کاروبار کا ایک تجربہ تھا، رام پور میں انھوں نے ایک مطبع "تاج المطابع" قائم کیا تھا اور یہاں سے اخبار کا اجراء بھی ہوا تھا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے "اخترِ شہنشاہی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ :

"تاج المطابع رام پور ۔۔۔ امیر کا ذاتی مطبع تھا۔ اس مطبع سے ایک ہفتہ وار اخبار "تاج الاخبار" نکلتا تھا، جس کے مالک وہ خود اور مہتمم محمد احمد قمر تھے۔ مطبع اور اخبار دونوں یکم ستمبر ۱۸۷۵ء کو جاری ہوئے تھے۔"(۴۸)

گمان غالب ہے کہ امیر کو، رام پور میں اخبار اور مطبع کے کاروبار میں بھی نقصان ہوا یہی وجہ ہے کہ وہ سلسلہ زیادہ عرصہ چل نہیں سکا۔ غالباً اسی ناکامی کے پیش نظر بالکل آخری دنوں میں وہاں اس منصوبے کو ترک کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ امیر کے ایک مکتوب بنام میر مجاور علی خاں محررہ ۸ر دسمبر ۱۸۸۴ء سے یہ پتا چلتا ہے کہ :"اس سال آگ لگ گئی اس سے نقصان کثیر ہوا"(۴۹) ہو سکتا ہے اس بڑے نقصان کے باعث امیر مزید تنگ دستی کا شکار ہو گئے ہوں اور انھوں نے اخبار کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس لیے کہ ۹ر دسمبر ۱۸۸۴ء کا مکتوب بنام طاہر فرخ آبادی، جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، سے پتا چلتا ہے کہ اخبار اور گلدستے دونوں کی تیاری مکمل تھی۔ اشتہار چھپ بھی گئے اور تقسیم بھی کر دیے گئے تھے۔ لیکن صرف "دامنِ گلچیں" جاری ہوا اور اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ امیر اس کاروبار کو جمانے کے لیے تمام تر وسائل بروئے کار لائے۔ بالخصوص اپنے احباب اور شاگردوں سے بھر پور تعاون حاصل کیا۔ جو لاشاگردوں کا کلام نہایت توجہ سے اصلاح کے بعد شائع کیا گیا۔ اس سے کئی فوائد امیر کو حاصل ہوئے۔ پہلا یہ کہ گلدستہ کی فروخت میں اضافہ اور آسانی ہوئی۔ دوسرا یہ کہ امیر کے رنگِ شاعری کو عروج حاصل ہوا اور تیسرا یہ کہ دبستانِ لکھنؤ کے مزاج اور معیار کی قبولیت میں اضافہ ہوا۔ امیر احسن اللہ ثاقب کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ۷ر جنوری ۱۸۸۵ء کے خط میں انھیں لکھتے ہیں کہ :

"گلدستہ دامنِ گلچیں کی نسبت التفات آپ کا اس قدر کافی نہیں ہے کہ آپ خریداری فرمائیں، بلکہ آپ سے فرد تر احباب نے بھی تیس تیس درخواستیں بھجوائی ہیں۔ آپ کو بھی بر عایت اپنی شان اور د بپاسِ مشرب وضع و محبت کے، سعی بلیغ فرما کر جلد درخواستیں بکثرت بھیجنا چاہئیں۔ اب تو اللہ اس گلدستے کی بیل منڈھے چڑھائے اور مشتہرینِ اشتہار نے جس غرض سے میرا نام درج اشتہار کیا ہے۔ اس کی لاج رہ جائے۔"(۵۰)

ڈاکٹر ابو محمد سحر "دامنِ گلچیں" کے شماروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"دامنِ گلچیں" کا پہلا پرچہ فروری ۱۸۸۵ء میں ٹائپ میں شائع ہوا۔ مارچ ۱۸۸۵ء کا دوسرا پرچہ بھی

ٹائپ میں نکلا۰۰۰اپریل ۱۸۸۵ء اور اس کے بعد کے پرچے لیتھو میں طبع ہوئے۔ امیر کا یہ گلدستہ اپنے معیار اور دل کشی میں اس وقت کے تمام گلدستوں میں ممتاز ہوا۔۰۰۰دامنِ گلچیں امیر کی نگرانی میں ایک سال تک نکلتا رہا۔" (۵۱)

اپریل ۱۸۸۵ء کا پرچہ تاخیر سے شایع ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ ،اس شمارے کے لیے شعرائے رام پور، داغؔ و جلالؔ کی غزلیات کا انتظار تھا۔ امیر شاداب رسول پوری کو رقم طراز ہیں کہ۔ مکتوب محررہ ۱۲/اپریل ۱۸۸۵ء۔

"گلدستہ اپریل میں کسی تاریخ نکلے گا۔ شعرائے رام پور، داغؔ و جلالؔ وغیرہ کی غزلوں کا انتظار ہے۔" (۵۲)

امیر کے ایک خط محررہ ۱۴/ مئی ۱۸۸۵ء بنام احسن اللہ ثاقب سے "دامنِ گلچیں" کے اصول و ضوابط کا پتا چلتا ہے۔

۱۔ امیر صرف نگرانی کرتے تھے۔ اور دیگر امور محمد احمد قمر و دیگر احباب کے مشورے سے کیا کرتے تھے۔

۲۔ غیر طرحی کلام شائع نہیں کیا جاتا تھا۔

۳۔ پہلے سے شائع شدہ کلام شامل نہیں کیا جاتا تھا۔

۴۔ صرف اردو کلام شایع ہوتا تھا۔

امیر مذکورہ تمام امور کو نہایت عمدگی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں :

"غزل بھی دیکھی اور ہر شعر پر وجد کیا۔ سبحان اللہ کیا کیا شعر کہے ہیں۔ میں بسر و چشم ان پھولوں سے 'دامنِ گلچیں' کو آراستہ کرتا، مگر 'دامنِ گلچیں' سے میرا خاص تعلق نگرانی کا ہے۔ اور امور میں قمر باتفاق رائے کمیٹی کاربند ہوتے ہیں اور کمیٹی کی رائے غیر طرح کلام کرنے کی اب تک نہیں ہے اور طرح کا کلام اس قدر آتا ہے کہ ورق بڑھانا پڑتے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کی غزل کو باحتیاط رکھ لیا ہے، اگر آیندہ کلام غیر طرح چھپنے لگے گا تو ضرور چھپے گی، بشرطیکہ اس سے پہلے شائع نہ ہو چکی ہو۔ مجھ کو آپ اپنا مخلص دیرینہ تصور فرمائیں، آخر میں پھر عذر خواہ ہوں کہ بہ مجبوری ابھی آپ کی غزل درجِ گلدستہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر اردو زبان میں کچھ موزوں کرنے کا اتفاق ہوتا ہو، تو طرح 'دامنِ گلچیں' میں طبع آزمائی ضرور فرمائی جائے۔" (۵۳)

"دامنِ گلچیں" امیر کے اہلِ خانہ کی کفالت کی کچھ سبیل نکل آتی تھی۔ لیکن اس میں بھی امیر کی بیماری کے باعث تعطل آجاتا تھا۔ شاداب کو ۷/جون کے شمارے کی تاخیر کی وجہ لکھتے ہیں کہ : "میری رنجوری و معذوری سے اب کی بار بھی "دامنِ گلچیں" کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔" (۵۴) امیر خود بھی اپنا کلام اس میں شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن اپنی نقاہت اور بیماریوں کے باعث ناکام تھے۔ کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں :

" گلچیں کی دھوم دھام سن کر جی چاہتا ہے کہ محنت کی جائے مگر نہ دل و دماغ میں طاقت نہ مکروہات سے فرصت نہ صحت" (۵۵)

قیام لکھنؤ کا عرصہ امیر کی زندگی میں نہایت پر پیچ تھا۔ رہائش کا مسئلہ، فکر روزگار کا، تجارت میں نقصان، گھر میں آگ کا لگنا، قرض پر قرض لینا اور ادائیگی کی کوئی صورت نہ پانا۔ اہلِ خانہ کی بیماریاں، رام پور میں موجود، بقیہ خاندان کی ضرورتوں کا خیال اور امیر کی اپنی بیماریاں۔ ان سب نے ایک بہت بڑے شاعر، محقق، عالم اور انسان کو تباہ کر ڈالا۔ ان سب مکروہات کے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا کہ نواب کلب علی خاں کو امیر کے لکھنؤ آنے کا علم ہو گیا اور انھوں نے امیر کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ لیکن امیر نے منع کر دیا۔ اسی عرصے میں نواب بیمار ہو گئے اور بیماری بڑھ گئی۔ امیر ایک درد مند انسان تھے اور پھر نواب کی ایک حیثیت (یعنی آقا) سے شکایت ہوتی تھی۔ نواب تو امیر کے شاگرد بھی تھے۔ امیر کو جب نواب کی بیماری کا علم ہوا تھا وہ تڑپ اٹھے۔ امیر کو لکھنؤ آئے ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہی ہوئے تھے، کہ نواب کلب علی خاں کی بیماریوں کی اطلاعات آنا شروع ہو گئیں۔ امیر نے رام پور میں اپنے احباب کو خطوط لکھ کر خیریت معلوم کی لیکن تشفی نہیں ہوئی۔ چناں چہ وہ ۴؍ جنوری ۱۸۸۴ء کو ایک خط میر مجاور کے نام لکھتے ہیں اور ان سے درخواست گزار ہیں کہ :

"اگر چہ بعض تحریروں سے بندگانِ حضور فیض گنجور کا صحیح ہونا معلوم ہوا، مگر کما حقہ تسلی نہیں ہے۔
امید ہے کہ براہِ کرم آپ اعتدال اقدس واعلیٰ سے تسکین بخشیں۔ کمال احسان ہوگا۔" (۵۶)

جنوری ۱۸۸۴ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ، امیر نے رام پور جانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بیماریوں نے انھیں اتنا نحیف و نزار کر دیا جس کی وجہ سے وہ ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

"قسمت سے وہ پیچ پڑا کہ ایک مہینے سے عوارض نے رشتہ حیات میں گتھیاں ڈال دی تھیں۔ الجھ کر توڑا ہی چاہتی تھی۔ بارے شکر ہے کہ جسم کی رگوں میں چھپ چھپا کر جان بچی رہی۔ اب ضعف کے قوی پنجے سے نجات پاؤں تو دربار جاؤں۔" (۵۷)

امیر، اس زمانے میں امیر تجمل حسین خاں کی بارہ دری کے قریب رہائش پذیر تھے۔ اور ان کے صاحب زادے لکھنؤ آنے کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی اسی ماہ رام پور میں بیمار اعزاء کی نگہداشت کے لیے رام پور چلے گئے تھے۔ ۲۷؍ جنوری ۱۸۸۴ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ : "محمد احمد رام پور میں ہیں۔" (۵۸) ممکن ہے اس لیے کہ، وہ نواب صاحب کی خیریت سے امیر کو آگاہ کرتے رہیں۔ ۲۵؍ فروری ۱۸۸۴ء کے مکتوب سے پتا چلتا ہے کہ، امیر نے رام پور جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ : "چوں کہ میرا قیام یہاں عارضی ہے اور عنقریب احتمال ہے کہ رام پور جاؤں لہٰذا آپ جلد خط بھیجیں۔" (۵۹) یہ وہ زمانہ ہے جب امیر نے آغا باقر شیرازی کو چار ہزار روپے تجارت کی غرض سے دے دیے تھے اور یہ رقم انھوں نے مختلف لوگوں سے ادھار لے کر دی تھی۔ اب اگر وہ رام پور جاتے ہیں تو رقم ڈوب جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے کہ معاہدے کے مطابق شیرازی منافع دو سال بعد دیتے۔ امیر کے ایک دوست غافل نے رام پور نہ جانے کی وجہ دریافت کی، تو یکم اپریل ۱۸۸۴ء کے خط میں انھیں لکھا کہ :

"ریاست کو نہ جانے کی وجہ تحریر میں لانا دشوار اور خلافِ احتیاط ہے۔ کہیں خدا نے ملایا تو لکھوں گا۔ ماحصل یہ کہ ادھر سے اصرار ہے اور ادھر سے نہ پورا اقرار ہے اور نہ صاف انکار ہے۔ رفتہ رفتہ یکسوئی ہوتی جائے گی۔ میں اس سرکار کا نمک خوار وہ مجھ پر مجھ سے زیادہ مہربان، میرے آقا

میرے قدر دان اور پھر جانا نہیں ہوتا، تو یہ قدرت نمائی ایسی ہی ہے۔ پیش از وقت نہ کوئی ہوا ہے اور نہ ہو۔"(۶۰)

اسی خط میں رام پور نہ جانے کی ایک اور وجہ کی طرف امیر نشان دہی کرتے ہیں کہ انھوں نے آغا باقر شیرازی کے ساتھ چندسی میں تجارت شروع کی ہے۔ آغا کو مالی مدد اور دینا ہے۔ اگر نہ دے سکا تو نقصان ہو جائے گا۔ یعنی جو رقم لگائی گئی ہے۔ وہ ڈوب جائے گی۔

"میرا مشغلہ چندوسی کا کمک نہ ہونے کی وجہ سے، جس کی ضرورت ابتداء میں ہوا کرتی ہے۔ کچھ ٹھٹھر سا گیا ہے۔ اگلے سال اس کا نتیجہ معلوم ہوگا۔ میں آغا صاحب کو مدد نہ دے سکا۔ اس وجہ سے میرا ہی نقصان ہے۔"(۶۱)

۴ر اپریل ۱۸۸۴ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ "بندہ زادہ کلاں ریاست میں حسبِ طلب گیا ہے"۔(۶۲) ۱۲ر اگست ۱۸۸۴ء کے خط بنام میر مجاور سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر، نواب کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین ہیں کہ اسی زمانے میں محمد احمد بھی کلکتہ میں شیرازی سے ناکام ملاقات کے بعد واپس آئے ہیں۔ امیر کی کیفیات ملاحظہ کیجیے :

"چوں کہ سرمایہ حیات اس حالت میں بدتراز ممات ہے یہی وجہ ہے کہ کس کی تحریر آئے اور اس سے مژدہ صحت و خوشنودی طبع ہمایوں معلوم ہو جائے۔ لہذا جی مٹی ہو رہا ہے۔(۶۳)

۹ر ستمبر ۱۸۸۴ء کے خط بنام میاں کبیر احمد سے امیر کے بڑے بھائی مفتی طالب حسین کی بیماری کا پتا چلتا ہے۔ "بھائی جان کا ضعف بدستور ہے"(۶۴) ۶ر اکتوبر ۱۸۸۴ء کے خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر ایک نئی بیماری میں مبتلا ہیں "دردِ شانہ دو دن سے عوارض سابقہ پر مزید ہے۔ یہاں تک کہ بیٹھنا بھی مشکل ہے۔"(۶۵) دوسری طرف نواب صاحب کی بیماریوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ امیر لکھنؤ میں ان سے ملاقات کے لیے تڑپ رہے تھے۔ ۸ر دسمبر ۱۸۸۴ء کے خط میں میر مجاور کو لکھتے ہیں :

"میں بہ قسم لکھتا ہوں کہ اگر کسی طور سے بھی میں قابلِ سفر ہوتا، تو اس زمانہ میں مجھ سے ہرگز یہاں ٹھہرا نہ جاتا۔ اگرچہ اس حالت میں سرکار کو دیکھ کر تسکین تو کیا ہوتی۔ مگر خیر اور جان نثارانِ سخت جان کی طرح میں بھی دیکھتا۔ یہ تو ہوتا کہ کسی وقت کسی بات میں تخفیف دیکھ کر ذرا سی تسلی بھی ہو جاتی۔ دوری میں تو یہ بھی نصیب نہیں۔"(۶۶)

اسی خط میں مزید رقم طراز ہیں :

"میر صاحب میرا حال بھی ایسا حال ہے، اس کو میں ہی جانتا ہوں۔ نہ دوسرے سے کہہ سکتا ہوں نہ کسی کو یقین آسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ظاہر میں زندہ اور واقع میں مردہ ہوں"۔

جنوری ۱۸۸۵ء میں امیر کی بیماریاں اور گلدستہ کی مصروفیات بڑھی ہوتی ہیں۔ ۱۲ر اپریل کے خط میں شاداب کو لکھتے ہیں کہ :

"فرصتی اب بے فرصتی کو پہنچ گئی ہے۔ باوجود ضعف نسیاں صبح سے آدھی رات گئے تک مختلف کاموں میں صرف جاتا ہے۔"(۶۷)

۷ر جون ۱۸۸۵ء کے خط میں شاداب کو لکھتے ہیں کہ :" یہ سخت جاں امراض لاحقہ سے جانبر تو ہوا، مگر اب تک تختۂ مشق ڈاکٹراں وطبیباں ہے۔"(۶۸)اسی تاریخ کے ایک خط میں حاجی کلب حسن کو رقم طراز ہیں :

"میں ایک مہینے سے سخت بیمار ہوں۔ اگر چہ امراض میں اب افاقہ ہے، مگر دل ودماغ نہایت ضعیف ہو گیا ہے۔"(۶۹)

کچھ ہی عرصے بعد ڈاکٹر کریم الدین احمد کی معلومات کے مطابق :"مصلح سنگ میر حشمت علی پہنچے۔"(۷۰) ہمارے خیال میں، یہ نواب صاحب کا کوئی پیغام لے کر آئے تھے۔ مکتوبات اور امیر کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ نواب صاحب نے کئی مرتبہ امیر کو بلانے کے لیے بھیجا، لیکن امیر نے منع کر دیا تھا۔ اس کی وجوہات گذشتہ صفحات میں دی جاچکی ہیں۔ الغرض میر حشمت کا آنا۔ اس سلسلے کی کڑی معلوم ہو تا ہے۔ امیر نے بڑے صاحب زادے محمد احمد کے ہاتھ خط دے کر فی الفور نواب صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ خط میں امیر رقم طراز ہیں :

"کیفیت نصیب دشمناں ناچاقی طبع اقدس کی سن کر فدوی نیم جان ہو گیا۔ چوں کہ بیس دن سے بسبب شدائد امراض کے جس میں فصد کے علاوہ پنج نشتر منہ کے اندر کھا چکا ہے۔ اب تک شدید درد اور بقائے اصل امراض سے وقفِ بستر ہو رہا ہے کہ عرض داشت مختصر بھی اپنے ہاتھ سے لکھ نہیں سکتا۔ لہٰذا شرفِ حضور سے محروم رہا۔ محمد احمد کو فی الفور حضور میں روانہ کیا۔"(۷۱)

ممتاز علی آہ لکھتے ہیں :

"(نواب صاحب نے) یکے بعد دیگر کئی مصاحب بھیجے لیکن امیر نے معذرت کی آخر کار نواب صاحب نے لکھا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ باوجود ناسازی طبیعت اور ضعف ونقاہت کے میں خود آپ کو لینے لکھنؤ آؤں۔ اب انکار کا موقع عذر کی مجال نہیں تھی۔"(۷۲)

امیر نے اِدھر محمد احمد کو رام پور روانہ کیا اور اُدھر رام پور جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ فوری طور پر سب کچھ چھوڑ کر جانے میں بھی بہت کچھ قباحتیں تھیں۔ قرض، جو لکھنؤ میں مختلف لوگوں سے لیا تھا"دامنِ گلچیں" کے خریداروں کی رقم اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ ،امیر کی مالی حیثیت اتنی گر گئی تھی، کہ وہ نواب کی خدمت میں پہنچ کر نذرانہ بھی پیش کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اگر کوئی کتاب نایاب یا قطعاتِ خوش نویس پیش کریں، تو اس کے لیے بھی بڑی رقم درکار تھی۔ یہاں تک درباری پوشاک بھی نہ رہی۔ وہ بھی گھر میں آگ لگنے کے باعث جل گئی۔ اس پریشانی کے عالم میں وہ مہدی علی خاں کو خط لکھتے ہیں کہ وہ میر مجاور سے صورتِ حال بتا کر مشورہ لیں اور فوراً خط کے ذریعے مطلع کریں تاکہ روانگی سے قبل مل جائے :

"زمانہ میری روانگی کا قریب ہے۔ اگر آپ جلد خط لکھیں تو مجھ کو مل سکتا ہے۔ اس خط میں مژدہ صلح مزاج بندگاں حضور ضرور ہو، دو عشرہ سے صراحتاً کچھ حال معلوم نہیں ہوا۔ میں بھی تہیہ سفر سے متعلق افکار میں رہا، کہ تم کو کچھ لکھ نہ سکا۔ اب ضرورت سے لکھتا ہوں کہ تم میرے محسن میر مجاور علی صاحب سے بعد سلام نیاز کے پوچھو کہ اگر چہ گدائے تہی دست بارگاہِ شاہی میں

سوائے نقدِ عاجزی کے کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا۔ مگر اس گدائے بے مایہ کو شرم ضرور آتی ہے کہ بالکل خالی ہاتھ آئے۔ کبھی یہاں ایسا برا ہوتا ہے کہ اقسامِ ماکولات میں کوئی چیز اختیار نہیں کر سکتا۔ اور کتاب نایاب اور قطعاتِ خوش نویس اول تو نایاب ہیں اور ملیں تو زرِ کثیر درکار ہے اور میری یہ حالت کہ محض بے سامان ہوں۔ حتیٰ کہ درباری پوشاک بھی ندارد ہے۔ کچھ سامان وہاں آگ میں جل گیا کچھ برباد ہوا۔ خیر سرکار فیض آثار سلامت رہیں تو یہ سب کچھ ہو رہے گا۔ آپ میری حالت موجودہ کے مناسب کوئی ایسی چیز بتلایئے۔ جو مقبولیت کے قابل ہو۔ مہدی علی خاں میر صاحب سے پوچھ کر جواب لکھو۔ اس لیے کہ اب میرے توقف کا زمانہ بہت کم ہے اور حضور کی زیارت کو دل بے قرار ہے۔"(۷۳)

الغرض امیر صحت یاب ہوتے ہی رام پور روانہ ہو گئے۔ یوں امیر دسمبر ۱۸۸۵ء کے آخری عشرے میں رام پور پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد (۷۴) اور ڈاکٹر ابو محمد سحر (۷۵) کا خیال ہے کہ امیر ۱۸۸۶ء میں رام پور گئے۔ لیکن ۴/ دسمبر ۱۸۸۵ء کے خط، بنام مہدی علی خاں کے متن سے پتا چلتا ہے کہ، اب رکاوٹ کوئی نہیں رہی تھی۔ روانگی بھی تیار تھی۔ اس لیے روانہ ہو گئے۔

امیر نے لکھنؤ سے روانہ ہوتے وقت "دامنِ گلچیں" کے خریداروں کا زرِ خرید جو امیر پر واجب تھا وہ پورا کر دیا اور گلدستہ اپنے عزیز شاگرد، واحد علی بسمل کے حوالے کر دیا۔ ۱۸/ دسمبر ۱۸۸۶ء کے خط میں یعنی لکھنؤ سے رام پور روانگی کے لگ بھگ ایک سال بعد شاداب کو لکھتے ہیں:

"دامنِ گلچیں" سے میں نے مدت ہوئی کنارہ کیا۔ ایک سال پورا کر دیا تھا تاکہ زرِ واجب خریداروں کا اپنے ذمے نہ رہے۔ جب پار سال میں لکھنؤ سے رام پور چلنے لگا تو اپنے ایک عزیز شاگرد واحد علی بسمل کو سپرد کیا کہ وہ اپنے شوق سے بقدرِ امکان اس کو سنبھالتے ہیں۔"(۷۶)

امیر نے لکھنؤ کے لوگوں سے جو قرض لیا تھا، وہ تقریباً سولہ ہزار روپے تھا۔ امیر نے یہ صورتِ حال نواب کلب علی خاں کو خط میں نہیں لکھی، لیکن محمد احمد سے کہلوا بھیجا تھا۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ محض بہانہ نہ تھا بلکہ واقعہ تھا۔ نواب صاحب نے منشی محمد احمد صاحب کو طلب کر کے سولہا ہزار روپیہ دے دیا اور فرمایا 'منشی صاحب کو جلد لے آؤ۔"(۷۷)

قیام لکھنؤ کا زمانہ امیر کی زندگی کا ایک اذیت ناک دور تھا۔ لیکن باوجود ان حالات کے امیر نے تلامذہ کی طرف بھرپور توجہ رکھی۔ اور ان کے کلام کی اصلاح وہ نہایت دیانت اور خوش اسلوبی سے کرتے رہے۔ قیام لکھنؤ کا بہترین واقعہ، "دامنِ گلچیں" کا جاری کرنا تھا۔ جس نے اس دور کے گلدستے کے رواج کو ایک نئی جہت سے روشناس کیا۔ کاش کہ امیر کو پر سکون لمحات میسر آتے، تو قوی امکان تھا کہ وہ اس کے علاوہ بھی قابل ذکر علمی کام کرتے۔ یا کم از کم ابتدائی دور میں مرتب کیے گئے لغات نظر ثانی کر کے شائع کر دیتے۔ جو یقیناً اردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہوتی۔

(۴)

نواب کلب علی خاں، ایک شریف النفس انسان، اہل ہنر کے قدردان، علم دوست، حقِ دوستی نبھانے والے، استاد پرست انسان

تھے۔ جس کا بڑا ثبوت رام پور میں اہل ہنر کا مجمع اور امیر پر کرم نوازیاں تھیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قابلِ ذکر واقعہ ان کا اچھا انسان ہونا ثابت کرتا ہے کہ امیر سے اختلاف کے باوجود، انھیں نوکری سے برطرف نہیں کیا۔ اور جب امیر اپنی مرضی سے چھپ کر لکھنؤ چلے گئے۔ تو بھی تنخواہ کا اجراء برقرار رہا۔ بہر کیف، ان سب باتوں سے خطا نظر، لکھنؤ سے امیر کو بار بار مصاحب بھیج کر بلوانا ہمارے خیال میں دو وجہوں سے تھا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ :

انھیں ایک ایسا دوست اور ہم راز چاہیے تھا، جو ایمان دار ہو۔ اور امیر کے علاوہ دوسرا انھیں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ بیشتر ہنر مند موجود تھے۔ لیکن وہ صرف اپنے اپنے ہنر میں یکتا تھے۔ اس کے مقابلے میں امیر، ایک بااصول، پابندِ نظم وضبط، بااخلاق اور نیک سیرت اور نیک کردار انسان ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر، عالم اور محققانہ مزاج رکھنے والے مصنف بھی تھے۔ اور نواب کلب علی خاں کی زندگی کا وہ دور تھا کہ جب وہ مستقل بیمار رہنے لگے تھے۔ حکومت سلطنت میں انھیں ایک ہمہ جہت مشیر کی ضرورت تھی۔ اور وہ اس منصب کے لیے صرف امیر ہی کو بہترین تصور کرتے تھے۔ اس کی تصدیق ممتاز علی آہ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے :

> ”خلد آشیاں کی طبیعت زیادہ ناساز رہنے لگی، تو حضرت کو ایشائی طرز حکومت سے واقف اور امین ومزاج شناس پا کر اپنا رازدار اور پرائیوٹ سکریٹری بھی بنالیا۔ رازداری کی مراسلت اور پرائیوٹ خط و کتابت میں نواب صاحب کی زبان تھی اور قلم ان کا۔ پہلے سہ پہر کو بھی اور دو بجے سے چار بجے شام تک سرکار میں حاضر رہتے تھے۔ اب اس خدمت کی بدولت دن کی قید رہی نہ رات کی۔ سفر ہو یا حضر، جاڑے ہوں یا گرمی، لو چلتی ہو یا مینہ برستا ہو، ہر وقت کی حاضری، نواب صاحب اکثر اپنے بے نظیر باغ میں جا کر رہتے، تو باغ ہی میں حضرت کے لیے خیمہ نصب کر دیا جاتا۔ جب ضرورت ہوتی جس وقت کام پڑ تا بلا لیتے۔“(۷۸)

دوسری وجہ یہ تھی کہ ”۷ار اکتوبر ۱۸۸۴ء کو سر الفرڈ لائل گورنر ممالک متحدہ آئے تھے“۔(۷۹) انھوں نے کلب علی خاں سے، ”فرمائش کی تھی کہ اردو کا ایک مبسوط اور جامع لغت تالیف کرایئے“(۸۰) چناں چہ نواب، امیر سے یہ کام لینا چاہتے تھے۔ حالاں کہ اس وقت دربار میں بہت سے زباں داں موجود تھے۔ لیکن نواب صاحب اس کام کے لیے امیر ہی کو بہتر تصور کرتے تھے۔ اب وجہ اس کی جو بھی ہو۔ امیر لگ بھگ دسمبر ۱۸۸۵ء میں رام پور آئے۔ تو امیر کو نئی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں یعنی ”پرائیوٹ سکریٹری“ اور ”لغت کا ذمہ دار“ بنا دیا گیا۔

امیر نے نہایت تیز رفتاری سے لغت کا کام شروع کیا اور لغت کا ایک نمونہ، بقول ممتاز علی آہ جنرل اعظم الدین (جو اس وقت ریاست میں سفیر تھے) کی معرفت سر الفرڈ لائل کی خدمت میں بھیجا۔“(۸۱) جو ”۲جون ۱۸۸۶ء کو پیش کر دیا گیا۔“(۸۲) یوں امیر نے اپنے آپ کو بہت حد تک اہل ثابت کر دیا۔ جسے امیر کے مطابق بے حد پسند کیا گیا اور سر الفرڈ لائل نے یہ ہدایت کی کہ :

> ”گورنمنٹ بہت سی جلدیں اس لغت کی خرید کرے۔ ہم مختلف ریاست ہائے ہندوستان اور بنگال، پنجاب، بمبئی اور مدراس کی گورنمنٹوں سے بھی درخواست کریں گے اور ہر ایکسیلنسی وائسرائے سے

التجا کر کے ان کو سرپرست اور مربی اس کا بنائیں گے۔ جس قدر روپیہ منشی صاحب اس کی تالیف کے لیے خیال کرتے ہیں۔اس سے کہیں زیادہ مہیا ہو جائے گا۔"(۸۳)

چناں چہ امیر نے سر الفرڈ لائل کی ہدایت پا کر، اپنی دیگر ذمہ داریوں کے ساتھ تالیف لغت پر بھی کمر کس لی اور نمونہ شائع کرانے سے قبل اس پر رائے لینے کے لیے محمد احمد نے علی گڑھ، دہلی، سہارن پور، انبالہ، پٹیالہ، امرتسر، لاہور وغیرہ کے سفر کیے اور نامور فضلا سے آرا لی۔ اب تک لغت کے کام اور اسفار میں جو اخراجات ہوئے، وہ امیر ہی نے برداشت کیے۔ ۱۹ر ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ کے خط میں شاداب کو لکھتے ہیں:

"کسبِ زر اس گردش سے مقصود نہیں۔ اس کی صورت جو کچھ صاحب فرمائش کو منظور ہو گی وہ کریں گے۔ مقصود اس سیر و سیاحت سے لائق ممبروں کی تجویز اور ملک کو متوجہ کرنا ہے۔ البتہ اس سفر میں جو مصارف پڑتے ہیں، وہ میری زہرباری کا باعث ہوں گے اور مجھ پر کئی برس سے ایسے پیچ پڑتے ہیں کہ متحمل ایسے مصارف کا ہونا، دشواری سے خالی نہیں۔ دیکھیے کیا انجام ہوتا ہے۔"(۸۴)

مسٹر الفرڈ لائل کی ہدایت پر محمد احمد نے پھر پنجاب کا سفر اختیار کیا۔ تاکہ وہ اہل علم کی رائے لیں لیکن غریب، امیر مینائی اس کام میں تنگ دستی کا شکار ہو گئے۔ اور انھوں نے تالیفِ لغت کے لیے پہلا قرض لینے کے لیے شاداب کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ ۳ر جنوری ۱۸۸۷ء کے مکتوب میں امیر پھر شاداب کو لکھتے ہیں:

"سفر سے مقصود طلب زر نہیں ہے۔ بلکہ لائق آدمیوں کا انتخاب کرنا ہے۔ روپیہ تو اس کام کے واسطے بہت درکار ہے۔ جس کو میں اور میرے احباب نہیں لگا سکتے۔ اس کے ذمہ دار تو لائل صاحب بہادر لفٹنٹ گورنر ہیں۔ البتہ مجھ کو اہتمامِ لغت کے واسطے دو تین ہزار روپیہ درکار ہے۔"(۸۵)

خیال کرنا چاہئے کہ تالیفِ لغت کا کام، امیر کی دیگر ذمہ داریوں کے علاوہ تھا۔ اور افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ مشورے الفرڈ لائل بہادر کے تھے اور محنت اور رقم امیر کی خرچ ہو رہی تھی۔ ابھی تالیفِ لغت کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی، کہ خلد آشیاں نواب کلبِ علی خاں ۲۳ر مارچ ۱۸۸۷ء کو انتقال کر گئے۔ امیر چیخ اٹھے:

"آقا اور محسن شفیق اور عزیز دوست اور قدر افزا شاگرد دبیر شناس دنیا سے اٹھ گیا۔"(۸۶)

اسی عرصے میں سر الفرڈ لائل بھی ہندوستان سے چلے گئے۔ اب امیر یک و تنہا رہ گئے۔ ۱۲ر رمضان، ۱۳۰۴ھ کے خط میں ثاقب کو رقم طراز ہیں کہ:

"انقلابِ ریاست سے ترددات ایسے بڑھ گئے ہیں کہ ان کو لکھ نہیں سکتا۔ فراقِ دائمی نواب خلد آشیاں کا صدمہ اور زیادہ روح فرسا ہے کہ وہ میرے بڑے ناز بردار اور عموماً اہلِ شہر کے قدردان تھے۔ الغرض عجب نازک حالت میں زندگی کے دن کاٹتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔"(۸۷)

۱۱ر مئی ۱۸۸۷ء کے خط میں امیر ثاقب کو اپنے اور رام پور کے حالات لکھتے ہے کہ:

"قلقِ فراقِ دائمی حضرت خلد آشیاں نے سخت افسردہ دل کر دیا ہے۔ مدت کی صحت یکجائی تھی۔ افسوس صد افسوس۔ ••• جناب اعظم الدین خاں بہادر جنرل ریاست اب مدار المہام بااختیاراتِ کامل ہیں۔ وہ ایک مرد متین و مہذب انگریزی تعلیم یافتہ بڑے جفاکش ہیں۔ بطور خود ربط و ضبط و نظم و نسق میں کوشش کر رہے ہیں۔ میری حالت اب تک تو باعتبار تعلقات کے بدستور ہے۔ آگے کا حال معلوم نہیں۔"(۸۸)

نواب کلب علی خاں کے بعد نواب محمد مشتاق خاں مسند نشیں ہوئے۔ اور جنرل اعظم الدین خاں جو پہلے سفیر تھے اب مدار المہام ہو گئے۔ انھوں نے ریاست کا نظم و ضبط انگریزی طریقے پر شروع کر دیا۔ ادھر نواب محمد مشتاق خاں کو شعر و سخن وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ادھر امیر کا حال یہ تھا ایک بڑے خاندان کے ساتھ رام پور میں بے سہارا ہو گئے۔ ۲۸ر ستمبر ۱۸۸۷ء کے خط میں سید محمد نوح شبیر کو مفتی طالب حسن کی بیماری کے بارے میں لکھتے ہیں :

"میرے بڑے بھائی، مفتی طالب حسن صاحب قبلہ، جو باپ سے زیادہ مجھ پر مہربان ہیں۔ دو مہینے سے صاحبِ فراش ہیں۔ فالج، لقوہ، بواسیر، حبس بول میں مبتلا ہو کر ایسے ضعیف ہو گئے ہیں کہ ہر نفس نفسِ واپسیں معلوم ہوتا ہے۔"(۸۹)

۳ر نومبر ۱۸۸۷ء کے خط میں نہایت رنج کے ساتھ لکھتے ہیں کہ :

"پانسو روپے ماہوار کا خرچ اور دو سو کی آمدنی ہے۔ رحلت خلد آشیاں سے اب تک تین ہزار روپے کے مصارف آمدنی سے علاوہ بڑھ چکے ہیں۔ اپنی بساط کیا تھی۔ انھیں سات مہینے میں حیثیت بھی مٹ گئی۔ قرض داری بھی بڑھ گئی۔"(۹۰)

امیر اس عرصے کہاں تھے ؟ معلوم نہیں ہوتا اس خط میں لکھتے ہیں۔ "آپ مجھ کو جب تک میں یہاں ہوں خط لکھا کیجیے۔ میری تواریخ روانگی بوجہ موانع چند در ٹلتی جاتی ہے۔"(۹۱) اسی خط کے شروع میں امیر لکھتے ہیں کہ :

"دونوں خبریں جو آپ نے سنی ہیں وہ صحیح ہیں۔ خلعت والی تو پوری وہی ہے، جیسی وہاں تک پہنچی ہے۔ استعفے والی ذرا تاویل طلب ہے۔ جس کی تفصیل آپ کو مرزا علی حسن صاحب سے جو پرسوں ۵ر نومبر ، کو دلی جانے والے ہیں، معلوم ہو گی اور بہت سے اخبارات سے آپ سنیں گے۔ جو سب آپ کی خوشی کے باعث ہوں گے۔"(۹۲)

کس کے استعفے اور کس کی خلعت کی بات ہے، کچھ پتا نہیں چلتا۔ نہ کسی حوالے سے یہ پتا چلتا ہے کہ امیر استعفیٰ دے کر کسی دوسرے علاقے میں جا بسے تھے۔ اگر ایسا نہیں تو اس طرح کی بھی کوئی خبر نہیں ملتی کہ امیر رام پور سے نکلنے کے لیے موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن نکل نہیں پا رہے تھے۔ اور انھوں نے نوکری سے استعفا دے دیا ہو۔ بہر کیف داغ کے نام مذکورہ خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر بری طرح انتشار کا شکار ہیں۔ داغ کے نام خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے :

"میاں کبھی کبھی کسی مزار پرانوار پر جانا ہو، تو ذرا اس سیہ کار کے حق میں بھی دعائے حسنِ خاتم کرنا۔ ہر

نفس نفس واپسیں ہے۔ دیکھنا چاہیے کیا معاملہ پیش آتا ہے۔

کیا کہوں گا کوئی محشر میں جو پوچھے گا امیر
کیوں نہ بگڑی ہوئی باتوں کو بناتے آئے "(۹۳)

اسی عرصے میں مفتی طالب حسن انتقال کر گئے۔ ۱۲ر جنوری ۱۸۸۸ء کے مکتوب بنام زاہد حسن زاہد سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ مفتی طالب حسن کی اہلیہ کا بھی انتقال ہو گیا:

"ہجوم کروہات و صدمات اور وفور غم والم نے فرصت نہ دی۔ پہلے تو اپنے برادر مہربان نزار پدر کا ماتم رہا۔ پھر ان کی خاتون، جو مجھ کو بجائے مادر تھیں۔ ان کی رحلت کا غم ہوا۔ ایک آباد گھر برباد ہو گیا۔ ان حوادث سے جو صدمے مجھ ناتواں پر ہوئے، ان کو لکھ نہیں سکتا۔"(۹۴)

تنگ دستیوں اور بیماریوں کے باوجود "امیر اللغات" کا کام آہستہ آہستہ جاری جاری رہا۔ ۲ر جولائی ۱۸۸۸ء کے خط، بنام زاہد حسین زاہد سے یہ پتا چلتا ہے کہ:

دماغ میں ضعف ہے اور تھوڑی دیر لکھنے پڑھنے میں آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔ آنسو بھر آتے ہیں۔"(۹۵)

۱۹ر جولائی ۱۸۸۸ء کے خط، بنام شاداب سے رام پور کے انتظامی حالات پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ جسے پڑھ کر امیر کی بے بسی، آہ و فریاد بالکل بجا معلوم ہوتی ہے اور ان حالات میں ایک بڑے کنبے اور "دفتر امیر اللغات" کی ذمہ داریوں کے ساتھ زندہ رہنا موجبِ حیرت معلوم ہوتا ہے۔

"مڈل پاس مدار المہام بہادر ایک بڑے جفاکش اور مدبر و منتظم آدمی ہیں۔ اصولِ انتظامی کو انگریزی رنگ پر لاتے جاتے ہیں۔ بے خدمت بظر استحقاق یا خصوصیت و پرورش کسی کو رکھنا، یا تنخواہ دینا، اصول انتظامی انگلشیہ کے مخالف ہے۔ میری تنخواہ میں بلا سبب ایک سو سولہ کی کمی ہو گئی۔ سرکار گردوں وقار نے اختیارات سپید و سیاہ مدار المہام بہادر کو دے رکھے ہیں۔ ... مڈل پاس آ آکر ملازم ہو رہے ہیں اور انتظامی گروہ میں جگہ پا رہے ہیں، حکیم عبد العلی صاحب دو سو کے ملازم ہوئے تھے اور سو کی ترقی کر کے تین سو تک انھوں نے جگہ پائی تھی۔ اب یہاں کا رنگ دیکھ کر وہ ہجرت کر گئے۔ ...
نواب مرزا خاں داغ سے کارخانہ اصطبل پہلے نکل گیا تھا۔ فراشخانہ کی موجودات وہ خود سمجھا کر مستعفی ہوئے۔ استعفا نا منظور اور رخصت دو ماہ منظور ہوئی۔ کئی روز ہوئے کہ وہ بھی چلے گئے۔ احتمال آنے کا ضعیف ہے۔ میں بھی دل برداشتہ ہوں۔ معمولی وقت پر حسبِ حکم سرکار، تسلیم گاہ میں جا کر تسلیم بجالاتا ہوں۔ وگر ہیچ۔"(۹۶)

امیر رام پور کے ان حالات پر بڑے دکھ کے ساتھ رقم طراز ہیں کہ:

"ایشیائی باغ جو انھوں نے (نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں) نے دنیا بھر سے گل

بوٹے چُن کر لگایا تھا۔ خزاں کے ہاتھوں اُجڑ رہا ہے۔ میں بھی اس باغ کا ایک کمھلایا ہوا شجر ہوں۔ جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں یہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اب جب اصل شجر میں نقصان ہے، تو پھول پنکھڑی کی طراوت معلوم۔"(۹۷)

ریاست کے ابتر حالات کے باوجود، امیر نے حواس کو مجتمع کیا اور لغت کی بابت اہل علم کی رائے معلوم کرنے کے لیے لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس سے پٹنے تک کا سفر کیا۔ "امیر اللغات" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ : دیکھوں اردو لغات کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں، لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس ہوتا ہوا پٹنے تک گیا۔"(۹۸) امیر کا یہ سفر محض لغت کی بابت فضلا کی رائے حاصل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ان کا مقصد لغت کی تکمیل کے لیے مالی معاونت حاصل کرنا بھی تھا۔ جس میں انھیں ناکامی ہوئی : ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ :

"اردو کے قدردانوں اور لغتِ اردو کی ضرورت سے باخبر اصحاب نے، جن سے بات چیت ہوئی۔ اپنی تمنا کے اظہار سے اس تالیف کی تشویق دلائی، مگر مالی امداد کی کہیں سے کوئی صورت نظر نہ آئی۔"(۹۹)

امیر ۲/ جولائی ۱۸۸۸ء کے خط بنام زاہد حسین زاہد میں لکھتے ہیں کہ :"فقیر رمضان میں سفر سے فارغ ہو کر وطن پہنچا۔(۱۰۰) گویا امیر اپریل یا مئی ۸۸ء میں سفر سے واپس آئے۔ رام پور پہنچے تو نئی مشکلات اور نئے صدمات سے واسطہ پڑا۔ ۹/ دسمبر ۱۸۸۸ء کے خط میں صغیر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

"سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماریوں کی پرستاریوں نے مجھ سے جی بھر کے ان آسائشوں کا عوض لیا۔ جو میں نے ملاقاتِ احباب سے سفر میں پائی تھیں۔۔۔۔ کتنے ہی عزیز چل بسے۔"(۱۰۱)

اسی زمانے میں امیر کے ہونہار شاگرد، سید محمد عسکری، وسیم خیر آبادی مالی پریشانی کے سبب، "دفتر امیر اللغات" چھوڑ کر چلے گئے۔ امیر نے انھیں ایک انتہائی عاجزانہ خط لکھا اور وسیم کو ان کی شرائط پر دوبارہ بلا لیا۔

"میاں وسیم۔ تمھاری پریشانی سے مجھ کو بھی پریشانی ہوئی۔ سوائے کام چھوڑ کر چلے جانے کے اور جو بات امکانی ہو تم مجھ کو بتاؤ۔ تو وہ میں کروں۔ میں کسی حالت میں اپنے عزیز اپنے دوست کا نقصان نہیں چاہتا۔ مگر تم خود سمجھتے ہو کہ (امیر اللغات) ایک حصہ مکمل ہو جانے تک، تمہارے جانے سے اس کام کو نقصان سخت پہنچے گا۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔ تم بجائے خود، خوب سوچ کر جو درخواست قابلِ قبول ہو۔ مجھ سے کرو، اس میں میں حاضر ہوں اور تمہاری راحت سے بہ حلف لکھتا ہوں کہ مجھے راحت ہوتی ہے۔ اور تمھاری تکلیف سے تکلیف کفاف تمہارا ۱۰۰۰ کم ہے اور اب مجھے پسند نہیں کہ تمھارا کفاف ترقی نہ کرے۔ آیندہ سے میں تم کو مع تنخواہ ۰۰۰ ماہ وار کر دوں گا"۔(۱۰۲)

سفر سے واپسی پر یہ ہوا کہ :

"عرش آشیاں نواب محمد مشتاق علی خاں بہادر طاب مژاہ نے بالاجلاس کو نسل ایسی دستگیری فرمائی کہ

بوٹے چُن کر لگایا تھا۔ خزاں کے ہاتھوں اُجڑ رہا ہے۔ میں بھی اس باغ کا ایک کمھلایا ہوا شجر ہوں۔ جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں یہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اب جب اصل شجر میں نقصان ہے، تو پھول پنکھڑی کی طراوت معلوم۔"(۹۷)

ریاست کے ابتر حالات کے باوجود، امیر نے حواس کو مجتمع کیا اور لغت کی بابت اہل علم کی رائے معلوم کرنے کے لیے لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس سے پٹنے تک کا سفر کیا۔ "امیر اللغات" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ : دیکھوں اردو لغات کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں، لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس ہوتا ہوا پٹنے تک گیا۔"(۹۸) امیر کا یہ سفر محض لغت کی بابت فضلا کی رائے حاصل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ان کا مقصد لغت کی تکمیل کے لیے مالی معاونت حاصل کرنا بھی تھا۔ جس میں انھیں ناکامی ہوئی : ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ :

"اردو کے قدردانوں اور لغتِ اردو کی ضرورت سے باخبر اصحاب نے، جن سے بات چیت ہوئی۔ اپنی تمنا کے اظہار سے اس تالیف کی تشویق دلائی، مگر مالی امداد کی کہیں سے کوئی صورت نظر نہ آئی۔"(۹۹)

امیر ۲ر جولائی ۱۸۸۸ء کے خط، بنام زاہد حسین زاہد میں لکھتے ہیں کہ : "فقیر رمضان میں سفر سے فارغ ہو کر وطن پہنچا۔(۱۰۰) گویا امیر اپریل یا مئی ۸۸ء میں سفر سے واپس آئے۔ رام پور پہنچے تو نئی مشکلات اور نئے صدمات سے واسطہ پڑا۔ ۹ر دسمبر ۱۸۸۸ء کے خط میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

"سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماریوں کی پرستاریوں نے مجھ سے جی بھر کے ان آسائشوں کا عوض لیا۔ جو میں نے ملاقاتِ احباب سے سفر میں پائی تھیں۔ ... کتنے ہی عزیز چل بسے۔"(۱۰۱)

اسی زمانے میں امیر کے ہونہار شاگرد، سید محمد عسکری، وسیم خیر آبادی مالی پریشانی کے سبب، "دفتر امیر اللغات" چھوڑ کر چلے گئے۔ امیر نے انھیں ایک انتہائی عاجزانہ خط لکھا اور وسیم کو ان کی شرائط پر دوبارہ بلا لیا۔

"میاں وسیم۔ تمہاری پریشانی سے مجھ کو بھی پریشانی ہوئی۔ سوائے کام چھوڑ کر چلے جانے کے اور جو بات امکانی ہو تم مجھ کو بتاؤ۔ تو وہ میں کروں۔ میں کسی حالت میں اپنے عزیز اپنے دوست کا نقصان نہیں چاہتا۔ مگر تم خود سمجھتے ہو کہ (امیر اللغات) ایک حصہ مکمل ہو جانے تک، تمہارے جانے سے اس کام کو نقصان سخت پہنچے گا۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔ تم بجائے خود، خوب سوچ کر جو درخواست قابلِ قبول ہو۔ مجھ سے کرو، اس میں میں حاضر ہوں اور تمہاری راحت سے بہ حلف لکھتا ہوں کہ مجھے راحت ہوتی ہے۔ اور تمھاری تکلیف سے تکلیف کفاف تمہارا ... کم ہے اور اب مجھے پسند نہیں کہ تمھارا کفاف ترقی نہ کرے۔ آیندہ سے میں تم کو مع تنخواہ ... ماہ وار کر دوں گا"۔(۱۰۲)

سفر سے واپسی پر یہ ہوا کہ :

"عرش آشیاں نواب محمد مشتاق علی خاں بہادر طاب مژاہ نے بالاجلاس کونسل ایسی دستگیری فرمائی کہ

اسمعیل احمد مینائی اس دور کے حالات کی تفصیل یوں پیش کرتے ہیں :

"نواب حامد علی خاں کی کم سنی کے باعث ریجنسی کا دور رام پور پر بھی انگریزیت کا سیلابِ بلا لے آیا، تو 'امیر اللغات' پر بھی آفت آئی۔ ۰۰۰ امداد دفتر اس قدر گھٹادی گئی کہ مولفین کو معاوضہ دینا تو درکنار، دفتر کے عمال جیسے خدمت گار کاتب مصحح وغیرہ کی تنخواہیں تک ادا نہیں ہو سکتیں تھیں۔" (۱۱۰)

اسی مضمون میں اسمعیل احمد مینائی مزید رقم طراز ہیں :

"انھوں نے مجبور ہو کر باوصف پیرانہ سالی و عوارض، بہار بنگال کا ایک سفر اور کیا۔ پٹنے میں مہدی حسن خاں شاداب کے پاس ٹھہرے اور انھی کے توسط سے عمائدین بہار تک اپنی آواز پہنچائی، مگر وہاں دال گلی، نہ ڈھاکے یا مرشد آباد میں۔"

اسمعیل احمد مینائی کے اس بیان کی تصدیق مکاتیب اور دیگر سوانحی تحریروں سے نہیں ہوتی۔

"دفتر امیر اللغات کی ابتری کے باعث پہلے وسیم خیر آبادی دفتر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب ممتاز علی آہ چلے گئے۔ ہمارے خیال میں اس کا خاص سبب بھی مالی تھا۔ لیکن مکتوبات کی فضاء سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ریاست سے امیر کے تعلقات کچھ بہتر ہو چلے تھے، ۱۸ر اکتوبر ۱۸۹۰ء کو وہ لغت کا پہلا حصہ شائع کرنے کے لیے پانچ سو روپے کا نوٹ مولوی احمد خاں صوفی مالک مطبع مفید عام آگرہ کو بھیجتے ہیں۔

"پانسو روپیہ کا نوٹ نمبری ۳۸۶۳۳ کا نصف ٹکڑا بذریعہ رجسٹری بھیجتا ہوں۔" (۱۱۱)

۲۰ر اکتوبر ۱۸۹۰ء کو دوسرا نوٹ بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"آج نوٹ کا دوسرا ٹکڑا بھی ملفوف نیاز نامہ ہذہ ہے۔" (۱۱۲)

امیر نے آہ کے والد سے ان کی واپسی کے لیے خط و کتابت کی۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ آہ کے والدِ بزرگوار نوکری کے لیے انھیں دکن بھیجنا چاہتے ہیں۔ امیر جواب میں لکھتے ہیں :

"آپ نے میرے پیارے نور چشم، ممتاز کو مجھ سے چھڑانے کی کئی وجہیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک قوی اور دو ضعیف ہیں۔ قوی علت اپنا ضعف پیرو قرضداری اور زیرباری ہے۔ اس بنا پر سفر دور و دراز دکن نور چشم موصوف کا گوارا کرنا لکھا ہے، اس کی نسبت میں جہاں تک سوچتا ہوں کوئی جواب مجھ سے بن نہیں پڑتا۔ یہ میرا مشرب نہیں کہ شفیق باپ، بیٹے کو ایسی راہ سے جانا چاہیے جو راہ باپ بیٹے دونوں کے حق میں موصل الی المقصود ہو اور میں کہوں نہیں میرا حرج ہے۔ میرا نقصان ہے۔ ہرگز ایسا نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ جو محبت مجھ کو نور چشم موصوف سے ہے۔ وہ اسی کو مقتضی ہے کہ میں اپنا حرج گوارا کروں اور شاہ راہ مقصود پر جانے دوں۔" (۱۱۳)

امیر کو یہ احساس تھا کہ ان کے شاگرد بہت باصلاحیت ہیں۔ ''دفتر امیر اللغات'' کے علاوہ کہیں اور نوکری کریں گے تو زیادہ ترقی کریں گے۔ وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیکن امیر کی مجبوری یہ تھی کہ محدود وسائل کے باعث، ان افراد کو ان کے حسبِ منشا تنخواہ نہیں دے سکتے تھے۔ اسی وجہ سے پہلے وسیم خیر آبادی چلے گئے تھے، لیکن امیر کی منت سماجت کی وجہ سے واپس آگئے۔ بعد ازاں پھر چلے گئے۔ آہ کے سلسلے میں بھی، یہی دشواری تھی۔ امیر نے ایک طرف تو آہ کے والد کو مطمئن کر دیا، لیکن دوسری طرف وہ اپنے لاڈلے شاگرد سے درخواست گزار (محررہ ۳؍ دسمبر ۱۸۹۰ء) ہوتے ہیں کہ :

''زیادہ سواد عاؤں کے کیا لکھوں۔ اپنے ابا سے میری طرف سے بناچنا کر ایسی میٹھی باتیں کرو کہ وہ کڑوے گھونٹ تمھاری دوری ضروری کے پینا گوارا کر لیں۔ بیٹا !! تم آخر سفر تو کرو ہی گے۔ گھر میں بیٹھنے کی چیز تو تم کو خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ پھر ان کو تمھاری مہاجرت گوارا کرنے سے چارہ نہیں۔ البتہ یہ بات ہے کہ اور کہیں زیادہ کماؤ گے۔ یہاں اسی قدر نہ سہی۔ یہی سمجھو کہ اپنے بوڑھے دعا گو کی دل سوزی کی۔ وہ دعا گو جو خود چراغِ سحر ہے۔''(۱۱۴)

اس خط لکھے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد میلہ بے نظیر شروع ہوا۔ امیر سے، ڈپٹی سید علی حسن خاں ممبر مال نے قصیدے کی فرمائش کی۔ امیر نے حکم کے مطابق ستر اشعار کا قصیدہ کہا۔ جسے بعد نمازِ جمعہ کئی ہزار آدمیوں کے مجمع میں محمد احمد سے پڑھوایا گیا۔ ممتاز علی آہ کے نام امیر ۱۴؍ دسمبر ۱۸۹۰ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ :

''معزز ارباب کونسل خصوصاً وائس پریسڈنٹ بہادر نے بہت ستائش کی اور بندگان حضور پر نور دام ملکہم واقبالہم نے بھی توجہ سے سماعت فرما کر بہت سمجھ کر اکثر اشعار کی داد دی اور قصیدہ لے کر جیب میں رکھ لیا اور اب روز اس کا چرچا ہوتا ہے اور جو ملتا ہے اس سے بہ نیکوئی اس کا ذکر فرماتے ہیں''۔(۱۱۵)

ان خطوط کے کچھ ہی عرصے بعد ممتاز علی آہ واپس رام پور آگئے اور دفتری امور میں مصروف ہو گئے۔ مکاتیب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ میلا بے نظیر میں قصیدہ پیش کرنے کے بعد جنرل اعظم الدین کے ساتھ امیر کے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ اور وہاں سے مالی امداد ہونے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ''امیر اللغات'' کا پہلا حصہ مارچ ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا۔ امیر جنرل اعظم الدین خاں کو ۱۸؍ مارچ ۱۸۹۱ء شکریے کا خط لکھتے ہیں :

''امیر فقیر کس زبان سے آپ کی قدر دانی اور بندہ پروری اور عفو وفت گستری کا شکر ادا کرے، مجھ کو مسدس کی جانفشانی کا پورا صلہ آپ کے ان دو حرف کے لکھ دینے سے مل گیا اور یقین ہو گیا کہ دربابِ لغت جو التجائیں میں نے کی ہیں، وہ سب آپ کے دست گیری سے پوری ہوں گی۔ خداوند تعالیٰ آپ کو اس قدر شناسی کا صلہ دونوں جہاں میں دے، اشتہارات انگریزی کے نسبت مجھے کچھ نہیں معلوم ہے کہ کتنے اشتہار چھپنے کا حکم آپ نے دیا ہے۔ پانیر میں کتنے نکلیں گے اور یہاں کتنے آئیں گے جو ہز آنر کے حضور پیش ہوں گے۔''(۱۱۶)

ایک اور مکتوب بنام برہم محررہ مارچ ۱۸۹۱ء سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنرل اعظم الدین نے امیر کا بھرپور ساتھ دیا۔ امیر کے مذکورہ خط محررہ ۱۸/ مارچ، کہ جس میں امیر نے عمدگی سے "امیر اللغات" کے اشتہار کی طرف توجہ دلائی تھی۔ وہ ۲۶/ مارچ کو شائع بھی ہو گیا۔ امیر ۲۸/ مارچ ۱۸۹۱ء کے خط میں برہم کو لکھتے ہیں: "اشتہارات بعض ہندوستانی اخباروں میں چھپ گئے۔ انگریزی اخبار پانیر میں اڈیٹوریل تو ۲۶/ مارچ کو شائع ہو گیا۔" (۱۱۷) لیکن امیر کا یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔ اس لیے کہ جنرل اعظم الدین خاں کو ۳/ اپریل ۱۸۹۱ء کو قتل کر دیا گیا۔" (۱۱۸) جنرل اعظم کا یہ واقعہ امیر کے لیے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس کے علاوہ "امیر اللغات" کی اشاعت کے فوراً بعد اس لغات پر اعتراضات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ ڈیڑھ دو سال تک جاری رہا۔ امیر اس صورتِ حاصل سے سخت پریشان ہو گئے اس بابت مفصل طور پر باب پنجم میں لکھا گیا ہے۔ ۲۰/ اپریل ۱۸۹۱ء کے خط بنام زاہد سے پتا چلتا ہے کہ ان کے قریبی اعزاء میں لڑکی کی شادی تھی۔ مہمان آ گئے تھے کہ اچانک لڑکی کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے نے بھی امیر کو پژمردہ کر دیا:

"میرے ایک عزیز کی لڑکیوں کی شادی تھی۔ گھر عشرت کدہ ہو رہا تھا۔ دوسرے دن عقد کی شادی رچانے والے باپ نے، جو جوان سال خوش خصال تھے۔ دنیا سے دفعتہً کوچ کر کے اس عشرت کدہ کو ماتم کدہ کر دیا۔ جو مہمان نزدیک و دور سے بیاہ میں آئے تھے۔ وہ تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ دنیا عجب عبرت گاہ ہے۔ مگر افسوس کچھ عبرت نہیں ہوتی:

آسان نہیں ہے دام سے دنیا کے چھوٹنا
یہ ایک بڑے حکیم کا باندھا طلسم ہے

میری اولاد میں بھی پانچ مبتلائے تپ ہیں۔" (۱۱۹)

۳۰/ اپریل، ۱۸۹۱ء کا خط جو عبدالاحد کے نام ہے۔ اس حوالے سے بے حد معلوماتی ہے کہ اس میں "امیر اللغات" کے لیے جنرل اعظم کی پرخلوص معاونت کا پتا چلتا ہے:

"جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر نے 'امیر اللغات' کو گویا لاوارث کر دیا۔ مرحوم کی مربی گمری سے اس کو اپنی تکمیل اور اشاعت کی کچھ فکر نہ تھی۔ تالیف میں گوناگوں اعانتیں ان کی طرف سے ہوتی تھیں اور ملک میں اس کے پھیل جانے کی صورتیں عمدہ عمدہ نظر آتی تھیں۔ ہند سے ولایت ہائے غیر تک ان کی بڑے بڑے معزز حکام سے رسم وراہ تھی۔ سر رشتہ تعلیم و دفاتر سرکار میں عموماً اس کی کاپیاں خرید ہوئیں۔ مگر افسوس کہ دفعتہً کھیل بگڑ گیا۔" (۱۲۰)

زاہد حسن زاہد کے نام ۱۸۹۱ء کے خط سے امیر کی ایک کیفیت کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: پیرانہ سالی کے علاوہ اور بہت سے اسباب ہیں جو مجھ کو شاعری کی طرف متوجہ ہونے سے روکتے ہیں۔" (۱۲۱) ۲۶/ ستمبر ۱۸۹۱ء کے خط میں رقم طراز ہیں کہ: "میں دو مہینے سے آشوبِ چشم میں مبتلا ہوں۔ لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا ہے"۔ (۱۲۲) ۱۴/ نومبر ۱۸۹۱ء میں نعیم الحق آزاد کو رقم طراز ہیں کہ: مجی غزلیں آئیں، بیماری اور بیماروں کی پرستاری کی حالت میں دیکھیں۔" (۱۲۳) ۱۲/ جنوری ۱۸۹۲ء کے مکتوب بنام زاہد حسین زاہد سے پتا چلتا ہے کہ

بیماریاں بدستور ہے لیکن نوعیت بدل گئی ہے۔"اس موسم بارد میں میری طبیعت کوبار بار ہرج ہو جاتا ہے۔ سنبھلنے نہیں پاتی کہ پھر بگڑ جاتی ہے۔"(۱۲۴) ۳۰ر جنوری ۱۸۹۲ء کے خط بنام زاہد سے پتا چلتا ہے کہ بیماریوں کے باوجود لغت کا کام زور و شور سے جاری ہے: "میری طبیعت ابھی تک صحیح نہیں ہے۔ ۰۰۰ تم سے اگر ممکن ہو توزبان کی اصلیت کی ابتداء کہاں سے زبان پیدا ہوئی اور کن تغیرات کے بعد اس حد کو پہنچی وغیرہ وغیرہ لکھو۔"(۱۲۵) ۵ر فروری ۱۸۹۲ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز احمد جو کئی عرصے سے بیمار ہیں ان کی حالت بدستور ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد عزیز بیمار ہیں:

"ممتاز احمد کو امید اندمال زخم تو قوی ہے۔ مگر ہنوز رنجور و معذور ہے اور عزیز بھی گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ آجکل پریشانیاں بڑھی ہوئی ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔"(۱۲۶)

مذکورہ خط سے پتا چلتا ہے کہ جلیل مانک پوری بھی دفتر سے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کہ والد، بزرگ ہیں اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ دفتر سے اتنی آمدنی نہیں کہ باآسانی گزر بسر ہو سکے۔ لیکن جلیل چاہتے ہیں کہ گھر کے قریب ہی میں کوئی اچھی ملازمت مل جائے، تاکہ والد سے زیادہ دور نہ ہوں۔ امیر، حکیم عابد کوثر خیر آبادی کو سفارشی خط لکھا کہ آپ اس سلسلے میں جلیل کی مدد کریں: امیر اس صورت حال سے سخت پریشان نظر آتے ہیں۔

"مجھے محبی جلیل سے سخت انفعال ہے اور ان کی کامیابی کا نہایت ہی خیال ہے۔ ۰۰۰ جلیل کو دفتر سے علیحدہ ہونے دینا مجھے پسند نہیں۔ ۰۰۰ان کی علیحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں۔ مگر بہ مجبوری گوارا کرتا ہوں۔"(۱۲۷)

جلیل امیر کے وہ واحد شاگرد تھے جو ابتداء سے آخری سانس تک ان کے ساتھ رہے۔ یا پھر ان کی اولادیں۔ ۲۶ر مئی ۱۸۹۲ء کے ایک خط میں اپنے صاحب زادے کی بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ممتاز احمد کے پاؤں سیدھا ہونے کا علاج ہو رہا تھا نمک اور مسکے کی مالش ہوتی تھی۔ جراح نے دو دن موم باندھ دیا۔ تمام ران میں پٹھوں پر دانے نکل کر کچھ مرجھا گئے۔ اور پانچ چھے پھوڑے ہو گئے اب ان کا علاج ہو رہا ہے۔"(۱۲۸)

۲۴ر جولائی ۱۸۹۲ء میں اپنی آنکھوں کی بیماریوں اور ان کی شدت کے بارے میں قاضی عبدالجمیل کو اطلاع دیتے ہیں:

"آنکھوں میں نمی اور چرکِ لطیف کہ فوراً پلکوں پر آکر خشک ہو جاتا ہے۔ اور ضعف اور حالت کنیت جو ایک مرضِ خاص ہے اور کتبِ طبیہ میں مذکور ہے ان سب کی شکایت مجھ کو ایک برس سے ہے۔"(۱۲۹)

۱۸۹۲ء کا سال امیر کا بہت مصروف گزرا، بیماروں کی تیمارداری، خود کی بیماری شاگردوں کی کلام کی اصلاح کے ساتھ ساتھ لغت کی تالیف میں بے حد مشغولیت رہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ریاست کے رویوں سے پریشان ہو کر حیدر آباد دکن میں بھی رسائی کی کوششیں شروع کر دیں۔

داغ کی طرح امیر نے بھی حیدر آباد میں رسائی کے لیے میز مبارک کے خانساما محمد ابراہیم کا سہارا لیا۔ ان کے ایک بھتیجے بھی امیر کے

شاگرد تھے، اس لیے خانساماں کی امیر پر خصوصی توجہ رہی۔ محمد ابراہیم کے لکھنے پر امیر نے اپنا مطبوعہ کلام بھی بھیجا، جو نظام دکن کی خدمت میں پیش ہوا اور پسند کیا گیا۔ اس کے بعد امیر کے احباب اور تلامذہ نے اصرار کیا کہ امیر حیدر آباد آئیں۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ : "میں نے بھی عرض کی کہ چلنا چاہیے۔"(۱۳۰) امیر نے فرمایا :

"بیٹا مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ناخواندہ مہمان ہوں۔ وہاں جا کر ڈھی دوں اور برسوں امیدواری کی کڑیاں جھیلوں۔ ہاں حضور کا اشارہ پاؤں تو سر آنکھوں سے جاؤں۔"(۱۳۱)

امیر کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ ورنہ امیر کا اس سے زیادہ برا حشر ہوتا، جو لکھنؤ میں ہو چکا تھا۔ اور پھر لغت کا کام جو آہستہ ہی سہی، ہو تو رہا تھا۔ بالکل بند ہو جاتا۔ امیر کے ایک مکتوب مورخہ ۲۶ / جولائی ۱۸۹۲ء سے پتا چلتا ہے کہ داغ نے بھی خانساماں صاحب سے امیر کی سفارش کی تھی، جس کا شکریہ امیر اس طرح ادا کرتے ہیں :

"آپ کا ممنون ہوں۔ خانساماں صاحب سے جو آپ نے میرے حق میں سفارش کی۔ اس کا شکر گزار ہوا۔"(۱۳۲)

امیر کے ایک خط بنام داغ مورخہ ۳۰ / جولائی ۱۸۹۲ء سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امیر، حیدر آباد دکن مستقل جانے اور اعزاز حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح لغت مکمل ہو کر شائع ہو جائے اور جو زہرباری ہو گئی ہے اس سے نجات مل جائے۔ امیر رقم طراز ہیں :

"خانسامہ صاحب سے جو آپ نے میرے حق میں سفارش کی اس کا شکر گزار ہوا۔ مگر میرے حق میں مساعی جمیلہ کا اثر اگر یہ ہو کہ 'امیر اللغات' کے باب میں کافی مدد ملے، تو البتہ مزید منت کا باعث ہے۔ اس لیے کہ اب مجھ میں پیرانہ سالی اور عوارض و خستہ حالی نے وہ طاقت نہیں چھوڑی کہ میں وہاں پہنچنے اور اعزاز حاصل کرنے کا حوصلہ کروں۔"(۱۳۳)

۶ / اگست ۱۸۹۲ء کے خط میں کوثر خیر آبادی کو اپنی کیفیت میں لکھتے ہیں :

"کتابِ لغت کی بدولت زہرباری حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ خدا رحم فرمائے۔ پیشاب کا مرض سخت مکلف ہے، چوکی پر جاتے جاتے پاؤں تھک جاتے ہیں اور ہربار رک کر ہوتا ہے۔ دیر ہوتی ہے تو، عسر بول بڑھ جاتا ہے۔ آنکھوں کو جب سے روگ لگا ہے، تب سے لکھنا اور کتاب دیکھنا گویا چھوٹ ہی گیا ہے۔ دوسرے کی محتاجی اور زیادہ مکلف ہے اور اکثر ہرج بھی ہوتا ہے۔ اب دو سطریں لکھیں اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں، کڑوانے لگیں، بصارت میں بھی کم ہونے لگی۔"(۱۳۴)

امیر کس خلوص محنت اور جانفشانی سے لغت کی تالیف میں مبتلا ہیں اس کی ایک جھلک اس خط میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ خط محررہ ۲۵ / ستمبر ۱۸۹۲ء۔

"حکیم صاحب! عجیب کیفیت میں ہوں کہ دن رات میں کسی وقت آرام نہیں۔ نہ آنکھیں کام دیتی

ہیں، نہ ہاتھ قابو میں ہیں۔ سوادِ خط سے آپ پہچان لیجیے کہ رعشہ خط کو خراب کر رہا ہے۔ صراحت ایسی مفقود ہے کہ رات کے ۱۱ بجے تک جان نہیں چھوٹتی۔ لغت نے مجھے مار ڈالا۔" (۱۳۵)

۲۷ر ستمبر ۱۸۹۲ء کے خط میں زاہد کو لغت کے کام کی تفصیلات اور مسائل سے آگاہ کرتے ہیں :

"افسوس ہے کہ نصف ٹکڑا دوسرے حصہ کا ۱۵ر ستمبر کو چھپنے کے لیے روانہ ہو چکا۔ لیکن پھر بھی جہاں تک اس ٹکڑے میں الفاظ بڑھانا ممکن ہو گا کوشش کی جائے گی۔ ۔۔۔ میں نے بہت دنوں ملک کی رائے پر کام کرنا چاہا، مگر باہم رایوں کا اختلاف اس قدر ہوا کہ میں عاجز آگیا۔ چند نازک خیال اور عالی دماغ احباب نے یہی رائے دی کہ ان جھگڑوں میں تالیفِ لغت رہ جائے گا۔ صرف اپنی رائے کو دخل دینا چاہیے۔ ملک سے بہت دنوں صلاح و مشورہ کیا گیا، ناچار میں اب اپنی ہی رائے سے کام لیتا ہوں۔" (۱۳۶)

ذہنی اور جسمانی مشقت، تفکرات، صدمات اور ریاست کی نوکری نے امیر کا یہ حال کر دیا کہ :

"اب میری حالت یہ ہو گئی ہے کہ چار چار پانچ پانچ منٹ کے بعد چوکی پر جاتا ہوں۔ نہ کہیں آنے جانے کے قابل رہا، نہ کسی سے ملنے جلنے کے لائق، مہینے سوا مہینے سے یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ اجابت کئی کئی بار ہوتی ہے۔ کبھی تلین کے ساتھ اور کبھی ذرا ذرا سے ملیں۔ سینے پر ایک سوزش اور جلن رہتی ہے۔ ریاح نہایت جلتے ہوئے خارج ہوتے ہیں۔ اجابت ہو جانے سے سوزش وغیرہ میں کمی ہو جاتی ہے اور اجابت نہیں ہوتی تو بدستور بے چینی رہتی ہے۔" (۱۳۷)

۱۷ر نومبر ۱۸۹۲ء کو نعیم الحق آزاد شیخ پوری کو رقم طراز ہیں کہ : "شاعری صحت و طاقت کی طرح پیرانہ سالی میں رخصت ہو گئی۔ فقیر ناتواں بیمار ہے، کئی بیماریوں کا پرستار ہے۔" (۱۳۸) کوثر خیر آبادی کو ۱۱ر دسمبر ۹۲ء کے خط میں رقم طراز ہیں کہ :

"میری طبیعت روز بروز بگڑتی ہی جاتی ہے۔ نہ سہولت ادوار کو کوئی دوا مفید ہوتی ہے۔ نہ ریاح باسوری کا غلبہ اور بار بار تلین ہونا موقوف ہوتا ہے اور یہی تلین اور حبس ریاح ہے۔ زیادہ علت حبس بول کی معلوم ہوتی ہے۔ اکثر تجربہ ہوا ہے کہ جب اجابت صالح القوام باآسانی اور اکبارگی ہو جاتی ہے اور ریاح بلا تکلف گردش کرتی ہیں اور منکسر ہوتی ہیں تو ادوار میں سہولت ہوتی ہے۔ حاجت ادرار تو بار بار اس حالت میں بھی ہوتی ہے۔ پیشاب رکتا نہیں۔" (۱۳۹)

جنوری ۹۳ء میں میں بھی بیماریاں بدستور ہیں۔ امیر اللغات کا کام جاری ہے۔ لیکن تاخیر امیر کی بیماری ہی کے سبب سے ہے کہ کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں :

"حصہ دوم امیر اللغات کی کاپیاں مطبع مفید عام میں لکھی جاتی ہیں عنقریب چھپنا شروع ہوں گی۔ اس حصے میں نصف اخیر بھی یہیں ہے۔ اس میں بعضے نوٹ دینا ہے طبیعت کو سکون ہوتا ہی نہیں کہ وہ نوٹ

لکھوادوں، صبح سے بارہ بجے تک حتی الامکان کچھ کرتا ہی رہتا ہوں۔ مگر پانچ پانچ منٹ کے بعد چوکی جانے آنے سے کوئی کام پورا نہیں ہوتا۔" (۱۴۰)

فروری ۱۸۹۳ء میں بھی، امیر کی بیماریاں بڑھتی ہوتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے صاحب زادے کے عقد میں بھی شرکت نہیں کر سکے۔ ۱۰ر فروری ۱۸۹۳ء کے خط میں کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ :اس زمانے میں نور چشم خورشید احمد کا عقد کاکوروی میں قرار پایا تھا۔ میں اپنے مرض کی وجہ سے نہیں جا سکا۔" (۱۴۱) ۱۲ر فروری ۱۸۹۳ء کو امیر، اپنے ہاتھ سے زاہد حسین زاہد کو خط لکھتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر بیماری کے باعث شاگردوں کے کلام پر اصلاح بھی دے رہے ہیں اور لغت کے کاموں پر بھی مکمل توجہ ہے :

"غزلیں دیکھیں ••• بارک اللہ ایسی پتھر زمین میں کیا نازک شعر کہے ہیں ••• شانِ امثال میں، میں نے یہ رائے دی ہے کہ جس حکایت میں خلافِ عقل وعادت کوئی بات نہ ہو، ضرور لکھی جائے۔ میرا گمان ہے کہ مانعین بھی وہی لوگ اکثر ہیں۔ جو نیچر کے خلاف امور پر معترض ہیں۔ میں ہاتھ کے مرتعش ہونے سے اب اپنے ہاتھ سے کم لکھتا ہوں ••• یہ چند سطریں تمھارے لیے اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ جن میں نہ رخ حرفوں کے درست ہیں، نہ کرسی صحیح۔" (۱۴۲)

۲ر مارچ ۱۸۹۳ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بیماریاں بدستور ہیں لیکن تلامذہ کے کلام پر اصلاح اور ان کی فرمائشیں پوری کی جا رہی ہیں۔ بر ہم کو لکھتے ہیں کہ :باوجود تپ لرزے میں مبتلا ہونے کے دو تاریخیں ایک فارسی اور ایک اردو لکھ کر قاضی صاحب کی خدمت میں بھیجدیں اور تمھاری نسبت بھی مختصر الفاظ لکھ دیے" (۱۴۳) ۱۹ر اپریل ۱۸۹۳ء کے خط بنام زاہد حسین زاہد سے پتا چلتا ہے کہ ان کے بڑے بیٹے محمد احمد، کی بہو انتقال کر گئیں، اس صدمے نے امیر کو جسمانی اور روحانی طور پر سخت اذیت پہنچائی :

"امیر کے افکار و آلام کی اس زمانے میں کوئی حد نہیں ہے ایک تو میں اپنے عوارض جسمانی ہی سے مورد مصائب و آفات رہا کرتا ہوں۔ دوسرے بندہ زادہ کلاں منشی محمد احمد کی خاتون نے ۲۴ شعبان کو رحلت کر کے مجھے اور بھی چور کر ڈالا۔ اس قیامت نما سانحے سے جو روحانی صدمہ پہنچا ہے وہ بیان نہیں ہو سکتا۔ مگر مشیتِ ایزدی پر سوا صبر اور شکر کرنے کے چارہ ہی کیا ہے۔" (۱۴۴)

مئی ۱۸۹۳ء کا مہینہ امیر کے لیے اس حوالے سے خوش قسمت تھا کہ اس مہینے کے پہلے ہفتے میں "امیر اللغات" کا دوسرا حصہ شائع ہو گیا۔ ۱۹ر مئی ۱۸۹۳ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ :"امیر اللغات کا دوسرا حصہ چھپ گیا۔ کچھ جلدیں اس کی مطبع سے بھی آگئیں۔" (۱۴۵) ۱۹ر مئی ۱۸۹۳ء کے ایک اور خط سے پتا چلتا ہے کہ امیر بیماریوں کے باوجود اپنی استادانہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں مشغول ہیں :

"میری حالت بدستور ہے نہ بیماریوں اور بیمارداریوں سے فرصت ہوتی ہے۔ نہ آئے دن کے صدمات سے نجات ملتی ہے۔ باوجود اس رنجوری و معذوری کے غزل ورباعیاں آپ کی دیکھ کر بھیجتا ہوں۔" (۱۴۶)

۳۰ر جون ۱۸۹۳ء کے مکتوب بنام زاہد حسین زاہد سے امیر کی متفرق مصروفیات کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اطلاع یہ ہے کہ : "امیر اللغات کا تیسرا حصہ مرتب اور مکمل کیا جاتا ہے۔"(۱۴۷) ۱۸ر اگست ۱۸۹۳ء کے خط میں مذکور ہے کہ " اپنے امراض میں تو کوئی جدید شکایت نہیں ہے۔ مگر بیمارداریوں کی کثرت سے چور ہو رہا ہوں۔"(۱۴۸) جب کہ ۱۳ر ستمبر ۱۸۹۳ء کے خط میں مذکور ہے کہ :

"ان دنوں مجھے حبس بول کا سخت دورہ پڑا تھا حتیٰ کہ قاثاطیر کی نوبت آئی۔ اس روز تکلیف اور بے چینی معمول سے بڑھی ہوئی ہے۔"(۱۴۹)

ستمبر اور نومبر ۱۸۹۳ء کا مہینہ امیر کے لیے اذیت ناک تھا، بیماریوں کی کثرت نے انھیں ادھ موا کر دیا۔ لیکن اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی فکر میں مصروف ہیں۔ ۳ر نومبر ۱۸۹۳ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ بیماریوں کے باوجود شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا سلسلہ جاری ہے :

"دو مرتبہ قاثاطیر کی نوبت آئی، خون کئی روز تک آیا کیا۔ اب تک بے چینی بڑھی ہوئی ہے۔ ہر وقت دھڑکا رہتا ہے کہ اب پیشاب بند ہوا ... بڑی مشکل سے یہ غزل آپ کی سن کر میں نے بنائی۔"(۱۵۰)

۴ر نومبر ۱۸۹۳ء کو زاہد حسین زاہد کو بھی اپنی بیماریوں کی اطلاع دیتے ہیں۔"(۱۵۱) البتہ ۴ر نومبر ۱۸۹۳ء کے خط بنام حافظ غلام احمد فروغی سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ باوجود مسائل کے شعر و سخن کا مشغلہ تو چھوٹ گیا، لیکن لغت کا کام جاری ہے۔

میں اس زمانہ میں بہت ہی رنجور اور معذور ہو رہا ہوں۔ خود بیمار اور کئی بیماریوں کا پرستار رہتا ہوں۔ جو وقت فرصت و اطمینان کا ملتا بھی ہے، وہ 'امیر اللغات' کی تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا ہے۔ شعر و سخن کا مشغلہ مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔(۱۵۲)

۶ر نومبر کے ایک اور مکتوب بنام دل شاہجہاں پوری سے امیر کی بیماری کی شدت کی اطلاع ملتی ہے۔ جب کہ ۷ر نومبر ۱۸۹۳ء کے مکتوب بنام مولوی محمد ریاض سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ "اکثر اعزہ کی بیماری سے نہایت تشویش اور پریشانی رہتی ہے۔"(۱۵۳) ۱۸۹۴ء کا سال بھی امیر کے لیے پریشانیوں کا رہا۔ ۲۶ر فروری ۱۸۹۴ء کو نواب حامد علی خاں کی شادی نواب جاروی کی صاحب زادی سے ہوئی۔"(۱۵۴) لیکن امیر اپنی بیماری کے باعث اس میں شرکت نہیں کر سکے۔ "البتہ کئی سہرے کہے۔"(۱۵۵) زاہد حسین کو لکھتے ہیں : حضور پرنور کی شادی رچی ہوئی ہے۔ میں اگرچہ اپنے امراض کے سبب سے شرکت سے محروم ہوں۔ تاہم بعض اسباب سے فرصت کم ہے۔"(۱۵۶) ۱۳ر جون ۱۸۹۴ء کے خط سے یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ "امیر اللغات کی تیسری جلد بعض موانع قویہ ہے اب تک نہیں چھپی۔ خداوند نعمت سراپا اقبال مسند آرائے حال کو متوجہ کرنے کی تدبیر کر رہا ہوں۔ التفات ہو جائے تو کام چلے۔ سرمایہ مالی مفقود ہے۔"(۱۵۷) ۱۴ر اگست ۱۸۹۴ء میں بخار کی وبا پھیلی، بشیر ملیح آبادی نے امیر کو اس وبا کے بارے میں تحریر کیا امیر لکھتے ہیں کہ : "میرے گھر میں بھی اس وقت ۲۵ر آدمی اس مرض میں مبتلا ہیں دل کسی وقت مطمئن نہیں ہوتا۔"(۱۵۸) امیر کی حالت اب یہ ہو گئی ہے کہ احباب سے خط و کتابت بھی ترک ہو گئی۔ سید محمد نوح کو لکھتے ہیں :

"شدائد امراض عسر بول و حبس بول سے اوقات میں سخت اختلال ہے۔ ضعف و پیرانہ سالی کو خستہ حالی نے اور قوت دے رکھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ احباب سے بھی رسم وراہ خط و کتابت ترک ہو گئی ہے۔"(۱۵۹)

۱۲؍ جنوری ۱۸۲۵ء کے خط سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ :"لغت کا تیسرا حصہ تمام ہوا اور نظر ثانی بھی ہو گئی"(۱۶۰)۲؍ مارچ ۱۸۹۵ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ لغت کے کام میں حد درجہ مشغولیت رہتی ہے۔"(۱۶۱) لیکن ۱۱؍ مارچ ۱۸۹۵ء کے خط سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ امیر کا گھر اسپتال بنا ہوا ہے۔ باوجود اس صورتِ حال کہ امیر نے اس حال میں بھی بشیر ملیح آبادی کی خواہش کے مطابق تاریخ بھیجی : امیر رقم طراز ہیں :

"دل نواز! یہ تاریخ بڑی ہی مجبوری سے ہوئی۔ مجھے متواتر حبس بول کے دورے پڑے۔ یہ بھی خبر نہیں کہ ڈاک کب آئی اور اس میں کیا آیا... مجھے بیماریوں سے بھی اب تک نجات نہیں ہے۔ تمام شہر میں امن ہے، میرا گھر مریض خانہ بدستور ہے۔ معہد اور بعض کاہشیں جدید لاحق ہو گئی ہیں۔ جو سوہان روح ہیں۔ میرے ساتھ میرے احباب بھی بدحواس رہتے ہیں۔"(۱۶۲)

۲؍ جولائی کے مکتوب سے پتا چلتا ہے کہ امیر کو ایک نیا مرض لاحق ہو گیا ہے" میری ران میں ایک دمل نکل آیا تھا۔"(۱۶۳)

۳؍ جولائی کے خط میں اس مرض کی شدت کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں :

"دمل کا حال تم سن چکے ہو اب تک اس سے نجات نہیں ہے۔ کسی قدر خشکی پر آچکا تھا۔ مگر ایک کنارہ اس کا پھر پک گیا جس سے پھر پلٹس کی حاجت ہوئی بستر معذوری پر پڑے پڑے دم گھبرا گیا۔"(۱۶۴)

ستمبر کے خط سے بھی بیماریوں ہی کی اطلاع ملتی ہے کہ :"مجھے حبس بول کے مستقل دورے پڑے قانا طیر کی بار بار اذیت اٹھانے میں بالکل چور ہو گیا۔"(۱۶۵) مولوی محمد اعجاز حسن خاں کو رقم طراز ہیں کہ : رات جو دورہ پڑا ہے۔ اس کی ایذا سے اس وقت تک بے قرار ہے۔"(۱۶۶) ۱۹؍ ستمبر کے خط میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ :"اس مہینے میں تین دورے حبس بول کے پڑے۔"(۱۶۷) اسی خط میں یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ بے سر مائگی کی وجہ سے دفتر تباہ ہو گیا۔ ارکانِ دفتر گھر چلے گئے اور کام بند ہو گیا۔"

"تیسرا حصہ لغت کا مدت سے تیار ہے بے سرمائگی اس کی طبع سے مانع ہے۔ دفتر ابتر اور پریشان ہوا چاہتا ہے۔ بلکہ ہو گیا، کام بند ہو گیا... اربابِ دفتر میں سے جو لوگ رہ گئے ہیں، آپ کو سلام کہتے ہیں۔"

اسی زمانے میں نظام دکن کے محل میں شادی کا اہتمام ہوا۔ امیر نے بھی خانساماں ابراہیم کے توسط سے سرے بھیجے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ سرکاری کی خدمت میں پہنچے بھی یا نہیں۔ چناں چہ داغ کے نام ۲۵؍ اکتوبر ۱۸۹۵ء کے خط میں رقم طراز ہیں کہ :

"خانساماں صاحب کا کوئی خط نہیں آیا۔ جس سے پیشی کی کچھ کیفیت معلوم ہوتی کہ سرکار دولت

مند نے تو توجہ سے ان سہروں کو ملاحظہ فرمایا نہیں۔ ... آپ کو کچھ کیفیت معلوم ہو تو آگاہ فرمایئے۔ سرکار کے پسند آنے سے مقصود تو یہ ہے کہ اس پر کوئی حسبِ دل خواہ نتیجہ مرتب ہو۔"(۱۶۸)

۲۲؍دسمبر ۱۸۹۵ء کے مکتوب، بنام بشیر ملیح آبادی سے یہ پتا چلتا ہے کہ :اسی ہفتہ میں ایک دورہ شدید دورہ حبس بول کا پڑ چکا۔ جس میں قاناطیر کی نوبت آئی تھی۔"(۱۶۹)

۴؍جنوری ۱۸۹۶ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ امیر پریشانیوں میں اس قدر مبتلا ہو گئے ہیں کہ قریبی احباب سے خط و کتابت میں بھی تعطل پیدا ہو گیا ہے۔ حکیم برہم کو معذرت کے ساتھ رقم طراز ہیں کہ : پریشانیوں کے ہجوم سے آپ کی غزل اور جواب غزل نہ بھیج سکا۔ انفعال کے ساتھ عذر خواہ ہوں۔"(۱۷۰)۴؍جنوری کے ایک اور خط میں 'صنم خانہ عشق' کے بارے میں زاہد حسین زاہد کو اطلاع دیتے ہیں کہ اسی ہفتے چھپنے کو آگرہ روانہ ہو جائے گا۔"(۱۷۱)۴؍مارچ ۱۸۹۶ء کو زاہد کو خوشی خوشی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ :" صنم خانہ تیزی کے ساتھ چھپ رہا ہے۔ نصف سے زاید چھپ گیا۔"(۱۷۲)۱۹؍اپریل ۱۸۹۶ء کے خط بنام زاہد سے یہ علم ہوتا ہے کہ صنم خانہ شایع ہو گیا اور زاہد کو بھیج دیا گیا تھا۔ جس کی تعریف زاہد نے اپنے خط میں کی تھی۔ اس کے جواب میں امیر لکھتے ہیں کہ :"میں اس سے خوش ہوا کہ تم نے صنم خانہ کو پسند کیا اور دیکھ کر خوش ہوئے۔"(۱۷۳)۲۵؍جون ۱۸۹۶ء کے خط سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ نواب یوسف ناظم کے زمانے میں، جو رہائش فراہم ہوئی تھی۔ وہ امیر کو سرکاری حکم کے مطابق خالی کرنا پڑی۔ جس سے سارا خاندان، اور دفتر "امیر اللغات" تتر بتر ہو گیا۔ امیر رقم طراز ہیں :

> "میں اس زمانے میں ایک جدید تکلیف پیش آجانے سے سخت پریشان ہوں۔ عالی شان مکانات سرکاری، جو ایک عمر سے میری سکونت گاہ تھے۔ دفعتہً بضرورت سرکار مجھے خالی کر دینا پڑے۔ جس سے میرا سارا قافلہ پریشان ہو گیا۔ اولاد و احفاد کہیں، میں کہیں، اسباب کہیں، کتابیں کہیں، غرض ہنوز جمعیت و اطمینان کی کوئی صورت نہیں نکلی۔"(۱۷۴)

سرکاری مکانات خالی کرنے کے بعد امیر ایک عرصے تک دربدر رہے۔ خیال کرنا چاہیے کہ ایک بوڑھا شخص ایک بڑے خاندان کے ساتھ کس طرح اذیت میں رہا ہو گا۔ اس دربدری کی ایک کیفیت امتیاز علی خاں راز کے خط میں ملاحظہ کیجیے امیر یکم نومبر ۱۸۹۶ء کے خط میں رقم طراز ہیں :

> "وسیع مکان میری گزر کے قابل باوجود کمال کوشش کہیں دستیاب نہ ہوا۔ ورنہ اس زمانے میں جس کرایہ کو ملتا بناچاری لیا جاتا۔ بناچاری میں اپنی ذات سے خانقاہ معصومی کا مجاور ہوا اور اہل و عیال کو حافظ عبدالحی والے مکان میں، جو میاں صاحب کے مکان سے جانب جنوب متصل سڑک ہے بھر دیا۔ اسباب حتی کہ کتابوں کی الماریاں بھی سب کھنڈ سار کی زمین پر کھلے میدان میں ہیں اور جہاں تک ممکن ہے، کوشش کر رہا ہوں کہ اسی زمین کی تعمیرات کہنہ میں کسی عنوان سے صلاحیت برسات بسر کرنے

کی نکلے۔ مگر روپیہ بہم پہنچانے میں کچھ بس نہیں چلتا۔ حرکات مذبوحی اور تپش بسملانہ سے اب تک اس قدر ہوا ہے کہ اس احاطے کی چار دیواری خام بن گئی ہے۔"(۱۷۵)

امیر کو جس طرح کے مکان کی ضرورت تھی، وہ تو نہ ملا البتہ اتنا ہو گیا کہ بچوں کے ساتھ سر چھپایا جاسکتا ہے۔ امیر، منشی ولایت علی خاں صفی کو ۸ ررمضان ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۳ر جنوری ۱۸۹۷ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"جن مکانوں میں سالہائے دراز سے میں اقامت گزیں تھا۔ دفعتہً وہ مکان مجھے چھوڑنا پڑے اور اسباب سب متفرق جابجا عزیزان و احباب کے مکانوں پر پہنچایا گیا۔ اس لیے کہ مکان وسیع سر دست مل نہ سکا۔ اب جو مسکن قرار پایا وہاں سب مقاموں سے اسباب منگوا کر بے ترتیب و بے تہذیب رکھ دیا گیا۔"(۱۷۶)

امیر کو تقریباً سات ماہ دربدر رہنے کے بعد، مکان میسر آیا تھا۔ لیکن "دفتر امیر اللغات" ستمبر ۱۸۹۷ء میں منظم ہوا۔ امیر زاہد حسین زاہد کو ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۷ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ :بڑی کوششوں سے خدا خدا کر کے یہ صورت پیدا ہوئی کہ دفتر قائم ہوا اور آگے کام چلے۔"(۱۷۷) گویا پندرہ ماہ بعد امیر کو مستقل ٹھکانہ ملا، جہاں گھر اور دفتر ایک ساتھ تھے۔ اس عرصے میں امیر مالی معاونت حاصل کرنے کے لیے بھی تگ و دو کرتے رہے۔ اور بیماریوں سے بھی نبرد آزما رہے۔ امیر نے ایک درخواست سرکار عالیہ بھوپال کی خدمت میں "امیر اللغات" کی مالی معاونت کے لیے منشی امتیاز علی خان راز کے توسط سے پیش کی تھی۔ اور ایک قصیدہ بھی، وزیر صاحب کے توسط سے بھیجا تھا۔ لیکن اس کی بابت کچھ پتا نہیں چلا، چناں چہ منشی امتیاز احمد خاں راز کو درخواست اور قصیدے کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے خط لکھا۔ لیکن وہ اپنی بیماری کے باعث کوئی کارروائی نہیں کر سکے۔ چناں چہ امیر کو اس صورتِ حال کا جب علم ہوا تھا انھوں نے یکم جون ۱۸۹۴ء کو ایک اور خط منشی امتیاز کو لکھا کہ :

"امید ہے کہ اب شفا حاصل ہو چکی ہو گی۔ جیمس صاحب شکار سے آجائیں، تو اب حالت میری اس کی مقتضی ہے کہ جس طرح ممکن ہو، ان سے کام نکالنے میں کوشش کرو۔ حاجت جس قدر ہے اور جو حال ہے، تم سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ جیسا مناسب سمجھو ان سے کہو، تمھاری ہی رائے پر اور تمھاری ہی کوشش پر میں نے اپنے کام کو حوالہ کر دیا۔

تعجب ہے کہ سرکار عالیہ نے گزارش کی عبارت بغور ملاحظہ فرمائی اور پھر کچھ نہ فرمایا، تہنیتِ عید الاضحیٰ میں ایک قصیدہ جناب وزیر صاحب کے توسط سے میں نے پھر بھیجا ہے، اس کے پہنچنے اور پیش ہونے کا کچھ حال اب تک معلوم نہیں ہوا، تم اگر صحیح ہوتے تو کھوج نکالتے ••• ہر روز تمھاری اور جیمس صاحب کی تحریر کا انتظار رہتا ہے۔"(۱۷۸)

یکم ستمبر ۱۹۹۶ء کے خط میں بشیر ملیح آبادی کو رقم طراز ہیں کہ :

"دو دن میں چار دورے جس بول کے پڑے۔"(۱۷۹)

۱۲ر ستمبر ۱۸۹۶ء کے خط میں زاہد کو لکھتے ہیں کہ :

"میرے سینے میں جانبِ قلب ایک گلٹی پیدا ہو گئی ہے۔ جو سخت مکلف ہے۔"(۱۸۰)

امیر نے یکم جون ۹۶ء کو جو خط راز کو تحریر کیا تھا۔ راز نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ امیر ان کو ایک شکایتی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ :

"پیارے راز عمر دراز۔ اب تو تمھاری تحریر بھی شاید مقصود کی طرح منہ چھپانے لگی، ایک تسکین کا سہارا تھا، وہ بھی گیا۔ باوصف اس بات کے جاننے کے کہ میں تمھارے خط کا کس قدر مشتاق رہتا ہوں اور پھر خط نہ لکھنا۔ کہیں کہو ستم ہے کہ نہیں۔ ... جیمس صاحب نے تو کوئی تحریر مجھے نہ بھیجی نہ آیندہ بھیجنے کی امید نظر آتی ہے۔ خدا جانے اس کی علت کیا ہے۔ بے التفاتی ہے یا عدم کارروائی کی خجالت۔ وزیر صاحب سے جواب، خط ملنے کی تو پہلے ہی امید نہ تھی۔ آخر وہی ہوا۔ خیر، کوئی لکھے یا نہ لکھے تم تو تسکین افزائی میں کمی نہ کرو میں اسی حالت کے ساتھ زندہ ہوں اور تمھارے حق میں دعا کرتا ہوں۔"(۱۸۱)

امیر کے اس خط کے جواب میں راز نے خط لکھا اور وضاحت لکھی کہ کارروائی، درخواست پر اس لیے نہ ہوئی کہ خزانہ خالی ہے۔ امیر ۲۴ر ستمبر ۱۸۹۶ء کو اس کے جواب میں لکھا کہ :

"خزانہ خالی ہونے کا جو ذکر تم نے کیا۔ اس عذر کے مرتفع کرنے کے لیے میں نے رباعی کہی۔ جسے خوش خط لکھوا کر تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ بہت جلد اچھے صاحب کی خدمت میں پہنچو اور کہو کہ مہربانی کر کے سرکار عالیہ متعالیہ کے ملاحظے سے گزاریں۔ اور جو کیفیت ہو اس سے آگاہ کرو ... وہ رباعی یہ ہے :

"کب ہے یہ خدائی کارخانہ خالی
حاتم سے نہیں کوئی زمانہ خالی
معمور ہے گنجینۂ دل ہمت سے
ممکن ہی نہیں کہ ہو خزانہ خالی"(۱۸۲)

امیر کی اس کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ چناں چہ امیر نے پھر ۱۴ر اکتوبر ۱۸۹۶ء کی تاریخ میں ایک خط راز کو تحریر کیا، جس میں ان کے رویے کی شکایت کی۔ غالباً اس کے بعد بھی امیر کو کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ اس ناکامی کے بعد امیر نے مالی امداد کے لیے ایک درخواست گورنر جنرل کو بھیجی۔ لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ امیر ۴ دسمبر ۱۸۹۶ء کو زاہد کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ : "سکریٹری نے" جواب لکھا کہ یہ درخواست لفٹنی کے ذریعے سے آنا چاہیے۔ اب وہاں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔"(۱۸۳)

ادھر سرکار رام پور میں، امیر نے حیدر آباد جانے کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ چناں چہ بہت جھگڑوں کے بعد منظور ہو گئی۔ گرمی شروع ہو چکی تھی، یہ موسم امیر کی طبیعت کے لیے موافق نہ تھا۔ لیکن مالی پریشانی سے مجبور ہو کر امیر کے بیان کے مطابق "آخر اپریل" دکن کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کے دو صاحب زادے لطیف، مسعود دو شاگرد جلیل اور کے علاوہ ایک کمپاؤنڈر اور دو تین حکومت گزار تھے۔ امیر کے ایک خط مورخہ ۸ر مارچ ۱۸۹۷ء سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ انھوں نے مارچ میں سفر کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور وہ

چاہتے تھے کہ لکھنؤ یا ملیح آباد کے اسٹیشن پر بشیر ملیح آبادی سے ملاقات ہو جائے۔

"اس زمانے میں میرا ارادہ براہِ لکھنؤ، کانپور سفر کا ہے۔ اگر خداوند تعالیٰ نے ارادہ پورا کیا تو چاہتا ہوں کہ ملیح آباد کے اسٹیشن پر یا لکھنؤ میں آپ کی دیدار فرحت آثار سے بھی مسرور ہوں"۔ (۱۸۴)

اسی دور میں زاہد حسین زاہد کا خط آتا ہے۔ جس میں انھوں نے لغت کے لیے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے دی گئی درخواست کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ امیر مصروفیات کی وجہ سے فوری جواب نہ دے سکے۔ ۱۰ اپریل ۹۷ء کے خط میں اپنی پریشانیوں اور درخواست کی تفصیلات سے انھیں آگاہ کرتے ہیں:

"میری کوتاہ قلمی بے شک سزاوار اور ملامت ہے اور مجھے آپ کی طرف سے انتہا کی ندامت ہے۔ کچھ ایسی کاہشیوں میں مبتلا رہتا ہوں کہ ضروری کام بھی مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ نہ آپ کو کوئی خط لکھا نہ خط کا جواب دیا اور نہ آج تک غزلیں دیکھنے کی نوبت آئی ۰۰۰ امراض میرے بدستور ہیں اور پریشانیاں موفور دل و دماغ آلام و افکار کے شکار ہو گئے ہیں ۰۰۰

"امیر اللغات" کے باب میں جو درخواست گورنمنٹ سے کی گئی تھی، وہ وہاں سے اس ہدایت کے ساتھ واپس کی گئی تھی کہ لوکل گورنمنٹ کے ذریعے سے درخواست آنا چاہیے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا کہ درخواست کی دونوں جلدیں لفٹننی بھیجی گئیں کہ وہاں سے درخواست اور کتابیں حضور وایسرائے میں پیش ہوں۔ مگر ابھی تک کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔" (۱۸۵)

امیر دکن جانے کے لیے نکلے، لیکن وہ پہلے کانپور گئے پھر بھوپال میں قیام رہا۔ ممتاز علی آہ اس تفصیل کو یوں بیان کرتے ہیں:

"آخر مالی مشکلات سے گھبرا کر غالباً ۱۸۹۷ء میں محصولِ رخصت، حیدر آباد کا قصد کیا۔ نواب بنیاد حسین خاں جاہ نے، بہت اصرار سے لکھا تھا کہ کانپور ضرور آیئے۔ ان کی خاطر سے کانپور میں چار پانچ دن قیام فرمایا۔ ۰۰۰ نواب عالم گیر محمد خاں رئیس بھوپال سے بہت دنوں سے خط و کتابت جاری تھی اور دوستانہ مراسم تھے۔ ۰۰۰ اور احباب کا جو بھوپال میں تھے اصرار کے ساتھ تقاضہ ہوا کہ بھوپال ضرور تشریف لایئے۔ حضرت نے کانپور سے اپنی روانگی کا تار دیا۔ بیگم صاحبہ (سرکار عالیہ بھوپال) نے اپنی خوشنودی مزاج کا اظہار فرمایا۔ ۰۰۰ دورانِ قیام میں مشغلہ شعر و سخن بھی رہا اور حسبِ موقع قطعات و رباعیات وغیرہ کہہ کر حضور میں گزرائے ۰۰۰ سرکار عالیہ سے جب رخصت چاہی تو، یہی ارشاد ہوا کہ: "ابھی میری خوشی یہی ہے کہ آپ اور چند روز قیام کیجیے، آخر ایسی جلدی کیا ہے،۔ ادھر سرکار عالیہ اس خیال سے کہ امیر ابھی اور قیام کریں شرفِ ملاقات کو ٹالتی رہتی تھیں۔ ادھر چھٹی کا زمانہ گزرتا جاتا تھا۔" (۱۸۶)

بھوپال جا کر امیر پھنس گئے۔ دکن کے سفر کا امکان بھی کم ہونے لگا۔ امیر نے بھوپال سے آہ کو ایک تفصیل خط تحریر کیا جس سے سفر کے مقصد اور مجبوریوں پر روشنی پڑتی ہے:

"پیارے ممتاز میں نے جہاں تک ممکن ہوا، رام پور میں کوشش کی کہ زادِ راہ بقدر سفر و اقامت حیدر آباد مہیا ہو، کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ رخصت کی عرضی دے چکا تھا اور بڑے جھگڑوں سے بہت دنوں کے بعد اس کی منظوری ہوئی تھی۔ اگرچہ موسم سفر کا نہ رہا تھا، مگر اپنی جگہ سے حرکت کرنا پڑا۔ قلیل سے زادِ راہ پر قناعت کر کے گھر سے گھبرا کر نکل کھڑا ہوا۔ لطیف و مسعود و جلیل و راز اور ایک کمپاؤنڈر اور دو تین خدمت گزار ساتھ لے کر کانپور پہنچا اور دو چار دن جاہ کا مہمان رہ کر یہاں آیا۔ اب تک سرکارِ عالیہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ حیدر آباد کے سفر کا سامان بظاہر معلوم نہیں ہوتا اس لیے ادھر رخصت کا زمانہ گھٹتا جاتا ہے۔ ادھر یہ نہیں معلوم کہ یہاں سے کب رخصت ہو گی۔ ..."(۱۸۷)

نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال باذوق خاتون تھی۔ شاعرہ تھیں اور تاجور تخلص کرتی تھیں۔ ان کا دیوان مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ امیر نے جب انھیں "امیر اللغات" کی دونوں جلدیں تحفۃً بھیجی تھیں، تو انھوں نے بھی جواباً اپنا دیوان بھیجا تھا۔

ممتاز علی آہ کو خط لکھنے کے کچھ ہی دنوں بعد، امیر کو بیگم صاحب کی خدمت میں باریاب ہونے کا موقع ملا اور دونوں کی دوبدو ملاقات ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے امیر کی بہت تعریف کی اور نوکری کی پیش کش کی۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں :

"بیگم صاحبہ نے کہا کہ : آپ کے قدردان نواب کلب علی خاں تو اب رہے نہیں، اگر آپ منظور کریں تو میں تین سو روپے ماہوار آپ کو دوں گی اور جیسا جیسا موقع ملے گا، آپ کے بیٹوں کو بھی اچھے عہدوں پر مقرر کروں گی۔ اب آپ اسی ریاست میں آرہیے۔ حضرت نے جواب میں بہت شکریے کے ساتھ حسبِ موقع اور مناسب وقت الفاظ میں اس وقت معذوری ظاہر کی اور رخصت ہوئے۔"(۱۸۸)

امیر بھوپال سے واپسی میں لکھنؤ میں قیام کرتے ہیں۔ یہاں ان کے میزبان خواجہ کاظم وکیل تھے۔ امیر کا ارادہ تھا کہ وہ بھوپال پسنجر ٹرین میں جائیں گے، تاکہ ملیح آباد کے اسٹیشن پر بشیر ملیح آبادی سے ملاقات ہو سکے۔ لیکن بیماری کے باعث انھوں نے ڈاک گاڑی اختیار کی، جو ملیح آباد کے اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی اور اب بھی ارادہ ڈاک گاڑی سے جانے کا تھا، امیر چوں کہ وہ ۸ مارچ کے مکتوب میں بشیر ملیح آبادی کو ملیح آباد کے اسٹیشن پر ملاقات کا لکھ چکے تھے۔ اس لیے اب وہ خط میں، ملاقات نہ ہو سکنے کی معذرت تحریر کرتے ہیں۔ خط محررہ ۱۲ر جون ۱۸۹۷ء۔

"مجھے آخر اپریل میں سفر کا اتفاق ہوا۔ مگر اپنے عوارض کی وجہ سے بہ نظر راحت و اختصار ڈاک گاڑی اختیار کرنا پڑی اور معاودت میں بھی، بہ سبب بعض خصوصیات ذاتی کے پسنجر اختیار کرنا نہیں ہو سکتا اور حسرت بقائے گرامی دل میں رہ جاتی، لکھنؤ میں اقامت غالباً تین دن سے زیادہ نہ ہو اور چوں کہ میں اپنے وطن میں بسبب مدت سے مہاجرت کے مسافر ہوں، لہٰذا آپ کو تکلیف نہیں دے سکتا۔ ... بواپسی ڈاک کارڈ کا جواب شعر خیر و عافیت اس نشان سے لطف ہو۔ لکھنؤ متصل لال اسکول مکان خواجہ کاظم وکیل۔"(۱۸۹)

امیر جون ۱۸۹۷ء کے آخر میں رام پور واپس پہنچ گئے تھے زاہد کو ۴ر جولائی ۱۸۹۷ء کے خط میں لکھتے ہیں کہ :"میں سفر میں تھا اب رام پور پہنچا۔"(۱۹۰) امیر کی بھوپال میں جس طرح پذیرائی ہوئی، وہ امیر کے لیے بے حد طمانیت کا باعث ہوئی، اس کے علاوہ غالباً مالی امداد بھی امیر کی سوچ سے بڑھ کر ہوئی۔ لیکن اس رقم کی بدولت، امیر نے احباب کے قرض سے نجات حاصل کی۔ جب کہ ریاست رام پور سے جو قرض لیا وہ حد سے بڑھ گیا۔ اب امیر کے سامنے دو اہم مسئلے تھے کہ ایک تو ریاست کا قرض ادا ہو جائے، دوسرے یہ کہ دفتر کھل جائے تا کہ لغت مکمل ہو کر شایع کی جا سکے۔ لیکن ریاست کی طرف سے کوئی امید نظر نہیں آئی۔ چناں چہ اب امیر کی پوری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح دکن کی طرف سے مدد مل جائے تا کہ کام چلے۔ چناں چہ وہ داغ کو لکھتے ہیں :(۱۹۱)

"امیر اللغات کی تکمیل کا خیال کئی وجہوں سے ہے۔ ایک تو یہ کہ جنرل صاحب مرحوم کے اصرار سے عہد آشیاں میں ریاست سے روپیہ قرض لیا اور وہ قرض بڑھتے بڑھتے حد سے بڑھ گیا۔ ••• ریاست بھوپال سے قدر دانی ہوئی اور میری حیثیت سے بڑھ کر ہوئی۔ مگر یہ کام اتنا بڑا ہے کہ اس کے واسطے وہ مدد کافی نہیں۔ سب سے بڑی سرکار اللہ رکھے وہی آصفیہ ہے وہاں سے لاکھوں کے وارے نیارے بھی ہو سکتا، ممکن ہے۔ بشر طیکہ بن پڑے ••• آپ اپنی فراخ حوصلگی سے کوئی عمدہ رائے فلاح نکالیے، تو بات ہے۔"(۱۹۲)

امیر کی پریشانیوں میں پھر مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ امیر جب بھوپال کے لیے روانہ ہوئے تو، نواب حامد علی خاں نے آسرا دیا تھا کہ : جب آپ واپس آئیں گے تو "دفتر امیر اللغات" کھول دیا جائے گا۔ لیکن نواب نے ابھی تک اس وعدے پر توجہ نہیں کی۔ امیر زاہد حسین زاہد کو ۱۱ر اگست ۹۷ء کے خط میں لکھتے ہیں :

"حضور پر نور، والی رام پور نے جب میں سفر کے لیے رخصت ہوتا تھا۔ اس کی تکمیل پر اپنی آمادگی اور پوری خواہش ظاہر فرماتی تھی۔ بلکہ قرار پا گیا تھا کہ سفر سے میری مراجعت پر دفتر کھول دیا جائے گا۔ مگر مجھے آئے ہوئے قریب دو مہینے کے گزرے اب تک کچھ نہیں ہوا۔"(۱۹۳)

اسی دور میں امیر، اپنی مالی پریشانیوں کو کم کرنے کے لیے اپنے داماد کی نوکری کے لیے برہم کو لکھتے ہیں۔ ۵ر ستمبر ۹۷ء کے خط میں وہ ایک درخواست پر زور دینے کے لیے رقم طراز ہیں کہ :"نور عین لیاقت حسین کے واسطے بھی بہت خیال ہے۔ اس واسطے کے ان کا تحمل کثیر اور وہ بہت پریشان ہیں۔"(۱۹۴) اسی خط میں وہ مبہم الفاظ میں لیاقت حسین کی سفارش کے لیے لکھتے ہیں کہ :

"ج سے آپ کا کچھ بس نہیں چلتا اور وہ جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ ہے۔ آپ فکر رسا سے کوئی اچھا اور معقول کام لو تو جی خوش ہو۔"(۱۹۵)

اس خط کے بعد بھی امیر نے تواتر کے ساتھ برہم کو خط لکھے۔ لیکن غالباً امیر کا مقصد حل نہیں ہوا۔ اس دور میں امیر خود بیمار اور بیماروں کی تیمار داری میں مصروف رہے۔

"مجھے بہت افاقہ ہے اور مرض کا گویا ازالہ ہو چکا ہے۔ مگر ضعف سے اب بھی یہ حالت ہے کہ، اپنی

طاقت سے کروٹ نہیں لے سکتا۔ لطیف احمد و مسعود احمد تپ میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس سے اور پریشانی ہے۔ کچھ عجب اتفاق ہے کہ قافلہ میں کوئی فرد صحیح نہیں ہے۔ لیاقت اور ثابت علی بھی باربار مبتلا ہوئے اور سنبھلے انھیں پریشانیوں میں شبانہ روز گزرتے ہیں۔ اتنا موقع نہیں ملتا کہ تم کو یا کسی کو کوئی خط لکھوا سکوں۔" (۱۹۶)

۱۹ر ستمبر ۹۷ء کے خط سے پتا چلتا ہے۔ دفتر ایک بار پھر کھل گیا ہے۔ لیکن اب مسئلہ یہ ہو گیا ہے کہ جو تربیت یافتہ عملہ تھا، ان میں اکثر نے دوسرے مقامات پر نوکری حاصل کر لی اور بعض کا انتقال ہو گیا۔ گویا امیر کو اب ایک نئی تکلیف کا سامنا تھا:

"امیر اللغات کی طرف کچھ توجہ ہمارے آقائے ولی نعمت کی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی کوششوں سے خدا خدا کر کے یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ دفتر قائم ہو اور آگے کام چلے۔ مگر اب یہ دقت در پیش ہے کہ وہ عملہ جو برسوں کی صحبت میں کاموں سے واقف ہو گیا تھا، سب متفرق ہو گیا۔ بعض ان میں کے دنیا ہی میں نہ رہے اور بعض کو اور مقامات پر تعلق پیدا ہو گئے۔ اب نئے ایسے آدمیوں کا بہم پہنچانا ہے، جس میں قابلیت اس کام کے سیکھ جانے کی جلد ہو۔" (۱۹۷)

۲۰ر اکتوبر ۱۸۹۷ء کے خط میں، لغات کے بیرونی معاون، زاہد کو رقم طراز ہیں کہ :

"اب کچھ ہمت باندھیے اور متوجہ ہو کر پوری مدد دیجیے۔" (۱۹۸) ۵ر دسمبر ۹۷ء کے خط میں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ : "بائے فارسی سے چوتھے حصے کا آغاز ہوا ہے۔" (۱۹۹) اب دفتر معاملات میں حالات پر سکون ہیں، لیکن امیر، خود بیمار ہیں۔ وہ زاہد سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرتے ہیں کہ : "تم اولادِ رسول ہو میرے لیے بھی دعا کرو۔" (۲۰۰) مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیماریوں کے باوجود شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور لغت کے کاموں میں مکمل توجہ ہے۔ زاہد ایک خط میں ترتیبِ لغت کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ امیر مصروفیات کی وجہ سے ۳۰ر دسمبر ۹۷ء کو خط تحریر کرتے ہیں، جس میں وہ لغت کی تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہیں۔ امیر کی پوری کوشش یہ نظر آتی ہے کہ جلد سے جلد بائے تازی کی جلد مکمل ہو جائے تاکہ وہ سرکار رام پور کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

"ہجوم مکروہات کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ اب غزل دیکھنے کی نوبت آئی۔ ۰۰۰ بائے فارسی کی جلد کا صحیح اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا کہ، کے جزو میں تمام ہو گی۔ آپ اب بائے فارسی اور تائے قرشت کے متعلق جو کچھ ہو سکے وہ لکھیے بائے تازی کی جلد زیر نظر ثانی ہے۔ امید ہے کہ تین چار مہینے میں مکمل ہو جائے گی۔ چھپنے کی نسبت ابھی میں نہیں کہہ سکتا کہ، کب چھپے گی۔ نظر ثانی سے تکمیل کے بعد سرکار میں پیش کروں گا۔" (۲۰۱)

لغات کے کام کے ساتھ ساتھ امیر اپنے بچوں اور ان کی اولادوں کی بیماریوں سے بھی پریشان ہو گئے تھے۔ ۱۱ر فروری ۱۸۹۸ء کے خط بنام قاضی عبدالجلیل کے نام مکتوب میں محمد احمد کے بیٹے کی آنکھ میں تکلیف کی بابت رقم طراز ہیں :

"نور چشم محمد احمد سلمہ ربہ کے بیٹے کی آنکھ میں، مدت سے کچھ خرابی ہے کہ باوجود متواتر علاج کے صحت

نہیں ہوتی۔ فی الحال یہاں کے ایک ہندوستانی ڈاکٹر نے تجویز کیا ہے کہ گوشہ چشم کے قریب کا ایک سوراخ بند ہو گیا ہے، جس سے رطوبات دماغ کی طرف نکلتے ہیں اور بغیر سلائی ڈالے ہوئے کھل نہیں سکتا۔"(۲۰۲)

مولانا احسن مارہروی، "گلدستہ" کے لیے امیر سے غزل چاہتے ہیں ان کی خواہش ہے کہ امیر غزل دیں گے، تو گلدستہ شائع ہوگا۔ امیر ان سے یہ کہہ کر معذرت کر لیتے ہیں کہ :

"گلدستے کی ترتیب اور طبع کو میری غزل پر موقوف نہ رکھیے، میری طبیعت اچھی نہیں اور میرے گھر میں کئی عزیز بیمار ہیں، میں غزل نہیں کہہ سکتا۔"(۲۰۳)

لغت کا کام تسلسل کے ساتھ جاری تھا، لیکن اس کی رفتار اس لیے سست تھی کہ امداد کی کمی ساتھ ہو رہی تھی۔ تیسری جلد تیار ہو چکی تھی۔ گویا اشاعت کے قابل تھی، لیکن رقم نہیں تھی۔ جب کہ "پ" کے لغات یعنی چوتھی جلد زیر تالیف ہے۔ یہ کیفیات ۸ر جولائی ۹۸ء کے خط بنام زاہد حسین زاہد میں ملتی ہیں :

"جس طرح سرکار سے کمی کے ساتھ امداد ہو رہی ہے، اسی طرح کام بھی آہستگی کے ساتھ تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے۔ چوتھی جلد جس میں 'پ' کے لغات ہیں، زیرِ تالیف ہے اور تیسری جلد تو گویا تیار ہے۔"(۲۰۴)

امیر اپنی اولادوں اور شاگردوں کی خواہشات کا بہت خیال رکھا کرتے تھے۔ اور باوجود اپنی مصروفیات کے ان پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے، اسی زمانے میں امیر کے چھوٹے صاحب زادے لطیف احمد مینائی نے بے روزگاری سے تنگ آکر "دامنِ گلچیں" کے اجراء کا ارادہ کیا اور امیر سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کی نگرانی کریں۔ امیر، داغ دہلوی کو لکھتے ہیں :

"نورِ چشم محمد احمد کے چھوٹے بھائی، برخوردار لطیف احمد کی طبیعت شعر سے بہت مناسب واقع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں بسببِ بے شغلی کے ان کو خیال پیدا ہوا کہ 'دامنِ گلچیں' کے قالبِ بے جان میں پھر نئے سرے سے روح پھونکی جائے۔ مجھ سے اصرار کیا گیا کہ اس گلدستے کی نگرانی پر مثل سابق پھر توجہ کی جائے۔ اگرچہ آلام و اسقام کی وجہ سے نکما ہو رہا ہوں، مگر ان کی خاطر سے منظور کرنا پڑا۔"(۲۰۵)

"دامنِ گلچیں" جب وسیم نے گورکھپور سے نکالا تھا۔ جب بھی امیر نے اس کی نگرانی کی تھی اور اس سے بھی پہلے، محمد احمد نے لکھنؤ سے اجراء کیا تھا، تو بھی امیر اس کے نگراں تھے۔ اس مرتبہ بھی امیر نے حسبِ سابق اپنے احباب اور تلامذہ کو اس گلدستے کو کامیاب کرنے کے لیے متوجہ کیا۔ داغ کے بعد انھوں نے اپنے قریبی شاگرد زاہد کو بھی مطلع کیا اور غزل کی درخواست کی۔ مکتوب محررہ ۲۴ر نومبر ۹۸ء۔

"گلدستہ دامن گلچیں جنوری سے باہتمام نور چشم لطیف احمد اختر پھر نکلے گا۔ یہ وہی پرچہ ہے جو

۱۸۸۵ء میں میری زیرِ نگرانی نکل کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ اب کے بھی کوشش یہی ہے کہ حسن معنوی کے اعتبار سے یہ پرچہ آپ ہی نظیر ہو ••• جنوری کی طرح جو ذیل میں لکھی جاتی ہے۔ اپنی غزل ۱۰ر دسمبر تک لطف فرمایئے"۔(۲۰۶)

۲۰ر دسمبر ۱۸۹۸ء کے مکتوب، بنام برہم سے پتا چلتا ہے کہ لطیف مینائی گلدستہ شائع کرانے لکھنؤ گئے ہیں۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ امیر کو اس کام میں زبردست پذیرائی ملی اور انھوں نے یہ بھی ارادہ کیا کہ آہستہ آہستہ اپنا مطبع کرلیا جائے۔ تاکہ کام میں آسانی ہو جائے۔ امیر رقم طراز ہیں کہ :

"لطیف میاں گلدستہ چھپوانے لکھنؤ گئے ہوئے ہیں اور اہل مطابع کے ناز اٹھا رہے ہیں •••رفتہ رفتہ جب اپنا مطبع ہو جائے گا تو آسانی ہو جائے گی۔"(۲۰۷)

"دامنِ گلچیں" کی نگرانی کے ساتھ "امیر اللغات" پر بھی امیر کی توجہ تھی، "امیر اللغات" ایسا شوق تھا، جو روگ بن گیا۔ اس نے امیر کو کسی اور علمی و ادبی خدمت کے قابل نہ چھوڑا، اس کام میں مسائل تھے۔ بہت سا کام اس لیے ادھورا تھا کہ کتابیں میسر نہیں تھیں۔ اور کتابوں کا نہ ہونا، مالی وسائل کی کمی کے باعث تھا۔ چناں چہ امیر، دوست، احباب سے کتابیں مانگ کر کام چلاتے تھے۔ ۷ر جنوری ۱۸۹۹ء کے خط میں مولوی محمد اعجاز حسن خاں کو رقم طراز ہیں کہ : "مقاصد حسنہ کا نسخہ نہ ملنے سے میں اب تک عبارت مندرجہ 'امیر اللغات' کی فصیح نقل نہ کرسکا۔"(۲۰۸)

امیر "دامنِ گلچیں" کی ذمہ داری بھی بہ احسن پوری کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دیر ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی اہم وجہ طباعت کا مرحلہ تھا، جس پر بس نہیں چلتا تھا۔ اس لیے کہ یہ کام دوسروں کی مرضی پر تھا۔ امیر ۱۲ر مارچ ۹۹ء کے خط میں فروری کے شمارے کی تاخیر کی بابت رقم طراز ہیں کہ :

"دامنِ گلچیں کا دوسرا نمبر عنقریب نکلے گا۔ ہر چند تعمیل میں کوشش کی جاتی ہے، مگر طبع کا کام چوں کہ اوروں کے ہاتھ میں ہے۔ دیر ہی ہو جاتی ہے۔ میری حالات بدستور اور ناگفتہ (ہے)۔"(۲۰۹)

امیر کی طرح ان کے قریبی تلامذہ کو بھی "دامنِ گلچیں"، "امیر اللغات" کی فکر رہتی تھی، اور وہ وقتاً فوقتاً احوال معلوم کرتے رہتے تھے۔ چناں چہ زاہد حسین زاہد نے "دامنِ گلچیں" میں غزل کی اشاعت اور "امیر اللغات" کے بارے میں دریافت کیا، تو امیر ۱۴ر مارچ،" کے خط میں زاہد کو لکھتے ہیں کہ :

"دامنِ گلچیں کی غزل دیکھی اور کمیٹی انتخاب میں منتخب ہو گئی ••• 'امیر اللغات' سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ۔ کام تھوڑا تھوڑا ہو رہا ہے۔ اور ایک بڑی جگہ سے امید بھی ہے۔"(۲۱۰)

بڑی جگہ سے مراد غالباً حیدرآباد دکن ہے، بہر کیف ۱۶ر اپریل ۹۹ء کے خط میں پھر زاہد کو اپنا حال لکھتے ہیں کہ : "انفلوئنزا کا آج کل زور ہے۔ میں اور میرے کئی عزیز کئی روز سے مبتلا ہیں۔"(۲۱۱) ۲۱ر اپریل ۹۹ء کے خط میں دل شاجہاں پوری کو رقم طراز ہیں کہ : "میرے امراض کی حالت بدستور ہے۔"(۲۱۲) بیماریوں کے باوجود امیر اللغات کے کام میں مشغولی کا ۳۰ر مئی ۹۹ء کے خط بنام مولوی محمد اعجاز سے

علم ہوتا ہے۔ امیر "سخن دانِ پارس" کے لیے پریشان ہیں، چاہتے ہیں جہاں سے مل سکتی ہو حاصل کرلی جائے۔" (۲۱۳)

"سخن دانِ پارس کاذکر آگے آپ نے لکھا تھا۔ چوں کہ 'دفتر امیر اللغات' میں اس کی حاجت ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ جس مطبع سے اس کا ملنا ہو، مجھے آگاہ کیجیے۔" (۲۱۴)

بہت مدت بعد بشیر ملیح آبادی کا خط آیا اور انھوں نے امیر کی کیفیت دریافت کی تو امیر نے ۲۳ر جون ۹۲ء کے خط میں لکھا کہ :

"مدت کے بعد محبت خمیر تحریر آئی ... آلام واسقام میرے کبھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کچھ کم، مگر ساتھ نہیں چھوڑتے۔ بہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں۔ یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے۔" (۲۱۵)

اکتوبر میں، امیر کی بیماریاں بہت بڑھی ہوتی ہیں : زاہد کو لکھتے ہیں کہ :

"میری حالت کیا پوچھتے ہو۔ مختصراً یہ کہ بہر حال قابلِ شکر ہے ورنہ : حال ایں غمزدہ اے یار ہمانست کہ بود۔ فقط۔" (۲۱۶)

ماہ نومبر میں امیر ایک بڑے سانحے سے دوچار ہوئے۔ اس کی تفصیل راقم نے باب چہارم میں تفصیل سے پیش کی ہے۔ سردست یہاں امیر کے ایک خط سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

"نومبر کے مہینے میں آگ نے زنانے مکان سے مشتعل ہو کر مردانے مکان تک، دوپہر میں تمام اسبابِ راحت و سامانِ معاشرت جلا کر خاک کر دیا۔ قلمی اور مطبوعہ کتابیں بھی بہت سی جل گئیں، بڑا حصہ میرے کلام غیر مطبوعہ کا بھی نذر آتش ہوا۔ مگر خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ نفوس محفوظ رہے۔" (۲۱۷)

اس آگ کے واقعے کے ساتھ "دفتر امیر اللغات" ختم ہو گیا۔ اس صورتحال کے بعد امیر کی کیا حالت ہوئی ہوگی اس پر ممتاز علی آہ نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود امیر اپنی ذمہ داریوں کا احساس اپنے اوپر طاری کیے ہوئے تھے۔ انھی میں بچوں کی تعلیم بھی پیش نظر تھی۔ مسعود مینائی بریلی میں انٹرنس کا امتحان دینے جا رہے تھے۔ ان کی رہائش اور کھانے کا انتظام کرنا تھا، امیر اس بابت بہت پریشان تھے۔ انھوں نے اپنے ایک شاگرد قاضی عبدالجلیل رئیس بریلی کو مسعود احمد کی مدد کے لیے لکھا کہ :

"بندہ زادہ کو چک محمد مسعود احمد انٹرنس میں امتحان دینے کی ضرورت سے کالج کے بورڈنگ ہوس میں ۳۱ر دسمبر سے ۱۰ر جنوری تک مقیم رہے گا ... اگرچہ وہ بورڈنگ ہوس میں رہے گا۔ مگر باعتبار ماکل و مشارب کے آپ ہی کا مہمان ہو۔ کسی طرح کا تکلف اس کے لیے نہ فرمایا جائے۔ صرف سالن اور روٹی اور تسحیر کے واسطے کھیر یا دودھ میں نان پاؤ ہو۔" (۲۱۸)

"امیر اللغات"، "دفتر امیر اللغات" کے ختم ہونے کے بعد ختم ہی ہو گئی اس کے بعد امیر کے کسی خط میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ ۲۳ر جنوری ۱۹۰۰ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ "دامنِ گلچیں" بھی اس کے بعد سے بند ہو گیا امیر لکھتے ہیں کہ :

"اختر بہ وجہ قحط سالی اور ادائیگی نہ ہو سکنے۔ زر مال گزاری سخت سراسیمہ ہیں۔ اسی وجہ سے "دامنِ گلچیں" کئی مہینے سے نہیں نکلا۔" (۲۱۹)

امیر شدید مالی بحران کا شکار تھے کہ اسی زمانے میں غالباً جنوری ۱۹۰۰ء کا آخر یا فروری ۱۹۰۰ء کے ابتدائی زمانے میں ممتاز علی آہ کے مطابق :"نواب میر محبوب علی خاں طاب ثراہ نے کلکتے کا سفر کیا اور حضور ممدوح کا کچھ ایسا اشارہ پایا گیا کہ امیر بنارس میں شرف ملاقات حاصل کریں۔ اس پر حیدر آباد سے نہایت اصرار اور تاکید کے ساتھ خطوط آئے۔" (۲۲۰) یہ خطوط اور ملاقات کے اشارے داغ دہلوی اور خانسامہ کی طرف سے تھے۔ جن کے توسط سے امیر نے نظام دکن تک رسائی کی تھی۔ چناں چہ امیر نے بنارس میں نظام سے ملاقات کی۔ ممتاز علی آہ" امیر مینائی" میں لکھتے ہیں :

"حضور نظام طاب ثراہ مہاراجہ بنارس کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ حضرت قدم بوسی کے لیے وہیں حاضر ہوئے۔ جیسے ہی حضور میں اطلاع ہوئی فوراً خود بہ نفسِ نفیس باہر تشریف لے آئے۔ حضرت آداب بجالائے اور نذر پیش کی۔ قبول فرمائی اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ جو مسدس راہ میں مرتب کیا تھا۔ حضرت نے پڑھ کر سنایا۔۔۔ حضور نظام نے نہایت التفات اور رغبت سے یہ نظم سنی۔ ہر مصرعہ پر داد سخن دی، نہایت محظوظ ہوئے۔ اور بہت شوق سے خود ہاتھ بڑھا کر مسدس لے لیا اور ارشاد ہوا کہ اب آپ ہمارے ساتھ حیدر آباد چلیے۔ عرض کی کہ میں قدیم نمک خوار ریاست رام پور کا ہوں، وہاں سے اجازت نہیں لی ہے اور ہم رکاب سعادت چلنے کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا ہوں۔ انشاء اللہ جلد حاضر ہوں گا"۔ (۲۲۱)

امیر نے ۷ار فروری ۱۹۰۰ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو اس ملاقات کا مختصر احوال اور نظام کے ساتھ ان کے اسپیشل میں سفر نہ کرنے کی مجبوریاں رقم کی ہیں۔ ان میں پہلی تو یہ کہ موسم سرما میں اپنی بیماریوں کے باعث سفر کرنے کے قابل نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ رام پور سے رخصت لے کر نہیں آئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی حیدر آباد کے سفر کا اظہار ہی امیر اور ان کے خاندان کے لیے مخالف تھا۔

"حضرت نظام عالی مقام، حیدر آباد دکن خلد اللہ ملکہم واقبالہم سے میں بنارس میں ملا۔ بجز اطلاع مجھے یاد فرمایا۔ اور جو نظم میں نے مناسب مقامِ راہ میں مرتب کی تھی، اس کو بکمال التفات میری زبان سے سماعت فرما کر داد سخن دی اور وسعت اخلاق و مروت و فتوت فطری سے میرا اعزاز بڑھایا۔ مرضی مبارک کے موافق ان کے معزز ارکان اسٹاف نے مجھ سے ہمرکاب سعادت ہونے کے لیے اصرار کیا۔ افسوس کہ میں موسم شدت برو میں اپنے مرض کی وجہ سے ان کے اسپیشل پر نہ جاسکا۔ ایک مانع قوی یہ بھی تھا کہ یہاں کے تعلقات کثیر اور حالت بغیر حصول رخصت کیوں کر چلا جاتا۔ بہت ہی خطرات کا سامنا ہوتا۔ ناچار آغاز موسم گرما میں شرف حضوری کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ یہ سفر باعث مزید

زیرباری کا تو ہوا، مگر جس عنوان سے ملاقات ہوئی اس سے وہاں پہنچنے پر امید کامیابی کو حسبِ دلخواہ قوت ہوگی۔"(۲۲۲)

اب امیر فوراً حیدرآباد جانا چاہتے تھے، لیکن سفر کے مصارف کے لیے رقم نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ سفر میں چند عزیز، چند شاگرد بھی ہوں گے اور امراض کے باعث ایک پورا ڈبہ، سیکنڈ کلاس کا درکار ہوگا۔ پھر وہاں پہنچ کر انعام واکرام کے لیے زرِ کثیر کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ وہ بڑا دربار تھا۔ اگر رقم ہو، تو فوراً نکل جائیں۔ لیکن یہاں رام پور میں سفر کا اظہار بھی خلافِ مصلحت تھا۔ امیر نے ۱۷ر فروری ۱۹۰۰ء کے خط ہی میں ان امور کا اظہار کیا ہے۔

"اب ہر وقت یہ فکر ہے کہ سامانِ سفر بہم ہو جائے تو تہیہ سفر کروں۔ اس لیے کہ ادھر کے سفر کا اظہار بھی یہاں خلافِ مصلحت ہے۔ دیکھا چاہئے منظور الٰہی کیا ہے ••• یہ بات بھی وہاں کے احباب و عمائد سے معلوم ہوئی کہ سرکار میں برتاؤ بہ نظر حیثیت ہوتا ہے۔ میرے ساتھ چند عزیز چند شاگرد لایق ضرور ہوں گے۔ اور مرض عسر بول و حبس بول کے سبب سے ایک پوری گاڑی سیکنڈ کلاس ریزروڈ ہر سفر میں کرنی پڑتی ہے۔ پھر وہاں پہنچ کر انعام واکرام وغیرہ کے مصارف علاوہ، کہ اس کے بغیر کسی دربار میں کام نہیں چلتا اور وہ تو بڑی سرکار بڑا دربار ہے۔ آگ نے اگر گھر برباد نہ کر دیا ہوتا، تو تہیہ سامان سفر میں سامان البسہ واقمشہ کی ضرورت نہ ہوتی۔"(۲۲۳)

۴ر مارچ ۱۹۰۰ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں کہ :

"دکن سے ارکانِ دولت کے خطوط برابر آتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت قدر قدرت میرا ذکر بہ خیر فرماتے ہیں۔ میرے بہی خواہ احباب اسی پر زور دے رہے ہیں کہ تازہ تازہ ملاقات ہوئی ہے، اس کا اشتیاق ہے، یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ سفر اختیار کیجیے اور بہت کچھ کیجیے۔ میں باوصف رنجوری و معذوری سفر پر تیار ہوں، مگر کیا کروں موانع قوی جو سدِراہ ہیں، بر طرف ہو لیں تو کام چلے اور میں بھی چلوں۔"(۲۲۴)

۴ر جون ۱۹۰۰ء کے خط بنام مختار شاہجہاں پوری کے مکتوب سے پتا چلتا ہے کہ سفر کی تیاریاں زور شور سے جاری ہیں۔ ضروریات کی چیزیں جمع کی جا رہی ہیں۔ مختار شاہجہاں پوری کے توسط سے مختلف چاقو بھی بنوائے جا رہے ہیں۔

"چاقو بڑے چھوٹے دونوں قسم کے مطلوب ہیں۔ چھوٹے، ان چاقوؤں سے جن کی نوکیں ترشوانے کو دی تھیں، کم نسوں اور بڑے اوف سے سوائے ڈیوڑھے ہوں۔ حتی الامکان خوش قطع بھی ہونا چاہئے۔ دستے بھی موزوں اور خوش قطع ہوں اور تاکید کر کے جلد بنوایئے۔ تاکہ مجھے سفر سے پہلے ملیں اور قیمت سے اطلاع دیجیے۔"(۲۲۵)

۱۵ر جون ۱۹۰۰ء کے خط، بنام مختار شاہجہاں پوری سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ امیر ابھی رام پور ہی میں ہیں۔ سفر میں رکاوٹ کی وجہ امیر

اور ان کے ہمراہی احباب کی بیماریاں ہیں۔ امیر لکھتے ہیں کہ :

" میرے سفر میں توقف، جن اسباب سے ہے۔ تعین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ وہ موانع کے (کتنے) روز میں رفع ہوں گے۔ خدا سے امید ہے کہ اس ماہ سفر کی کسی تاریخ میں روانگی کا اتفاق ہو، ایک ہفتے سے میری طبیعت زیادہ ناچاق ہے اور میرے دو فرزندان کی طبیعت بھی جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئی ہے۔ زیادہ تر یہی وجہ توقف ہے۔" (۲۲۶)

اسمٰعیل احمد مینائی (نبیرہ امیر مینائی) اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ "یہ ماہ اگست ۱۹۰۰ء "امیر رام پور سے حیدر آباد روانہ ہوئے۔ اور بھوپال میں لگ بھگ ایک ماہ قیام کیا۔" (۲۲۷) ممتاز علی آہ اس قیام کی وجوہ اور دیگر تفصیلات میں لکھتے ہیں کہ :

"آخر وقت آیا اور برسات میں حیدر آباد کا سفر کیا۔ چوں کہ احباب وارا کین دار الاقبال بھوپال کو خبر مل گئی تھی اور ان سب کا بہت اصرار تھا۔ بر سر راہ پہلے وہیں اتر پڑے۔ سرکار عالیہ نے فرحت افزاء باغ میں فرود کش کیا اور پہلے سے بھی زیادہ اعزاز و اکرام فرمایا اور اس قدر اصرار اور قدر دانی کی کہ کم و بیش ایک مہینا بھوپال ہی میں آپ کا قیام رہا۔" (۲۲۹)

میکش حیدر آبادی بھوپال کی قدر دانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ دام اقبال نے اپنے خاص باغِ فرحت افزاء میں، نہایت اعزاز کے ساتھ مہمان رکھا اور سو روپیہ روزانہ آپ کے اور آپ کے ہمراہیوں کے واسطے مقرر تھا۔ آپ وہاں قریب ایک ماہ کے کچھ زیادہ قیام پذیر رہے۔" (۲۳۰)

بھوپال میں قیام کے دوران امیر کو ۱۹ ر اگست ۱۹۰۰ء کو داغ کا خط موصول ہوا۔ امیر نے اس کا جواب ۲۳ ر ربیع الآخر ۱۳۱۸ھ بہ مطابق ۲۰ ر اگست ۱۹۰۰ء کو اس کا جواب لکھا یہ خط سوانحی حوالے سے نہایت اہم ہے۔ اس میں کئی اطلاعات ملتی ہیں : مثلاً : داغ نے اس خط میں لکھا تھا کہ اگر چہ مکان میرا اس قابل نہیں مگر آپ میرے یہاں قیام کیجیے گا۔ امیر جواباً لکھتے ہیں :

"میرے پیارے داغ، غربت میں میری راحت کے سہارے داغ، اس سے زیادہ مجھے کیا خوشی ہو گی کہ غریب الوطن ہو کر ایسے مانوس المطبع ہمدرد کے پاس ٹھہروں۔" (۲۳۱)

اس کے علاوہ داغ نے نظام دکن کو امیر کے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امیر لکھتے ہیں :

"آپ نے حضور میں میرے آنے کی خبر کر دی۔ بہت اچھا کیا۔ میں ممنون ہوا اور مسرور، خداوند تعالیٰ آپ کو اس مرض تبخیر و ضعفِ دماغ و دوران سر سے نجات اور پرہیز کامل کی توفیق دے۔" (۲۳۲)

غالباً داغ نے امیر سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کے ہم راہی کتنے ہیں امیر جواباً لکھتے ہیں :

"میرے ہم راہی یہ ہیں : لطیف احمد، مسعود احمد، لیاقت حسین برادر زادہ و داماد بندہ، ثابت علی

فرزند خواہر زادہ حقیقی۔ حافظ جلیل حسن جلیل، خان علی خاں برادر مہدی علی خاں۔ ان کے علاوہ تین خدمت گار ہیں۔"(۲۳۳)

امیر کا قیام بھوپال میں تھا۔ امیر وہاں سے جلد نکلنا چاہتے تھے، لیکن بھوپال سے اجازت نہیں مل رہی تھی۔ داغ کو اسی خط میں لکھتے ہیں کہ: "آج میں نے پھر درخواست رخصت کی سرکار عالیہ کو بھیجی ہے۔ خدا کرے جلد ملازمت و رخصت حاصل ہو جائے۔" بالآخر امیر کو بھوپال سے رخصت ملی، تو وہ وہاں سے گلبرگہ تشریف لے گئے، جہاں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور دو روز قیام کے بعد دکن روانہ ہوئے۔ امیر ۱۰ر جمادی الاول ۱۳۱۸ھ شام پانچ بجے وارد حیدر آباد ہوئے۔ اسٹیشن پر امیر کی بہت پذیرائی ہوئی۔ (۲۳۴) یہاں سے امیر، داغ کے گھر تشریف لے گئے۔ دو دن تک لوگوں کی آمد و رفت رہی۔ دوسرے ہی دن سے امیر کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوئی اور ایسی حالت ہوئی کہ پھر سنبھل نہ سکے اور ۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۳ر اکتوبر ۱۹۰۰ء کی شب امیر اس دیار فانی سے کوچ کر گئے۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون**o

افسوس تجھ کو رحم نہ آیا کچھ اے اجل
مارا کہاں امیرؔ غریب الدیار کو (جلیل)

اور امیر کا اپنے لیے کہا درست ہو گیا کہ:

قبر ہی وادی غربت بنے گی ایک دن
اور کوئی نظر آتی نہیں گھر کی صورت

یارام پور سے روانگی کے وقت کہا تھا کہ:

اب کے سفر وہ ہے کہ نہ دیکھوں گا پھر وطن
یوں تو میں لاکھ بار غریب الوطن ہوا
کیسی گھڑی تھی گھر سے جو نکلا تھا میں غریب
پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا

امیر کی وفات کے ساتھ ہی ایک در بستہ ہوا اور ایک باب کھلا۔ امیر پر بہت سے اعتراض ان کی وفات کے بعد بھی ہوئے، لیکن اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اعتراضات ایسے تھے کہ امیر کے مرتبے اور مقام کو متاثر نہ کر سکے۔ ظاہر ہے ایسی باتوں کو سو سال گزر جانے کے بعد دوبارہ دہرانا لاحاصل ہے۔ لیکن ایک واقعے کو یہاں پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ امیر کی سوانح سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ امیر حیدر آباد دکن کیوں گئے؟ کیا سلطنت آصفیہ کی دعوت پر گئے تھے؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور یہ سوال احسن مارہروی کے مضمون "نشتر سخن اور امیر مینائی کا سفر دکن" مشمولہ "الناظر" لکھنؤ، ۱۹۱۲ء سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ احسن مارہروی شاگرد رشید داغ دہلوی نے دلیل سے ثابت کیا ہے کہ امیر: "حضور نظام کے مطلوبہ نہ تھے۔"(۲۳۵) اگر ہم امیر کے مکتوبات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ امیر جب نواب حامد علی خاں کے رویے سے سخت مایوس ہوئے، تو

انھوں نے بھی حیدر آباد دکن کی طرف دیکھنا شروع کیا اور وہی راستے منتخب کیے جو داغ نے کیے تھے اور ساتھ ساتھ داغ کی ناکامیوں کو بھی دھیان میں رکھا۔ امیر نے بھی خانسامہ محمد ابراہم کے توسط سے اپنا کلام نظام کی خدمت میں بھیجا۔ یہ بات ۱۸۹۲ء کی ہے۔ ساتھ ساتھ خانسامہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے داغ سے بھی مدد لی۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ امیر صرف اور صرف "امیر اللغات" کے لیے امداد حاصل کرنا چاہتے تھے نہ کہ ملازمت یا اعزاز۔ چناں چہ امیر کی کوششیں جاری رہیں۔ امیر یہ بھی ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ نظام کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے حیدر آباد میں پڑاؤ ڈالا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ جب میدان بالکل تیار ہو جائے گا۔ تو پہنچ جائیں گے اور یہ فیصلہ امیر کا بالکل درست تھا۔ کیوں کہ داغ کئی سال تک دکن میں امیدواری کی کڑیاں جھیلتے رہے تھے اور حد درجہ قرض دار ہو گئے تھے۔ بالآخر اوائل ۱۹۰۰ء میں جب نظام طاب مژاہ نے کلکتے کا سفر بہ راستہ بنارس کا ارادہ کیا، تو داغ، نظام کے ساتھ تھے۔ چناں چہ داغ نے حقِ دوستی نبھاتے ہوئے بنارس میں نظام سے امیر کی ملاقات کا انتظام کیا۔ اور امیر کو اس کی اطلاع دی۔ امیر نے نظام سے ملاقات کی اور مسدس پیش کیا۔ نظام، امیر سے متاثر ہوئے اور انھوں نے آگے بڑھ کر مسدس امیر کے ہاتھ سے لے لیا اور دکن کی دعوت دی۔ اس موقعے پر داغ نے امیر سے کہا کہ آپ ہم رکاب رہیے، کام بن جائے گا۔ امیر نے زاہد کے نام جو خط لکھا اس میں لکھا کہ : "ان کے معزز ارکانِ اسٹاف نے مجھ سے ہم رکاب سعادت ہونے کے لیے اصرار کیا۔" (۲۳۶) امیر نے یہاں داغ کا نام نہیں لیا۔ اس بات کی صراحت احسن مارہری نے اپنے مضمون میں کی ہے۔ احسن رقم طراز ہیں کہ :

> "ریاست حیدر آباد میں عموماً اور نظام سادس کے دربار میں خصوصاً کسی شاعر کو صلہ مدح فوراً حاصل نہیں ہوا۔ مگر شاہی خوشنودی مزاج مداح کو امیدواری کے ایسے خوش گوار خواب دکھاتی ہے، جس پر بیداری بخت کا گمان ہوتا ہے۔ اس بنا پر مزاج شناس درباری، داغ نے منشی صاحب سے کہا کہ اب آپ ہم رکاب رہیے۔ اسی سفر میں کوئی نہ کوئی نتیجہ ظاہر ہو جائے گا۔" (۲۳۷)

بہر کیف امیر کی کچھ مجبوریاں تھیں۔ (جس پر تفصیلی روشنی گزشتہ صفحات میں خطوط کی مدد سے پیش کی گئی ہیں)۔ جس کی بنا پر وہ ہم رکاب نہ ہوئے۔ نظام، کلکتہ سے واپسی میں گلبرگہ میں مقیم ہوئے، تو انھوں نے امیر کو یاد کیا۔ احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ : "چوں کہ جناب موصوف موجود نہ تھے مجبوراً ان کی غیر موجودگی پر علالت کا پردہ ڈالا گیا۔" (۲۳۸) جب کہ جلیل لکھتے ہیں کہ : "مصاحبین نے عرض کیا کہ وہ بنارس میں حیدر آباد کے لیے تیار ہو کر نہیں آئے تھے۔ اب جلد حاضر ہوں گے۔" (۲۳۹) پھر عرصہ دراز کے بعد امیر رام پور سے حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئے، تو انھوں نے اپنی آمد کی اطلاع داغ کو دے دی۔ احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ : "اس زمانے میں حضرتِ داغ نے موقع پا کر حضور نظام کے گوش گزار کر دیا تھا کہ منشی صاحب آرہے ہیں اور یہ اطلاع کچھ ایسی موقع شناسی سے کی گئی تھی کہ شاہی جواب میں ایسے الفاظ نہیں سنے گئے جن پر ذرا بھی تنفص کا گمان کیا جاتا"۔ (۲۴۰) داغ نے نظام کو آگاہ کر کے امیر کو بھی مطلع کیا۔ جس کے جواب میں امیر نے لکھا تھا کہ : "آپ نے حضور میں میرے آنے کی خبر کر دی بہت اچھا کیا۔" (۲۴۱) لیکن امیر کی بد نصیبی کہ وہ بھوپال میں پھنس گئے۔ چناں چہ اسے امیر کا تساہل جانا گیا اور نظام پر اس کا برا اثر پڑا۔ ظاہر ہے جب نظام نے حیدر آباد دکن کی دعوت دی تو امیر نے عذر پیش کیا، پھر آمد لکھی۔ اور وقت پر نہ پہنچے، یہ بات بقول احسن :

"بہ جائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوئی۔ اور اس قسم کے اثرات کی وجہ سے منشی صاحب کو بہ تاکید آگاہ کر دیا گیا تھا کہ وہ، اپنی تشریف آوری سے براہِ راست حضور نظام کو مطلع نہ کریں۔ یہ مفہوم وہ لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں۔ جو دیسی ریاستوں کی حاسدانہ پارٹی فیلنگ کے راز سے واقف ہیں۔"(۲۴۲)

چناں چہ امیر جب گلبرگہ سے روانہ ہوئے تو انھوں نے داغ کو اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ تاری بھیجی۔ اس سے آگے کی روداد احسن مارہروی لکھتے ہیں:

"اطلاعی تار پہنچا کہ ہم آج چار بجے شام کو حیدر آباد پہنچیں گے۔ یہ تار پا کر مرزا داغ نے حضور نظام کو یہ عرضی لکھی کہ منشی امیر احمد صاحب میرے مہمان بن کر آرہے ہیں۔ اطلاعاً گزارش ہے۔ ہنوز اس اطلاع و گزارش کا کوئی جواب نہ آیا تھا کہ ایک سرکاری چوب دار حضور کا لفافہ لیے ہوئے پہنچا جس میں لکھا تھا کہ: منشی صاحب کیوں آتے ہیں اور کس نے بلایا ہے •••اس وقت کا اضمحلال و انتشار قابلِ بیان نہیں، جو مرزا داغ کے عاید حال تھا۔ چند گھنٹوں کے لیے وہ بالکل خاموش اور منتشر الحواس ہو گئے۔ اسی وجہ سے کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ حضور کا جواب کیا دیا گیا۔ مگر دو پہر بعد اس محبت کے پتلے کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، داغ، امیر کے استقبال کو ضرور جائے گا۔•••بالآخر ریل کا وقت آیا اور مرزا داغ بہ نفسِ نفیس چند نیاز مندوں کو ساتھ لے کر اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔•••ریل آئی اور منشی صاحب خیر و خوبی پلیٹ فارم پر رونق افروز ہوئے اور پھر مرزا داغ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر مرزا داغ کے مکان واقع محبوب گنج میں فروکش ہوئے۔ رات کو آرام و آسائش بسر ہوئی۔ دوسرے روز منشی صاحب، مرزا داغ کی نشست گاہ میں تشریف لائے اور اب یہاں دونوں کا تخلیہ ہوا۔ بعد تخلیہ جب کہ منشی صاحب اپنی فرود گاہ پر جانے لگے۔ اس وقت ان کے چہرے سے افسردگی کے آثار نمایاں تھے۔"(۲۴۳)

یہ صدمہ امیر کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ دوسرے ہی دن سے ان کی طبیعت بگڑنا شروع ہوئی اور بالآخر لگ بھگ ایک ماہ میں امیر چٹ پٹ ہو گئے۔ احسن مارہروی نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کئی دلیلیں دی ہیں۔ مثلاً

۱۔ امیر کے استقبال کے لیے ریاست نے کوئی انتظام نہیں کیا۔ ظاہر ہے۔ "ایک والیِ ملک کا ایک مسلمہ استاد فن کو بااصرار بلانا پرائیوٹ نہیں ہو سکتا۔"

۲۔ "دو ایک زیر اثر اور غیر معتبر اخباروں کے سوا کسی مقتدر اشاعت میں حضرت امیر مینائی مغفور کی طلبی کا حال شائع نہیں ہوا"۔

۳۔ "کوئی بزرگ فرما سکتے ہیں کہ مرحوم کی مرگِ ناگہاں پر منجانب حضور نظام ادائے تعزیت کے لیے کوئی آیا تھا"۔

۴۔ "دو تین سال تک ان کے (امیر کے) اعقاب پر باوجود سفارش مدار المہام مراحم خسروانہ مبذول تھے۔

۵۔ "امیر مینائی کوئی چلتے پھرتے بزرگ نہ تھے۔ ان کا رام پور سے اٹھنا، مہینے دو مہینے بھوپال میں ٹھہرنا۔ والیہ بھوپال کا مہمان بنانا اور قدر افزائی کرنا اور ایسی دوسری باتیں اخبارات میں شائع ہوں مگر نہ شائع ہو تو حضور نظام دکن کا بااصرار بلانا"۔

احسن مارہروی کے یہ سوال ان کے بیان کو مضبوط کرتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ امیر کو بااصرار نہیں بلایا گیا تھا۔ بااصرار ان کے اعزاء نے بلایا تھا جلیل لکھتے ہیں :

"زمانہ دراز سے اس خاندان کے بیشتر افراد سلطنتِ دکن کے نمک خوار اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔" (۲۴۴)

اعزاء کے علاوہ امیر کے شاگردوں کی ایک تعداد دکن میں موجود تھی۔ عقیدت مند اور چاہنے والے اس کے علاوہ تھے۔ جلیل نے سفر دکن کی روداد میں لکھا کہ :

"دکن سے احباب امیر کے خطوط اور طلب کے تار بھوپال ہی میں آنے لگے تھے اور اب گلبرگہ شریف پہنچنے پر تو خطوط اور تاروں کا تانتا بندھ گیا۔" (۲۴۵)

امیر کو ان خطوط اور تاروں ہی سے دھوکہ ہوا۔ امیر یہ سمجھے تھے کہ نظام نے بنارس میں قدر کی تھی، دعوت بھی حیدر آباد آنے کی دی تھی۔ پھر داغ نے بھی انھیں مطلع کر دیا ہے۔ اور میرے احباب نظام کے نمک خوار ہیں بات بن جائے گی۔ لیکن اندرونِ خانہ کیا ہوا امیر سمجھ نہ سکے اور دھوکہ کھا گئے۔ اب جہاں تک احسن مارہروی کے دلائل کی بات ہے تو وہ بالکل درست ہے۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں۔

۱۔ احسن کا مضمون جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد جلیل کی تحریر کردہ سوانح ۱۹۲۸ء میں ممتاز علی آہ کی ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ جلیل امیر کے شاگرد اور جانشین، ممتاز علی آہ شاگرد اور مرید۔ دونوں سوانح نگاروں نے اس الزام کی صفائی میں غیر محسوس طور پر بھی کوئی مواد فراہم نہیں کیا۔ البتہ یہ احتیاط کی کہ یہ نہ لکھا کہ امیر بااصرار نظام دکن حیدر آباد گئے۔ بلکہ اس طرح لکھا کہ امیر کی بنارس میں نظام دکن سے ملاقات کے بعد، سفر حیدر آباد کو متصل تحریر کر دیا۔ جس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ : امیر بااصرار نظام دکن حیدر آباد گئے۔ جلیل نے بھی واضح طور نہیں لکھا، اور بہت محتاط بیان اختیار کیا اور سفر دکن کا یہ جواز لکھا کہ :

"حضرت امیر کے بعض فرزند، جو ملازمت کے خواہاں تھے اور حضرت کو بھی ان کی بے کاری گراں تھی۔ ان کی کوشش و ترغیب بار بار حضرت کو اس جانب مائل کراتی تھی کہ سفر دکن اختیار کیا جائے۔ زمانہ دراز سے اس خاندان کے بیشتر افراد سلطنتِ دکن کے نمک خوار اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ اس لیے سلطنتِ آصفیہ فرزندانِ امیر کے لیے بیگانہ مقام نہ تھا۔ ۰۰۰ اب جب کہ بنارس میں اعلیٰ حضرت سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہو گیا تھا اور ارکانِ دولت ایمائے جزوی سے مصر رہتے تھے کہ سفر دکن کیا جائے حضرت امیر کو تامل کا موقع نہ رہا۔" (۲۴۶)

جلیل کے بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امیر بنارس میں نظام طاب مژاہ سے ملاقات کے بعد ہی امید لگا بیٹھے تھے۔ اور پھر احباب و اعزاء کے مشورے اور اصرار نے دکن کی طرف متوجہ کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ امیر رام پور سے نکلنے کے بعد سیدھے حیدر آباد پہنچتے تو صورتِ

حال مختلف ہوتی۔ بہر کیف امیر دھوکہ کھا گئے اور احسن کی بات درست ثابت ہوئی۔

۲۔ ڈاکٹر شائز اللہ خاں وجہی نے "حیات امیر مینائی : کچھ نئے مآخذ" میں علامہ عبدالجبار خاں آصفی کی تحریر کردہ امیر مینائی کی سفر دکن کی روداد شامل کی ہے جو ہفتہ وار اخبار مفید عام آگرہ، ۱۰ر نومبر ۱۹۰۰ء کی اشاعت سے مستفاد ہے۔ اس میں کسی موقع پر یہ تاثر بھی نہیں ملتا کہ امیر کے استقبال کے لیے ریاست سے کسی نے شرکت کی ہو۔ یا امیر کی وفات کے بعد نظام دکن کی طرف سے کوئی تعزیت کے لیے آیا ہو۔ یا کسی معتبر اخبار میں امیر کی آمد کی خبر شائع ہوئی ہو یا امیر کو سرکاری سواری اور رہائش مہیا کی گئی ہو۔ وغیرہ وغیرہ

الغرض امیر اپنی مرضی اور احباب کے مشورے کی بناء پر وارد دکن ہوئے۔ داغ نے امیر کا بھرپور ساتھ دیا اور حق دوستی نبھادیا۔

(۹)

گذشتہ صفحات میں، امیر کی ایک مربوط سوانح، خطوط کی مدد سے پیش کی گئی۔ جس سے یقیناً، امیر کے مکتوبات کی اہمیت سامنے آئی ہے۔ لیکن اسے امیر کے زندگی گزارنے کا ایک مربوط تسلسل قرار دیا جاسکتا ہے اور بس۔ اس میں جگہ جگہ امیر کی شخصیت کے مختلف پہلو بھی یقیناً سامنے آئے ہیں، لیکن اتنے مکمل نہیں کہ جس کی بنیاد پر امیر کے کردار، عادات واطوار، مشاغل اور رغبتوں کا پتا چل سکے۔ گویا گذشتہ سطور میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، وہ امیر کی زندگی کے خارجی پہلو سے بحث کرتی ہیں۔ جب کہ ذیل میں جو معلومات پیش کی جارہی ہیں۔ وہ امیر کی داخلی زندگی کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔

امیر فطرتاً محبت کرنے والے، نیک اور پاک طینت انسان تھے۔ وہ حضرت شاہ میناؒ کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ جس پر انھیں بوا ناز تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ اس خانوادے کی وجاہتوں اور روایتوں کے امین بھی تھے۔

امیر مکروہات سے ہمیشہ دور رہے۔ ان کی پوری زندگی صبر واستغنا کی آئینہ دار رہی، اگر وہ بھی مکر وفریب کے لبادے اوڑھ لیتے۔ تو اتنے مرید تو تھے۔ کہ ان کی زندگی کسمپرسی میں نہیں گزرتی۔ لیکن وہ ہر دم یہی دعا کرتے نظر آتے ہیں کہ : "اللہ خاتمہ بالخیر کرے"۔ سچ تو یہ ہے کہ امیر کی تحریریں ان کی فطرت کی آئینہ دار ہیں۔

امیر کے مکتوبات میں، ان کی فطرت کے متعدد عکس بہت نمایاں ہیں۔ ان میں امیر کے دعائیہ کلمات ہیں جو آورد سے پاک دل کی آواز معلومات ہوئے ہیں۔ مثلاً بشیر ملیح آبادی کا خط موصول ہونے پر، امیر اس طرح دعا گو ہوتے ہیں :

> "محبی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، محبت نامہ آیا اور ممنون ومسرور یاد آوری کیا۔ خداوند تعالیٰ آپ کو اسی دل نوازی اور محبت طرازی کے ساتھ خوش رکھے اور مقاصد دینی اور دینوی پر فائز کرے۔" (۲۴۷)

تلامذہ سے امیر کی انسیت ومحبت کی متعدد مثالیں گذشتہ باب میں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن دعا نگاری میں امیر کو ملکہ حاصل تھا۔ جو ان کے پر خلوص دل اور احباب سے خاص تعلق کا پتا دیتا ہے۔ قاضی عبدالجمیل کو دی گئی دعا ملاحظہ کیجیے :

> "الحق! آپ کی ذات مستودہ صفات اخلاقِ محمدی واشفاقِ اسلامی میں یادگار اسلاف کرام ہے۔ حق تعالیٰ

سات عورتیں ہوں گی۔ ایک چھوٹا بچہ ہے۔ منجملہ ان آدمیوں کے اس کی انا بھی ہے۔ لطیف احمد بندہ زادہ اوسط سواریاں لینے گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ مراد آباد سے رام پور تک، راہ میں دو دریا پڑتے ہیں۔ جن پر اس موسم میں پل نہیں ہے اور بریلی سے یہاں تک راہ مامون ہے۔ میں نے لطیف احمد سے کہہ دیا ہے کہ بریلی کے اسٹیشن پر اتریں اور ایک منزل کی جگہ دو منزل خشکی کی گوارہ کریں۔ اگر وہاں یہی صلاح قرار پائی، تو راہ سے مجھے تار آئے گا اور میں بذریعہ خط، خواہ بذریعہ تار آپ کی خدمت میں اطلاع دوں گا۔ کہ آپ براہ نوازش قدیمانہ چند باتوں کا بندوبست فرما دیں۔

ایک ہلکا اور مضبوط میانہ جس پر دو زنانی سواریاں باآسانی بیٹھ سکیں اور ایک کافی وسعت کی ڈولی جس پر بچے کی انا، بچے کو لے بیٹھ سکے۔ وقت معمور پر اسٹیشن پر مہیا فرما دیں اور احتیاطاً ایک مکان مختصر خالی رکھیں کہ اگر یہ مسافران منزل دور دراز دو چار پہر آسائش کے واسطے اترنا چاہیں، تو اس میں اتر پڑیں اور جس قسم کی مدد یہاں آنے کے واسطے کہاروں وغیرہ کی ان کو درکار ہو، اس میں توجہ فرمانے کی بھی آپ سے امید واثق ہے۔"(۲۵۲)

امیر کو اپنے اعزاء کا شدت سے انتظار ہے۔ اور متفکر اس لیے تھے کہ راستے میں انھیں کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔ چناں چہ جیسے ہی انھیں، دکن سے تار کے ذریعے اطلاع ملتی ہے کہ منگل کی شب احباب بریلی پہنچے تھے۔ تو وہ فوراً ایک خط حسبِ وعدہ عبد الجمیل کی خدمت میں بھیجتے ہیں کہ وہ اہلِ خانہ کی مدد کریں:

"مجھے انتظار تھا کہ جن عزیزوں کے اتارنے کا بریلی میں بندوبست کرنا ہے، ان کا تار تعینِ وقت کے ساتھ آجائے تو آپ کی خدمت میں اطلاع کروں۔ اس وقت راہ سے تار آیا کہ منگل کا دن گزر کر شب کی ریل میں بریلی پہنچیں گے۔ میں احتیاطاً میر ناصر علی اپنے ایک معتمد کو، کہ مثل میرے عزیزوں کے ہیں۔ یہ نامہ نیاز دے کر آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔"(۲۵۳)

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شعراء وغیرہم اپنے اہلِ خانہ پر توجہ کم دیا کرتے تھے، یا توجہ ہوتی ہی نہیں تھی۔ خاص کر امیر کا دور، اس حوالے سے کسی حد تک ناگفتہ بہ تھا، خود داغ کی زندگی ہمارے سامنے ہے، کم و بیش شعراء کا حال داغ جیسا ہی تھا۔ رات کسی کے کوٹھے پر تو دن کسی کی کوٹھری میں، شراب اور راز و نیاز کے مجموعے کو زندگی کا نام دے دیا گیا تھا۔ یہ ایک عمومی صورتِ حال تھی۔ اس دور میں امیر اور اس قبیلے کے لوگ شاذ و نادر تھے۔ جو اپنے اہلِ خانہ کی ضرورتوں کا خیال رکھتے اور اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتے۔ (یہاں میری مراد شعراء کے کیمپ سے ہے) یہ امیر کی خاص توجہ ہی تھی کہ آج بھی ان کی اولادیں اپنی علمیت اور جدید اعلیٰ تعلیم کے باعث معاشرے میں عزت کی زندگی گزارتی ہیں۔

امیر اپنے بیٹے صاحب زادے محمد احمد صریر مینائی کی تعلیم کی طرف سے بہت پریشان رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانی لیاقت میں تو کامل تھے، لیکن انگریزی سے ناواقف تھے۔ اور اب صورتِ حال یہ ہوتی جا رہی تھی کہ انگریزی تعلیم کے پھیلاؤ

کی وجہ سے اس لیاقت کی قدر و قیمت نہیں رہی تھی۔ امیر چاہتے تھے۔ کہ محمد احمد وکالت کی تعلیم حاصل کرلیں تا کہ ان کے بعد وہ گھرانے کی کفالت کر سکیں۔ محمد احمد عربی، فارسی اور اردو کی لیاقت تو رکھتے تھے۔ لیکن اس بنیاد پر ریاست رام پور میں انھیں صرف پچاس روپے تک کی نوکری ملتی اور ترقی کا کوئی امکان نہ تھا۔ امیر چاہتے تھے کہ آنے والے وقتوں میں ان کی اولادیں بھی سر اٹھا کر چل سکیں۔ خیال کرنا چاہیے کہ انگریزی کا عمل دخل بڑھ جانے سے کیسے کیسے ہنر مند اور تعلیم یافتہ ہستیاں بے نام ہوگئیں۔ کیسی کیسی ہندوستانی شعری و نثری اصناف معدوم ہوگئیں۔ ہزاروں اہل علم اور لاکھوں کتابیں تاریخ کا حصہ بننے سے محروم رہ گئیں۔ سیکڑوں ہزاروں اہل علم کے تجربات منتقل ہی نہ ہو سکے۔ ذیل میں امیر کا ایک خط، بنام شاداب پیش کیا جاتا ہے۔ جو امیر کی اولاد سے محبت اور عہدِ امیر میں اہل علم کی زبوں حالی کی تصویر پیش کرتا ہے :

> "مفصل ارشاد ہو، کہ کتنے زمانہ میں اس ملک میں ذہین آدمی جو ناواقف انگریزی ہو اور عربی، فارسی، اردو سے آگاہ ہو وکالت کی لیاقت حاصل کر سکتا ہے اور کیا کیا مدد اس کو آپ کے سرکار سے مل سکتی ہے۔
>
> محمد احمد کو اس ریاست میں پچاس روپے ماہواری تک کی نوکری مل سکتی ہے مگر ترقی معتدبہ کی امید نہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ میں فرا خور حوصلہ فلاح حاصل کروں اور میں بھی اس کو، یہ خیال حاجات آتیہ پسند کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میرا ہر نفس نفس واپسیں ہے اور اعقاب کا قافلہ بڑا، جائداد کوئی پیدا نہیں ہوئی، پھر اس قافلے کی خدمت گزاری بغیر عمدہ وجہ معاش کے کیوں کر ہو سکے گی۔ میں نے تو وقت اچھا پایا، دس سے بری تو بیس سے اچھی گذر گئی۔ اب صرف ہندوستانی لیاقت کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، دورِ سلطنت انگلشیہ ہے، ریاست کے قیام سے وہ حاصل نہیں ہوئی :
>
> اب قصد کیا جاتا ہے تو محمد احمد کا مقتضائے عمر نہیں باایں ہمہ وہ ارادہ کرتے ہیں کہ میں تین برس متصل کوشش کروں۔ اس بارے میں ارباب فہم سے رائیں لی جاتی ہیں ••• محمد احمد اگر اس ملک میں رہ کر قانون وکالت یاد کرنے میں یا اور جس ذریعے سے آپ تجویز فرمائیں فلاح حاصل کرنے میں برس دو برس، تین برس کوشش کریں تو مجھے کس قدر ماہوار کفالت ان کی آسائش رسمی کے واسطے ضرور ہو گی۔" (۲۵۴)

امیر اپنے بیوی بچوں کے علاوہ خاندان کے دیگر افراد کی بھی بے لوث خدمت کیا کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ امیر کے احباب، جو تحائف انھیں بھیجتے، امیر انھیں اپنے خاندان میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ بشیر ملیح آبادی ہر سال پابندی سے آم بھیجتے تھے۔ جسے وہ خاندان میں برابر سے تقسیم کیا کرتے۔ ایک مرتبہ بشیر نے مختلف قسم کے آم بھیج دیے۔ جس سے امیر کو تقسیم میں پریشانی ہوئی۔ وہ بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں کہ :

> "مختلف اقسام میں ایک دشواری یہ بھی ہے کہ سب عزیزان خانہ کو ایک قسم، جس کے چند افراد ہوں،

دینا نہیں ہو سکتا اور شکایت رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ ماشاء اللہ کنبہ بڑا ہے۔ دوستوں سے قطع نظر، عزیزوں کو بھی جو چیز بکثرت ہو، وہ پہنچ سکتی ہے اور تنہا، کسب لذت اس شخص سے نہیں ہو سکتا۔ جو ایک قافلے کا خدمت گزار ہو۔"(۲۵۵)

امیر اولاد کی تعلیم کے ساتھ ان کی خوراک اور آرام کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے۔ گویا حد درجہ لاڈ پیار کرتے تھے اور ان کی نازبرداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ امیر کے ایک صاحب زادے بریلی میں انٹر کا امتحان دینے جا رہے تھے۔ امیر ان کی رہائش اور خوراک کے لیے پریشان تھے۔ امیر چاہتے ہیں کہ مسعود احمد کی رہائش تو ہاسٹل میں ہو تاکہ پڑھائی پر توجہ رہے۔ لیکن کھانے کا اہتمام قاضی عبدالجمیل کے ہاں سے ہو جائے چناں چہ ۲۸ ردسمبر ۱۸۹۹ء کے خط میں انھیں بالتفصیل تحریر کرتے ہیں۔ اور توجہ کے طلب گار ہوتے ہیں:

"وہ ضعیب البیان اور اس زمانے میں محنت کی وجہ سے نہایت ناتواں ہو رہا ہے۔ کوئی عنوان اس کی راحت اکل وشرب کا اس سے بہتر نظر نہیں آتا کہ اگرچہ وہ بورڈنگ ہوس میں رہے، مگر باعتبار ماکل و مشارب کے آپ ہی کا مہمان ہو۔ کسی طرح کا تکلف اس کے لیے نہ فرمایا جائے، صرف سالن اور روٹی اور تسحر کے واسطے کھیر یا دودھ میں نان پاؤ ہو۔"(۲۵۶)

اس خط کے بعد بھی امیر مطمئن نہیں ہوتے اور جنوری ۱۹۰۰ء میں بھی پھر تاکید لکھتے ہیں:

"اپنے ناتواں بچوں کے مثل تصور فرما کر، پرہیزی کھانا اپنے آدمی کے ہاتھ اوقات معینہ پر کالج میں بھجوا دیا کریں۔ محل اقامت سے وہ خود آپ کو آگاہ کرے گا۔ زیادہ سوائے منت پزیری کے کیا عرض کیا جائے۔"(۲۵۷)

امیر کی یہ توجہ، شفقت و محبت صرف اہل خانہ اور اولادوں تک محدود نہیں تھیں۔ بلکہ اس کا دائرہ وسیع تھا۔ البتہ نوعیتیں مختلف مختلف تھیں۔ مثلاً وہ دوستوں کی بھی خبرگیری کرتے اور ان کے بچوں کی بھی۔ مثلاً سوزاں، امیر کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے وہ زاہد حسین زاہد کو ۲۸ راگست ۱۸۸۸ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

"حضرت سوزاں کی کیفیت آپ ہی کچھ لکھیے کہ اب مشغلہ کیا ہے اور دلی کا تعلق کیوں ترک ہوا اور آیندہ کیا قصہ ہے۔ آیا وطن ہی میں اقامت، مد نظر ہے۔ یا سفر کا ارادہ ہے اور سفر کا عزم ہے تو کدھر۔"(۲۵۸)

زاہد، سوزاں کے انتقال کی خبر دیتے ہیں، امیر بے حد افسردہ ہوتے اور انھیں لکھتے ہیں:

"حضرت سوزاں مرحوم کی رحلت کا صدمہ، سخت روح فرسا ہوا ہے۔ کیا آدمی تھے۔ خدا بخشے۔ انا اللہ کے سوا، اس کے سوا اس کا مرہم کہاں۔ اللہ تعالیٰ توفیق صبر دے۔ ان کے اعقاب میں، جو ان کا جانشین ہو وہ کون ہے۔ کوئی لائق فرزند ہے یا نہیں، ضرور لکھیے گا۔"(۲۵۹)

کچھ وقت گزرنے کے بعد، امیر پھر ایک خط میں اپنے دوست کے لیے پکار اٹھتے ہیں۔ "ہائے!" میرے سوزاں کے کیا صفات تھے۔

خدا حافظ۔"(۲۶۰) ریاض خیر آبادی کے والد سید طفیل احمد، امیر کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ ان کی طبیعت ناساز تھی، امیر اپنے ایک شاگرد کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ ان کی خیریت سے جلد مطلع کریں کیوں کہ پرانے احباب میں اب ان کا دم باقی رہا ہے۔

"محبی و مکرمی سی د طفیل احمد صاحب کی ناچاقی طبیعت کو طول ہوا ہے۔ ۰۰۰ آپ طبیب ہیں، بہت تفصیل کے ساتھ ان کے حالات سے آگاہی کر کے مجھے اطلاع دیں اور میرے پریشان دل کو اطمینان بخشیں تو میں نہایت ممنون ہوں گا۔ پرانے مہربان دوستوں میں ان کا دم باقی ہے۔"(۲۶۱)

امیر کے ایک اور قدیم دوست، طاہر فرخ آبادی کے بارے میں، حکیم محتشم کے خط سے معلوم ہوا۔ امیر نے انھیں ایک تفصیلی خط میں اپنا احوال لکھا اور تجدید ملاقات پر خوشی کا اظہار کیا:

"مخدومی و محترمی جناب حکیم محتشم علی صاحب کے ذریعے سے مدت دراز کے بعد، آئینۂ رابطہ قدیم کا زنگ چھوٹا اور نئی جلادی گئی۔ یعنی آپ کا عنایت نامہ، جس میں کچھ فقیر کا ذکر ہے ملا، میں نے سوچ کر آپ کی تصویر خیالی، ذہن میں کھینچی اور محبت دیرینہ کا مزا اٹھایا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کر دی ۔"(۲۶۲)

امیر کی دوستوں سے محبت بے غرض تھی۔ البتہ کہیں کہیں وہ حالات سے تنگ آکر دستِ طلب بڑھاتے تھے، لیکن اس میں عزت و وقار کو ضرور ملحوظ رکھتے تھے۔ بلکہ یوں کہا جانا چاہئے تھا کہ غیرت کا عنصر شاملِ حال ہوتا تھا۔ داغ سے امیر کے نہایت دوستانہ تعلقات تھے۔ امیر ان پر روک ٹوک بھی کیا کرتے تھے۔ جس کا داغ برا نہیں مناتے تھے۔ امیر نے ایک مرتبہ انھیں ٹوکا کہ وہ اللہ کی طرف توجہ کم رکھتے ہیں۔ امیر کو احساس ہوا کہ داغ کہیں اس گرفت پر برا نہ مان جائیں۔ چناں چہ انھوں نے فوراً دوسرے خط میں لکھا کہ:

"میں نے اپنی تحریر اولین میں ناصحانہ جو کچھ لکھا، وہ محض دردمندی اور خیر اندیشی سے تھا۔ آپ اس کا برا نہ مانئے گا۔ دل سوز دوست کا جی جب لگتا ہے، تو وہ دلسوزی کی راہ سے دوست کو اس راہ چلنے سے روکتا ہے۔ جو اس کی بدنامی کا باعث ہو۔ یہ زمانہ بہت غنیمت ہے۔ جہاں تک ہو سکے، لوگوں کے ساتھ احسان کیجیے۔ اس سے میرا مقصود اپنے حق میں سعی اور احسان نہیں ہے۔"(۲۶۳)

امیر اپنے احباب کو یاد کرتے، انھیں خط لکھتے، انھیں نصیحتیں کرتے اور ہر ممکن ان کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ شاد عظیم آبادی، عہد امیر کی ایک نامور شخص تھے۔ انھوں نے اپنی تصنیف امیر کو بھیجی۔ امیر نے اپنے خط میں ان کا شکریہ ادا کیا اور اس کی فروخت میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

"ریاست کے ڈائریکٹر مدارس سے ملاقات ہو تو ان سے بھی زور دے کر کہوں، خدا کرے آپ کی سب کتابیں، جو مفید عام ہیں، چھپ کر کام میں آئیں۔"(۲۶۴)

امیر اپنے تلامذہ اور احباب کے علاوہ اپنے معاصرین سے دلی لگاؤ رکھتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی مثال تو داغ سے تعلقات ہیں۔ جس پر باب پنجم میں تفصیلی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ امیر اللہ تسلیم، جلال لکھنوی اور شاد عظیم آبادی سے بھی امیر کے دوستانہ تعلقات تھے۔ داغ، امیر اللہ تسلیم اور شاد عظیم آبادی تو امیر سے علمی مسائل پر تبادلہ خیال بھی کرتے اور اپنے کلام پر دوستانہ انداز میں رائے بھی لیتے۔

ظاہر ہے اس میں امیر کی علمیت سے قطع نظر دوستانہ رویے کا عمل دخل زیادہ تھا۔

اسی وجہ سے امیر کے تعلقات، اپنے احباب، تلامذہ اور معاصرین سے نہایت اچھے تھے۔ وہ ان کی دل جوئی کرتے، اور جو مشورہ ان سے مانگا جاتا وہ نہایت دیانت سے دیا کرتے تھے۔ امیر کے دل میں کھوٹ اور حسد نام کو نہ تھا۔ مزاج میں جو انکساری اور بڑا پن تھا وہ ان کی تحریر میں بھی ملتا ہے۔ بڑا پن ہوتا ہی اس میں ہے جس میں عاجزی، انکساری، شفقت و محبت پائی جائے۔ مولوی مظہر الاسلام دربار دکن میں اپنے دو قصیدے پیش کرنا چاہتے تھے۔ پیش کرنے سے پہلے انھوں نے امیر کی خدمت میں بھیجے اور رائے کے طلب گار ہوئے۔ امیر نے قصیدوں کی بابت نہایت دیانت داری اور فیاضی سے لکھا کہ :

> ''میری رائے یہ ہے کہ اگر اس دربار میں پیش کرنا ہے، تو بہت جی لگا کر شگفتہ قافیوں میں کوئی قصیدہ کہیے اور بہت سے شعر کہہ کر چھانٹ لیجیے۔ یہ قصیدے جو آپ نے بھیجے ہیں بہت ہی روکھے ہیں۔ عذوبت ان میں بالکل نہیں۔ اعلیٰ حضرت نظام عالی خلد اللہ ملکہ، خود سخن شناس و سخن فہم و سخن گو اور سخن آفریں ہیں۔ ان کے دربار کے لیے مختصر ہی کلام سہی مگر بہت اچھا ہونا چاہیے۔ فصیح الملک داغ سا شاعر شیریں زبان، وہاں موجود ہے۔ ایسے ویسے کلام پر وہاں امید قبولیت نہیں۔ یہ بات میں نے فرطِ محبت سے دوستانہ لکھی ہے، برا نہ مانیے گا۔'' (۲۶۵)

جلال لکھنوی امیر کے اہم معاصر تھے، جلال نے اپنے قصیدے بھوپال بھیجے تھے۔ لیکن وہ دربار میں پہنچ نہ سکے۔ تو انھوں نے امیر سے اس سلسلے میں مدد چاہی۔ امیر نے انھیں مشورہ دیا کہ :

> ''اس سرکار میں جب تک کوئی اندرونی ذریعہ نہ ہو، کارروائی کی امید نہیں اور اندرونی ذریعہ اس پر موقوف ہے کہ آدمی برسوں وہاں پڑا رہے اور گوناگوں کوششیں کرتا رہے۔ یہ شرح کشاف، جو میں نے پڑھی، اس کی سچائی میں بال برابر فرق نہیں۔ بااین ہمہ میرے دل پر آپ کی پریشانی کا اثر ایسا پڑا ہے کہ میں ہرگز تدبیر سے غافل نہ رہوں گا۔''(۲۶۶)

امیر کے مزاج میں انصاف پسندی اور دیانت حد درجہ تھی۔ اسی لیے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ ہونے کی تگ و دو کرتے رہتے تھے۔ اہلِ خانہ کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، دوستوں کو یاد کرنا اور انھیں خط لکھنا، دوستوں کی مدد کرنا، اولادوں کی تعلیم کا خاص خیال کرنا، ہمیشہ صائب مشورے دینا، شاگردوں کے خطوط کا جواب دینا، یہاں تک کہ دعائیں دینا بھی وہ اپنی ذمہ داریوں میں شامل کرتے تھے۔ شاگردوں سے شفقت و محبت سے پیش آنا ان کی عادت نہیں، جبلت کا حصہ تھی۔ شاگردوں سے شفقت و محبت کے اظہاریے تو ان کے مکاتیب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک شفقت و محبت کا اظہار بھی ایک عبادت ہے۔ زاہد حسین زاہد کے نام مختلف ادوار میں جو خطوط امیر نے تحریر کیے ہیں۔ اس میں سے تین ملاحظہ کیجیے۔ اور امیر کا باطن دیکھیے۔ مکتوب محررہ ۵؍ نومبر ۱۸۸۸ء :

> ''مکرمی و محبی، سلام مسنون! محبت نامہ آیا، خدا تم کو خوش رکھے کہ مجھ شکستہ حال کی مزاج پرسی کرتے

رہتے ہو۔ میں اس سچی محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اور اپنے پیارے قدردان کے لیے دعا کرتا ہوں۔"(۲۶۷)

مکتوب محررہ ۱۷ رجون ۱۸۹۲ء۔

"پیارے زاہد۔ الٰہی تم ہو اور دونوں جہاں کی لذتیں۔ دنیا میں نامرغوبات سے محفوظ رہو اور عقبیٰ میں نعمات سے محفوظ۔ مدت کے بعد محبت نامہ آیا، میں نے اس کو سینے سے چمٹایا۔ آنکھوں سے لگایا۔"(۲۶۸)

دعائیں تو سب دیتے ہیں۔ لیکن دعاؤں کے جتنے پیرائے ایک ولی اللہ جانتا ہے غالباً دنیا میں دوسرا کوئی اور نہیں جانتا۔ اس لیے کہ ولی اللہ کی دعاؤں میں لفظ خود اللہ سے فریاد کرتے نظر آتے ہیں۔ ولی اللہ کا اظہارِ شفقت و محبت بھی دعا ہی ہوتی ہے۔ زاہد نے عرصہ دراز کے بعد خط لکھ کر امیر کی خیریت دریافت کی تو امیر کھل اٹھے۔ وہ زاہد کو لکھتے ہیں :

"آپ نے مسرت نامہ لکھ کر مجھ کو خوش کیا اور اپنی محبت و عنایت کا منت پذیر بنایا۔ ع

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

آپ کی دل پذیر تحریر، لیاقت کا دفتر ہے۔ قابلیت کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جتنی لیاقت دی ہے۔ اس سے زیادہ سعادت دی ہے اور سعادت سے بھی زیادہ میری محبت دی ہے۔ اور میرے دل کو جو آپ کی محبت دی ہے۔ وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت آپ کو دعائیں دیا کرتا ہوں اور آپ کی یاد سے دل کو تسکین دیتا رہتا ہوں۔"(۲۶۹)

امیر تعریف کرنے میں بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ گویا جو تعریف کا حق رکھتا تھا۔ وہ اس کے سامنے یا پیٹھ پیچھے ضرور تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دامنِ "گل چیں" میں میر مومن حسین صفی کی غزل شائع ہوئی۔ امیر نے جب ممتاز علی آہ کو خط لکھا، تو اس غزل کا ذکر بھی کیا اور تعریف بھی کی :

"میاں ممتاز! میر مومن حسین صفی نے گلچیں میں ایسے اچھوتے مضامین کی غزل کہی ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ بندشیں صاف ہیں اور کوئی مضمون ٹکسال باہر نہیں۔ یہ بیدلی شاعری کا زندہ کرنے والا نیا شاعر نکلا۔ کیا فیضانِ الٰہی ہے۔"(۲۷۰)

امیر کی عادت تھی کہ وہ تلامذہ اور احباب کی کامیابیوں پر خوش ہوتے اور مبارک باد بھیجتے تھے۔ داغ، استاد السلطان ہوئے تو امیر نے انھیں لکھا :

"اخبار گورکھپور میں ریاض نے آپ کا مخاطب مخاطب استاد السلطان ہونا اور سات سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہونا چھاپا، یہ دیکھ کر نہایت مسرور ہوا تھا۔"(۲۷۱)

اسی خط میں امیر کی بے تکلفی اور خلوص ملاحظہ کیجیے :

"ارے یار، استاد السلطان ہونے کی مٹھائی تولا۔ یا استاد یا استاد، برسوں کہا کیا ہے۔ اب جو، وہ وقت آیا تو استاد کی شیرینی ندارد۔"

امیر احباب کو تحفے تحائف پیش کرنے کے بھی شوقین تھے۔ جواباً ان کے دوست اور تلامذہ بھی تحائف بھیجتے تھے۔ جنھیں امیر نہاتخلوص اور احترام سے وصول کرتے اور اس کی تعریف کرتے۔ حافظ غلام احمد فروغی نے امیر کو ایک کتاب تحفتاً بھیجی، امیر اپنے خط میں لکھتے ہیں :

"نصاب کا نسخہ جو تحفۃً آپ نے مرحمت کیا میں نے خوش ہو کر اس کو قبول کیا۔ میں نے دو چار ورق الٹ کر دیکھے۔ کتاب آپ نے بہت اچھی اور مفید لکھی ہے۔ مرزا غالب مرحوم کا 'قادر نامہ' بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ آپ کے یہاں بہت سی باتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ حسن وانجام کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ الفاظ روابط بہت ہی کم آئے ہیں۔ انشاءاللہ یہ کتاب مقبول خاص و عام ہو گی۔"(۲۷۲)

امیر ہمیشہ اچھے اور خوب صورت تحفے بھیجنا پسند کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ اکثر اپنے شاگردوں سے مدد لیا کرتے تھے۔ کسی دوست کو آم تحفے میں بھیجنا تھے۔ تو امیر نے زاہد حسین زاہد کو لکھا کہ :

"مجھے ایک عالی مرتبہ ریاست میں ہدیہ بھیجنے کی ضرورت شدید ہے۔ مجبوراً آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ سہارنپور کے عمدہ اور بڑے آم قابلِ تہدی بقدر مناسب لطف کیجیے۔"(۲۷۳)

ایک مرتبہ امیر سے ان کے کسی دوست نے اناس کا مربہ فرمائش کیا۔ تو امیر نے اس مرتبہ پھر زاہد کو لکھا کہ :

"مجھ کو عمدہ اناس اگر بڑے ہوں تو بیس اور اگر چھوٹے ہوں تو چالیس، مطلوب ہیں۔ ایک عالیشاں امید گاہ کو مربہ تیار کروا کے بطور پیش کش بھیجنا ہیں۔"(۲۷۴)

امیر انتہائی رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ دوسروں کی تکالیف سے افسردہ ہو جاتے۔ دوست احباب کے نقصان کو اپنا نقصان جانتے اور ان کے غم میں برابر کے شریک ہوتے اور انھیں تسلیاں دیتے۔ عابد علی کوثر خیر آبادی کے خط سے پتا چلا کے ان کی بہن کے بچوں نے رحلت کی۔ امیر کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔ وہ لکھتے ہیں :

"آپ کا محبت نامہ آیا۔ واقعہ جگر گداز رحلت برادر زادہ اور برادر زادی سن کر وہ صدمہ اٹھایا کہ اس کو دل ہی جانتا ہے۔ ہائے ان دونوں کی عمریں ابھی کیا تھیں اور دنیا میں آکر انھوں نے ابھی کیا دیکھا تھا۔ میرا ستم رسیدہ دل تو اس تصور سے پاش پاش ہوا جاتا ہے کہ ان کے ماں باپ اور آپ کی کیا حالت ہو گی۔ مگر خدا کی مشیت میں، سوا صبر و شکر کے بندے کو کیا دخل ہے۔"(۲۷۵)

زاہد حسین زاہد کی اہلیہ سخت بیمار تھیں۔ انھوں نے امیر سے دعا کے لیے درخواست کی۔ امیر نے انھیں لکھا کہ :

"خدا سے امید ہے کہ تمھاری خاتون کو صحت ہو جائے گی۔ دعا صحت میں ضرور کروں گا۔ اگر چہ انتہا کا گنہ گار ہوں، مگر گناہوں سے شرمسار ہوں اور ارحم الراحمین سے مغفرت و اجابت دعا کا امیدوار ہوں۔"(۲۷۶)

امیر کی مصروفیات کیسی ہی کیوں نہ ہوں، لیکن وہ احباب کی دل جوئی کے لیے لازماً وقت نکال لیتے تھے۔ داغ کی اہلیہ کا انتقال ہوا، تو امیر نے فوراً انھیں تعزیتی خط لکھا۔ جس کے جواب میں داغ نے لکھا "میرے دل کو تسلی دینے والے سلامت رہو"۔ کوثر خیر آبادی کی بہن کے ہاں چوری ہوئی، تو امیر نے انھیں دلاسہ دیا۔ جلال کے قصیدے بھوپال میں گم ہوگئے تو انھیں تسلی دی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دل جوئی کرنا امیر کے مزاج کا حصہ تھا۔ وہ دنیا والوں کی خوشیوں میں خوش اور غموں میں افسردہ ہوتے اور تسلی دیتے تھے۔ زاہد حسین زاہد کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ امیر نے ایک ہی تاریخ میں دو خطوط تحریر کیے۔ اور زاہد کی دل جوئی میں قرآن واحادیث اور تاریخ سے اہم واقعات درج کیے اور آخر میں یہ مشورہ دیا کہ دوسرا عقد فوراً کرو، تاکہ بچے کی اچھی پرورش ہو جائے اور مرحومہ کا غم بھی جلد کم ہو:

"تمھارے واسطے دعائے توفیق مصابرت مانگتا ہوں اور مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت۔ خدا اس بچے کو جو مرحومہ کی پیاری نشانی ہے، پروان چڑھائے اور اقبال کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے۔ اس جگہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ مرحومہ کا نعم البدل کیسے ہو سکتا ہے۔ جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہا جب اپنے شوہر ابو سلمہ کی رحلت سے بیوہ ہو گئیں تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے وقت یاد آیا کہ حضرت رسول مقبول ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو کوئی کسی چیز کے فوت ہو جانے پر یہ آیت ترجیع پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کو نعم البدل عطا فرماتا ہے۔ اس خیال سے پڑھتی تو تھیں مگر یہ خطرہ دل میں گزرتا تھا کہ میرے شوہر کا نعم البدل کیا ہو سکتا ہے۔ جب حضرت ﷺ کے عقد میں آئیں تو سمجھیں کہ حق تعالیٰ نے کیسا نعم البدل عطا فرمایا۔ جو خلاصہ کائنات ہے۔ اس بیان سے میرا مقصود یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت تمھارے نفس پر شاق ہوگا۔ مگر اے میری جان سراپا اوصاف زاہد! ابھی سے دوسرے عقد کی فکر کر، تو نام خدا ابھی جوان ہے۔ تیرا بچہ معصوم نادان ہے۔ اس کی پرورش میں جیسی کوشش چاہیے ویسی تنہائی میں دشوار ہوگی اور اسی حیلے سے مرحومہ کا غم بہت جلد کم ہو جائے گا۔ میرے دل نے نہ مانا میں نے نیک نیتی سے یہ نصیحت کر دی۔" (۲۷۷)

امیر دوسرے تعزیتی خط میں ایک اور پیرائے میں، زاہد کی دل جوئی کرتے ہیں:

"پیارے زاہد! عقل کو خواہش پر ترجیح دینا اور دائرہ اتباع شریعت سے قدم باہر نہ نکالنا، صبر کی حقیقت ہے۔ آنسوؤں سے رونے کا کچھ مضائقہ نہیں۔ گریہ چشم رحمت ہے۔ مگر اس کا مقصد نہ کرنا کہ طبیعت صبر واستقلال کی طرف متوجہ ہو۔ صبر ورضا کی مخالفت ہے۔ روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے مناجات میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ الٰہی کون سا بندہ تیرے نزدیک محبوب ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ جس بندے سے میں اس کی محبوب شے لے لوں اور وہ میری محبت کی وجہ سے برا نہ مانے۔" (۲۷۸)

امیر کی دل جوئی اور بار بار تاکید کی وجہ سے زاہد حسین زاہد نے دوسرا نکاح کر لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر کو دل جوئی کا ہنر آتا تھا۔ یا یہ

کہ ان کے ادا کیے گئے لفظوں میں اتنا خلوص ہوتا کہ وہ دل کو موم اور دماغ کو شفاف کر دیتا تھا۔ امیر کو تعزیت نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔ وہ محض لفظوں کے الٹ پھیر سے کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ان کے سامنے یہ کثرت احادیث مبارکہ اور قرآنی واقعات موجود تھے، وہ اپنے ممدوح کی ذہنی سطح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مواد کا انتخاب کرتے اور صدمے کا اندازہ کر کے زبان وبیان اختیار کرتے۔ کیوں کہ امیر نے خود بہت صدمے اٹھائے تھے اس لیے وہ دوسروں کے غموں کا اندازہ کر لیتے تھے۔ امیر کے زخموں پر مرہم رکھنے والے شاید کم تھے۔ یہ احساس بھی بڑا گہرا ہوتا ہے۔ چناں چہ امیر جب دوسروں سے تعزیت کر رہے ہوتے تو گویا اپنا کیتھارس کر رہے ہوتے تھے۔

امیر مردم شناس تو نہ تھے۔ لیکن نیک، قابل اور محنتی انسان کی قدر کرتے تھے۔ اور ایسے لوگوں کے بارے میں باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ امیر نے جب دفتر "امیر للغات" قائم کیا، تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قابل لوگوں کو دفتر میں رکھا اور ان کی نازبرداری کی۔ اسی طرح جب بیرونی معاونین کی ضرورت پیش آئی تو محمد احمد اور خود شہر شہر پھرے اور قابل لوگوں کو لغت کی تالیف کے لیے منتخب کیا۔ جب کسی اہل علم کے بارے میں پتا چلتا تو کسی نہ کسی ذریعے سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ یہ امیر کا عجیب وغریب شوق تھا۔ کہ گردن تک مسائل میں الجھا ہوا شخص نیک لوگوں کے بارے میں سن کر خوش ہوتا اور وہ شخص اگر پریشان ہوتا تو خود افسردہ ہوتے اس کے حق میں دعا کرتے۔ اسی طرح کے ایک صاحب منشی نظام الدین تھے۔ جو نہایت قابل انسان تھے۔ لیکن اب ان کی قدر نہیں تھی۔ برہم کو لکھتے ہیں :

> "منشی نظام الدین صاحب، نظام کی لیاقت سے میں خوبی آگاہ ہوں۔ افسوس کہ بڑی ناقدردانی کے وقت میں وہ پیدا ہوئے اور بہت خراب مقام پر ان کا قیام ہے۔ خدا ان کو کہیں اچھی جگہ پہنچا دے۔" (۲۷۹)

امیر، منشی نظام الدین کی لیاقت سے آگاہ تھے۔ اور ان کی ناقدری پر افسردہ تھے۔ ایک اور خط میں برہم کے ذمہ یہ کام لگاتے ہیں کہ ان کی صفاتِ انسانی کے بارے میں نہایت سچی اور تحقیق سے ثابت باتیں تحریر کریں۔ غالباً امیر انھیں بھی "دفتر امیر اللغات" لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

> "منشی نظام الدین صاحب کی تنگ حالی سے بہت دل دکھا۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ ان کی صفاتِ انسانی کا کیا حال ہے۔ کبھی لکھیئے گا۔ مگر نہایت راستی کے ساتھ، تحقیقی باتیں، جو قابل اعتماد کامل ہوں۔" (۲۸۰)

امیر کے دل میں، اہل علم کی جو قدر تھی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ حسد نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک سچے عالم تھے اور علمیت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ حسد کو کبھی سر اٹھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ معاصرین کی کامیابیوں پر بھی خوش ہوتے اور شاگردوں کی ترقی پر تو جھوم ہی جاتے۔ "گچھیں" کے لیے داغ اور جلال کے علاوہ جلیل، آہ اور ریاض نے غزلیں بھیجیں، لیکن امیر مصروفیات کے باعث اپنی غزل پر زیادہ محنت نہ کر سکے۔ اس کا انھیں احساس بھی تھا۔ لیکن کوثر کے پوچھنے پر وہ رقم طراز ہیں کہ :

> "مجھے بڑی خوشی یہ ہے کہ گو میری غزل ست ہے۔ مگر میرے عزیزوں دوستوں کی غزلیں تو اچھی نکلیں گی۔ جلیل و آہ نے بہت اچھے اچھے شعر کہے ہیں اور آپ نے تو دریا بہا دیے ہیں۔ ریاض نے بھی ایک غزل بھیجی تھی۔" (۲۸۱)

امیر شکوہ و شکایت کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ لیکن امیر کی شکوہ نگاری کی یہ خوبی ہے کہ وہ حد سے نہیں گزرتے۔ کوئی عامیانہ لفظ ادا نہیں کرتے، ان کے ہاں شکوہ و شکایت کا انداز بھی دوست کا دامن پکڑے ہوئے نظر آتا ہے۔ شاگرد کیسی ہی بڑی غلطی کرے وہ جذباتی نہیں ہوتے، منشی امتیاز احمد خاں راز کو امیر نے ایک سفارشی خط نواب شاہجہاں بیگم میں پیش کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ جس کا جواب انھوں نے نہیں دیا۔ امیر ان سے شکایت کرتے ہیں :

"یہ شکایت نامہ دیکھ کر منتظروں پر ترس کھاؤ ••• تم سے بھی شکایت ہے کہ کیسا ضروری خط بھیجا مگر جواب ندارد۔ میرے عجز کی حالت اس بے پروائی کو مقتضی نہیں۔" (۲۸۲)

امیر کا شکایتی انداز مکالماتی ہے۔ جیسے سامنے بیٹھا کر ڈانٹ ڈپٹ کی جارہی ہو۔ اور اس کے بعد پھر روز مرہ کے مسائل پر گفتگو شروع ہو جائے گی۔ مولوی محمد اعجاز نے عرصہ دراز کے بعد خط تحریر کیا تو امیر کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا :

"اگر اپنا بوڑھا دعاگو سمجھ کر کبھی کبھی پوچھتے رہو تو تمھاری محبت و سعادت ہے۔ ورنہ کیا شکایت ہے۔ ••• میں صرف تم لوگوں کے تصور سے اپنے دل کو خوش کر لیا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ زندہ اور خوش رکھے۔" (۲۸۳)

شاداب رسول پوری بھی امیر سے رابطے میں نہیں رہے تھے۔ امیر نے کئی بار انھیں خط لکھا، جواب نہیں آیا، پھر رجسٹری کیا، پھر بھی جواب نہیں آیا، تو پھر امیر نے حقِ استادی استعمال کرتے ہوئے، سخت لب و لہجہ اپنایا۔ لیکن سختی میں بھی، امیر کا فطری عاجزی رنگ نمایاں ہے :

"ایک مدت سے آپ نے مخلص نوازی کے خلاف یہ شیوہ تغافل شعاری اختیار کیا ہے کہ جب تک آرزو مندانِ اخلاق منش اچھی طرح تڑپ نہ لیں، تب تک ان کی طرف التفات ہوتا ہی نہیں، ہر نامہ نیاز کا بصیغہ رجسٹری روانہ کرنا تکلف سے خالی نہیں اور بغیر اس کے جواب لطف نہیں ہوتا، برائے خدا یہ رنگ اب بدل دیجیے اور بوضع قدیم مہربانی فرمایا کیجیے۔" (۲۸۴)

امیر کے لاڈلے شاگرد، ممتاز علی آہ رخصت لے کر اپنے گھر گئے تھے، وہاں سے ان کی خیریت کا کوئی خط نہیں آیا اور نہ وہ خود وقتِ مقررہ پر پہنچے۔ امیر نے کئی خطوط لکھے، لیکن ممتاز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو امیر ایک خط میں ان پر برس پڑے، امیر کو زیادہ افسوس اس بات کا ہوا کہ ممتاز نے وہ رنگ ڈھنگ چھوڑ دیے، جو امیر کے پسندیدہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود امیر، شکایت کرتے ہوئے اعتدال میں نظر آتے ہیں اور ان کے شکوے میں دبا دبا سا ایسا پیار جھلکتا ہے، جو اولاد کے لیے مخصوص ہے :

"میں نے جو تم کو یہاں آنے کے لیے لکھا، اسی کی تم نے سزا دی کہ اب تک جواب نہ دیا۔ اس سے اگر یہ مقصود ہو کہ میں مایوس ہو کر تمھارے ملنے سے صبر کر لوں اور اب اس باب میں کچھ کہوں سنوں نہیں، تو یہ مجھ سے اور میرے دل سے دشوار محال ہے۔ یہ جبھی ہو سکتا جب مجھے بھی تمھارا سا دل ملا ہوتا۔ تم نے جو تیل کی طلب میں کارڈ لکھا وہ ایسا خشک اور روکھا تھا کہ کہیں سے اس کی بو نہ پائی گئی کہ تم وہی ہو، جو یہاں مدتوں رہے ہو اور میری طبیعت سے آگاہ ہو اور کوئی ہوتا تو اس کی جگہ کچھ کہتا مگر

میں بھی کہتا ہوں کہ :

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست۔" (۲۸۵)

زاہد حسین زاہد جب ضرورت ہوتی تو خط لکھا کرتے تھے۔ امیر کی حالات یہ تھی کہ مسائل نے انھیں ادھ موا کر دیا تھا، ایسے میں اگر کسی کا خط آتا اور وہ امیر سے خیریت دریافت کر لیتا، تو امیر کے لیے ایسا خط ہوا کا تازہ جھونکا ہوتا، ورنہ امیر شدید گھٹن کا شکار ہو جاتے تھے یہی زاہد حسین زاہد کے نام خط میں بھی نظر آتی ہے :

"مجھے آپ کی قابلیت وسعادت مندی سے آپ کے ساتھ ایک ایسا علاقہ معنوی ہے کہ ہمیشہ داعی خیر اور آرزومند اور اک حالات خیریت آیات رہتا ہوں۔ آپ کو بھی میری تکلیف کا خیال رکھنا چاہیے بلا ضرورت بھی خط لکھ بھیجا کیجیے۔" (۲۸۶)

امیر احباب سے جی اور جان سے محبت کیا کرتے تھے۔ اور توقع رکھتے تھے کہ ان کی محبت کا جواب اسی طرح دیا جائے گا۔ لیکن جس تواتر سے امیر خط لکھا کرتے تھے۔ ان کے احباب عدم مصروفیت کے باعث ان کے ساتھ نہیں چل پاتے تھے۔ زاہد حسین زاہد کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا، امیر ہی کی بار بار توجہ سے انھوں نے دوسرا نکاح کیا۔ اس کے بعد ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ تو امیر نے ایک شکایتی خط انھیں تحریر کیا :

"پیارے زاہد! خدا کرے تم خوش ہو، خیریت سے ہو، غم غلط ہو گیا ہو، مصروف عیش و طرب ہو اور یہی مصروفی میری طرف کم توجہی کا سبب ہو، تم نے مجھ کو بھلا دیا مگر میں تم کو دعائے خیر کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ مدت ہو گئی کہ اوراکِ خیریت کو ترستا ہوں اور تڑپتا ہوں، معلوم نہیں کہ تم کو اس ترسانے اور تڑپانے میں کیا مزا ملتا ہے۔ ... میں انتظار کرتے کرتے تنگ آگیا اور ابھی معلوم نہیں کہ اس سلسلے کا خاتمہ کیا ہو گا۔" (۲۸۷)

امیر ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ان کے دل میں ہوتا، وہی زبان اور نوک قلم پر ہوتا، وہ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے اور احباب سے تعلقات کے معاملے میں ہر بات صاف اور عیاں رکھنے کے قائل تھے۔ مذکورہ اقتباسات وہ ہیں جن میں امیر کا شکایتی انداز سامنے آیا ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امیر دل کے صاف تھے۔ یہی ان کا بڑا پن اور یہی سچی دوستی کا آئینہ دار بھی ہے۔ انسان کی سچی محبت کا اندازہ شکوے اور شکایت اور غصے کی حالت میں ہی کیا جاتا ہے۔ امیر کی ناراضگی وقتی اور جزوی ہوتی تھی۔ ان کے شکوے اور شکایت میں دامن چھڑانے کا جذبہ ہرگز نہیں ملتا۔

امیر کی شکوہ نگاری بڑی دل چسپ ہے۔ اس میں بے تکلفی کے ساتھ اظہارِ محبت کا جذبہ بھی ملتا ہے۔ جتنی شکایت ہوتی ہے اتنی ہی ملتی ہے۔ گذشتہ شکایت کا کوئی حوالہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امیر اپنے بڑے پن کا فائدہ اٹھاتے تھے۔ شکوہ شکایت تو اظہارِ عقیدت و محبت کا ایک بہانہ تھا۔ اسی حوالے سے شکوہ و شکایت کا ایک اور نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ یہ حبیب الرحمن خاں سے تعلق رکھتا ہے۔ شروانی نے سات سال بعد، امیر کو خط لکھا، امیر انھیں شرمندہ بھی کر رہے اور اور شرمندہ بھی ہو رہے ہیں اور سات سال کیسے گزرے اس پر بھی روشنی ڈال رہے ہیں۔ امیر کے مکتوبات میں جذبات نگاری کی چند ہی مثالیں ملتی ہیں۔ انھی میں سے یہ ایک ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

امیر، احباب کو دل سے کبھی نہیں بھلاتے، وہ اپنے خلوص اور اپنی التجاؤں کو لفظوں کا لبادہ پہنانے میں بھی ماہر ہیں اور دوستوں کے دل میں گھر کرنے کے ہنر سے بھی آشنا ہیں۔ ملاحظہ کیجیے حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خط کا یہ اقتباس :

"آپ سات برس کے بعد چوکنے پر اظہارِ ندامت فرماتے ہیں۔ وائے بر حال اس غفلت کی نیند سونے والے کے، جس کی عمر قریب ستر برس کے ہوئی اور وہ ایسی غفلت کی نیند سو رہا ہے کہ کروٹ ہی نہیں لیتا، وہ غافل کون ہے، سراپا تقصیر فقیر امیر، جس کی موت کا وقت قریب آیا اور وہ روز بروز اپنے مولا سے دور ہوتا جاتا ہے۔ اس کو توبہ دانابت کا خیال آتا ہے۔ تو اس طرح جیسے خواب میں کسی سرمست خواب کو کوئی لہر سے آجائے اور آنکھ کھلتے ہی اسے یہ بھی یاد نہ آئے کہ کچھ دیکھا تھا۔ اسے سراپا تقصیر سے معذرت خواہ ہونا اور بھی اس کو منفعل کرتا ہے۔ میں اپنی کوتاہ قلمی سے خجل ہوں آپ کی عذر خواہی اور بھی مجھے نادم کر رہی ہے۔ میری کوتاہ قلمی کی علت شدائد امراض عسر بول و حبس بول ہیں۔"(۲۸۸)

امیر جس طرح شکایت کرنے سے نہیں چوکتے، اسی طرح ان کی عادت تھی کہ فوراً اپنی غلطیاں تسلیم کر لیتے تھے۔ شاگرد، امیر سے کوئی فرمائش کرتے، اصلاح کے لیے کلام بھیجتے، خط میں کوئی مسئلہ پوچھتے اور اپنی مصروفیات یا بیماریوں کے سبب سے۔ فرمائش پوری نہیں کر پاتے یا کلام پر اصلاح میں تاخیر ہوتی یا یہ کہ خط کا جواب نہیں دے پاتے تو فوراً خط لکھ کر معذرت کرتے، اور اس طرح کرتے کہ لگتا امیر احباب یا شاگردوں کے قدموں کو چھو رہے ہیں۔ زاہد حسین زاہد نے اپنی غزل اصلاح کے لیے ارسال کی، لیکن وہاں "امیر اللغات" کے دفتر میں گم ہو گئی، امیر بہت پریشان ہوئے۔ کئی بار سوچا کہ زاہد کو مطلع کیا جائے۔ لیکن ہمت نہ ہوئی۔ بالآخر معذرت نامہ تحریر کیا :

"پیارے زاہد، میں تم سے اس قدر محجوب ہوں کہ کئی دن سے تم کو خط لکھنے کا قصد کرتا تھا، مگر ندامت کسی طرح اجازت نہ دیتی تھی۔ اس اتفاق کو میں نہایت ہی افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ تمھاری غزل مثلِ جام شراب کھو گئی۔ ۰۰۰ افسوس صد افسوس میں نے کوئی دقیقہ تلاش کا اٹھا نہیں رکھا، مگر غزل نہ ملنا تھی نہ ملی۔ اب نہایت ہی قلق اور ندامت کے عالم میں تم کو یہ کارڈ اس لیے لکھتا ہوں کہ تم مسودے کو بخوبی تلاش کرو۔ ۰۰۰ رات میں کئی بار یہ غزل مجھے یاد آتی ہے اور گھنٹوں قلق رہتا ہے۔"(۲۸۹)

زاہد نے اس خط کا جواب نہیں لکھا۔ امیر نے ۱۴ر دسمبر ۱۸۹۲ء کو پھر ایک خط لکھا اور اپنی اس تشویش کا اظہار کیا کہ : "کیا باوجود کمال معذرت اور اظہارِ ندامت کے تم مجھ سے اس قدر خفا ہو گئے ہو کہ مجھے خط لکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔"(۲۹۰) اس کے بعد زاہد کا خط آیا، جس سے پتا چلا کہ وہ شدید بیمار تھے۔ امیر نے ۷ر ۲ر جنوری ۱۸۹۳ء کو خط لکھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر کو اب اطمینان ہو گیا کہ زاہد ناراض نہیں ہیں۔ "میں کہتا ہی تھا کہ زاہد سا محبّ دیرینہ میرے خطوط کا جواب نہ لکھے۔ اس کے کیا معنی۔ ہو نہ ہو کوئی مانع قوی ضرور ہے۔"(۲۹۱)

امیر کی معذرت نگاری میں عاجزی، انکساری، انسیت و محبت اس درجہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے ممدوح کے برابر آجاتے تھے۔اس کے علاوہ اختصار کا خیال رکھتے تھے۔سادگی کے ساتھ چند جملوں میں معذرت کر لیتے یا شرمندگی کی وجہ جو اصلیت سے خالی نہ ہوتی بیان کر دیتے تھے۔امیر کی یہ خوبی تھی کہ دوستوں اور شاگردوں کے سامنے خود کو چھوٹا کر کے پیش کرتے۔خط کے آخر میں اکثر "امیر فقیر" یا "امیر حقیر فقیر" تحریر کرتے تھے۔احسن اللہ ثاقب کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ :

"فقیر نواز کہوں یا امیر نواز کہوں، امیر نواز کہنے میں آپ کی ترقی مراتب تو ہے، مگر اپنی نسبت امارت کی اضافی خود نمائی ہے اور وہ بھی جھوٹی، خود نمائی اس لیے کہ برائے نام امیر ہوں اور در حقیقت فقیر ہوں۔"(۲۹۲)

حقیقت یہ ہے کہ امیر کی معذرت نگاری ان کے مزاج کے مطابق ہے۔ مثلاً نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں : "میں آپ کے اخلاق کا جس قدر شکر گزار ہوں۔اس سے کئی حصے زیادہ اپنے مقصودِ خدمت گزاری سے شرمسار ہوں۔"(۲۹۳) زاہد کو لکھتے ہیں : "میں بہ سبب ہجومِ مکارہ کے اپنی کم خدمتی سے منفعل رہتا ہوں۔ آپ سے عفو کی امید ہے۔"(۲۹۴) ایک اور خط میں معذرت اس طرح ملتی ہے :

"بحمد اللہ کہ میں زندہ ہوں، مگر اس زندگی سے جس میں احباب کی خدمت نہ کر سکوں، شرمندہ ہوں، ہمیشہ عفو تقصیر کا خواستگار اور دعائے حسنِ انجام کا امیدوار رہتا ہوں۔"(۲۹۵)

امیر کے مزاج میں عاجزی رچی بسی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ شاگردوں کو کبھی یہ نہیں کہتے تھے کہ "میرے شاگرد ہیں۔بلکہ یہ کہتے تھے کہ میرے احباب میں ہیں"۔(۲۹۶) احسن اللہ ثاقب نے امیر سے تذکرہ "انتخاب یادگار" کی فرمائش کی امیر نے انھیں لکھا کہ "میں اپنی تالیفات کو اس قابل نہیں جانتا کہ ہدیہ احباب کروں۔ ...اب جو آپ نے یاد فرمایا، تو ضرور ہوا کہ ایک نسخہ بھیجوں۔"(۲۹۷) احسن اللہ ثاقب نے اس تذکرے کی تعریف لکھی، تو امیر رقم طراز ہوئے : "بندہ پرور اس تذکرے میں اگر کچھ محاسن ہوں تو ان کو آپ سے ہنر بیں جانیں۔"(۲۹۸) جلیل مانکپوری، سوانح امیر میں لکھتے ہیں کہ :

"جب کوئی ان کے کمال کی تعریف کرتا تو یہ کہتے کہ :

عالم ہمہ مُردہ زنا ما وماہیچ

اور کبھی یہ کہتے تھے کہ : جب کامل اٹھ جاتے ہیں تو ناقص ہی کو لوگ کامل کہنے لگتے ہیں۔"(۲۹۹)

جلیل کے بیان کی تصدیق امیر کے ایک خط بنام داغ سے ہوتی ہے۔امیر نے خانسامہ ابراہم کے توسط سے نظام دکن کو سہرے بھیجے تھے۔داغ تو دکن ہی میں تھے۔دونوں ہی کے کہے ہوئے سہرے دربار میں پیش ہوئے۔لیکن امیر داغ کو لکھتے ہیں کہ :

"اس کی امید کہاں کہ آپ کے سہرے کے سامنے میرے سہروں کے شعر نظر کیا اثر میں جچے ہوں۔"(۳۰۰)

امیر کی عاجزی ہی کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ ہمیشہ امور کی انجام دہی میں احباب کے مشورے ضرور شامل کرتے تھے۔بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہو یا صحت کا، سفر درپیش ہو یا قرض لینا ہو، لغت کی بحث ہو یا کتابوں کی طباعت، امیر احباب کی مشاورت سے کام کرتے تھے۔اس

کی وجہ یہ تھی کہ امیر اپنے احباب پر بہت اعتبار کیا کرتے تھے۔ آہ لکھتے ہیں کہ : "حضرت احباب پر بھروسا رکھتے اور ان کا بہت اعتبار کرتے تھے۔"(۳۰۱) یہی وجہ تھی کہ "امیر اللغات" کی تالیف میں بھی امیر نے مشاورت کا نظام قائم کیا تھا، جو رائے صائب ہوتی اسے قبول کر لیا کرتے تھے۔ امیر نے نمونہ "امیر اللغات" شائع کر کے فضلاء کو بھیجا تھا تاکہ وہ رائے دیں۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے سب سے پہلے اپنی تجاویز ارسال کیں، امیر نے جواباً لکھا کہ "اہل امرائے کی رائیں کمیٹی میں پیش ہو کر ردو قبول کا فیصلہ ہو گا۔"(۳۰۲) اسی طرح 'امیر اللغات" میں شانِ مثل کے بارے میں "احباب کی رائے یہ ہوتی کہ اسے ترک کر دیا جائے۔"(۳۰۳) امیر نے اسے کسی حد تک قبول کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ :

"جس حکایت میں خلاف عقل وعادت کوئی بات نہ ہو وہ ضرور لکھی جائے۔ میرا گمان ہے کہ مانعیں بھی وہی لوگ اکثر ہیں۔ جو نیچر کے خلاف امور پر معترض ہیں۔"(۳۰۴)

امیر دلیل کے ساتھ مشورہ قبول کرتے تھے۔ زاہد نے "امیر اللغات" کا مطالعہ کرنے کے بعد امیر کو خط تحریر کیا اور اس میں یہ اعتراض کیا کہ لغت میں انگریزی الفاظ کم ہیں۔ امیر نے مشیروں کے فیصلے سے انھیں آگاہ کیا کہ ایسا کیوں ہے :

"تم نے جو انگریزی الفاظ 'امیر اللغات' میں کم پائے اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیٹی میں باتفاق یہ رائے قرار پائی کہ 'امیر اللغات' میں وہی الفاظ انگریزی کے داخل کیے جائیں، جن کی جگہ اردو میں کوئی فصیح مختصر اور ٹھیک انھی معنوں میں لفظ موجود نہیں۔"(۳۰۵)

امیر کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ یہ طے ہو جاتا کہ امور کی انجام دہی کا فیصلہ کمیٹی کرے گی، تو پھر وہ کمیٹی پر اثر انداز نہیں ہوتے اور نظم و ضبط کی پابندی کرتے تھے۔ اپنی جو بھی رائے ہوتی وہ کمیٹی میں پیش کرتے اور بحث و مباحثے کے بعد جو بھی فیصلہ ہوتا اسے قبول کرتے۔ زاہد کو امیر نے اردو زبان کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی ہدایت کی تھی۔ انھوں نے امیر کی ہدایت کے مطابق لوازمہ جمع کر کے ارسال کیا، تو امیر نے انھیں اس لوازمے سے متعلق لکھا کہ :

"اردو کی تحقیق میں جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ اس پر اچھی طرح نظر کروں تو اس کے بعد جواب لکھوں۔ ...آپ کی تحریر کے ہر جزیئے کو تدقیقِ نظر سے دیکھوں اور صاحبانِ رائے موجود دفتر سے بھی بحث کر کے رائے لوں۔"(۳۰۶)

امیر کا مشاورت کی بابت ایک اصول یہ بھی سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی عزیز یا دوست مدد کرتا یا رائے دیتا اور وہ رائے مناسب ہوتی تو اسے قبول کرنے میں حیل و حجت سے کام نہیں لیتے بلکہ صاحبِ مشورہ کے شکر گزار ہوتے۔ زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں :

"اب اپنی ہی رائے سے کام لیتا ہوں اور جو عزیز یا دوست میری مدد کرتا ہے۔ اور اپنی کوئی صائب رائے ظاہر کرتا ہے اس کا شکر گزار ہوتا ہوں اور اس کی رائے ماننے نہ ماننے میں ہٹ دھرمی نہیں کرتا۔"(۳۰۷)

امیر ایک محتاط محقق تھے۔ جس طرح وہ دیئے گئے مشورے کو دیانت کی بنیاد پر قبول کرتے۔ اسی طرح لغت کے لیے جو لوازمہ انھیں

چاہیے، آپ کہیں نہیں یوں درست ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شاید آپ جو تصرف کریں، اس تصرف سے بہتر ہو، جو میرے خیال میں آئے ہیں۔ دو ایک جگہ اپنے خیال کے موافق نسخہ لکھ دوں گا، آپ کو اختیار ہے۔ چاہیے وہی رکھئے گا۔ چاہے اور طرح بنا لیجیے گا۔" (۳۱۳)

ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ امیر کی : "طبیعت انصاف پسند تھی اور امر حق کے ہمیشہ طرف دار رہتے۔" (۳۱۴) امیر کی طبیعت میں انصاف پسندی اس لیے بھی تھی کہ ان میں انانیت نہیں تھی۔ اور دوسری بڑی شان ان کے مزاج میں یہ تھی کہ غرور اور تکبر نہیں تھا۔ اس لیے ان کا رویہ چاہے نواب یوسف ناظم ہوں یا کلب علی خاں یا زاہد حسین زاہد شاگرد رشید سب کے ساتھ یکساں تھا۔ وہ اللہ کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتے تھے۔ لیکن ادب اور احترام چھوٹے بڑے سب کا کیا کرتے تھے۔ زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں :

"دعاے خیر کا طالب ہوں، آپ بنی فاطمہ ہیں، ضرور دعا کیجیے کہ اللہ مجھ سیاہ کار کا خاتمہ خیر کر دے۔" (۳۱۵)

امیر اپنے اس اصول کے تحت زندگی گزارتے اور دوسروں کو بھی مشورہ دیتے کہ :

"محسود ہونا سرمایہ ناز و فخر ہے۔ حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے۔" (۳۱۶)

امیر کے مزاج کا ایک اور نمایاں وصف خود داری ہے۔ وہ نہ کسی کو تکلیف دینے کے روادار تھے اور نہ کسی کا احسان لینے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمیشہ احسان کرنے میں پہل کرتے اور دوسروں کو بھی احسان میں پہل کرنے پر متوجہ کرتے۔ اگر قریبی احباب میں سے کسی سے مدد لیتے تو کوشش کرتے کہ یہ احسان جلد اتر جائے۔ امیر نے رام پور کے بعد کچھ عرصہ لکھنؤ میں گزارا وہ نہایت تکلیف دہ تھا۔ (اس کی تفصیل اس باب کے ابتدائی حصے میں مندرج ہے)۔ مالی مسائل نے امیر کی کمر توڑ دی تھی۔ قرض میں بری طرح پھنس گئے تھے۔ ان حالات میں ان کے ایک دوست مولوی مظہر الاسلام نے ان کی مدد کرنا چاہی، لیکن امیر نے اسے سختی کے ساتھ یہ کہہ کر رد کر دیا کہ :

"میں تمام عمر اپنے ملاقاتیوں کا نزدیک و دور خدمت گزار ہوں۔ گو آج زمانہ مخالف ہے مگر غیرت کا تقاضہ جو بھی ہے۔ ۔۔۔ ایسے مخالف روزگار میں بھی کسی کا احسان گوارا نہیں۔ بہتر ے تلامذہ بہ مقدور سلوک چاہتے ہیں اور پسند نہیں آتا اور اگر کبھی بہ اکراہ قبول بھی کر لیا جاتا ہے، تو اس قصد سے کہ انشا اللہ مساعدتِ وقت کے وقت حسابِ دوستاں در دل کے طور پر تلافی کی جائے گی۔" (۳۱۷)

امیر نے بڑے سلیقے سے زندگی گزاری، اس میں نظم و ضبط، عاجزی و انکساری اور خود داری نے ان کا بھرم ہمیشہ قائم رکھا۔ وہ لوگوں کی نظر میں ایک صاحبِ حیثیت انسان مشہور تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ریاست سے خاص تعلق اور نواب کا استاد ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی، لیکن امیر کی جو حالت تھی وہ اللہ کو معلوم تھی یا پھر قریبی احباب کو۔ امیر کی پوری کوشش تھی کہ یہ بھرم قائم رہے۔ چناں چہ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ "امیر اللغات" کا تیسرا حصہ بالکل تیار تھا۔ اس کی اشاعت کے لیے رقم نہیں تھی۔ احباب نے مشورہ دیا کہ لغت کی فروخت کے لیے پیشگی قیمت حاصل کرنے کے لیے اشتہار دیا جائے، تاکہ یہ محنت صوارت ہو۔ لیکن امیر کی وضع داری اور خود داری نے یہ قبول نہیں کیا۔ اس سے

موصول ہوتا، وہ اسے بھی تحقیقی اصولوں پر پرکھتے تھے۔ زاہد حسین نے لغت سے متعلق لوازمہ ارسال کیا، لیکن انھوں نے ماخذات کی صراحت نہیں کی۔ چناں چہ امیر نے انھیں فوراً لکھا کہ :

"تم نے بعض بعض الفاظ کے نوٹ لکھے ہیں اور مثلوں کی شان لکھی ہے۔ ان کا مآخذ معلوم ہونا چاہیے کہ : کہاں سے اور کس کتاب سے لیے گئے ہیں ۔۰۰۰ غالب ہے کہ تم نے اس کا خیال کرلیا ہوگا۔" (۳۰۸)

امیر نے تقریباً دو ماہ بعد پھر اسی موضوع پر زاہد کو خط لکھا اور انھیں یاد دہانی کرائی :

"میں نے ایک ضروری خط آپ کو لکھا تھا۔ اس میں دریافت کیا تھا کہ آپ نے تاریخی حالات جو لغت کے متعلق لکھ کر بھیجے ہیں۔ وہ کس کتاب سے لیے ہیں، مگر آپ نے جواب نہ دیا۔ مجھے اس کا انتظار ہے۔" (۳۰۹)

امیر زندگی کے ہر پہلو پر غور و فکر کے عادی تھے۔ اسی لیے ان کے مزاج میں احتیاط پسندی تھی۔ لغت کا معاملہ ہو یا کسی شخص کا، امیر سچ اور حقیقت پر ایمان رکھتے تھے۔ منشی نظام الدین کے بارے میں جاننا چاہتے تھے، تو تاکیداً، بر ہم کو لکھا کہ : ان کی صفاتِ انسانی کا کیا حال ہے، کبھی لکھیے گا، مگر نہایت راستی کے ساتھ۔ تحقیقی باتیں، جو قابلِ اعتمادِ کامل ہوں۔" (۳۱۰) اسی طرح میر مجاور کو بھی نواب کلب علی خاں کے طبیعت کے لیے تاکیداً لکھا تھا۔ اس لیے کہ : "نواب صاحب کی طبیعت کے بارے میں تو معلوم تو ہو گیا تھا، مگر جس سے معلوم ہوا وہ "مجملہ عوام تھا۔" (۳۱۱)

امیر خود بھی احتیاط پسند تھے اور شاگردوں کو بھی اس کی تاکید کرتے تھے۔ وہ ایسے الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کرتے تھے، جو التباس سے خالی نہ ہو۔ قاضی محمد خلیل کو لکھتے ہیں کہ : ساعت اور گھڑی، ساعت کے قافیے میں احتیاط تو مقتضی اس کی ہے کہ شاعر بلا ضرورت شدید وہم و التباس سے بھی بچے۔" (۳۱۲)

امیر نیک طینت تھے۔ کسی کو برا نہ کہتے نہ لکھتے۔ وہ اپنے خطوط میں اپنے معاصرین اور احباب کو ہمیشہ جن کے تعریفی پہلو اجاگر کر کے یاد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امیر میں یہ خوبی، بھی تھی کہ جب کوئی مشورہ مانگتا تو نہایت دیانت داری سے کام لیتے، اور مشورے کو تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے، پھر آخر میں معذرت بھی کر لیتے کہ ہو سکتا ہے کہ مشورہ پسند نہ آیا ہو۔ یہ عادت اس لیے بھی تھی کہ امیر، دوستی کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ہر ممکن اسے نبھاتے تھے۔ داغ دہلوی نے اپنا کلام انتخاب کے لیے بھیجا اور غالباً یہ بھی تحریر کیا کہ وجوہ بھی لکھی جائے چناں چہ امیر نے نہایت احتیاط کے ساتھ کلام انتخاب کیا۔ تصرف نہیں کیا۔ یہ حق داغ ہی کو دیا۔ اس خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے اور دیکھیں کہ امیر کتنے بڑے انسان تھے، انا، تکبر سے کتنے صاف تھے۔ لڑائی جھگڑوں سے کتنا دور رہتے تھے اور دوستی کتنی عزیز تھی :

"دو وجہوں سے میں اپنے بنانے پر اعتماد نہیں کرتا، ایک یہ کہ مہاجرت کو زمانہ دراز گزر گیا، خدا جانے زمانے کے انقلاب نے آپ کی طبیعت میں کیا انقلاب پیدا کئے ہوں، میرا دخل دینا اور تصرف کرنا مباداگراں گزرے، تو ادھر آپ کو رنج ہو، ادھر مجھے ملال ہو اور مفت کی بحث آپڑے، میں کہوں یوں

ان کا بھرم، ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ امیر زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں :

"پیشگی قیمت حاصل کرنے کے واسطے اشتہار دینے کی صورت 'امیر اللغات' کی شان پر نہایت بد نما ہے۔ ... خلق میں اس کی نسبت مختلف خیالات ہیں، کوئی مؤلف کو سرمایہ دار جانتا ہے۔ کسی کو یہ خیال ہے کہ ریاست میں اس کی بنا پڑی ہے، رئیس کی امداد سے تکمیل کو پہنچے گا۔ ایسی حالت میں یہ عامیانہ طریقہ اختیار کرنا کہ پیشگی قیمت آئے تو تیسرا حصہ چھپے، مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"(۳۱۸)

امیر نے، نظامِ دکن سے "امیر اللغات" کے لیے مالی اعانت کی کوششیں جاری رکھی ہوئی تھیں، اسی دوران، داغ، استاد السلطان ہوئے، غالبًا انھوں نے امیر کو نظام دکن سے خطاب حاصل کرنے کے لیے لکھا۔ اس موقع پر اس امیر کی خودداری کو ایک بار پھر دھچکا لگا، انھوں نے داغ کو لکھا کہ : "اول تو میں خطاب لینے ہی کے قابل اپنی قابلیت کو نہیں سمجھتا اور پھر درخواست دے کر خطاب مانگنا، یہ تو بالکل پسند نہیں۔"(۳۱۹)

امیر، جب دکن کے لیے روانہ ہونے لگے تو انھوں نے داغ کو اپنی آمد سے مطلع کیا تھا۔ داغ نے انھیں خوش آمدید کہا اور لکھا کہ آپ میرے ہاں قیام فرمائیں۔ امیر نے پھر فطری احتیاط اور وضعداری کے سبب سے انھیں لکھا کہ :

"یار شاطر ہو کر رہنا چاہتا ہوں نہ بار خاطر، خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ کا دل و دماغ عوارض و امراض اور کثرتِ فکرِ سخن سے ضعیف ہو رہا ہے۔"(۳۲۰)

یہ ایک مثالی حقیقت ہے کہ امیر نے بہت کچھ گنوا کر اپنا ایمان بچایا، ورنہ بھوپال سے دو مرتبہ ملازمت کی پیش کش ہوئی، لیکن امیر نے ریاست رام پور کا نام اُونچا رکھا اور ملازمت قبول نہیں کی، بنارس میں نظام نے، دکن چلنے کی دعوت دی امیر نے صاف کہہ دیا کہ اجازت لے کر نہیں آیا ہوں، ہم رکاب نہیں ہو سکتا۔ اس موقعے پر بھی ان کی خودداری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ایک مالک کی موجودگی میں دوسرے کے ہو جائیں۔ یہ اس لیے کہ امیر لالچی نہیں تھے۔ وہ بھوپال اور دکن کی طرف بھی صرف اس لیے دیکھ رہے تھے کہ وہ مالی معاونت کر دیں۔ نوکری کی انھیں ضرورت نہیں۔ جو کام شروع ہوا ہے وہ مکمل ہو جائے، ورنہ دنیا کہے گی کہ امیر لغت تالیف نہیں کر سکے۔ انھیں اپنی استادی دکھانے کا شوق نہیں تھا۔ وہ تو استاد پرست اور شاگرد پرست انسان تھے۔ نمود و نمائش سے تو وہ دور بھاگتے تھے۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ :

"ایک بار ان (امیر) کا کچھ کلام دیکھ کر میرا جی لوٹ گیا، میں نے لکھا! خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میری عمر بھی آپ کی عمر میں جوڑ دے۔"(۳۲۱)

امیر نے جواب میں عجیب و غریب بات تحریر کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"تم اپنی جوہر شناسی سے میری پوری قدر کرنے کے آرزو مند ہو، تو میں اس کی راہ تم کو بتائے دیتا ہوں کہ جی توڑ کے میرے ستر عیوب عفو د خوب حسن انجام، مورد رحمت خاص و عام ہونے کی دعا کیا کرو۔ اس سے بڑھ کر کوئی احسان نہیں ہے۔ میری اس التجا کو سرسری نہ سمجھو بلکہ میری زندگی میں اور

مرے پیچھے ہمیشہ اس دعا کا التزام رکھو۔" (۳۲۲)

امیر کی عادت تھی کہ اگر کوئی ان کی تعریف کرتا، تو وہ شرمندہ ہوتے، اپنے ممدوح کا شکریہ ادا کرتے، اسے دعائیں دیتے۔ زاہد حسین زاہد نے امیر کے کلام کی تعریف میں خط لکھا، تو امیر نے جواباً انھیں لکھا کہ :

"میری قدر کر کے میرا دل بڑھانے والے، خدا تم کو زندہ رکھے اور اقبال بڑھائے۔ آمین، محبت نامہ آیا، دل کو تسکین ہوئی، تم نے میری انشا پردازی کی ستائش کر کے اور مجھے شرمندہ کیا۔ شرمندگی کے ساتھ تمھاری قدر دانی کا (جو محض محبت سے ہے) شکر گزار ہوں۔" (۳۲۳)

امیر اپنی علمیت، شہرت اور کامیابیوں کو منجانب اللہ قرار دیتے تھے۔ ایک مرتبہ امیر نے رام پور میں میلے کے موقعے پر ایک قصیدہ لکھا۔ جسے جمعے کی نماز کے بعد ان کے صاحب زادے نے پڑھا، اس قصیدے کو بے حد پسند کیا گیا۔ نمود و نمائش کے پرہیزی امیر، ممتاز کو لکھتے ہیں کہ :

"شاعری تو اس میں بہت کم ہے۔ مگر مطالب خوب صورتی سے موزوں ہیں اور مقبولیت منجانب اللہ ہے۔" (۳۲۴)

امیر کے مزاج میں نمود و نمائش کا عنصر تو نہیں تھا، لیکن نفاست پسندی، سلیقہ مندی اور منفرد ہونے کا احساس بہت گہرا تھا۔ اور بعض اوقات ان کی نفاست پسندی ان کی نازک مزاجی میں تبدیلی ہو جاتی تھی۔ جیسا کہ لکھنؤ والوں کا خاصہ ہے۔ یہ برائی نہیں، جس علاقے میں فنونِ لطیفہ بلند مقام پر پہنچ جائے، جہاں زندگی کے اطوار کو اعلیٰ پیمانے پر دیکھا جائے اور برتا جائے، وہاں کے خواص تو کیا عوام کے مزاج میں بھی یہ اثرات آجاتے ہیں۔ جو بعد میں تقویت پا کر موروثی ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں تو امیر، جن کا تعلق تو تھا ہی خواص سے، اس لیے ان کے مزاج میں ان اثرات کا پایا جانا، کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ امیر نے "سراجِ سخن" میں غزل شائع کرنے کے لیے بھیجی، لیکن امیر کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اس لیے کہ :کاغذ برا، چھپائی ناقص، خط بھی اچھا نہیں تھا۔" (۳۲۵) "گلچیں" جس زمانے میں گورکھپور سے نکلا کرتا تھا۔ تو ایک پرچے میں، امیر کے تمام نامور شاگردوں کے علاوہ داغ اور امیر کی غزل بھی شائع ہونے والی تھی۔ امیر کا اندازہ تھا کہ یہ "پرچہ اچھا نکلے گا" لیکن انھیں ڈر تھا کہ شاید کاغذ اور خط اچھا نہ ہو۔ زاہد کو لکھتے ہیں کہ :واقع میں یہ پرچہ اچھا نکلے گا۔ خدا کرے کاغذ و خط بھی اچھا ہو۔" (۳۲۶) "جلوہ خضر" از صفیر بلگرامی کو امیر نے بہت پسند کیا، لیکن طباعت کے لیے لکھتے ہیں کہ :"افسوس کہ بہت ہی بری چھپی ہے۔" (۳۲۷) البتہ "دیوانِ نایاب" حسنِ طباعت کے لحاظ سے امیر کو بہت پسند آیا، لکھتے ہیں کہ :دیوان کی چھپائی اور خوش اسلوبی دیکھ کر بہت جی خوش ہوا۔" (۳۲۸) امیر کی خوش ذوقی کا یہ حال تھا کہ تلامذہ جو کلام اصلاح کے لیے ارسال کرتے تھے، اس کا کاغذ اگر امیر کو پسند نہیں آتا، تو ٹوک دیا کرتے تھے : منشی جمیل احمد شاداں کو لکھتے ہیں :کاغذ آپ نے بہت برا اور کھرا اختیار کیا ہے۔ آئندہ سے سفید اور چکنے کاغذ پر لکھا کیجیے۔" (۳۲۹)

امیر کی خوش ذوقی کی ایک اور تصویر ملاحظہ کیجیے کہ :جب انھوں نے حیدر آباد دکن جانے کا ارادہ کیا تو اس کی بھرپور تیاری کی اور یہاں تک کہ جو چاقو تیار کرائے جس کے لیے تاکید کی کہ : حتی الامکان خوش قطع بھی ہونا چاہیے۔ دستے موزوں اور خوش قطع ہوں۔" (۳۳۰)

امیر اعلیٰ ذوق کے مالک ہونے کے ساتھ خوش سلیقہ بھی تھے۔ اچھی اشیاء کو خوبی سے برتنے کا ہنر جانتے تھے۔ خوب صورت، اچھے تحائف

پسند کرتے تھے۔ جیسی چیز اپنے لیے پسند کرتے، ویسی ہی دوسروں کے لیے منتخب کرتے تھے۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ :

"سنا ہے کہ جوانی میں حضرت کو خوش لباسی کا بہت شوق رہا اور اس زمانے کی روش کے موافق، جوتا بھی گھتیلا پہنتے تھے۔ مگر ان کے بڑھاپے میں جب مجھے زیارت نصیب ہوئی، تو میں نے لباس میں سادگی ہی پائی۔" (۳۳۱)

آہ کے بیان کی کسی حد تک تصدیق، انھی کے نام امیر کے ایک خط سے ہوتی ہے۔ جس میں امیر لکھتے ہیں کہ :

"سر میں باندھنے کے قابل گلوبند متین اور ثقہ رنگ کا میرے لیے اور عمدہ پان چلتے وقت لکھنؤ سے اپنے ساتھ لانا۔" (۳۳۲)

امیر کا معیار زندگی تنگدستی میں بھی بہت اعلیٰ رہا ہمیشہ بڑے مکانوں میں رہے۔ لکھنؤ سے رام پور پھر رام پور سے لکھنؤ اور پھر رام پور اور وہاں سے حیدر آباد دکن، خطوط سے پتا چلتا ہے کہ جہاں رہے کوشش کر کے ہمیشہ بڑے اور کھلے ہوادار مکان کو ترجیح دی۔ یہاں تک کہ اولادوں کو بھی اسی چیز کا عادی بنایا۔ دکن روانگی سے قبل داغ کو مکان کے لیے لکھتے ہیں کہ :

"میرے ساتھ جو میرے فرزند ہیں وہ بھی بسببِ عادات تکلیفاتِ شاقہ تنگی مکان کے متحمل نہیں اور سب تکلیفیں چندروز گوارا ہو سکتی ہیں مگر جس طرح ممکن ہو، کوئی وسیع مکان جس میں متعدد درجات ہوں، میرے واسطے پہلے سے مرتب کر رکھیے۔" (۳۳۳)

امیر خوش ذوق، بلند خیال، نفاست پسند، نازک مزاج، پروقار اور سلیقہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادیت پسند بھی تھے۔ وہ دینی اور دنیاوی کاموں میں بھی جس نظم و ضبط کا اہتمام کرتے، وہ زمانے کی روش سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ضرور ہوتا۔ مثلاً "صنم خانہ عشق" کی طباعت ہو رہی تھی۔ احباب نے قطعہ تاریخ ارسال کیے۔ بہت سی تاریخیں بغیر طلب کے بھی موصول ہوئیں۔ لیکن امیر نے وہ تاریخیں شامل کیں، جو انتخاب الانتخاب تھیں، ورنہ تروخشک تاریخوں سے دیوان کا حجم بڑھ جاتا۔ امیر زاہد کو لکھتے ہیں :

"تاریخیں بغیر طلب، احباب نے بہت سی بھیجیں، مگر تو خشک تاریخوں سے دیوان کا حجم بڑھانا، مجھے پسند نہ آیا، ان میں سے چُن چُن کر وہ تاریخیں رکھیں جو انتخاب الانتخاب تھیں باقی سے قطع نظر تھیں۔" (۳۳۴)

امیر سے غزل کی فرمائش ہوئی، مسائل میں رہتے ہوئے انھوں نے ایک مصرع کہا، لیکن اس میں اچھے قافیے نہیں ملتے تھے، اس لیے غزل نہیں کہی۔ یہ کیفیت زاہد کو لکھتے ہیں :

"مکروہات کا ہجوم ہے۔ ایک مصرعہ کہا تو، اس میں خوب صورت قافیے نہیں ملتے، عام قافیوں میں قطعہ، موزوں کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" (۳۳۵)

امیر کے مزاج کی یہی خوش ذوقی اور انفرادیت پسندی ان کے جاری کردہ گلدستہ گلچیں میں نظر آتی ہے۔ وسیع النظر، امیر مینائی جانتے تھے کہ گلدستوں کی کثرت نے اس کے معیار کو گرا دیا ہے۔ داغ کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ : "گلدستے برساتی کیڑوں کی طرح بے انتہا

پسند کرتے تھے۔ جیسی چیز اپنے لیے پسند کرتے، ویسی ہی دوسروں کے لیے منتخب کرتے تھے۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ :

"سنا ہے کہ جوانی میں حضرت کو خوش لباسی کا بہت شوق رہا اور اس زمانے کی روش کے موافق، جوتا بھی گھیلا پہنتے تھے۔ مگر ان کے بڑھاپے میں جب مجھے زیارت نصیب ہوئی، تو میں نے لباس میں سادگی ہی پائی۔" (۳۳۱)

آہ کے بیان کی کسی حد تک تصدیق، انھی کے نام امیر کے ایک خط سے ہوتی ہے۔ جس میں امیر لکھتے ہیں کہ :

"سر میں باندھنے کے قابل گلوبند متین اور ثقہ رنگ کا میرے لیے اور عمدہ پان چلتے وقت لکھنؤ سے اپنے ساتھ لانا۔" (۳۳۲)

امیر کا معیار زندگی تنگدستی میں بھی بہت اعلیٰ رہا ہمیشہ بڑے مکانوں میں رہے۔ لکھنؤ سے رام پور پھر رام پور سے لکھنؤ اور پھر رام پور اور وہاں سے حیدر آباد دکن، خطوط سے پتا چلتا ہے کہ جہاں رہے کوشش کر کے ہمیشہ بڑے اور کھلے ہوادار مکان کو ترجیح دی۔ یہاں تک کہ اولادوں کو بھی اسی چیز کا عادی بنایا۔ دکن روانگی سے قبل داغ کو مکان کے لیے لکھتے ہیں کہ :

"میرے ساتھ جو میرے فرزند ہیں وہ بھی بسببِ عادات تکلیفاتِ شاقہ تنگی مکان کے متحمل نہیں اور سب تکلیفیں چند روز گوارا ہو سکتی ہیں مگر جس طرح ممکن ہو، کوئی وسیع مکان جس میں متعدد درجات ہوں، میرے واسطے پہلے سے مرتب کر رکھیے۔" (۳۳۳)

امیر خوش ذوق، بلند خیال، نفاست پسند، نازک مزاج، پروقار اور سلیقہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادیت پسند بھی تھے۔ وہ دینی اور دنیاوی کاموں میں بھی جس نظم و ضبط کا اہتمام کرتے، وہ زمانے کی روش سے کسی نہ کسی حد تک مختلف ضرور ہوتا۔ مثلاً "صنم خانہ عشق" کی طباعت ہو رہی تھی۔ احباب نے قطعہ تاریخ ارسال کیے۔ بہت سی تاریخیں بغیر طلب کے بھی موصول ہوئیں۔ لیکن امیر نے وہ تاریخیں شامل کیں، جو انتخاب الانتخاب تھیں، ورنہ تر و خشک تاریخوں سے دیوان کا حجم بڑھ جاتا۔ امیر زاہد کو لکھتے ہیں :

"تاریخیں بغیر طلب، احباب نے بہت سی بھیجیں، مگر تو خشک تاریخوں سے دیوان کا حجم بڑھانا، مجھے پسند نہ آیا، ان میں سے چُن چُن کر وہ تاریخیں رکھیں جو انتخاب الانتخاب تھیں باقی سے قطع نظر تھیں۔" (۳۳۴)

امیر سے غزل کی فرمائش ہوئی، مسائل میں رہتے ہوئے انھوں نے ایک مصرع کہا، لیکن اس میں اچھے قافیے نہیں ملتے تھے، اس لیے غزل نہیں کہی۔ یہ کیفیت زاہد کو لکھتے ہیں :

"مکروہات کا ہجوم ہے۔ ایک مصرعہ کہا تو، اس میں خوب صورت قافیے نہیں ملتے، عام قافیوں میں قطعہ، موزوں کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" (۳۳۵)

امیر کے مزاج کی یہی خوش ذوقی اور انفرادیت پسندی ان کے جاری کردہ گلدستے گلچیں میں نظر آتی ہے۔ وسیع النظر، امیر مینائی جانتے تھے کہ گلدستوں کی کثرت نے اس کے معیار کو گرا دیا ہے۔ داغ کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ : "گلدستے برساتی کیڑوں کی طرح بے انتہا

امیر کی بے تکلفی کا حال یہ تھا کہ بے تکلف ہونے کا ارادہ بعد میں اور معذرت پہلے کر لیا کرتے تھے۔ بشیر ملیح آبادی کے نام خط ملاحظہ کیجیے :

"پیارے بشیر ! ایک نظر تمھارے دیدار فرحت آثار نے ایسا تکلف بر طرف کر دیا کہ رسمی تکلفات کے القاب لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس لیے پیارے بشیر لکھنے پر قناعت کی۔ تمھاری سعادت مندی سے امید ہے کہ اس یگانگی کے الفاظ کو ناپسند نہ کرو گے۔"(۳۴۰)

امیر کے مکتوبات میں مزاح اور بے تکلفی کا بہترین نمونہ اس اقتباس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو زاہد حسین زاہد کے نام مکتوب سے مستفاد ہے :

"پیارے زاہد! شعر کے مشرب میں زاہد کی صفت خشک مستعمل ہے۔ مگر تمھاری نظم و نثر کی تر و تازگی دیکھ کر، روح تازہ ہو جاتی ہے۔ اور زاہد کی صفت خشک، درست معلوم نہیں ہوتی۔"(۳۴۱)

الغرض امیر ایک سنجیدہ اور کم گو انسان تھے، اس لیے بے تکلفی اور مزاح میں بھی بے ساختگی اور بے پروائی کا عنصر نہیں ملتا۔ بنیادی طور پر وہ ایک کٹر مذہبی انسان تھے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ :"خلق کے حق میں بھلائی کرنا بڑا عمدہ شکر ہے۔ اس سے بھی، قلم، زبان، دل کبھی نہ رکے۔"(۳۴۲) رمضان المبارک میں وہ صرف عبادت کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں :"ماہ مبارک رمضان میں کوئی کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔"(۳۴۳) بہت زیادہ پریشان ہوتے تھے تو، مزارات پر جا کر دعا کرتے، خود نہیں جا سکتے تو احباب سے درخواست گزار ہوتے۔ داغ کو لکھتے ہیں :

"میاں کبھی کسی مزار پر انوار پر جانا ہو تو ذرا اس سیہ کار کے حق میں بھی دعائے حسنِ ختام کرنا۔ ہر نفسی نفس واپسیں ہے۔ دیکھا چاہیے۔ کیا معاملہ پیش کرتا ہے۔

کیا کہوں گا ، کوئی محشر میں جو پوچھے گا امیر
کیوں نہ بگڑی ہوئی باتوں کو بناتے آئے ۔ "(۳۴۴)

امیر کو، سری علوم سے گہرا شغف تھا۔ اس حوالے سے انھوں نے کئی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں،(۳۴۵) لیکن شائع نہیں ہو سکیں۔ امیر جب پریشان ہوتے یا کوئی خاص کام کرنا ہوتا تو علمِ جفر وغیرہ سے بھی مدد حاصل کرتے تھے۔ زاہد حسین زاہد کے نام خط سے پتا چلتا ہے کہ امیر لغات کی اشاعتِ کے لیے فکر مند تھے۔ نواب حامد علی خاں التفات نہیں فرما رہے تھے اور عوارض کے سبب سے وہ سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ورنہ امیر کا خیال تھا کہ مدد ہو جائے گی اس لیے کہ قرائن دلالت کر رہے تھے۔ ۱۳ر جون ۱۸۹۴ء کے خط میں ہے کہ :"سرمایہ مالی مفقود ہے۔ بعض عوارضِ لازمہ سے سفر نہیں کر سکتا۔ ورنہ قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ امداد کافی کا سامان ہو جاتا۔"(۳۴۶) امیر کی اس دلچسپی کے بارے میں ممتاز علی آہ نے بھی امیر کی زبانی ایک واقعہ لکھا ہے :

"۱۸۸۸ء میں ملک کے خیالات دریافت کرنے کو حضرت نے لکھنؤ، بنارس ہوتے ہوئے پٹنے تک سفر کیا۔ ... حضرت فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں اپنے قدیم دوست میر علی حسن رمال سے میں نے سوال کیا کہ : تالیفِ لغت کی ضرورت سے میں نے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ ذرا بتاؤ اس کام کے لیے کہاں سے مدد ہو گی۔ کہا" جہاں سے آئے ہو وہیں سے امداد ہو گی"۔ میں نے کہا،"اب تو تم سٹھیا سے گئے

ہو، بھلا وہاں سے امداد کی امید ہوتی تو میں گھر سے کیوں نکلتا۔ذرا غور کر کے حکم لگاؤ۔۔۔۔'کہا' میں تو
پھر یہی کہتا ہوں کہ وہیں سے امداد ہوگی۔"(۳۴۷)

ہمارا خیال ہے کہ امیر کی ناکامیوں میں سری علوم کے غلط حسابات کا بھی عمل دخل ہے۔بہر کیف امیر کے بڑے ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن کیوں کہ وہ انسان تھے، اس لیے بعض شری کمزوریوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ مثلاً نواب کلب علی خاں جب امیر سے ناراض ہو گئے تھے اور امیر رام پور چھوڑ کر لکھنؤ جانا چاہتے تھے تو رقم کی ضرورت تھی۔امیر اس قدر پریشان ہو گئے کہ بالآخر انھوں نے مولانا عبدالقادر کے توسط سے مہاجن سے، سود پر رقم لینے کا ارادہ کیا، لیکن اللہ نے انھیں بچایا۔"(۳۴۸) پھر قیام لکھنؤ کے زمانے میں بھی انھوں نے حالات سے تنگ آکر اسی طرح کی کوشش کی، لیکن اللہ نے پھر انھیں بچالیا۔"(۳۴۹) انسان دینی یا دنیاوی کسی بھی بڑے منصب پر ہو وہ مختلف حیثیتوں کا مالک ہوتا ہے۔اس کے مختلف رویے ہوتے ہیں۔لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کی ہر حیثیت اور اس کا پہلو اس سے وابستہ تمام رویے مکمل اور مثالی ہوں، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی پہلو، کمزور ہو جاتا ہے یا ہوتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ امیر کے مزاج میں توہم پرستی کا عنصر بھی تھا۔ امیر کو اچھے چاولوں اور ایک عمدہ بھینس کی ضرورت تھی، امیر نے بلا سپور اور سوار میں تحصیل دار اور پیش کار کو فرمائش لکھی اور روپیہ بھی بھیجا، لیکن کام نہیں ہوا۔امیر نے اس ناکامی کے بعد احسن اللہ ثاقب کو ہی فرمائش لکھی، "لیکن رقم نہیں بھیجی، اس لیے کہ غالباً پیشگی رقم بھیجنا منحوس ہے، اس لیے کہ پہلے بھی رقم پیشگی بھیجی تھی اس لیے کام نہیں ہوا۔

"روپیہ چاولوں کی قیمت کا اور بھینس کی قیمت کا یہاں فوراً ملے گا، میں بھیج دیتا مگر دو جگہ بھیجا، 'سوار' کو اور بلا سپور کو، اور دونوں جگہ سے پلٹ آیا تو، خیال آیا کہ شاید روپیہ بھیجنا ہی منحوس ہو۔لہٰذا صرف فرمائش پر اکتفا کیا گیا۔"(۳۵۰)

سود پر رقم لینا اور توہم پرستی کے علاوہ امیر کی شخصیت کا ایک اور پہلو، محمد حسین آزاد سے بغض رکھنا بھی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارا اندازہ غلط ہو، اس لیے کہ داغ جو، امیر کے سب سے اہم معاصر ہیں، ان کے لیے کسی خط میں بھی ہلکا جملہ نہیں ملتا اور یہی برتاؤ امیر کا سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کے ساتھ بھی رہا۔لیکن 'آزاد' کے ساتھ ایسا کیوں ہے؟ سردست کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

امیر کے ایک شاگرد نعیم الحق شیخ پوی پہلے 'صفیر' تخلص کیا کرتے تھے۔بعد میں انھوں نے بدل کر 'آزاد' کر لیا۔امیر نعیم کو رقم طراز ہیں :

"آپ اپنا تخلص، صفیر کی جگہ آزاد قرار دیتے ہیں، میں بھی پسند کرتا ہوں۔واقعی صفیر بلگرامی ایک مشہور شخص تھے۔"(۳۵۱)

امیر کا یہ خط ۹ر فروری ۱۸۹۳ء کا تحریر کردہ ہے۔ادبی تاریخوں کے مطابق یہ وہ دور تھا جب آزاد اپنے علم و فضل کی بدولت ملک گیر شہرت اختیار کر چکے تھے۔ایسے میں آزاد کے مقابلے میں صفیر بلگرامی کو ترجیح دینا، یقیناً اس کے پس پردہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے۔اس کے علاوہ امیر نے جب امیر اللغات کی بابت ملک بھر کے فضلائے اکرام سے آراء طلب کی تو ان کے شاگرد محمد نوح نے اپنے طور پر آزاد کو بھی "امیر اللغات" پر رائے دینے کے لیے لکھا تھا جسے امیر نے پسند نہیں کیا اور انھیں لکھا کہ :"مولوی محمد حسین صاحب آزاد کو 'امیر اللغات" کی نسبت آپ نے ناحق تحریر فرمایا۔"(۳۵۲) باوجود ان بشری کمزوریوں کے امیر کی شہرت اور کردار پر کوئی ایسا حرف نہیں آتا، تو جو ان کو

نقصان پہنچائے۔ اور ایسے بے تحاشہ شواہد ملتے ہیں۔ جس کی بنیاد بھی یہی کہا جائے گا کہ امیر مجموعی طور پر نیک انسان تھے۔ جس کی ایک بہت بڑی مثال یہ ہے کہ امیر لین دین اور سودے کے معاملے میں سچے، کھرے اور وعدے کے پابند تھے۔ سید علی قادری کو لکھتے ہیں :

"مجھ کو چار ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ ایک اشد ہے اور دوسری شدید اور چھے مہینے کی مدت میں، دو ہزار اور چھے مہینے میں دو ہزار ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔" (۳۵۳)

امیر سودہ طے کرنے میں بھی بہت صاف گو اور وعدے کے پابند تھے۔ "امیر اللغات"، حصہ اول، مطبع مفید عام، آگرہ، میں شائع ہو رہا تھا۔ جس کے مالک مولوی احمد خاں صوفی تھے۔ امیر کا سودہ طے کرنے کا انداز دو خطوط میں ملاحظہ کیجیے۔ یہ دونوں خط مولوی احمد خاں صوفی کے نام ہیں :

"پانسو روپیہ کا نوٹ نمبری ۳۸۶۳۳ کا نصف ٹکڑا بذریعہ رجسٹری بھیجتا ہوں۔ رسید ضابطہ آنے کے بعد فوراً، دوسرا ادہا روانہ کروں گا۔ اور جو روپیہ دوران طبع میں بہم پہنچے گا وہ بلا ایمائے طلب ارسال ہو گا اور ختم طبع حصہ اول پر اس کا حساب بے باق ہو جائے گا۔" (۳۵۴)

حسبِ وعدہ نوٹ کا دوسرا ٹکڑا روانہ کیا گیا۔ جس کے ساتھ خط کا متن ملاحظہ کیجیے :

"آج نوٹ کا دوسرا ٹکڑا بھی ملفوف نیاز بذہ ہے۔ کل اتوار کے سبب سے روانہ نہ کر سکا۔ اس کی رسید سے بھی مطمئن فرمائیے گا کہ ڈاک کا معاملہ ہے۔" (۳۵۵)

امیر کی خریداری کا ایک اور انداز احسن اللہ ثاقب کے خط سے ملاحظہ ہو :

"ایک عمدہ بھینس، جو غریب و شائستہ، قوم کی اچھی کم سے کم چھے سات سیر دودھ دیتی ہوئی اور کمالِ صلاحیت و غربت سے گھر میں پل سکتی ہو۔ ... قیمت چالیس پچاس تک دینا منظور ہے۔ بشر طیکہ مال زیادہ کا ہو۔" (۳۵۶)

مکتوباتِ امیر سے یہ پتا چلتا ہے کہ جس طرح وہ روپے کے لین دین میں کھرے تھے۔ اسی طرح وہ اپنی مطلوبہ شے کو منتخب کرنے میں بھی محتاط تھے۔ اور اسی مناسبت سے ادائیگی کے قائل تھے۔ سودا اسی وقت کرتے جب قیمت کا اندازہ لگا لیتے۔ امیر اکثر اپنے تلامذہ سے فرمائش کر کے اشیا منگاتے تھے۔ لیکن ان کی ترجیح یہ ہوتی تھی کہ قیمت پہلے پتا چل جائے۔ امیر کو اچھی قسم کی شکر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ دل شاہجہاں پوری کو لکھتے ہیں کہ :

"بہت سفید قسم اعلیٰ قند کی چائے کے واسطے ضرورت ہے۔ معلوم نہیں شاہجہاں پور میں اس کا آج کل کیا نرخ ہے۔ آپ تحقیق کر کے لکھیے۔" (۳۵۷)

امیر کا ذوق بہت اعلیٰ اور معیارِ زندگی نہایت پر وقار تھا، وہ خوش لباس کے ساتھ خوش خوراک بھی تھے۔ اسی طرح روزمرہ کی اشیاء کے استعمال میں بھی اپنے مزاج کے مطابق اہتمام کیا کرتے تھے۔ مثلاً امیر کو "عطر" کا شوق تھا اور وہ موسم کی مناسبت سے اچھے عطر استعمال کیا کرتے تھے۔ حفیظ جون پوری عطر کی تجارت کرتے تھے۔ امیر کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے حفیظ کو لکھا کہ :

"یہاں عطر کی اکثر حاجت رہتی ہے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔ کہ دو تین قسم کے عمدہ عمدہ عطر اس موسم کے موافق، بطور نمونہ روانہ کیجیے اور قیمت بھی لکھیے۔"(۳۵۸)

حفیظ نے امیر کے ذوق کے مطابق عطر بھیجے، جو انھیں پسند آئے۔ چناں چہ امیر کا اشتیاق اور بڑھا اور انھوں نے اس مرتبہ جاڑوں کے موسم کے لیے عطر کی فرمائش کی:

"عطر جاڑوں کی فصل کے موافق بھیجیے، مگر بہت اعلیٰ درجے کے عطر ہوں تو بھیجیے۔ ورنہ معمولی تو یہاں بھی موجود ہیں، اور ہر جگہ ملتے ہیں۔"(۳۵۹)

امیر عمدہ عمدہ اشیاء کی تلاش میں رہتے تھے اور ان کے استعمال سے انھیں خوشی ہوتی تھی۔ عطر کے علاوہ امیر کو "حقے" کا بھی بہت شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ مشہور جگہوں سے بڑھیا قسم کے نیچے اور سٹک منگواتے تھے۔ اعجاز حسن کو لکھتے ہیں کہ: عظیم آبادی تاروں کے نیچوں کے لیے لکھا تھا، ان کا بھی انتظار ہے۔"(۳۶۰) کچھ دن بعد اعجاز حسن کو پھر تحریر کیا کہ: مجھے قفلی دار چند نیچے مطلوب ہیں اور ایک نیچہ پیچواں کا۔"(۳۶۱) اعجاز حسن نے نیچے بھیج دیے۔ اس میں کچھ امیر کی مرضی کے تھے اور کچھ مرضی کے خلاف۔ چناں چہ اعجاز حسن کو لکھتے ہیں:

"نیچوں کا بکس کھلوایا گیا۔ تینوں نیچے، باعتبار کپڑے اور حسنِ بندش کے بہت اچھے ہیں۔ کلابتونی نیچوں کی کچھ حاجت نہیں۔ البتہ ان نیچوں میں کوئی نیچہ صرف 'نے' کا جس میں قفلی نہیں ہوتی اور وہیں بنتے ہیں۔ نہیں ہے۔ چند نیچے ویسے مطلوب تھے۔"(۳۶۲)

ایک اور خط ملاحظہ کیجیے، اس سے پتا چلتا ہے کہ امیر حقے کا کتنا شوق اور اس کی خوب صورتی و نفاست کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ اور چیزوں کے مول تول میں کس قدر ہوشیار رہتے تھے۔

"روپے کے جو چھے 'نیچے' ملتے ہیں۔ وہ فرمائش کر کے خاص طور پر بنوائے جائیں گے، تو چار ملیں گے، اور جو چار ملتے ہیں، وہ فرمائشی دو ملیں گے۔ آپ میرے واسطے دونوں قسم کے نیچے عمدہ، بنوا کر لیجئے اور سٹک روپیہ بارہ آنے کی، جو اعلیٰ درجے کی ہو، ایک مجھے درکار ہے۔ غرض دو روپے کے چار اور دو روپے کے چھے عمدہ نیچے اور ایک روپے یا بارہ آنے کی ایک پتلی اور نرم و نازک سٹک لے کر روانہ کیجیے۔"(۳۶۳)

امیر کو اچھی قسم کے "چاولوں" کا بھی بہت شوق تھا اور وہ اس کے لیے مشہور علاقوں کے چاول حاصل کرنے کی تگ و دو کیا کرتے تھے۔ امیر کی خواہش ہوتی تھی کہ چیز بے شک اعلیٰ ہو، لیکن قیمت مناسب ہونا چاہئے۔ وہ شوق کی خاطر فضول خرچی سے گریز کیا کرتے تھے۔ ثاقب کے نام خط میں امیر چاولوں کی بابت لکھتے ہیں:

"چاولوں کے نمونوں میں سے دلبادل غیر مطلوب ہے۔ یہاں بھی دیسی بکثرت ملتے ہیں۔ چلہیا ایک من پٹنہ اور فتح پوری دس سیر بھیج دیجیے گا۔ یہ دونوں چاول اچھے ہیں، البتہ پہلے سے گراں پڑتے ہیں۔

کئی باران اقسام کے چاول آگے منگوائے اس زمانے میں اس قیمت سے سستے تھے بہر کیف اب جو قیمت ہے۔ اس کے حساب سے ملنے چاہئیں۔ مزدوری بار برداری کی جو قرار پائے اس سے آگاہ فرمائے گا۔"(۳۶۴)

امیر اچھے چاولوں کے بے حد شوقین تھے۔ اس کا اندازہ امیر کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے، جو احسن اللہ ثاقب کے نام ہے۔ ثاقب کی نوکری میں ترقی ہوئی، تو امیر نے بڑے دل چسپ انداز سے مبارک باد دی۔ جس میں چاولوں کی بھی فرمائش تھی :

"میں نے سنا کہ کسی قدر آپ کی ترقی ہوئی۔ اگر سچ ہے تو اس کی مبارک باد لیجیے اور منھ میٹھا کیجیے۔ منھ میٹھا کرنے کا ہر طریقہ اچھا ہے کہ جس جس قسم کے چاول وہاں اچھے ہوتے ہیں"وہ تھوڑے تھوڑے سے بھجوادیجیے، قند و شکر یہاں بہت ملتی ہے۔ وہ ملالی جائے گی۔ اور سال بھر میٹھے چاول کھائے جائیں گے۔"(۳۶۵)

امیر کو "دودھ" کا بھی بے حد شوق تھا۔ خاص کر اپنے گھر کی پلی ہوئی بھینس کا۔ احسن اللہ ثاقب کو لکھتے ہیں : "بھینس میرے یہاں ایک ہفتے سے نہیں رہی۔ بازار کے دودھ سے نفرت ہے۔"(۳۶۶) امیر کے مکتوبات سے ان کے مزاج کا ایک دل چسپ پہلو اور سامنے آتا ہے۔ کہ وہ بھینس کی خریداری میں صرف مول تول ہی میں محتاط نہیں تھے۔ بلکہ وہ چاہتے تھے کہ بھینس متلون مزاج بھی ہو۔ اس بابت احسن اللہ ثاقب کو کیا کیا ہدایتیں تحریر کرتے ہیں وہ لطف اٹھانے کی چیز ہے۔

امیر، "پھل"، "فروٹ" اور "میوے" کے بھی شوقین تھے۔ لیکن اچھے اور معیاری ہونا شرط تھی، اگر معیاری نہ ہوتے تو ٹوک دیا کرتے تھے۔ گویا غیر معیاری اشیاء سخت ناپسند تھیں۔ زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں :

"رسیلے لوکاٹ پہنچے اور باعث شکر گزاری ہوئے، اگر چہ یہ لوکاٹ اعلیٰ قسم کے نہ تھے، جیسا کہ سہارنپور کے لوکاٹ مشہور ہیں اور تم بھیجا کرتے ہو۔"(۳۶۷)

امیر کو جب اپنی مرضی کے پھل میسر آتے تو وہ جھوم اٹھتے :

"پیارے زاہد، دو پٹاریاں آلو اور شفتالو کی آئیں اور بلٹی کے ذریعے موصول ہوئیں۔ شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو۔ خلیفہ حقیقی میرے، میوے کھلانے والے کے نہال آرزو کو دو جہاں، میں سر سبز و شاداب کرے۔"(۳۶۸)

امیر اچھی اشیاء کی دل سے تعریف کرتے اور شکر گزار ہوتے تھے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امیر کس ذوق و شوق اور مزاج کے انسان تھے۔ زاہد حسین نے انھیں پونڈے بھیجے جو امیر کو بے حد پسند آئے۔ چناں چہ رقم طراز ہیں کہ :

"پونڈے بھی پہنچے اور نہایت شیریں اور نرم رسیلے نکلے آپ نے جو اوصاف لکھے تھے۔ وہ سب پائے گئے، کوئی شک نہیں کہ یہ پونڈے بے مثل ہیں۔ میں آپ کے اس اتحافِ دوستانہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔"(۳۶۹)

امیر کو "آم" سے بھی خصوصی رغبت تھی۔ بشیر ملیح آبادی ہر سال، خاص طور سے امیر کو آم تحفتاً ارسال کیا کرتے تھے۔ امیر بھی بشیر کے بھیجے ہوئے آموں کو پسند کرتے اور ہر سال آم کی فصل میں انتظار کرتے تھے۔ ۲۶/ جون ۱۸۹۳ء کے خط میں بشیر کو لکھتے ہیں:

"آموں کی فصل آگئی اور آپ کی مستعدی ہدیہ کرنے کی نسبت اس تحریر سے معلوم بھی ہوئی۔ میں ہدیہ بھیجنے سے بیشتر شکر گزاری کرتا ہوں۔ مگر بہ نظرِ بے تکلفی آپ کی غزل دیکھتے دیکھتے یہ شعر زبان پر آگیا۔

آم وہ بھیجے کہ ہوں کم یاب
ورنہ امسال ادھر بھی کثرت ہے۔"(۳۷۰)

۹۳ء میں آم خوب ہوئے لیکن ۱۸۹۴ء میں آم کی قلت رہی۔ امیر کو اس کا بہت افسوس ہوا:

"آم کی قلت سن کر مجھے بھی افسوس ہوا۔ خیال تھا کہ شاید ہمارے ہی یہاں اب کے اس کا قحط ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ہر جگہ یہی حال ہے۔"(۳۷۱)

البتہ ۱۸۹۵ء میں آم پھر کثرت سے تھا۔ چناں چہ بشیر ملیح آبادی نے مختلف اقسام کے آم بھیجے جن میں سپیدے امیر کو زیادہ پسند آئے۔ اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کو آموں کی قسموں میں "لنگڑے" بھی پسند تھے:

"آم مجھے پہنچے، میں ممنون ہوں اور دل سے شکر ادا کرتا ہوں، جس قدر لذت ملی، سپیدے ہی سے ملی۔ ... مکرر یہ کہ کیا آپ کے باغ میں بنارس کے لنگڑے کی قلمیں نہیں لگائی گئیں۔ یہ آم تو بہت خوش ذائقہ اور قابلِ تعریف ہوتا ہے۔"(۳۷۲)

۹۶ء، ۹۷ء میں امیر کو آم میسر آئے یا نہیں البتہ ۲۹/ جون ۱۸۹۸ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ بشیر نے آم کی ایک بڑی مقدار بھیجی جس کا وہ شکریہ ادا کرتے ہیں:

"بلٹی آئی، تین سو آم سفیدے کے پہنچے۔ آپ کی دل نوازی کا کہاں تک شکر ادا کروں۔

از دست فقیر بیسوانا ید ہیچ
جز آنکہ بصدقِ دل دعائے بحند۔"(۳۷۳)

جون ۱۹۰۰ء میں بشیر نے پھر امیر کو خوش کر دیا:

"محبت نامہ آیا، آموں کی بلٹی لایا، آموں نے مذاقِ جاں کو شیریں کیا۔ اتحاف کا شکر گزار ہوں۔"(۳۷۴)

الغرض امیر کے مکتوبات علمی و ادبی نکات کے علاوہ امیر کی شخصیت و کردار، عادت و اطوار، مشاغل اور مزاج کی نزاکتوں کے بارے میں بھی نہایت وقیع معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ جو ایک بڑی شخصیت کو، اس کے دور اور حالات کے ساتھ پڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔

امیر کی ناکامیوں کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں پہلی یہ تھی کہ امیر میں فوری فیصلہ کرنے کی قوت کم تھی، جس کے باعث انھوں نے

بہت نقصان اٹھایا۔ وہ دوسروں سے مشورے کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ ایک اچھی بات تھی، لیکن امیر کی بدنصیبی یہ تھی کہ ان کے مشیر ان سے کہیں زیادہ کم زور تھے۔ اور بے تکلف بھی نہیں تھے امیر کی شخصیت کا ان پر بہت رعب ودبدبہ تھا۔ جس کے باعث غالباً وہ کھل کر بول نہیں پاتے تھے۔ امیر کے مزاج میں نفسانیت تو نہیں تھی لیکن ضد تھی وہ اپنی بات پر ڈٹ جاتے اس وقت تک جب کوئی دلائل سے انھیں خاموش نہ کردے۔ امیر کے مشیر جن میں ان کے تلامذہ اور صاحب زادے دلائل دینے میں یقیناً کمزور تھے۔ وہ ایک اچھی بات سوچ تو سکتے تھے۔ لیکن بالتفصل گوش گزار کرنا امیر کے سامنے آسان نہ تھا۔

امیر ایک جذباتی انسان تھے۔ جذباتی انسان کو شیشے میں اتارنا بھی بہت آسان ہے۔ اور اگر وہ کسی بات پر اکڑ جائے تو پھر مشکل نہیں ناممکن ہے کہ کسی بات پر اسے متفق کرلیا جائے اور یہ ایک امیر ہی کیا برصغیر کے لوگوں کا عام مزاج ہے۔ امیر سے کسی نے اظہارِ محبت کیا تو وہ رام ہو جاتے تھے اور کسی نے غلط بات کی تو وہ بے شک جواب نہ دیں لیکن ضد کر جاتے تھے، قطع تعلق کر لیتے تھے۔ جیسے باقر شیرازی نے بے وقوف بنا کر امیر کو لوٹ لیا یا نواب کلبِ علی خاں کی ناراضگی پر امیر ضد کر گئے اور لکھنؤ چلے آئے۔

امیر بہت جلد خوش فہمیوں میں مبتلا ہو جانے والے انسان تھے۔ کوئی ایسا مشورہ جس سے فوائد کے امکانات ہوتے تو امیر فوراً اسے مان لیتے اور اس کو تخیل ہی تخیل میں اتنا آگے لے جاتے کہ پھر اصل کام بھی رہ جاتا، جیسے انھوں نے چھاپہ خانہ لگایا، ناکام ہوئے۔ پھر لکھنؤ میں گلدستے کے ساتھ اخبار بھی شروع کرنے کا ارادہ کر لیا اور ساتھ ساتھ چھاپہ خانہ لگانے کا منصوبہ بھی بنا لیا، ادھار رقم حاصل کرنے کی تگ ودو میں بھی لگ گئے گویا گلدستے کے منصوبے کے ساتھ ہی انھوں نے طے کر لیا کہ ایک بڑے پیمانے پر اشاعتی کارخانہ لگایا جائے۔ اور دوسری طرف رام پور جانے کا منصوبہ بھی ذہن میں ہے۔ جس نے بالآخر قرض دار کر دیا۔

امیر نے زندگی میں کئی بڑے اور غلط فیصلے کیے۔

۱۔ نواب کلب علی خاں کو چھوڑ کر لکھنؤ جانا۔

۲۔ دوبارہ رام پور آنا۔

۳۔ نواب شاہجہاں بیگم کی نوکری کی پیشکش کو رد کرنا۔

۴۔ بنارس میں نظام دکن کے ساتھ ہم رکاب نہ ہونا۔

۵۔ "امیر اللغات" کی ذمہ داری اٹھانا۔

۶۔ جب لغت کے لیے مالی امداد بند ہو گئی تھی تو کام بند کر دینا تھا اور اپنے نامکمل لغات ترتیب دے کر شائع کر دینا چاہیے تھا۔

دوسری مرتبہ جب بھوپال گئے اور نوکری کی پھر پیش کش ہوئی تو قبول کرنا چاہیے تھا، اور دکن کا ارادہ ملتوی کر دینا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ امیر جب دکن روانہ ہوئے تو گویا کشتیاں جلا کر گئے تھے۔ اس لیے اب بھوپال کی ملازمت کے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے تھا۔

یہ تجزیہ دستیاب مکتوبات کے مطالعے پر ہے ممکن ہے وجوہات اس کے علاوہ ہوں۔ امیر کی ناکامیوں میں نواب مشتاق علی خاں اور نواب حامد علی خاں کی سرد مہری کا بھی بڑا دخل ہے۔ جس کی بدولت ایک بہت بڑا عالم اور شاعر تباہ ہو گیا اور کسمپرسی کی حالت میں رام پور چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ امیر نوکری کے لیے یہاں خود نہیں آئے تھے، بلائے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ بھی لکھنؤ سے بلایا گیا تھا، لیکن سرمایہ

داروں اور جاگیر داروں کے اپنے اصول اور روپے ہوتے ہیں، جب تک انسانیت ان کی چوکھٹ پر دم نہ توڑے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان کی تعریف مکمل نہیں ہوتی، اور پھر رہی سہی کسر انگریزی قوانین نے پوری کر دی۔ بالآخر یہ نواب خود ماتحت ہو گئے۔ لیکن قومی اور مذہبی حمیت سے خالی یہ طبقہ صرف اپنا مفاد پیش نظر رکھتا ہے۔ ہماری تو ایک بہت بڑی تاریخ ہے۔ جس نے اپنے مفاد کے پیشِ نظر ملکی و قومی مفادات کو داؤ پر لگا دیا۔ رام پور کے نوابین بھی اسی تاریخ کے اہم کردار ہیں، جن کی بدولت جانے کتنے ہنر مند، فاضل ادب اور تاریخ ساز لوگ تباہ ہو گئے جانے کتنے ہوں گے جو تاریخ کا حصہ بھی نہ بن سکے۔

مجموعی طور پر امیر ایک نیک سیرت اور قابلِ فخر کردار کے مالک تھے۔ خوش ذوقی، سلیقہ مندی، نفاست پسندی، صوفیانہ رکھ رکھاؤ، صبر و استغنا، اولاد، تلامذہ، دوستوں سے محبت، مشاورت، انصاف پسندی، معاذرت خواہ ہونا، دعا گو ہونا، تعریف کا حق دینا، تحائف کا تبادلہ کرنا، دل جوئی کرنا، تعزیت کرنا، اہل علم کی قدر کرنا، شکوہ شکایت کرنا، صاف گو، انصاف پسندی، عاجزی، انکساری، مشاورت کرنا، احتیاط پسندی، خودداری، نمود و نمائش سے گریز، بلند خیال، نازک مزاج، پر وقار، انفرادیت پسند، بے تکلفی اور مزاح سے دور یہ سب امیر کی سیرت کی اجزائے ترکیبی ہیں۔ اور یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ امیر کے دور میں استاد جیسا شاعر کوئی اور دوسرا نظر نہیں آتا۔ وہ صرف ایک شاعر، عالم، لغت نگار، تذکرہ نگار، مفتی، استاد، سوشل ورک ہی نہیں بلکہ وہ ایک سوشل انجینئر تھے۔ ان کی بہت سی نشانیاں آج بھی موجود ہیں۔

حوالے

(۱) امیر مینائی: مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۱۰۹۔

(۲) ایضاً، ص ۲۶۷۔

(۳) ایضاً، ص ۳۱۲۔

(۴) ممتاز علی آہ: ''امیر مینائی''، ص ۱۷۔

(۵) ایضاً، ص ۳۷۔

(۶) جلیل مانک پوری: ''سوانح امیر مینائی''، ص ۲۶۔

(۷) ''امیر مینائی''، ص ۳۷۔

(۸) ''سوانح امیر مینائی''، ص ۲۶۔

(۹) ''امیر مینائی''، ص ۹۱۔

(۱۰) ایضاً، ص ۹۳۔

(۱۱) ایضاً، ص ۱۰۶۔

(۱۲) ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۳۳۴۔

(۱۳) امیر مینائی، ص ۱۰۶۔

(۱۴) ایضاً، ص ۱۰۱۔

(۱۵) ماہ نامہ، "اردوے معلیٰ"، شمارہ فروری مارچ ۱۹۰۷ء، ص ۲۹۔

(۱۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۴۱۔

(۱۷) ایضاً، ص ۲۵۵۔

(۱۸) ماہ نامہ اردوے معلیٰ، شمارہ فروری مارچ ۱۹۰۷ء، ص ۲۶۔

(۱۹) ڈاکٹر کریم الدین احمد : "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، لاہور آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۳۲۔

(۲۰) ایضاً، ص ۳۷۔

(۲۱) ایضاً، ص ۳۳۔

(۲۲) ایضاً

(۲۳) ایضاً، ص ۳۹۔

(۲۴) ایضاً، ص ۳۵۔

(۲۵) ایضاً، ص ۳۷۔

(۲۶) ایضاً، ص ۳۸۔

(۲۷) ایضاً، ص ۲۷۔

(۲۸) "امیر مینائی"، ص ۱۰۱۔

(۲۹) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۳۶۔

(۳۰) ایضاً، ص ۴۱۔

(۳۱) ایضاً، ص ۴۰۔

(۳۲) ایضاً، ص ۴۱۔

(۳۳) ایضاً، ص ۴۳۔

(۳۴) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۵۱۔

(۳۵) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۴۶۔

(۳۶) ایضاً، ص ۲۵۲۔

(۳۷) ڈاکٹر ابو محمد سحر : "مطالعہ امیر"، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۴۔

(۳۸) ایضاً، ص ۱۲۵۔

(۳۹) ماہ نامہ "اردوے معلیٰ"، لکھنؤ، شمارہ فروری مارچ، ۱۹۰۷ء، ص ۲۷۔
(۴۰) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۳۵۔
(۴۱) ایضاً، ص ۴۱۔
(۴۲) ایضاً، ص ۴۴۔
(۴۳) ایضاً، ص ۵۱۔
(۴۴) "امیر مینائی"، ص ۳۳۔
(۴۵) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۴۷۔
(۴۶) ایضاً، ص ۵۰۔
(۴۷) "مکاتیب امیر"، ص ۳۱۳۔
(۴۸) "مطالعہ امیر"، ص ۱۲۴۔
(۴۹) امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۵۱۔
(۵۰) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۵۱۔
(۵۱) "مطالعہ امیر"، ص ۹۰۔
(۵۲) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۵۶۔
(۵۳) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۵۱۔
(۵۴) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۵۶۔
(۵۵) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۵۱۔
(۵۶) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۴۳۔
(۵۷) ایضاً
(۵۸) ایضاً
(۵۹) ایضاً، ص ۴۴۔
(۶۰) ایضاً، ص ۴۵۔
(۶۱) ایضاً
(۶۲) ایضاً
(۶۳) ایضاً، ص ۴۶۔
(۶۴) ایضاً، ص ۵۲۔

(۶۵) ایضاً، ص ۵۰۔

(۶۶) ایضاً، ص ۵۳۔

(۶۷) ایضاً، ص ۵۶۔

(۶۸) ایضاً

(۶۹) ایضاً

(۷۰) ایضاً

(۷۱) ایضاً، ص ۵۷۔

(۷۲) ''امیر مینائی''، ص ۱۰۱۔

(۷۳) ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، ص ۵۸۔

(۷۴) ایضاً، ص ۵۹۔

(۷۵) ''مطالعہ امیر''، ص ۹۱۔

(۷۶) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۳۳۰۔

(۷۷) ''امیر مینائی''، ص ۱۰۲۔

(۷۸) ایضاً، ص ۱۰۶۔

(۷۹) حکیم نجم الغنی: ''اخبار الصنادید''، لکھنؤ، نول کشور پریس، ص ۱۶۸۔

(۸۰) ''امیر مینائی''، ص ۱۱۲۔

(۸۱) ایضاً

(۸۲) عرفان، عباسی، ''دبستانِ امیر مینائی''، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد، ص ۱۲۔

(۸۳) ''امیر مینائی''، ''امیر اللغات''، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹، ص ۳۔

(۸۴) ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۳۰۔

(۸۵) ایضاً، ص ۳۲۸۔

(۸۶) ایضاً، ص ۳۳۴۔

(۸۷) ایضاً، ص ۳۵۳۔

(۸۸) ایضاً، ص ۲۵۴۔

(۸۹) ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، ص ۶۰۔

(۹۰) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۲۷۶۔

(۹۱) ایضاً

(۹۲) ایضاً، ص ۲۷۵۔

(۹۳) ایضاً، ص ۲۷۶۔

(۹۴) ایضاً، ۱۵۵۔

(۹۵) ایضاً، ص ۱۵۶۔

(۹۶) ایضاً، ص ۳۳۵۔

(۹۷) ایضاً

(۹۸) ''امیر اللغات''، ص ۳۔

(۹۹) ''امیر مینائی''، ص ۱۰۷۔

(۱۰۰) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۵۶۔

(۱۰۱) ایضاً، ص ۳۳۶۔

(۱۰۲) ''نقوش مکاتیب نمبر''، ص ۱۲۴۔

(۱۰۳) ''امیر اللغات''، ص ۱۰۳۔

(۱۰۴) ''امیر مینائی''، ص ۱۰۷۔

(۱۰۵) ''اخبار الصنادید''، ص ۲۹۷۔

(۱۰۶) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۴۴۔

(۱۰۷) ایضاً

(۱۰۸) ''امیر مینائی''، ص ۱۱۸۔

(۱۰۹) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۶۱۔

(۱۱۰) ''ارمغانِ امیر''، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص ۲۹۔

(۱۱۱) ''نیرنگ''، دہلی، امیر نمبر، ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۳۔

(۱۱۲) ایضاً، ص ۱۱۴۔

(۱۱۳) ''امیر مینائی''، ص ۳۵۔

(۱۱۴) ایضاً، ص ۳۰۵۔

(۱۱۵) ایضاً، ص ۳۰۶۔

(۱۱۶) ''نیرنگ''، امیر نمبر، ص ۱۱۴۔

(۱۱۷) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۰۸۔

(۱۱۸) "اخبار الصنادید"، ص ۳۱۸۔

(۱۱۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۱۔

(۱۲۰) غیر مطبوعہ خط، بنام عبدالاحد۔

(۱۲۱) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۵۔

(۱۲۲) ایضاً، ص ۱۶۹۔

(۱۲۳) ایضاً، ص ۲۹۴۔

(۱۲۴) ایضاً، ص ۱۷۰۔

(۱۲۵) ایضاً، ص ۱۷۵۔

(۱۲۶) ایضاً، ص ۱۲۶۔

(۱۲۷) ایضاً، ص ۱۲۵۔

(۱۲۸) ایضاً، ص ۱۲۶۔

(۱۲۹) ایضاً، ص ۳۰۱۔

(۱۳۰) "امیر مینائی"، ص ۱۲۰۔

(۱۳۱) ایضاً،

(۱۳۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۷۸۔

(۱۳۳) نعیم الحق آزاد شیخ پوری: "حیات الشعراء"، میر پور خاص سندھ، بلدیہ میر پور خاص، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵۵۔

(۱۳۴) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۱۲۸۔

(۱۳۵) ایضاً، ص ۱۲۹۔

(۱۳۶) ایضاً، ص ۱۷۶۔

(۱۳۷) ایضاً، ص ۱۱۲۔

(۱۳۸) ایضاً، ص ۱۳۴۔

(۱۳۹) ایضاً، ص ۱۳۲۔

(۱۴۰) ایضاً، ص ۱۴۸۔

(۱۴۱) ایضاً، ص ۱۳۴۔

(۱۴۲) ایضاً، ص ۱۸۱۔

(۱۱۷) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۰۸۔

(۱۱۸) "اخبار الصنادید"، ص ۳۱۸۔

(۱۱۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۱۔

(۱۲۰) غیر مطبوعہ خط، بنام عبدالاحد۔

(۱۲۱) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۵۔

(۱۲۲) ایضاً، ص ۱۶۹۔

(۱۲۳) ایضاً، ص ۲۹۴۔

(۱۲۴) ایضاً، ص ۱۷۰۔

(۱۲۵) ایضاً، ص ۱۷۵۔

(۱۲۶) ایضاً، ص ۱۲۶۔

(۱۲۷) ایضاً، ص ۱۲۵۔

(۱۲۸) ایضاً، ص ۱۲۶۔

(۱۲۹) ایضاً، ص ۳۰۱۔

(۱۳۰) "امیر مینائی"، ص ۱۳۰۔

(۱۳۱) ایضاً،

(۱۳۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۷۸۔

(۱۳۳) نعیم الحق آزاد شیخ پوری: "حیات الشعراء"، میر پور خاص سندھ، بلدیہ میر پور خاص، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵۵۔

(۱۳۴) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۱۲۸۔

(۱۳۵) ایضاً، ص ۱۲۹۔

(۱۳۶) ایضاً، ص ۱۷۶۔

(۱۳۷) ایضاً، ص ۱۱۲۔

(۱۳۸) ایضاً، ص ۱۳۴۔

(۱۳۹) ایضاً، ص ۱۳۲۔

(۱۴۰) ایضاً، ص ۱۴۸۔

(۱۴۱) ایضاً، ص ۱۳۴۔

(۱۴۲) ایضاً، ص ۱۸۱۔

(۱۶۹) ایضاً، ص ۲۸۴۔

(۱۷۰) ایضاً، ص ۳۴۶۔

(۱۷۱) ایضاً، ص ۱۴۱۔

(۱۷۲) ایضاً، ص ۲۱۵۔

(۱۷۳) ایضاً، ص ۲۱۶۔

(۱۷۴) ایضاً، ص ۲۱۷۔

(۱۷۵) ایضاً، ص ۲۱۸۔

(۱۷۶) ایضاً، ص ۳۰۹۔

(۱۷۷) ایضاً، ص ۱۷۲۔

(۱۷۸) ایضاً، ص ۲۲۷۔

(۱۷۹) ایضاً، ص ۳۰۹۔

(۱۸۰) ایضاً، ص ۳۴۸۔

(۱۸۱) ایضاً، ص ۲۱۸۔

(۱۸۲) ایضاً، ص ۳۱۰۔

(۱۸۳) "نقوش" "مکاتیب نمبر، ص ۱۲۷۔

(۱۸۴) "مکاتیبِ امیر"، ص ۲۲۰۔

(۱۸۵) ایضاً، ص ۳۴۸۔

(۱۸۶) ایضاً، ص ۲۲۱۔

(۱۸۷) "امیر مینائی"، ص ۱۲۸۔

(۱۸۸) ایضاً

(۱۸۹) ایضاً، ص ۱۳۰۔

(۱۹۰) ایضاً، "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۴۹۔

(۱۹۱) ایضاً، ص ۲۲۳۔

(۱۹۲) اس خط پر ۵ / جون ۱۸۹۳ء درج ہے۔ لیکن اصل میں یہ خط ۵ / جون ۱۸۹۷ء کا ہے۔ اس لیے کہ اس میں سفر بھوپال کا حوالہ ملتا ہے۔ جہاں سے امیر کی بھرپور معاونت ہوتی تھی جیسا کہ اس خط میں ہے کہ : "ریاست بھوپال سے قدر دانی ہوئی اور میری حیثیت سے بڑھ کر ہوئی"، اور غالباً یہ خط بھوپال سے واپسی میں قیام لکھنؤ کے زمانے میں لکھا گیا۔

(۱۹۳) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۸۰۔

(۱۹۴) ایضاً، ص ۲۲۵۔

(۱۹۵) ایضاً، ص ۱۱۷۔

(۱۹۶) ایضاً، ص ۱۲۴۔

(۱۹۷) ایضاً، ص ۲۲۷۔

(۱۹۸) ایضاً، ص ۲۲۸۔

(۱۹۹) ایضاً، ص ۲۲۹۔

(۲۰۰) ایضاً، ص ۲۳۰۔

(۲۰۱) ایضاً

(۲۰۲) ایضاً، ص ۳۰۰۔

(۲۰۳) "نقوش" مکاتیب نمبر، ص ۱۲۸۔

(۲۰۴) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۳۲۔

(۲۰۵) "حیات الشعراء"، ص ۱۶۱۔

(۲۰۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۳۵۔

(۲۰۷) ایضاً، ص ۳۳۶۔

(۲۰۸) ایضاً

(۲۰۹) "نقوش مکاتیب نمبر"، ص ۱۲۸۔

(۲۱۰) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۳۲۴۔

(۲۱۱) ایضاً

(۲۱۲) "نقوش مکاتیب نمبر"، ص ۱۲۸۔

(۲۱۳) "مکاتیب امیر مینائی"، ص ۲۳۷۔

(۲۱۴) ایضاً، ص ۳۲۴۔

(۲۱۵) ایضاً، ص ۳۵۱۔

(۲۱۶) ایضاً، ص ۲۳۷۔

(۲۱۷) "امیر مینائی"، ص ۲۳۸۔

(۲۱۸) ایضاً، ص ۳۰۴۔

(۲۱۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۳۱۔

(۲۲۰) ایضاً

(۲۲۱) ایضاً، ص ۲۴۰۔

(۲۲۲) ایضاً، ص ۳۳۶۔

(۲۲۳) ایضاً، ص ۳۳۷۔

(۲۲۴) "نقوش"، شخصیات نمبر، حصہ دوم، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۹۷۔

(۲۲۵) "امیر مینائی"، ص ۱۳۴۔

(۲۲۶) میکش حیدر آبادی: "یادگار امیر مینائی"، دہلی، مطبع رحمانی، ۱۹۰۳ء، ص ۱۱۔

(۲۲۷) مکاتیبِ امیر مینائی، ص ۲۸۶۔

(۲۲۸) ایضاً،

(۲۲۹) ایضاً

(۲۳۰) نقوش، شمارہ ۱۲۴، ص ۲۴۳۔

(۲۳۱) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۳۹۔

(۲۳۲) ماہ نامہ "الناظر"، لکھنؤ، جون ۱۹۱۲ء، ص ۳۳۔

(۲۳۳) ایضاً، ص ۳۴۔

(۲۳۴) "سوانح امیر مینائی"، ص ۵۵۔

(۲۳۵) ماہ نامہ "الناظر"، لکھنؤ، جون ۱۹۱۲ء، ص ۳۴۔

(۲۳۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۸۶۔

(۲۳۷) ماہ نامہ "الناظر"، لکھنؤ، جون ۱۹۱۲ء، ص ۳۴۔

(۲۳۸) ایضاً

(۲۳۹) سوانح امیر، ص ۵۶۔

(۲۴۰) ایضاً

(۲۴۱) ایضاً

(۲۴۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۴۶۔

(۲۴۳) ایضاً، ص ۳۰۸۔

(۲۴۴) ایضاً، ص ۳۰۸۔

(۲۴۵) ایضاً، ص ۲۲۳۔

(۲۴۶) ایضاً، ص ۲۲۵۔

(۲۴۷) ایضاً، ص ۳۰۱۔

(۲۴۸) ایضاً، ۳۰۳۔

(۲۴۹) ایضاً، ص ۳۳۲۔

(۲۵۰) ایضاً، ۳۴۴۔

(۲۵۱) ایضاً، ص ۳۰۴۔

(۲۵۲) ایضاً، ص ۳۰۵۔

(۲۵۳) ایضاً، ص ۱۵۷۔

(۲۵۴) ایضاً، ص ۱۵۸۔

(۲۵۵) ایضاً، ص ۱۶۰۔

(۲۵۶) ایضاً، ص ۱۳۶۔

(۲۵۷) ایضاً، ص ۳۱۱۔

(۲۵۸) "حیات الشعراء"، ص ۲۵۴۔

(۲۵۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۵۴۔

(۲۶۰) ایضاً، ص ۳۵۹۔

(۲۶۱) ایضاً، ص ۳۵۸۔

(۲۶۲) ایضاً، ص ۱۵۸۔

(۲۶۳) ایضاً، ص ۱۷۳۔

(۲۶۴) ایضاً، ص ۲۱۱۔

(۲۶۵) "امیر مینائی"، ص ۳۰۷۔

(۲۶۶) "نقوش مکاتیب نمبر"، ص ۳۰۷۔

(۲۶۷) "نقوش مکاتیب نمبر"، ص ۱۲۵۔

(۲۶۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۱۲۔

(۲۶۹) ایضاً، ص ۲۳۲۔

(۲۷۰) ایضاً، ص ۲۲۷۔

(۲۷۱) ایضاً، ص ۱۳۶۔
(۲۷۲) ایضاً، ص ۲۶۹۔
(۲۷۳) ایضاً، ص ۲۰۵۔
(۲۷۴) ایضاً، ص ۲۰۷۔
(۲۷۵) ایضاً، ص ۲۰۸۔
(۲۷۶) ایضاً، ص ۱۰۹۔
(۲۷۷) ایضاً، ص ۱۵۰۔
(۲۷۸) ایضاً، ص ۳۰۷۔
(۲۷۹) ایضاً، ص ۳۱۴۔
(۲۸۰) ایضاً، ص ۳۱۳۔
(۲۸۱) "امیر مینائی"، ص ۳۰۷۔
(۲۸۲) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۸۹۔
(۲۸۳) ایضاً، ص ۲۱۰۔
(۲۸۴) ایضاً، ص ۲۹۲۔
(۲۸۵) ایضاً، ص ۱۷۸۔
(۲۸۶) ایضاً، ص ۱۷۹۔
(۲۸۷) ایضاً، ص ۱۸۰۔
(۲۸۸) ایضاً، ص ۲۴۸۔
(۲۸۹) ایضاً، ص ۲۹۸۔
(۲۹۰) ایضاً، ص ۱۸۹۔
(۲۹۱) ایضاً، ص ۱۵۸۔
(۲۹۲) "سوانحِ امیر"، ص ۲۶۔
(۲۹۳) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۴۴۔
(۲۹۴) ایضاً، ص ۲۴۶۔
(۲۹۵) "سوانحِ امیر"، ص ۲۶۔
(۲۹۶) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۸۴۔

(۲۹۷) "امیر مینائی"، ص ۳۳۔
(۲۹۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۸۸۔
(۲۹۹) ایضاً، ص ۱۸۰۔
(۳۰۰) ایضاً، ص ۱۸۱۔
(۳۰۱) ایضاً، ص ۱۶۹۔
(۳۰۲) ایضاً، ص ۱۷۳۔
(۳۰۳) ایضاً، ص ۱۷۶۔
(۳۰۴) ایضاً، ص ۲۰۱۔
(۳۰۵) ایضاً، ص ۲۰۲۔
(۳۰۶) ایضاً، ص ۱۰۹۔
(۳۰۷) امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۳۹۔
(۳۰۸) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۳۰۶۔
(۳۰۹) داغ : زبانِ داغ،
(۳۱۰) "امیر مینائی"، ص ۲۰۔
(۳۱۱) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۳۔
(۳۱۲) ایضاً، ص ۳۷۵۔
(۳۱۳) "امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، ص ۵۶۔
(۳۱۴) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۱۴۔
(۳۱۵) "نقوش" مکاتیب نمبر ۱۲۵۔
(۳۱۶) "حیات الشعراء"، ص ۲۶۳۔
(۳۱۷) "امیر مینائی"، ص ۳۴۔
(۳۱۸) ایضاً
(۳۱۹) "مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۶۴۔
(۳۲۰) ایضاً، ص ۳۰۶۔
(۳۲۱) ایضاً، ص ۳۰۶۔
(۳۲۲) ایضاً، ص ۳۳۹۔

(۳۲۳)　ایضاً، ص ۱۵۱۔

(۳۲۴)　ایضاً، ص ۳۲۱۔

(۳۲۵)　ایضاً، ص ۳۳۳۔

(۳۲۶)　ایضاً، ص ۲۹۹۔

(۳۲۷)　"نقوش"، خطوط نمبر، ۱۹۶۸ء، ص ۳۳۶۔

(۳۲۸)　"امیر مینائی"، ص ۱۱

(۳۲۹)　ایضاً

(۳۳۰)　"مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۸۶۔

(۳۳۱)　ایضاً، ص ۲۱۶۔

(۳۳۲)　ایضاً، ص ۳۲۴۔

(۳۳۳)　ایضاً، ص ۲۵۶۔

(۳۳۴)　"حیات الشعراء"، ص ۳۶۱۔

(۳۳۵)　"امیر مینائی"، ص ۳۲۲۔

(۳۳۶)　"نقوش"، مکاتیب نمبر، ص ۱۲۷۔

(۳۳۷)　"مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۹۷۔

(۳۳۸)　"حیات الشعراء"، ص ۲۵۹۔

(۳۳۹)　ایضاً، ص ۲۷۱۔

(۳۴۰)　"مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۷۶۔

(۳۴۱)　ڈاکٹر ابو محمد سحر نے "مطالعہ امیر" میں "علم جعفر سے متعلق دو رسائل کا تذکرہ کیا ہے ان میں "رموز غیبیہ" نایاب ہے۔ جب کہ "رمز الغیب" رضا لائبریری، رام پور میں محفوظ ہے۔ ص ۱۲۳۔

(۳۴۲)　"مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۱۹۸۔

(۳۴۳)　"امیر مینائی"، ص ۱۱۲۔

(۳۴۴)　"امیر مینائی اور ان کے تلامذہ" ص ۳۶۔

(۳۴۵)　ایضاً، ص ۴۱۔

(۳۴۶)　"مکاتیبِ امیر مینائی"، ص ۲۵۷۔

۳۴۷)　"نقوش مکاتیب نمبر"، ص ۲۹۶۔

(۳۴۸) ”مکاتیبِ امیر مینائی“، ص ۲۶۵۔

(۳۴۹) ”امیر مینائی اور ان کے تلامذہ“، ص ۴۱۔

(۳۵۰) ”نیرنگ“، دہلی، امیر نمبر، ص ۱۱۳۔

(۳۵۱) ایضاً

(۳۵۲) ”مکاتیبِ امیر مینائی“، ص ۲۵۶۔

(۳۵۳) ”نقوش“، مکاتیب نمبر، ص ۱۲۹۔

(۳۵۴) ہماری زبان علی گڑھ، یکم نومبر ۶۳ء، ص ۸۔

(۳۵۵) ایضاً، ص ۹۔

(۳۵۶) ”مکاتیبِ امیر مینائی“، ص ۳۱۷۔

(۳۵۷) ایضاً، ص ۳۱۹۔

(۳۵۸) ایضاً

(۳۵۹) دیکھیں حوالہ نمبر ۳۵۱۔

(۳۶۰) ”مکاتیبِ امیر مینائی“، ص ۲۵۷۔

(۳۶۱) ایضاً، ص ۲۵۶۔

(۳۶۲) ایضاً

(۳۶۳) ایضاً، ص ۱۶۶۔

(۳۶۴) ایضاً، ص ۲۰۹۔

(۳۶۵) ایضاً، ص ۲۲۸۔

(۳۶۶) ایضاً، ص ۳۳۷۔

(۳۶۷) ایضاً، ص ۳۴۱۔

(۲۶۸) ایضاً، ص ۳۴۴۔

(۳۶۹) ایضاً، ص ۳۵۰۔

(۳۷۰) ایضاً، ص ۳۵۴۔

(۳۷۱) ایضاً

(۳۷۲) ایضاً

(۳۷۳) ایضاً

(۳۷۴) ایضاً

☆☆☆

باب ہشتم

امیر و داغ کے مکتوبات کا تقابلی مطالعہ

امیر کو اپنی زندگی میں جو شہرت ملی، وہ شاعر، تذکرہ نگار اور لغت نگار کی حیثیت سے تھی۔ نثر نگار کی حیثیت سے وہ خطوط کے منظر عام پر آجانے کے بعد مقبول ہوئے۔ حالانکہ تذکرہ ''انتخاب یادگار'' اور کئی مذہبی رسائل شائع ہو چکے تھے۔ لیکن امیر کے دور میں سرسید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، آزاد شبلی، مولوی ذکاءاللہ وغیرہم کے سامنے کسی دوسرے کا چراغ جلنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے امیر نمایاں نہیں ہو سکے۔

امیر کی نثر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مکتوبات

۲۔ تذکرہ، مذہبی تصانیف اور چند دیباچے و تقریظیں۔

لیکن امیر کے نثری جوہر مکتوبات ہی میں نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مذہبی تصانیف، تذکرہ اور دیباچے و تقریظیں، ان کی نثر کے ارتقاء کا پتا دیتے ہیں۔ جب کہ خطوط انھیں نثر نگاروں کی صف میں شامل کراتے ہیں۔

امیر کے دور میں مکتوب نگاروں کی صف بندی کی جائے تو بہت سے نام سامنے آتے ہیں۔ ان میں سرسید، حاؔلی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاؔد، شبؔلی، منشی ذکاءاللہ، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، شاد عظیم آبادی اور داغ دہلوی وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ان میں داغ کو امیر کا اہم معاصر قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کا تعلق دربار رام پور سے رہا۔ جہاں امیر لکھنؤ اور داغ دبستانِ دہلی کی نمایندگی کرتے تھے۔ چناں چہ اس باب میں امیر و داغ کے خطوط کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔ داغ، امیر کے وہ معاصر ہیں، جن کے کلام کا موازنہ ان کی زندگی میں بھی کیا جاتا رہا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ راقم ناچیز کے پاس امیر و داغ کے کلام سے متعلق بیس کے لگ بھگ تقابلی مطالعے موجود ہیں۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ دونوں کے خطوط کا موازنہ پیش کیا جارہا ہے۔

امیر کے مکاتیب، زیادہ تر ان کے تلامذہ کے نام ہیں۔ لیکن دوست احباب، معاصرین، والیانِ رام پور علماء، فضلاء اور اہل سلوک کے نام بھی ان کے بکثرت خطوط ملتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں داغ کے خطوط تلامذہ، والیانِ رام پور، اور ارباب نشاط کے نام ہیں۔ امیر کے مقابلے میں داغ کے مکاتیب کی مقدار بہت کم ہے۔ پروفیسر عتیق احمد صدیقی کے مطابق دو سو انتالیس ہے۔ (۱) جب کہ نعیم الحق آزاد شیخ پوری نے سولہ خطوط اپنی کتاب ''حیات الشعراء'' (۲) میں شامل کیے ہیں۔ اس طرح داغ کے کل خطوط دو سو پچپن کے لگ بھگ ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ داغ کے خطوط بس اتنے ہی ہیں۔ یقیناً رسائل میں بھی بکھرے ہوئے ملیں گے۔ داغ کے مقابلے میں امیر کے خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اندازاً ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) کے لگ بھگ۔ جس کی تفصیل باب اول میں پیش کی گئی ہے۔

داغ کے زیادہ تر خطوط بہت سادہ اور خشک ہیں۔ لیکن ایسے مکتوبات بھی ہیں جن میں زبان اور انشا پردازی کی شان جھلکتی ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ داغ نے خطوط، دل لگا کر تحریر نہیں کیے۔ ان کے یہاں نجی خطوط زیادہ ہیں۔ رومانوی خطوط اس سے کم، علمی خطوط برائے نام اور خاص ادبی شان رکھنے والے خطوط کی مقدار بھی کم ہی ہے۔ گویا داغ کے اس دعوے کے مطابق خطوط بہت کم ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ، ہمیں جانتے ہیں ، داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

امیر کے یہاں بھی بکثرت خطوط کا طرزِ تحریر سادہ اور خشک ہے۔ لیکن امیر کی شخصیت اور ان کی علمیت کا پرتو ان میں نظر آتا ہے۔ اس لیے محض روکھے پھیکے قرار نہیں دیے جاتے۔ یوں داغ کی طرح امیر پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے خط توجہ سے لکھے، یا نہیں لکھے۔ امیر کے مختصر اور طویل دونوں طرح کے خطوط میں مدعا نگاری اور نظم وضبط ہے۔ داغ کے بیشتر خطوط ان باتوں سے عاری ہیں۔ داغ کے یہاں عوامی اور بازاری پن ہے۔ جب کہ امیر کے یہاں استادانہ شان کے ساتھ بے تکلفی اور رکھ رکھاؤ ہے۔ جو مصنوعی پن سے پاک ہے۔ امیر کے یہاں زیادہ تر خطوط نجی نوعیت کے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد علمی خطوط کی اور تقریباً یہی صورتحال ادبی طرزِ تحریر کے حامل مکاتیب کی ہے۔ البتہ رومانوی خط ایک بھی نہیں ہے۔

ہمارے علم کے مطابق، داغ کی بہ نسبتاً، امیر کے مکتوبات پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر کے خطوط میں عروضی مسائل زبان، محاورات، لغت، تذکیر و تانیث وغیرہ کے حوالے سے بہ کثرت معلومات ملتی ہیں اور پھر ان خطوط کا ایسا مزاج ہے۔ جس میں امیر کی شخصیت کے ساتھ زبان کا لطف ملتا ہے۔ عابد کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں:

''حکیم صاحب! گیا کے سفر سے پہلے، اب کی بار دو چار دن کے لیے آپ رام پور ضرور آئیں اور اپنے دیدار فرحتِ آثار سے مسرور کریں۔ اگر ایسا نہ ہو، تو مجھے نہایت حسرت رہے گی اور ملال رہے گا۔'' (۳)

اب داغ کا اندازِ تحریر ملاحظہ کیجیے:

''آپ کا خط پہنچا، غزلیں پہنچیں، فرصت میں جواب لکھوں گا۔ نواب خورشید جاہ کے انتقال سے یہاں بڑا صدمہ ہے۔ دو کارڈ آپ کے نام آئے تھے۔ ملفوف ہیں۔ یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ سفر دور دراز کرنا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کئی مہینے بعد آپ کا آنا ہوگا۔ مطبع کو آپ کچھ لکھتے رہتے ہیں یا نہیں۔ گلدستہ تو چھپ کر بٹ گیا۔ پرچہ تم کو پہنچا ہوگا۔'' (۴)

پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے داغ کے طرزِ تحریر پر کڑی تنقید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اردو کے اس صاحب طرز شاعر اور زبان کے پارکھ بلکہ محاورہ و روزمرہ کی روایت کے پاسبان کے مکاتیب میں کوئی ادبی شان پیدا نہ ہو سکی۔ ان میں نہ روزمرہ کی چاشنی نظر آتی ہے، نہ محاورات کی برجستگی نہ ندرتِ ادا کی کوئی اور خوبی۔ بلکہ اکثر مقامات پر زبان و بیان کی ناہمواریاں اور اغلاط نظر آتی ہیں۔'' (۵)

پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے داغ کے طرزِ تحریر کی کمزوریوں پر سخت گرفت کی ہے۔ ''شتر گربگی''، آپ اور تم یا ان سے بننے والے فعلی صیغوں کا تبادل اور ''تعقیہ لفظی'' کے عیب کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''فصیح اللغات کو نہ آپ چھپواتے ہو اور نہ اوروں کو اجازت دیتے ہو۔'' (۶)

''اپنے اخبار میں دیوان کے آنے کی کیفیت لکھی ہے۔ اس کی نقل جلد بھجوا دو، چھپنے کی جلد کیفیت لکھو، اپنی خیریت سے جلد آپ آگاہ کریں۔''(۷)

ایک اور حوالہ ملاحظہ کیجیے:

''آپ نے جو پلندہ بھیجا ہے۔ اس میں جا جسم بھی ہے اور آپ کا اسباب بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ریل پر پڑا ہوگا۔ اور ٹھہرا رہے گا، تم نے وہ اسباب میرے نام کیوں نہ بھیجا، سید افتخار عالم صاحب کا پتا لکھو، وفا کی بابت جو میں نے انھیں لکھا تھا، ان سے دریافت کر کے تم نے کوئی جواب نہ لکھا، جلد جواب دو، بچوں کو دعا، سب دوستوں کی طرف سے سلام پہنچے۔''(۸)

مذکورہ خط میں داغ نے احسن مارہروی سے اسباب نہ پہنچنے کی شکایت کی ہے۔ اب اسباب نہ پہنچنے کی ایک شکایت امیر سے بھی سنیے:

''کتاب کا انتظار تھا۔ پلندہ پر رام پور کے ساتھ راجپوتانہ لکھ گیا تھا۔ وہ راجپوتانہ کی سیر کرتا ہوا، آج سولہویں دن مجھ تک پہنچا۔ یہ ملک تو روہیلکھنڈ کہلاتا ہے اور ممالک مغربی وشمالی میں داخل ہے۔ ڈاک گاڑی لکھنؤ سے سات گھنٹے میں رام پور پہنچتی ہے۔ مراد آباد جانے کی زحمت اب نہیں ہے۔ مغل سرا سے چلی ہوئی گاڑی سیدھی رام پور ہوتی ہوئی سہارنپور کو جاتی ہے۔

تحریر گرامی سے تصانیف کا ذخیرہ تلف ہونا اور قرآن مجید کا حال (جس کی نظیر دنیا میں نہیں) معلوم کر کے سخت قلق ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ اس پر جس قدر افسوس کیا جائے بجا ہے۔ زیادہ بجز سپاس گذاری کیا عرض کروں۔ آپ کی عنایات کا شکر تو محال ہے، شکر کا اظہار بھی پورا پورا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔''(۹)

امیر کے مقابلے میں داغ کے خطوط کی فضا ہی اور ہے۔ ایسا لگتا ہے، کسی عالم کی صحبت سے اٹھ کر کسی بس اسٹاپ پر آکر بیٹھ گئے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داغ بے تکلف انسان تھے قلعلے کے بے پروا ماحول جہاں ان کا لڑکپن اور نوجوانی کا عرصہ گذرا، اس کے بعد ارباب نشاط سے راہ و رسم نے بے تکلفی کو پھکڑپن میں تبدیل کر دیا۔ داغ کا یہ انداز ان کے غیر مستقل مزاج کے ایک رخ کو بھی پیش کرتا ہے۔ داغ کے مزاج کا اتار چڑھاؤ ان کا بے تکلف مزاج خطوط میں کبھی تو بھلا معلوم ہوتا ہے اور کبھی نہایت عامیانہ، یہی وجہ ہے کہ ان کے مکتوبات کی فضا ایسی گرد آلود نظر آتی ہے جیسے ہم ایک عاشق مزاج کے خط تو کہہ سکتے ہیں لیکن کسی بڑے شاعر یا انسان کے کہنے میں تامل ہوتا ہے۔ الغرض داغ کے خطوط میں ایسا رنگ نہیں ملتا جو اردو مکتوب نگاری میں قابلِ ذکر جگہ پاتا۔

داغ کے مزاج کی آزادروی، شاعری میں تو اچھی لگتی ہے، لیکن نثر میں بہت سطحی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے انھیں مکتوب نگاری سے وہ شہرت نہ مل سکی، جو شاعری میں حاصل ہوئی۔ داغ مخصوص مزاج کی خواتین سے خصوصی رغبت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے رکھ رکھاؤ میں اس کا اثر تھا۔ اور یہ اثر تحریر میں بھی نظر آتا ہے۔

''ہاں ہاں میں اپنے ہاتھوں کے قربان کے صحیفہ مینائی ہاتھ آیا۔ اشعار متفرق پہنچے۔''(۱۰)

یہی بات ایک سادگی کے ساتھ بھی کہی جا سکتی تھی۔ لیکن مزاج اور ماحول کا اثر ان کے خط سے اتنا عیاں ہے کہ تحریر کی ادبی شان مجروح

ہوتی ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے:

''داغ کو جلا کر، خاک میں ملا کر، آپ لکھنؤ چلے گئے۔ خیر صبر وشکر، چوں کہ یہ بے وفائی اور کج ادائی، آپ نے اڑائی ہے۔ ہم بھی مہتمم سمجھے۔ اے شخص، اللہ رے، تیرا دماغ، چلتے وقت ملنا اور اس تمکنت اور اس استغنا کے ساتھ، رحم نہ آیا، ترس نہ کھایا کہ ایک کشتۂ فراق تڑپ رہا ہے۔ اس کی دل جوئی کیجیے یا اس کی تلافی یہ ہوئی کہ، لو ہم جاتے ہیں۔ اچھا جاؤ، غارت ہو، دہرا صبر کرلیں گے۔''(۱۱)

داغ کی طبیعت مکتوب نگاری پر مائل نہیں تھی اور وہ نثر نگاری کا مزاج بھی نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ ان کا مزاج احتیاط پسندی کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ کہ اپنے لکھے کو دوبارہ دیکھ لیں۔ لیکن چوں کہ احباب کے ساتھ ان کا رویہ بے تکلفانہ والہانہ اور محبت سے سرشار تھا۔ زبان پر بے شک شکوہ وشکایت تھا۔ لیکن دل صاف تھا۔ اس لیے داغ کے دوست اور تلامذہ انھیں پسند کرتے تھے۔ داغ جیسے ظاہر میں تھے۔ ویسے ہی خطوط میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس لیے تلامذہ کو داغؔ کی مکتوب نگاری کا یہی انداز پسند تھا۔

داغ کی طرح امیر کے خطوط بھی ان کے مزاج کے مطابق ہیں۔ لیکن کیوں کہ امیر ایک صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ علمیت ان کی بڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے خطوط میں احتیاط پسندی، اپنے منصب کا گہرا احساس ملتا ہے۔ مثلاً امیر کے ایک شاگرد نے مشاعرے کے لیے ان سے غزل کی فرمائش کی۔ امیر نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی مصروفیات سے انھیں آگاہ کرتے ہیں اور معذرت کر لیتے ہیں:

''آپ اپنے مشاعرے کے لیے مجھ سے غزل طلب فرماتے ہیں۔ میں اس زمانہ میں بہت ہی رنجور اور معذور ہو رہا ہوں۔ خود بیمار اور کئی بیماروں کا پرستار رہتا ہوں۔ جو وقت فرصت واطمینان کا ملتا بھی ہے، وہ ''امیر اللغات'' کی تالیف وتصنیف میں صرف ہوتا ہے۔ شعر وسخن کا مشغلہ مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ آپ کے حسنِ اخلاق سے امید ہے کہ عذر میرا قبول کر کے مجھ کو معاف فرمائیں گے۔''(۱۲)

داغ کے ایک شاگرد نے ان سے غزل کی فرمائش کی۔ اب امیر کے مقابلے میں داغ کا جواب ملاحظہ کیجیے:

''تم مجھ کو غزل لکھنے کو کہتے ہو۔ اگر میرا حال دیکھو اور میرے گھر کی کیفیت سنو۔ تو ایسا خیال بھی نہ کرو۔ مجھ کو اپنی زندگی میں کلام ہے۔ ع

'' تمھیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اپنی جان جاتی ہے۔''(۱۳)

امیر نے اپنا کلام ''سراج سخن'' میں اشاعت کے لیے بہ فرمائش مدیر بھیجا، لیکن کلام نفاست سے شائع نہ ہوا۔ تو امیر نے اپنے ایک دوست سے یہ شکایت کی کہ:

''مالک سراج سخن نے مجھ سے بھی غزل کے واسطے بہت ہی اصرار کیا۔٭٭٭ بہ مجبوری میں نے بھی گذشتہ گلدستے کے واسطے چند شعر موزوں کر کے بھیجے، پرچہ چھپ کر جو آیا، اس کو دیکھ کر جی خوش نہ ہوا۔ کاغذ برا، چھپائی ناقص خط بھی اچھا نہیں۔''(۱۴)

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ داغ کے ساتھ بھی پیش آیا۔ داغ کی شکایت طباعت سے متعلق نہ تھی، بلکہ کلام میں نقص تھا اور مدیر نے شائع

کر دیا۔ گویا امیر کو شکایت بھی اصل میں مدیر ہی سے تھی اور داغ کو بھی۔ لیکن امیر کے مقابلے میں داغ کا انداز ملاحظہ کیجیے:

''اہلِ انتخاب کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ، غلط کلام کو نہ چھاپیں، مگر یہ معلوم نہیں کہ نا معلوم صاحبانِ انتخاب کس کھیت کے ہیں۔'' (۱۵)

امیر نے ایک شاگرد کے کلام پر اصلاح کے دوران یہ اعتراض کیا۔

''غزل دیکھی، زمین کے سست ہونے سے اکثر شعر سست ہیں۔ جو شعر میرے نزدیک دیکھ لینے کے ہیں ان پر صاد ہیں۔'' (۱۶)

داغ نے ایک شاگرد کے کلام پر یہ اصلاح دی۔

''ابھی اس زمین میں، بہت جان ہے، مجھے غزل پسند نہیں آئی اور شعر کہہ کر بھیجو، نہ پہلو دیکھتے ہو، نہ سمجھتے ہو، مصرعہ طرح کرنا تم کو نہیں آتا۔ مزاج میں جلدی بہت ہے، اگر گلدستہ، ان کے بعد نکلا تو کیا کفر ہوگا۔'' (۱۷)

امیر کے خطوط میں بے تکلفی ڈری ڈری معلوم ہوتی ہے۔ جب کہ داغ کے یہاں بے پروائی میں ڈوبی ہوئی۔ اور مزاح تو امیر کے خطوط میں ہاتھ باندھے احترام سے کھڑا نظر آتا ہے۔ ایک مرتبہ سردیوں کے موسم میں امیر نے اپنے ایک شاگرد منشی امتیاز احمد خاں راز کو لکھا کہ کچھ ''کھورا'' اور ''اپلے'' بھیج دینا۔ انھیں تاخیر ہوئی تو امیر نے یاد دہانی کے خط میں شوخی کے ساتھ لکھا کہ:

''پیارے راز۔ ایک مطلع تھر تھرائے ہوئے دل سے کہا ہے اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لکھا ہے۔ سنو اور اس کی قدر کرو۔

''نہیں کچھ تاپنے کو، دست و پا سردی سے اولے ہیں
نہ کھورا ہے، نہ کنڈے ہیں، نہ سینٹھے ہیں، نہ کولے ہیں'' (۱۸)

اب داغ کا مزاح ملاحظہ کیجیے۔ اس نثر میں مزاح کا اصل ذائقہ اور نظر آئے گی۔

''آپ نے فرخ آباد کے لوٹوں کی فرمائش پر مجھے لکھا تھا کہ یہاں کے لوٹے بدوضع ہوتے ہیں، میں آپ کی بات نہ مانا اور لوٹے منگائے، خدا کی قسم بڑھاپے میں بھی میں ان لوٹوں سے زیادہ خوبصورت ہوں۔'' (۱۹)

داغ کے رومانوی خطوط اسلوب کے لحاظ سے بہت عمدہ اور قابلِ توجہ ہیں۔ اس میں ملنے والے جذبات سے خطا نظر کر کے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ خطوط انھوں نے بہت توجہ سے لکھے ہیں۔ منی بائی حجاب کے نام خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''دشمن جانی! سلام شوق، عین انتظار میں تمھارا محبت نامہ دستیاب ہوا، کئی بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا، چوما اور چھاتی پر دھرا، تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ، یہ کر لوگے۔ جب ہی تمھارے پاس آؤں گی۔ خوب تم کو بھول جاؤں۔

تو بھولنے کی چیز کی چیز نہیں خوب یاد رکھ
ناداں کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آ جاؤ، پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے تمھاری ہر بات منظور ہے، لکھو کہ کب آ رہی ہو۔'' (۲۰)

داغ کے عشقیہ خطوط میں بازاری پن اور ہوس ہے۔ عشق و محبت کا کوئی بلند فلسفہ کوئی خیال، کوئی احساس نہیں، محض شکوے شکایت اور چوما چاٹی کی سطحی خواہش اور بس۔

'' غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو، پاس ہوتیں تو سیر ہوتی، کبھی تمھارے گرد گھومتا اور شعلہ جوالا بن جاتا، کبھی تمھیں شمع قرار دیتا اور پتنگا بن کر قربان ہو، ہو جاتا، کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہو جاتا، ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی ہے کہ یہ دوسرا خط لکھوانے لگا۔ خدا کے واسطے جلد آ جاؤ یا تاریخ آمد مقرر کر کے اطلاع دو، شب و روز انتظار میں گزرتے ہیں۔'' (۲۱)

امیر کے یہاں عشقیہ خطوط نہیں ملتے لیکن ان کے یہاں زندگی کا پاکیزہ فلسفہ، محبت اور عشق کا وہ رویہ ملتا ہے جو ایک صوفی یا ایک عالم سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اصل میں امیر اور داغ دو مختلف مزاج کے انسان تھے۔ امیر دینوی سطح پر بڑھے ہوئے تھے تو داغ دنیاوی سطح پر، امیر کے مزاج میں ٹھہراؤ تھا، تو داغ میں سیمابیت تھی۔ امیر احتیاط پسند تھے تو داغ میں بہت عجلت تھی۔ داغ میں خود پسندی اور خودنمائی حد درجہ بڑھی ہوئی تھی۔ جب کہ امیر خوش لباس، خوش خوراک کی نفاست پسند اور نازک مزاج تھے۔ داغ جلد برامان جاتے تھے۔ امیر صبر کر جاتے تھے۔ الغرض یہ مزاج کا فرق ہے جو دونوں کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔

اب بات صرف اندازِ تحریر اور خطوط کی نوعیت کی رہ جاتی ہے۔ تو امیر، داغ سے آگے بڑھے ہیں۔ انھوں نے اپنے مکتوبات میں نثر کی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کا خیال رکھا ہے، وہ خطوط کو دلچسپ اور پر اثر بنانے کا اہتمام کرتے۔ فارسی اردو اشعار کا استعمال بھی بہت احتیاط سے کرتے ہیں، جہاں مصرعے سے کام چل جاتا، وہاں مصرعہ پیش کرتے جہاں پورے شعر کی ضرورت ہوتی تو شعر تحریر کرتے۔ امیر خطوط میں مواد کی ترتیب کا بھی خیال رکھتے تھے۔ مدعا نگاری ان کے خط کا اہم وصف ہے۔ جو بات کہنا ہوتی بہت احتیاط اور اہتمام سے لکھتے کہ ابہام کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اردو مکتوب نگاری میں داغ کا رتبہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک شاعر کے خطوط ہیں جن میں ان کے مزاج کا مد و جزر ملتا ہے۔ مکتوب نگاری کی شان نہیں ملتی۔ جب کہ امیر اردو مکتوب نگاری میں، متعدد نمایاں خوبیوں کی بدولت اہم مقام رکھتے ہیں۔ جس پر مزید تفصیل سے باب نہم میں اظہارِ خیال کیا جائے گا۔

حوالے

(۱) کامل قریشی: مرتب '' داغ دہلوی، حیات اور کارنامے''، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۰۔

(۲) نعیم الحق آزاد شیخ پوری: ''حیات الشعراء''، میرپور خاص، سندھ، بلدیہ میرپور خاص، ۱۹۶۹ء ص ۲۹۷ تا ۳۱۰۔

(۳) ''امیر مینائی''، مرتب احسن اللہ ثاقب، ''مکاتیب امیر مینائی''، لکھنؤ، مطبعہ ادبیہ، ۱۹۲۴ء، ص ۱۳۲۔

(۴) داغ دہلوی: ''زبان داغ''، سید رفیق مارہروی، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد۔

(۵) ''داغ دہلوی حیات اور کارنامے''، ص ۱۵۱۔

(۶) ''زبانِ داغ''، ص ۶۹۔

(۷) ایضاً، ص ۸۳۔

(۸) ایضاً، ص ۶۱۔

(۹) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۳۵۵۔

(۱۰) ''زبانِ داغ''، ص ۱۳۱۔

(۱۱) ایضاً، ص ۸۴۔

(۱۲) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۳۱۱۔

(۱۳) ''زبانِ داغ''، ص ۵۱۔

(۱۴) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۳۲۹۔

(۱۵) ''زبانِ داغ''، ص ۵۰۔

(۱۶) ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۳۳۷۔

(۱۷) ''زبانِ داغ''، ص ۴۶۔

(۱۸) ''نقوش''، مکاتیب نمبر، ص ۱۲۷۔

(۱۹) ''زبانِ داغ''، ص ۱۶۷۔

(۲۰) ایضاً، ص ۲۸۲۔

(۲۱) ایضاً، ص ۱۸۴۔

باب نہم

اردو مکتوب نگاری میں امیر کا مقام

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ لگ بھگ پونے دو سو سال پرانی ہے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں ایک زمانے تک خط و کتابت، چاہے نجی حیثیت میں ہی کیوں نہ ہو، فارسی میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن جب اردو کے قدردانوں نے بحیثیت مجموعی اردو کی ترقی کے لیے کوششیں شروع کیں، تو انھوں نے اس صنف میں بھی اردو کا استعمال شروع کر دیا۔ لیکن باوجود اس کے فارسیت بیغالب رہی۔ وہی فارسی ترکیبیں وہی اسلوب، وہی انداز بیان اور وہی مسجع و مقفی عبارت اور الفاظ جو فارسی کا طرۂ امتیاز تھے۔ اردو کی امتیازی خصوصیات بن گئے۔ یوں تو فارسی کے اثرات اردو پر گہرے ہیں۔ لیکن صنفِ مکتوب نگاری سے چوں کہ اردو بالکل ہی نا آشنا تھی۔ اس لیے فارسی کا غلبہ او راثرات اور زیادہ گہرے نظر آتے ہیں۔ بلکہ ہمارے خیال میں تو اس دور کے خطوط فارسی اور اردو کا عجیب و غریب مرکب تھے۔ معمولی اور مختصر بات بھی، ایسے ہیر پھیر اور مبہم پیرائے میں بیان کی جاتی کہ، سادگی دم توڑ دیتی تھی۔ یہی فارسیت کا غلبہ اور سادگی کی ناپیدی، اردو کی ابتدائی یا غالب سے پہلے کی مکتوب نگاری کا اہم وصف تھا اور اس کے محرکات بھی بہت نمایاں ہیں۔ گویا اردو میں ابتدائی زمانے کی مکتوب نگاری اسلوب کے لحاظ سے اپنے دور کی نثر سے الگ نہیں۔

اردو میں مکتوب نگاری کی ابتدا مرزا رجب علی بیگ سرور (۱۷۸۶ء-۱۸۶۹ء) کے رقعوں سے ہوتی ہے۔ (۱) خواجہ احمد فاروقی نے سرور کی خطوط نگاری کا نقطہ آغاز "۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء" کے درمیانی عرصے کو قرار دیا ہے۔ (۲) سرور کے خطوط تاریخی معلومات کا گنجینہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ ان سے لکھنؤ کی رنگین لیکن زوال آمادہ تہذیب، فرقہ وارانہ فسادات، مولوی امیر علی کے حالات، ہنومان گڑھی کے واقعات، انگریزی کوٹھیوں کے لین دین، غلے کی گرانی و کم یابی، بے روزگاری، تنخواہ کے ملنے میں تاخیر، انتظام کی خرابی اور سفر کی تکلیفوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے سرور کے مکتوبات میں تکلفات کے ساتھ سادگی بھی ملتی ہے۔ اس کے بعد واجد علی شاہ (۱۸۲۲ء-۱۸۸۷ء) (۳) اور ان کی بیگم نواب بذر عالم کے خطوط (۴) ہیں۔ جس میں تکلفات اور سادگی کے ساتھ جدت طرازی بھی شامل ہو گئی ہے۔ ان کے خطوط کو ایک خاص تہذیبی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس وقت ایک بساط الٹ چکی تھی دوسری بچھائی جا رہی تھی، جاگیرداری ختم ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی بدولت جو اقدار رائج ہونے والی تھیں۔ وہ ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھیں۔ چناں چہ بادشاہ اور ان کی بیگمات کی جو نفسی کیفیت تھی وہ بھی ان ہی خارجی عوامل کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے بعض خطوط ہندوستانی عورت کے دل کی پکار بھی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ بادشاہ جب مٹیابرج میں قید کر دیئے گئے اور بیگمات لکھنؤ میں رہ گئیں، کلکتہ نہ جاسکیں، تو انھوں نے اپنے اشتیاق اور محبت کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح بادشاہ (شوہر) نے اپنی مصیبت اور فراق کی داستان کو درد انگیز پیرائے میں بیان کیا ہے۔ کوئی بے کراں جذبہ، کوئی بلند تصور کوئی دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں ہے۔ ایک سستا رومانی انداز ہے۔ جو ہمیں خواہش کے تنگ دائرے سے نکال کر وسیع فضا میں نہیں لے جاتا۔ راقم ناچیز کی نظر سے مولوی عبدالحق اور عبدالماجد دریا بادی کے وہ تبصرے گزرے ہیں جو ان مکاتیب سے متعلق ہیں۔ دونوں بزرگوں نے ان کے اسلوب اور خیالات کو بری طرح رد کیا ہے

اور افسوس کیا ہے کہ یہ تھے، وہ واجد علی شاہ جنھیں ایک مسلمان لیڈر کا منصب حاصل تھا۔ اور اس لیڈر کے گرفتار ہونے پر مسلمان تاسف سے ہاتھ ملتے نظر آتے ہیں۔ بہر کیف اودھ کے اس بادشاہ نے متعدد مکتوبات میں اپنے گزرے ہوئے لمحات کی یاد تازہ کی ہے اور تصور میں محفل جاناں کو دوبارہ آراستہ کیا ہے۔

ان کے مقابلے میں غلام امام شہید (متوفی ۱۸۷۶ء)(۵) اور غلام غوث بے خبر (۱۸۲۴ء۔۱۹۰۴ء)(۶) کے خطوط میں سوچ کی پاکیزگی ملتی ہے۔ البتہ اسلوب وہی ہے جو اس دور کا تھا۔ یعنی تحریر میں رنگینی، لفظی شان و شوکت، پیچیدہ فقرے اور دور از کار باتیں وغیرہ۔ فنی لحاظ سے خط کا انداز فارسی زدہ تھا، معمولی اور مختصر بات بھی ایسے ہیر پھیر کے ساتھ بیان کی جاتی تھی کہ بعض اوقات اصل اور جھوٹ بات کا تمیز نہیں ہو جاتا تھا۔ مولوی غلام امام شہید کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے اپنے ایک دوست کے والد کی وفات اور اس کی شادی پر تحریر کیا ہے:

"مجموعہء انشاء شیریں زبانی دیباچہ کتابِ سخن معانی زاد حشمتہ۔ علم التفرتح مراتب اشتیاق و آرزو مندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے اور کچھ خوشی میں آکر مبارک باد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانہ میں خوشی و غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے ••• تقدیر نے صبح کو اگر لباس سفید خوشی کا پہنایا تو شام کے واسطے جامہء سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصل یہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا گویا اس گردشِ لیل و نہار میں خزاں و بہار کا تماشہ دکھایا ••• اور اس غم نے جتنا رلایا تھا آپ کی شادی نے اتنا ہنسایا اس افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے نظر آیا تو شفق کی سرخی نے وہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں دو ہتڑ جو پہلے منہ پر مارا تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے اور آپ سلامت رہیں اور یہ شادی مبارک ہو۔ بندہ بھی ادائے رسم فاتحہ خوانی و شرکتِ محفلِ شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہو گا"۔

زیادہ والسلام (۷)۔

غلام غوث بے خبر کے خط کا اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے نواب غلام دستگیر خاں حیدر آبادی کے نام تحریر کیا ہے گزشتہ خط کی طرح اسے بھی مختصر کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

"قبلہ میری شوخی دیکھیے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں، خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں، ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں ••• یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں ••• میرے لیے اس کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسی بات تھی جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے، ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے ••• مگر چوں کہ غلبہ شوق تمیز باقی نہیں رہتی یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔

دیباچہ لکھ ڈالا وہ اس کے قابل کا ہے کو ہے آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزے کا آویزہ لگا ہو، زربفت کی قبا میں چھینٹ کا حاشیہ لگا ہو ••• مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ بد صورت کے مقابلے میں حسین کے حسن کو اور رونق ہوتی ہے ••• خاطر مشکل پسند کرے تو ہو سکتا ہے، بے شک دیکھنے والوں کو اس کی برائی سے اس کی خوبی زیادہ نظر آئے گی۔ میری خوشی طالعی ہے۔ اگر یہ قبول ہو اس کے لیے شرف ہے اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت حاصل ہو"(۸)۔

مذکورہ دونوں اقتباس مواد، اسلوب اور مکتوب نگاری کی فنی ہیت کے اعتبار سے اپنے دور کی مکتوب نگاری کی عمدہ طور پر نمائندگی کرتے ہیں۔ اس کے بعد غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء)(۱۸ء) کی مکتوب نگاری (۹) کا دور شروع ہوتا ہے۔ جسے جدید مکتوب نگاری کا دور بھی کہنا چاہیے۔ اس لیے کہ غالب نے مکتوب نگاری میں رائج فارسی کی قدیم روش کو ترک کیا۔ گویا انھوں نے اردو مکتوب نگاری کے مزاج کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ جس پر اردو ادب کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے نے کسی نہ کسی موقعے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

غالب نے قدیم روش کو چھوڑ کر جو طرزِ نگارش اختیار کیا اس میں انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔ چند خطوط کو چھوڑ کر جن میں قافیہ پیمائی موجود ہے۔ انھوں نے اردو میں جتنے بھی خط لکھے، ان میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ غالب خود اس سے باتیں کر رہے ہیں۔ یوں ان کے خط زندگی کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے ہیں۔

بقول، پروفیسر خورشید الاسلام :

"غالب سے پہلے شاید لوگ زندگی کو دور سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے زندگی کو برت کے نہیں دیکھا تھا۔ غالب ذہنی طور پر اپنے پیش رووں سے کہیں زیادہ بیدار تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے وجدان اور فکر کو سمویا(۱۰)۔

الغرض مرزا غالب پر اردو انشا کا ایک دور ختم ہوتا اور دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ انھوں نے محمد شاہی روش، ماضی کی مردہ روایات اور قدیم لوازمِ نامہ نگاری پر ایک کاری ضرب لگائی۔ اس کے بعد مکتوب نگاری کی ایک ایسی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ جس کا ارتقاء دل چسپ ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کہتے ہیں کہ :

"حاکم بد ہن! دیوانِ غالب نہ ہوتا اور صرف غالب کے خطوط ہوتے تب بھی ان کا مرتبہ اردو ادب میں وہ ہی ہوتا جو آج ہے"(۱۱)۔

غالب کا دور سیاسی خلفشار کا تھا۔ افراتفری ہر طرف عام تھی ہندوستانی معاشرے میں تبدیلی نمودار ہو رہی تھی۔ انگریزی حکومت کا پرچم سارے ملک میں لہرانے لگا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کہانیوں میں منتقل ہونے لگا تھا۔ سیاسی، معاشی اور تعلیمی تبدیلیوں سے ایک ایسی نسل نمودار ہو رہی تھی۔ جو نئے اقدار کی حامی تھی۔ انھی حالات میں سر سید (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۹ء)، اردو کے افق پر نمودار ہوئے۔ سر سید حیرت انگیز شخصیت تھے، وہ ادیب بھی تھے اور صحافی بھی۔ اسکالر بھی تھے اور دانش ور بھی، سیاست دان بھی تھے اور ایک مصلح

بھی۔ وہ بر صغیر کے پہلے تعلیمی پالیسی ساز بھی تھے اور جدید کالج کے بانی بھی۔ ان کے خطوط (۱۲) ان کی تمام حیثیتوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے افکار بر صغیر کے تمام طبقوں نے تیزی کے ساتھ قبول کیے۔ چناں چہ سر سید کے خطوط ان کی شخصیت اور فکر کے آئینہ دار نظر آتے ہیں۔

سر سید کے خطوط میں نئی تہذیب کی پذیرائی ہے۔ قومی درد ہے۔ عبرت اور موعظت ہے، حیرت اور تعجب ہے ان کی شخصیت پہلو دار تو ہے لیکن پے چیدہ نہیں۔ یہی چیز ان کے مکاتیب میں بھی نمایاں ہے۔ سر سید کے خطوط سے ان کے خلوص اور قومی ہمدردی کا پتا چلتا ہے، قوم کی بھلائی اور ترقی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ سر سید کے وہ خطوط جو انھوں نے سمندر پار سے لکھے تھے۔ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاص طور سے اس پہلو سے کہ وہ انگریزوں سے کس حد اور درجے تک متاثر تھے۔ مکاتیب سر سید کے اسلوب کی بڑی خصوصیت ان کی سادگی اور بے تکلفانہ انداز تحریر ہے۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے۔ وہی نوکِ قلم پر بھی آجاتی ہے۔ ان کی حیثیت اردو انشاء میں سنگِ میل کی سی ہے۔ یہاں آکر قدیم و جدید راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ادب کی خدمت کے پردے میں قوم کو مخاطب کرنے کا انداز اختیار کیا۔ چناں چہ ان کے خطوط ایک عہد کی عمدہ طور پر ترجمانی کرتے ہیں یہ کسی شاعر یا مرصع کار ادیب کے خطوط نہیں۔ بلکہ ایک مصلح قوم کے مکاتیب ہیں۔ اس لیے ان کی ادبی حیثیت کم اور تاریخی زیادہ ہے۔

عہد سر سید میں ادباء کے تین گروہ نظر آتے ہیں۔ ۱ر سر سید اور ان کے رفقاء، ۲ر اکبر اور ان کے ہم نوا، ۳ر آزاد اور ان کے مقلد۔ سر سید اور ان کے رفقاء قومی اور تعلیمی نقطہ نظر کے حامل ہیں انھوں نے اپنی زندگی کی ہر خواہش پر اصلاحی تحریک کو ترجیح دی۔ مثلاً سر سید کے رفقاء میں سے مولوی نذیر احمد (۱۸۳۱ء۔ ۱۹۱۲ء) نے ایک واضح مقصد کے حصول کی جدوجہد کے باوجود ادب کے فنی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا۔ ان کے مکاتیب (۱۳) کا اساسی مقصد تو اپنے بیٹے کی شخصیت سازی اور تعمیر اخلاق ہے تاہم اس بات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ یہ ایک ایسے تخلیقی مزاج رکھنے والے ادیب کے خطوط ہیں جو مشکل سے مشکل منطقی استدلال کو اپنے دل نشین اسلوب سے افسانے کا روپ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مولوی نذیر احمد کے خطوط میں لفظوں کے املا اور تلفظ کے علاوہ زبان کے قواعد انشا اور ان کی تہذیبی حیثیت پر خیال انگیز مباحث اٹھائے گئے ہیں۔ نذیر احمد نے اپنے اسلوب کی دل فریبی سے اس خشک بحث میں بھی ایک مخصوص ادبی چاشنی بھر دی ہے۔ اور یہ کہنا درست ہے کہ غالب نے مراسلہ نگاری کو روز مرہ بنانے کا فریضہ ادا کیا تو اسے توسیع نذیر احمد نے دی۔

سر سید کے دوسرے اہم رفیق الطاف حسین حالؔی (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۱۴ء) کے یہاں سادگی اور بے ریائی تو ہے لیکن ادبی چاشنی کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سقوطِ دہلی کے واقعے سے ذہنی اور نفسیاتی طور پر عمر بھر مغلوب رہے۔ ان کے خطوط (۱۴) پر یاسیت اور احساسِ زیاں کی دبیز تہ جمی ہوئی ہے۔ خطوط میں جو حالی ہمارے سامنے آتا ہے وہ نیکی کا مجسمہ، خلوص کا پتلا، ہمہ تن محبت، سراپا ایثار اور اصول پرستی کا مرقع ہے۔ ان کے خطوط میں قومی زندگی کی جھلکیاں ہیں وہ متعدد مواقع پر علی گڑھ کالج سے ابھرنے والے مسائل اور نئے تعلیمی تقاضوں کی طرف واضح اشارے کرتے نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ قابلِ لحاظ تعداد ان خطوط کی بھی ہے جن میں ان کی گھریلو زندگی کے حالات وواقعات چھائے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب اس بے رنگ انداز میں لکھے گئے ہیں کہ قاری ان میں گہری دلچسپی لینے قاصر

نظر آتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ملاحظہ کیجیے کہ غالب کے شاگرد رشید ہونے کے باوجود حالی کی مکتوب نگاری پر غالب کے اثرات نا ہونے کے برابر ہیں۔ وہ ساری زندگی سر سید کے سحر سے نہ نکل سکے انھوں نے بھی اپنی ذاتی زندگی کی ساری خوشیوں اور آسائشوں کو بر صغیر کے مسلمانوں کی اصلاح پر قربان کر دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ کا جو مرتبہ مسدس کی صورت میں لکھا تھا اس کے اثرات ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہیں۔ حالی کے مکاتیب کی کوئی حیثیت اگر قائم کی جائے تو وہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ ایک ایسے دردِ مند مصلح قوم کے خطوط ہیں جس میں ایک حق گو حق شناس اور حق پرست شخص ملک و ملت اور اپنے گھر کے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ جو قول و فعل کے تضاد سے عاری ہے اور بس۔

سر سید کے رفقاء میں شبلی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء) کی مکتوب نگاری (۱۵) سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے (۱۶)۔ اردو نثر کی تاریخ میں غالب کے بعد سب سے دل کش اور بلند قامت شخصیت شبلی ہی کی نظر آتی ہے۔ اس کا اندازہ ان کی تحریر کردہ تاریخوں اور مضامین و مقالات سے نہیں بلکہ خطوط سے ہوتا ہے۔ جن میں ان کی زندگی کے ایسے نشیب و فراز جو اور کسی جگہ نہیں ملتے۔ جو شیلے شبلی کے یہاں ایک عام انسان کا پندار، حریفانہ چشمک اور بشری کمزوریاں ہیں۔ عطیہ اور زہرہ کے نام خطوط ظاہر کرتے ہیں کہ شبلی زاہد خشک نہیں، لیکن وہ سیاست میں تعلیم میں انشاء میں، سوانح نگاری میں تنقید میں پرانی لکیر کو چھوڑ کر جدید سے مفاہمت کرنے کے لیے تیار تھے۔ راقم سر سید اور ان کے رفقاء میں شبلی کردار کے اعلیٰ منصب پر فائز سمجھتا ہے۔ شبلی نے بھی اپنی شوخیوں اور حنائی طبیعت کو قربان کیا۔ غالباً اسی وجہ سے ان کے مزاج میں جھنجھلاہٹ اور بے زاری نمایاں ہے۔ الغرض شبلی کے خطوط میں اصلاح کا جذبہ ایک اہم قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے مکتوبات میں ندوہ اور علی گڑھ کے اخلاقی نقوش ابھارتے ہیں تو مصلح قوم دکھائی دیتے ہیں۔ شعر العجم پر بحث کرتے ہیں تو ایک فاضل نقاد کے طور پر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط ان کی باطنی صداقت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ شبلی کے مکتوبات ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسا انسان ہے جس کے شریر میں گرم خون دوڑ رہا ہے۔ جو جسم کی سلگتی ہوئی کیفیات میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جلا سکتا ہے۔ لیکن یہ اس کا کمال ہے کہ اپنی ذہنی اور جسمانی کیفیات کو حواس پر حاوی نہیں ہونے دیا اور اپنے کردار سے ایک ایسا سلیقہ پیش کیا جو گناہ اور ثواب کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم رکھتا ہے۔

سر سید کے رفقاء میں نواب محسن الملک (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۰۷ء) (۱۷)، نواب وقار الملک (۱۸۴۷ء۔ ۱۹۱۷ء) (۱۸) اور منشی ذکا اللہ (۱۸۳۰ء۔ ۱۹۱۰ء) کے بہت سے مکتوبات دستیاب ہیں لیکن ان میں ایسی ادبی شان نہیں پائی جاتی جس کی بناء پر وہ تاریخ میں نمایاں مقام پاتے۔ ان کے خطوط زیادہ تر نجی نوعیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں۔

عہدِ سر سید میں دوسرا گروہ اکبر الہٰ آبادی اور ان کے مقلدین کا تھا جو سر سید اور ان کے رفقاء سے بددل تھا۔ لیکن ان کا یہ رویہ ہندوستان یا مسلمانوں سے بغاوت پر نہیں اکساتا۔ بلکہ وہ کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اکبر اور ان کے احباب میں مکتوباتی ادب کے حوالے سے صرف اکبر (۱۹) ہی نمایاں ہیں۔

اکبر (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۲۱ء) مشرقی روایات کو مستحکم کرنے کے لیے کوشاں تو نظر آتے ہیں جو مغربی یلغار کے سامنے کمزور پڑتی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن ان کا مولویانہ رویہ اکثر مات کھاتا نظر آتا ہے۔ چناں چہ اکبر کے مکتوبات ان کی فکری ذہنی اور قلبی کیفیات کے

آئینہ دار ہیں۔ اکبر کا ذہنی کرب یہ تھا کہ سلطنت لٹ جانے کے بعد اب قوم اخلاقی اور روحانی طور پر ذلت کے کنویں میں ڈوبتی جارہی ہے۔ اس داخلی کرب کو انھوں نے اپنی شاعری میں ایک سچے مسلمان کی طرح پیش کیا تو خطوط میں ایک صاحبِ نظر عالم کی صورت میں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط علمی و ادبی مسائل، ذہنی و معاشرتی مباحث اور سیاسی و اخلاقی نظریات پر روشنی ڈالنے کی کاوش بھی ہے۔ اکبر کے خطوط ان کے اس قومی کردار کی بامعنی نشان دہی کے ساتھ انھیں ایک مستقبل شناس مدبر، ایک درد مند مصلح اور ایک بے چین و مضطرب مسلمان کے روپ میں بھی پیش کرتے ہیں۔

عہد سرسید کا ایک تاب ناک ستارہ محمد حسین آزاد (۱۸۲۷ء۔۱۹۰۱ء) ہے۔ جنھوں نے پرانی تعلیم کے زیرِ سایہ اور نئی روشنی کی صبح میں پرورش پائی لیکن وہ سرسید اور ان کے رفقاء کے پھیکے پن سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ سرسید کے یہاں پھیکا پن مجبوری اور کہیں کہیں ضرورت بھی تھی اسے عیب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس پر کچھ روشنی گزشتہ صفحات میں ڈالی گئی ہے۔

آزاد کے یہاں راہ و رسم آشنائی کا انداز ملتا ہے۔ ان کے مکاتیب (۲۰) میں وہ آزاد نہیں ملتا جو "قصص الہند" اور "آبِ حیات" کا مرقع نگار ہے۔ آزاد مکتوب نگاری کو نجی باتوں کے ابلاغ کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ وہ بھی ایجاز و اختصار کے ساتھ۔ ان کے خطوط میں ملک و ملت کا کرب، اقدار کے مٹنے کا غم جیسی چیزیں نہیں ملتیں بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ جیسے وہ خلوت میں کسی محرم راز سے سرگوشی کررہے ہیں۔ جس میں بے ساختگی بھی ہے اور بھرائو بھی۔

اسی دور میں امیر احمد امیر مینائی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۰ء) کا نام بھی مکتوب نگاری کے حوالے سے نمایاں ہے جس پر اظہارِ خیال ہم اس مقالے کے آخر میں کریں گے۔ امیر ہی کے ایک اہم معاصر داغ دہلوی (۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء) ہیں۔ ان کی مکتوب نگاری پر گزشتہ باب میں تفصیلی اظہارِ خیال کیا گیا ہے (۲۱)۔

حسن پرست اور جمال دوست مہدی افادی (۱۸۲۱ء۔۱۹۲۱ء) کے خطوط (۲۲) میں نجی شخصیت کے خدوخال جس عمدگی بلکہ بے تکلفی سے ملتے ہیں۔ اس سے شبلی کے مکاتیب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کے یہاں بھی ایک فکری توازن ہے انھوں نے بھی اپنی جمال دوستی اور حسن پسندی پر کوئی پردا نہیں ڈالا۔

مہدی افادی کے مکتوبات ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ یہ زندگی اور اس سے متعلق دائروں پر محیط ہیں جن میں زندگی کا جاذب نظر تنوع ملتا ہے۔ وہ ذاتی کوائف اور مسائل پر ایک زندہ دل انسان کی طرح نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے یہاں شعر و ادب کے مسائل پر خصوصی توجہ بھی ملتی ہے، اور دوستوں سے دل نوازی بھی، ان کے خطوط ان کی ذہانت، خوش فکری، رومانی شیفتگی اور لطافت کے آئینہ دار ہیں۔

مہدی افادی کے بعد ریاض خیر آبادی (۱۸۵۳ء۔۱۹۳۴ء) کے مکتوب (۲۳) بھی اپنی اسلوبی نفاست کی وجہ سے اہم ہیں۔ ریاض نے بھی اپنے مکتوبات میں بے ساختگی، شیفتگی اور آئینہ خانے کی رنگینیاں قید کی ہیں۔

ابو الکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) نے اپنے مکتوبات (۲۴) سے ادب کی تاریخ میں ایک بہترین اضافہ کیا۔ ان کے خطوط کی سب سے اہم امتیازی خصوصیت ان کا اندازِ بیان ہے، اس کے علاوہ ان مکاتیب سے مولانا کے مزاج اور معیار دوستی کا اندازہ بھی ہوتا ہے

کہ وہ دوستوں کو بہت سا وقت گزر جانے کے بعد بھی کن کن حوالوں کے ساتھ یاد رکھتے ہیں۔ ان کے معیار دوستی میں شرافت ملک اور ملت کا حوالہ ایک اہم مآخذ ہے۔ ان کی بیشتر دوستیاں انھی معیارات پر ہیں۔ وہ زندگی کا ہر لمحہ مذکورہ حوالوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سانچوں میں نہیں ڈھل سکتے جن میں ان معیارات کی نفی کی جاتی ہو اور نہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا پسند کرتے ہیں (چاہے دو گھڑی ہی کیوں نہ ہو) جو شرافت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اگر مولانا آزاد کے مکاتیب میں شامل فارسی اور عربی کے اشعار کو ان معیارات کی تشریح کے لیے حوالہ بنایا جائے تو آزاد سے بے ساختہ محبت سی ہو جاتی ہے۔

مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۰ء) ہماری سیاسی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ ان کے اثرات صحافت اور ادب پر بھی گہرے ہیں۔ مولانا کے خطوط (۲۵) اس راہنما کا نقش پیش کرتے ہیں جو ایک زوال آمادہ قوم کی شوکت رفتہ کا احیاء کرنے کا آرزو مند ہے۔ ان کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر گرجتا برستا ہوا محمد علی جوہر اندر سے کس قدر ٹوٹا ہوا ہے۔ لیکن باوجود اس کے موج حوادث سے مقابلہ کر رہا ہے۔ جب انھیں قوم کی زبوں حالی کا خیال آجاتا ہے تو مزاج کا رخ غصے کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی کوئی لطیف لہر بھی ان کے ہونٹوں پر نظر آجاتی ہے۔

اختر شیرانی (۱۸۸۰ء۔ ۱۹۴۸ء) کا شمار رومانوی مکتوب نگار (۲۶) کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن ان کے بہت سے خطوط غیر رومانوی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے بارے میں مفید معلومات بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ اختر شیرانی بیسوی صدی میں جدید اردو شاعری کے ممتاز معماروں میں سے ہیں وہ کئی رسائل کے مدیر بھی رہے۔ جدید اردو شاعری کے آغاز میں اپنے معاصر جدید شعراء سے ان کے علمی روابط رہے۔ ان کے تحریر کیے ہوئے مکتوبات اور جوابی مکتوبات سے بہ خوبی اختر کی زندگی ان کے افکار کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اختر کے رومانوی خطوط طویل اور عشق و مستی میں ڈوبے ہوئے ہیں جب کہ غیر رومانوی مکاتیب مختصر اور جامع ہیں۔ جن میں نظم و ضبط شگفتگی اور پر خلوص لہجہ ملتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر رحم دل، شفیق اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کے مکاتیب زندگی کے نشیب و فراز دوستوں اور شاگردوں سے تعلقات ہی کا پتا نہیں دیتے بلکہ اختر کے مزاج اور زندگی کے بدلتے ہوئے رویوں کی نقاب کشائی بھی کرتے ہیں۔

فتح پوری نیاز (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۶۶ء) کے ابتدائی زمانے کے مکتوبات (۲۷) رومانوی لب و لہجے کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اختر شیرانی کی طرح ان کے مکتوبات بھی دو طرح کے ہیں رومانوی اور غیر رومانوی۔ ان کے رومانوی خطوط کا سلسلہ شبلی اور مہدی افادی سے جڑا ہوا ہے۔ شبلی اور مہدی افادی کی بہ نسبت نیاز کے یہاں شگفتہ بیانی۔ بانکپن اور خود سپردگی کی کیفیت زیادہ ملتی ہے۔ جب کہ ان کے غیر رومانوی خطوط کا بیانیہ ہموار اور عام فہم ہے جس میں سے زندگی جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

منفرد اسلوب کے خالق خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۵۵ء) نے اپنے مکاتیب (۲۸) میں سادگی اور پرکاری سے کام لیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی شخصیت میں ایک دلچسپ اور قابلِ ذکر تنوع تھا۔ ایک طرف وہ تصوف کے داعی تھے تو دوسری طرف متعدد اخبارات ورسائل کے مدیر، وہ ادیب بھی تھے اور حکیم بھی سیاح بھی تھے اور مبلغ اسلام بھی۔ چناں چہ ان کے یہ تمام مشاغل یا رنگ ان کے مکاتیب میں بھی ملتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۷۷ء) کے ابتدائی زمانے کے خطوط (۲۹) میں ایک خاص نوع کی طغیانی کیفیت نظر آتی ہے لیکن آخری زمانے کے مکاتیب اعتدال اور خاص کیفیت سے ہم کنار ہیں، مولانا دوسرے کی خلوت میں داخل ہونے کے بہ جائے اپنی واردات قلب کو بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

سید سلمان ندوی (۱۸۸۴ء۔ ۱۹۵۳ء) اپنے عہد کی ایک منفرد اور اہم شخصیت ہیں ان کے خطوط (۳۰) میں غیر جذباتی اسلوب ملتا ہے۔ وہ خطوط میں ندوہ کے محافظ اور شبلی کے سرگرم وکیل نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے خطوط ایک علم دوست ادیب کے خطوط ہیں جن کی علمی مہک کبھی کم نہ ہو گی۔

مولوی عبدالحق (۱۸۷۱ء۔ ۱۹۶۱ء) اردو کے سب سے بڑے مقدمہ باز تھے اردو کی ترویج وترقی کو زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دے کر انھوں نے جو جدوجہد کی اس کی مثال ہماری ادبی اور علمی تاریخ میں نہیں ملتی ان کے خطوط (۳۱) ان کے مقصد اور کارگزاریوں کے آئینہ دار ہیں۔ مولوی صاحب کے مکاتیب کا اسلوب سادہ اور خیالات وافکار بہت بصیرت افروز ہیں۔

اقبال کے مکاتیب (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۵ء) (۳۲) خطوط اس مردِ مومن کے دل کی آواز ہیں جو ملتِ مسلمہ کے عروج وسربلندی کے لیے ہر وقت سوچتا نظر آتا ہے۔ یہ خطوط استدلال، راست گوئی، اور ان کی فکر کا اہم حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے عہد کے علمی ادبی اور فکری مباحث کا اہم مخزن ہیں جن میں فلسفہ، حکمت، تاریخ،، شاعری، نفسیات، مذہب اور اخلاقیات وغیرہ کو یکساں اہمیت حاصل ہے (۳۳)۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء۔ ۱۹۷۹ء) کے خطوط (۳۳) ایک ایسے راہ نما کے خطوط ہیں جو داخلی طور پر اپنے ہم سفروں کی بے دلی کا اور خاص طور پر اپنے نظریاتی حریفوں کا سامنا کر رہا ہے لیکن اپنے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا۔ مولانا مودودی کے خطوط معاملہ بندی سے آزاد ہیں۔ اصل میں تو انھوں نے مکاتیب کو ابلاغ صداقت کا وسیلہ بنایا ہے اور ان سے اسلامی اقدار وفضائل کی توضیح کا کام لیا ہے اس لحاظ سے ان کے خطوط ان کے اسلامی، تبلیغی مقاصد کا ایک اہم وسیلہ ہیں۔

جگر مراد آبادی (۱۸۹۰ء۔ ۱۹۶۰ء) کے خطوط (۳۴) میں سادگی بھی ہے اور بے ساختگی بھی اس کے علاوہ ان کی زندگی کے بعض مخصوص گوشے زیادہ نمایاں ہیں۔ علمی وادبی لحاظ سے ایسی کوئی بات نہیں ملتی جو قابلِ تعریف ہو۔

امام احمد رضا خان بریلوی (۱۸۵۶ء۔ ۱۹۲۱ء) کا شمار اہم مذہبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کے خطوط (۳۵) فقہی مسائل، تصوف کی باریکیوں اور ان استفسارات سے لبریز ہیں جو سیکڑوں طالبانِ علم ان سے خط وکتابت کے ذریعے پوچھا کرتے تھے۔

جوش ملیح آبادی (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۸۲ء) کے خطوط (۳۶) الجذبات واحساسات سے متعارف کراتے ہیں جن سے یہ عمر بھر نبرد آزما رہے۔ جوش کے خطوط میں بے باکی بھی ہے اور صاف گوئی بھی۔ وہ نامساعد حالات میں اکثر بلبلا اٹھتے ہیں اور آدم کو حیوان ہی نہیں کمینہ اور درندہ کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دوسری طرف وقت اور مصلحتوں کا شکار ہو کر وہ انسان کو فرشتوں کا منصب بھی عطا کر دیتے ہیں۔ الغرض ان کے خطوط ان کی باطنی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ زبان وبیان کا لطف ان کے خطوط کا اہم وصف ہے اور بس۔

منٹو (۱۹۱۲ء۔ ۱۹۵۵ء) کے خطوط (۳۷) میں ان کی شخصیت کا سچا اور کھرا پن ملتا ہے۔ یہ خطوط منٹو کی علمیت اور ان کی ناقدانہ

صلاحیتوں کا بہت قیمتی نمونہ ہیں۔ ان کے خطوط میں زندگی کی بعض گمشدہ کڑیاں بھی ملتی ہیں اور ان کے عہد کی ادبی صورتِ حال بھی۔

رشید احمد صدیقی (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۷ء) کے خاکے ہوں یا خطوط (۳۸) ان میں سے علی گڑھ کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ چناں چہ ان کے خطوط میں علی گڑھ کی مجلسی زندگی اس کے علاوہ نجی زندگی کے اہم مسائل، ان کے علمی ادبی خیالات کے ساتھ ساتھ ان کے افکار بھی ہیں۔ یہ خطوط ان کی علمیت تہذیبی زندگی سے گہری وابستگی اور زندگی کی ناکامیوں کا پتا بھی دیتے۔ چناں چہ یہ ایسی اہم دستاویز ہیں جن کے بغیر رشید احمد صدیقی کی زندگی کا مطالعہ ادھورا ہے۔

سید سجاد ظہیر (　　　　) کے خطوط (۳۹) میں عائلی محبت کو بازیافت کرنے اور خانگی یادوں سے جیل کی زندگی کو معطر بنانے کی خوب صورت کاوش کی گئی ہے۔ ان خطوط میں سجاد ظہیر نہ سیاسی راہ نما نظر آتا ہے اور نہ ادیب بلکہ وہ سر تاپا ایک شوہر ہے جو بیوی بچوں سے علاحدگی پر خود اپنے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ ان خطوط میں شادی کے دور اول کی یادوں کو اس خوبی سے تازہ کیا گیا ہے کہ تہذیب کا ایک پورا شہر آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتا ہے۔ ان کے خطوط کی نمایاں بات یہ ہے کہ انھوں نے خطوط میں ذاتی کرب کو کاغذ پر بکھیرے بغیر دردمندی کی لہر پیدا کی ہے۔ ان کے خطوط میں پروقار مردانگی، حوصلہ، صبر، استقلال اور تہذیبی وقار ملتا ہے۔ سجاد ظہیر سے نظریاتی اختلاف کے باوجود راقم ناچیز کی رائے یہ ہے کہ میرے بہت سے پسندیدہ اور ہم خیال ادیب بھی ان کی پاکیزگی اور سچائی تک نہیں پہنچتے۔

فیض احمد فیض (۱۹۱۲ء۔۱۹۸۴ء) اردو شاعری کا ایک اہم حوالہ ہیں۔ ان کے خطوط (۴۰) میں بھی عائلی زندگی اور اپنے بچوں سے گہری محبت کا ایک دل کش نقش ملتا ہے۔ دوسری طرف "سیاسی قیدی فیض" کی زندگی پر نظر ڈالیں تو وہ زنداں میں بھی زندگی کے نقوش تراشنے میں کامیاب ہیں اور تنہائی کے جان لیوا احساس کو دوستوں کی محفل، مشاعرے اور شاعری کے مشاغل سے زائل کر ڈالتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیگم سرفراز کے نام خطوط ان کی زندگی کے کئی اور گوشوں سے روشناس کراتے ہیں۔ یہاں فیض ایک مختلف روپ میں نظر آتے ہیں۔

بہادر یار جنگ (۱۹۰۵ء۔۱۹۶۷ء) ہماری سیاسی تاریخ کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ غالب نے خط کو مکالمہ بنادیا تھا بہادر یار جنگ نے مکاتیب (۴۱) کو خطبات کا جامہ پہنادیا۔ ان کے خطوط میں کھری کھری اور بے لاگ گفتگو کا ذائقہ ملتا ہے۔ تصنع کے ساتھ تکلف بھی ان کے خطوط میں مفقود ہے۔ قومی مشاغل، نجی معاملات اور سماجی کاموں کے طور طریقے ان کے خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ خطوط اصل میں ایک ایسے سماجی کارکن کے ہیں جو بہت کم وقت میں ملک و قوم کے لیے بہت کچھ کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن مسائل ہمیشہ آڑے آتے ہیں۔

زیرِ لب میں شامل صفیہ اختر (　　　　)(۴۲) کے خطوط میں ہجر و مفارقت کی تیز آنچ بھڑک رہی ہے۔ ان میں ایک بیاہتا عورت کے دل کی فریاد موجود ہے۔ جس میں محرومی بھی ہے اور نارسائی بھی۔ ان مکاتیب میں چوں کہ عورت مرد کو مخاطب کرتی ہے اس لیے ان میں ہندی گیتوں جیسا رس پیدا ہو گیا ہے۔ اردو مکتوب نگاری میں اس قسم کا اظہار اس سے پہلے نہیں ملتا۔

شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء۔۱۹۷۵ء) کے خطوط (۴۴) بنام عبداللہ ملک جیل سے لکھے گئے ہیں۔ یہ خطوط عبداللہ ملک سے ان کی

دوستی محبت اور الفت کی منہ بولتی داستان قرار دیے جاسکتے ہیں۔ جیل کے اذیت ناک لمحوں کو تاب ناک اور تاریخ بنانے کے لیے شورش نے قلم اور کاغذ کا سہارا لیا اور صفحہ قرطاس پر احساسات و جذبات کو بکھیر دیا۔ ان خطوط میں پاکستان کی مذہبی سیاست کی گم شدہ کڑیاں بھی ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے بھی شورش کے یہ خطوط دل چسپ اور اہم قرار پاتے ہیں۔

مکاتیب ابنِ انشا (۱۹۲۷ء۔۱۹۷۹ء) (۴۴) ایک نئے اور بدلے ہوئے ابنِ انشا سے متعارف کراتے ہیں۔ یہ خطوط مزاح کے شوخ لبادے میں لپٹے ہوئے ہیں اس لیے بے حد پر لطف ہیں۔ ابنِ انشا کے اسلوب میں رنگینی بھی ہے اور رعنائی بھی۔ طنز یہ چھیڑ چھاڑ بھی ہے اور معنی خیزی بھی۔ ان میں ابنِ انشا نہ بنجارہ ہے اور نہ جوگی بلکہ ایک پر اعتماد دنیادار ہے۔

مکتوباتِ جوش ملسیانی (متوفی ۱۹۷۶ء) (۴۵) علمی و ادبی مواد فراہم کرتے ہیں۔ ان خطوط میں وہ استادانہ شان پائی جاتی ہے جو ہمیں غالب امیر اور داغ کے یہاں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان مکاتیب میں ان کے دور کی ادبی سیاست، پنجابی اور ہندی کی جھگڑے کی بازگشت بھی ملتی ہے۔ جوش ملسیانی کی زندہ دلی، زندگی گزارنے کا ڈھنگ شاگردوں کے ساتھ رویہ اور جانے کتنے ہی پہلو ہیں جو ان کے خطوط کے ذریعے ہم تک پہنچتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (۱۹۱۹ء) کے خطوط (۴۶) کا شمار آسان نہیں ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ آپ دینی اور دنیاوی حوالے سے نہایت معتبر مسند پر فائز ہیں۔ ان دونوں ہی حوالوں سے ہزارہا طالب علم آپ نے مستفید ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ چناں چہ آپ کے مکاتیب علمی و ادبی معلومات کا ذخیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی مسائل سے متعلق معلومات کا بھی خزانہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے مکتوبات ان کی شخصیت عادت واطوار کے متعلق بھی دلچسپ، اور بصیرت افروز معلومات فراہم کرتے ہیں۔ خدا کرے سارے نہیں تو منتخب مکاتیب تو سب شائع ہو جائیں ورنہ متعدد حوالوں سے ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی اور مذہبی خدمات کی قیمتی کڑیاں گم ہو جائیں گی۔

قدرت اللہ شہاب (۱۹۲۰ء۔۱۹۸۶ء) کو ہمیشہ ایک افسانوی اور پراسرار شخصیت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن وہ اپنے خطوط (۴۸) میں ایک انسان کے اور ایک صوفی کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک بیوروکریٹ تھے لیکن ان خطوط میں وہ ایک سیدھے سادے محبت کرنے والے انسان کے روپ میں ملتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی گواہی دیتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب ایک سچا اور سیدھا سادا محبت کرنے والا انسان تھا غالباً یہی وہ خوبیاں ہیں جو اس کے دوستوں کے دلوں پر نقش ہیں اور ان کی عقیدت و محبت نے اسے ایک افسانوی اور پراسرار شخصیت بنادیا ہے یا پھر ان خطوط میں قدرت اللہ شہاب کی شخصیت پورے طور پر سامنے نہیں آسکی یا تو وہ خود کو چھپا گیا یا پھر وہ ایسا ہی تھا جیسا کہ خطوط میں ہے۔

مذکورہ مکتوب نگاروں کے علاوہ بھی اور بہت سے صاحبِ طرز ادیب یا نامور فضلاء کے خطوط ایسے ہیں جن کا جائزہ اس وقت لینا چاہیے تھا۔ مثلاً کرشن پرشاد شاد (۱۸۶۴ء۔۱۹۴۰ء) (۴۸) شاد عظیم آبادی (۱۸۳۶ء۔۱۹۲۷ء) (۴۹)، حسرت موہانی (۱۸۵۱ء۔۱۹۷۵ء) (۵۰)، مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء۔۱۹۴۴ء) (۵۱)، مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء۔۱۹۰۶ء) (۵۲)، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (۱۸۹۷ء۔۱۹۵۵ء) (۵۳)، فراق گورکھپوری (۱۸۹۶ء۔۱۹۸۲ء) (۵۴)، چودھری محمد علی رودولوی

(۱۸۸۰ء۔۱۹۵۵ء)(۵۵) ، علی سردار جعفری (۱۹۱۱ء۔۲۰۰۰ء)(۵۷) ، وزیر آغا (۱۹۲۲ء)(۵۶) ، اور پروین شاکر (۱۹۵۲ء۔ ۱۹۹۴ء)(۵۷)وغیرہ لیکن شاید یہ اضافی ہوتا اس لیے کہ ہمارا مقصد اردو مکتوب نگاری کا ایک ایسا اجمالی جائزہ لینا مقصود تھا جس سے ایک ایسی عمومی صورتِ حال سامنے آجائے۔ جس کی بنیاد پر اردو مکتوب نگاری میں امیر مینائی کا مقام متعین کیا جاسکے۔ ہمارے خیال میں مذکورہ جائزہ ہماری ضرورت کو بہ احسن پورا کرتا ہے۔ اور اس سے دلچسپ اور قابلِ ذکر نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ اس جائزے کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔

۱۔ انیسویں صدی کی اردو مکتوب نگاری ۲۔ بیسویں صدی کی اردو مکتوب نگاری

یہ تقسیم ادوار کے حوالے سے ہے۔ مواد اور اسلوب کے اعتبار سے اردو مکتوبات کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ علمی خطوط، ۲۔ ادبی خطوط، ۳۔ رومانی خطوط۔

علمی خطوط سے مراد وہ خطوط ہیں جن میں لسانی تصریحات، عروضی مسائل، بلاغت کے مباحث، لغت کے اصول و قواعد، نکات سخن، تاریخی معلومات اور درس و تدریس وغیرہ سے متعلق معلومات ہوں۔ جب کہ ادبی خطوط میں زندگی کے ہر پہلو پر گفتگو خاص اسلوب میں کی جاتی ہے۔ ادبی پہلو مجروح نہ ہو اس کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ تحریر میں شگفتگی، شائستگی، سلاست، روانی، بلاغت۔ وغیرہ کے عمدہ نمونے پر شامل کیے جاتے ہیں۔

رومانی خطوط میں ہم شبلی، مہدی افادی، نیاز فتح پوری اور اختر شیرانی کے ان خطوط کو رکھتے ہیں جن میں جمالیاتی رنگ، عاشقانہ بیان، وار فتگی، خوشی و غمی، غم ناکی و سپردگی کا ایسا بیان ملتا ہے جو علمی و ادبی خطوط سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔

مکتوبات بالکل نجی نوعیت کی تحریر ہوتی ہے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا بعض اوقات خطوط کا بیانیہ اجتماعی حیثیت بھی اختیار کر جاتا ہے۔ بزرگانِ دین اور سیاست دانوں کے خطوط عموماً اس کی مثالیں ہیں۔ یہ خطوط علمی و ادبی دونوں نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔

مکتوبات کی مواد کے اعتبار سے اور بہت سی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں رسیدی خطوط اور کاروباری نوعیت کے خطوط شامل ہیں۔ یہ اور اس طرح کے خط ہماری ترجیحات میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک وہی خطوط اہم ہیں جن کا تذکرہ مذکورہ بالا سطور میں کیا گیا ہے۔ اب ہم اردو مکتوبات کا ایک جائزہ مذکورہ اقسام کو پیشِ نظر رکھ کر ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک علمی خطوط کا تعلق ہے تو انیسویں صدی میں غالب، امیر مینائی اور شبلی نعمانی کے خطوط نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جب کہ بیسویں صدی میں سید سلیمان ندوی، مولوی عبدالحق، جوش ملسیانی ، غلام رسول مہر، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں وغیرہ کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔

اسی طرح ادبی خطوط کے حوالے سے انیسویں صدی میں رجب علی بیگ سرور، غلام غوث بے خبر، غلام امام شہید، غالب اور شبلی کے نام نمایاں ہیں۔ اس کے مقابلے میں بیسویں صدی میں ان کا شمار آسان نہیں۔

مکاتیب کی تیسری قسم میں سرور، شبلی، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، اختر شیرانی، جاں نثار اختر کے خطوط قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جن کی اپنی ایک شناخت ہے جو ہمارے خیال میں اسلوب اور مواد کے اعتبار سے اردو مکتوب نگاری میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس اجمالی جائزے کے بعد اب ہم صرف امیر مینائی پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو بہت واضح صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ امیر کے خطوط کی شناخت خالصتاً علمی ہے۔ بہت سے خطوط میں ادبی پہلو بھی خوب صورتی کے ساتھ نمایاں ہے اور متعدد مکاتیب روکھے پھیکے سرسری نوعیت کے بھی ہیں۔ جب کہ رومانی خطوط بالکل نہیں ملتے۔

امیر کے مقابلے میں غالب اور شبلی کے خطوط رکھے جاسکتے ہیں۔ غالب کے یہاں بیشتر خطوط میں خالص علمی رنگ ملتا ہے۔ لیکن ان کا اسلوب امیر کے اسلوب پر بھاری ہے۔ امیر کا طرزِ تحریر عالمانہ ہے۔ جو خط کے موضوع کی مناسبت سے بالکل ٹھیک ہے۔ اعتراض کا پہلو نہیں ہے۔ لیکن غالب کا مکالمانہ انداز خشک علمی مباحث میں قاری کے لیے شگفتگی اور اپنائیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ دونوں کا فطری مزاج اور معاشرتی ماحول ہے۔ غالب کے مقابلے میں امیر زاہد خشک تھے۔ یہ چیز ان کی شاعری میں تو نہیں ملتی البتہ خطوط میں بہت نمایاں ہے اور یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ چناں چہ مواد کے اعتبار سے تو بلاشبہ امیر غالب سے آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن اسلوب کے اعتبار سے غالب کو فوقیت حاصل ہے۔

شبلی کے یہاں عالمانہ رنگ مذہبی اور تاریخی نوعیت کا ہے۔ متعدد خطوط میں تنقیدی عوامل بھی ملتے ہیں ان کا طرزِ تحریر غالب جیسا بے تکلفانہ نہیں اور نہ امیر کی طرح خالصتاً عالمانہ ہے۔ بلکہ ان کے مکاتیب کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں موضوع کی مناسبت سے زبان و بیان اختیار کیا گیا ہے۔ مدعا نگاری جو سرسید کی نثر کا خاص وصف ہے شبلی کے یہاں بھی ملتا ہے اس طرح امیر کو غالب، اور شبلی کے مقابلے میں ایک منفرد اسلوب کا مالک قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی سامنے آتی ہے کہ شبلی کے نزدیک زبان کا پھیلاؤ ہی مقصد نہیں تھا۔ امیر کے نزدیک مقصد ہی یہی تھا اس لیے امیر کے خطوط میں زبان اور اس سے متعلق مباحث ملتے ہیں۔ اور ان میں وسعت بھی بہت ہے۔ اس لیے امیر کا دائرہ علمی ایک موقع پر جاکر شبلی سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ ادبی تاریخ کے مطالعے کے مطابق امیر اور شبلی دونوں کی پیروی کی گئی اور شدید اختلاف بھی کیا گیا لیکن کیوں کہ امیر کے مکاتیب کے موضوعات ان کے مقصد کے لحاظ سے شبلی کی بہ نسبت زیادہ وسیع اور پُر تنوع ہیں اس لیے امیر شبلی سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

بیسویں صدی میں علمی مکتوب نگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بہت سے مشاہیر کے خطوط تو یکجا ہی نہیں ہو سکے۔ رسائل یا کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بات کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ جو علمی رنگ اور طرز غالب اور امیر نے فراہم کیا وہ ہمیں اس صدی میں مکمل طور پر نہیں ملتا۔ علمی خطوط نگاری امیر کے مکاتیب کی پہچان ہے اسی لیے وہ انیسویں اور بیسویں صدی کے مکتوب نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر امیر اردو کے مکتوباتی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط ان کی سوانحی زندگی کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ علمی حوالے سے بھی قابلِ ذکر مواد فراہم کرتے ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے وہ غالب اور سرسید کے درمیان نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ اردو مکتوب نگاری میں امیر مینائی، غالب کے بعد دوسرے بڑے مکتوب نگار قرار پاتے ہیں۔

حوالے

(۱) "اردو مکتوباتی ادب پر ایک نظر" از خواجہ احمد فاروقی، مضمون مشمولہ، ماہنامہ "آج کل"، دہلی، اپریل ۱۹۵۲ء، ص ۴۔

(۲) ایضاً

(۳) واجد علی شاہ: "تاریخِ ممتاز"، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، لاہور، اردو مرکز، ۱۹۵۲ء۔

(۴) نواب بدر عالم: "رقعاتِ بدر"، مرتبہ حکیم سید محمد علی عرشی، حیدر آباد دکن، قاسم پریس، سنہ ندارد۔

(۵) غلام امام شہید: کی مکتوب نگاری کی بابت ہماری معلومات "اردو خطوط" از شمس الرحمٰن (کتابی دنیا، دہلی ۱۹۴۷ء) سے ماخوذ ہیں۔
غلام امام شہید کے مکاتیب کا مجموعہ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔

(۶) غلام غوث بے خبر: "انشائے بے خبر"، مرتبہ انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، آگرہ، مرتضائی پریس ۱۹۴۰ء۔

(۷) غلام غوث بے خبر: "فغانِ بے خبر"، ۱۳۰۹ھ۔

(۰) حوالہ "اردو خطوط"، ص ۲۵۔

(۸) انشائے بے خبر، ص ۵۲۔

(۹) اسد اللہ خاں غالب: "غالب کے خطوط"، حصہ اوّل، طبع دوئم، مرتبہ خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء۔
اسد اللہ خاں غالب: "غالب کے خطوط"، حصہ دوم، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ ۱۹۵۸ء۔
اسد اللہ خاں غالب: "غالب کے خطوط"، حصہ سوم، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۷ء۔
اسد اللہ خاں غالب: "غالب کے خطوط"، حصہ چہارم، مرتبہ خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۵ء۔

(۱۰) پروفیسر خورشید الاسلام: "تنقیدیں"، طبع سوم، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۷ء، ص ۱۸۔

(۱۱) "اردو مکتوباتی ادب پر ایک نظر"، ص ۵۔

(۱۲) سر سید احمد خاں: "مکتوباتِ سر سید، جلد اوّل، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۶ء۔

(۱۳) ڈپٹی نذیر احمد: "موعظہ حسنہ"، مرتبہ پروفیسر افتخار احمد صدیقی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء۔

(۱۴) الطاف حسین حالی: "مکاتیبِ حالی"، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، کراچی، اردو مرکز، ۱۹۵۰ء۔

(۱۵) شبلی نعمانی: "شبلی مکاتیب کی روشنی میں" مرتب معین الدین احمد انصاری، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء۔

(۱۶) شبلی نعمانی: "خطوط شبلی بنام زہرا بیگم و عطیہ فیضی"، مرتبہ محمد امین و سید محمد یوسف قیصر آگرہ، شمسی پریس، سنہ ندارد۔
شبلی نعمانی: "خطوط شبلی عورتوں کے نام" محمد امین زبیری، لاہور، تاج کمپنی، سنہ ندارد۔
شبلی نعمانی: "خطوطِ شبلی بنام آزاد مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین، پٹنہ، بہار، اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء۔

(۱۷) نواب محسن الملک: "مکاتیب نواب محسن الملک"، مرتبہ محمد امین زبیری مارہروی، آگرہ، شمسی مشین پریس، سنہ ندارد۔

(۱۸) نواب وقار الملک : "خطوط وقار الملک"، مرتبہ مشتاق احمد، علی گڑھ، مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۷۴ء۔

(۱۹) اکبر الٰہ آبادی : "رقعاتِ اکبر"، مرتبہ محمد نصیر ہمایوں، لاہور، قومی کتب خانہ، سنہ ندارد۔

اکبر الٰہ آبادی : "مکتوباتِ اکبر بنام مرزا الطاف احمد" لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۷ء۔

(۲۰) محمد حسین آزاد : "مکتوباتِ آزاد، طبع دوم، لاہور، مرغوب ایجنسی، سنہ ندارد۔

محمد حسین آزاد : "مکاتیبِ آزاد، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء۔

(۲۱) داغ دہلوی : "انشائے داغ"، مرتبہ احسن مارہروی، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء۔

داغ دہلوی : "زبانِ داغ"، مرتبہ سید رفیق مارہروی، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد۔

(۲۲) مہدی افادی کے متفرق خطوط "نقوش" کے "خطوط نمبر" جلد اول شمارہ ۱۰۹، ص ۳۵۷ ملتے ہیں۔

(۲۳) ریاض خیر آبادی : "نثر ریاض خیر آبادی"، مرتبہ عقیل جعفری، حیدر آباد دکن،، نفیس اکیڈمی، ۱۹۴۵ء۔

(۲۴) ابو الکلام آزاد : "غبارِ خاطر"، لاہور، مکتبہ میری لاہبری، ۱۹۶۲ء۔

ابو الکلام آزاد : "کاروانِ خیال"، مرتبہ عبد الشاہد شروانی، لاہور، مکتبہ احباب، سنہ ندارد۔

(۲۵) مولانا محمد علی جوہر : "خطوط محمد علی"، مرتبہ پروفیسر محمد سرور، دہلی، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۴۰ء۔

(۲۶) اختر شیرانی : "اختر و سلمیٰ کے خطوط"، مرتبہ خادم حسین بٹالوی، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۷ء۔

گزشتہ دنوں یہی خطوط مرتضیٰ انجم کے مختصر دیباچے کے ساتھ "سلمیٰ اور اختر شیرانی کے عشقیہ خطوط" کے نام سے داستان پبلی کیشنز نے شائع کیے ہیں۔ کتاب پر سنہ درج نہیں ہے۔

(۲۷) نیاز فتح پوری : "مکتوباتِ نیاز"، حیدر آباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، سنہ ندارد۔

(۲۸) خواجہ حسن نظامی کے مکاتیب "نقوش"، "خطوط نمبر"، حصہ اول ص ۷۷۴، اور جلد دوم، ص ۱۵۳ تا ۱۵۶ میں ملتے ہیں۔

(۲۹) مولانا عبد الماجد دریابادی : "خطوط ماجدی"، کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان، ۱۹۸۶ء۔

(۳۰) سید سلمان ندوی : "سید سلمان ندوی کے خطوط عبد الماجد دریابادی کے نام"، جلد اول، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء۔

(۳۱) سید سلمان ندوی : "برید فرہنگ"، کراچی مکتبہ الشرق، ۱۹۵۲ء۔

مولوی عبد الحق : "مکاتیب عبد الحق بنام محوی، مرتبہ عبد القوی دسنوی، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۰ء۔

مولوی عبد الحق : "مکاتیبِ عبد الحق"، مرتبہ جلیل احمد قدوائی، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۶۳ء۔

مولوی عبد الحق : "خطوط عبد الحق بنام آل احمد سرور"، مرتبہ آل احمد سرور، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء۔

مولوی عبد الحق : "مکتوبات بابائے اردو"، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء۔

(۳۲) علامہ اقبال : "کلیاتِ مکاتیب اقبال"، جلد اول، طبع چہارم، سید مظفر حسین برنی، دہلی اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء۔

علامہ اقبال : "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال"، جلد دوم، طبع دوم، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء۔

علامہ اقبال: "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال"، جلد سوم، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، طبع اول، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء۔
(۳۳) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: "مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی"، جلد اول، مرتبہ عاصم نعمانی، لاہور، ایوانِ ادب، ۱۹۶۶ء۔
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی: مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی، جلد دوم، مرتبہ عاصم نعمانی، لاہور، اسلامک پبلیکشنز، ۱۹۷۲ء۔
(۳۴) جگر: "جگر کے خطوط"، مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام، کراچی، مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۷۱ء۔
(۳۵) امام احمد رضا خاں بریلوی: مکتوباتِ امام احمد رضا خاں بریلوی، مرتبہ مولانا پیر محمود احمد قادری، لاہور، مکتبہ نبویہ ۱۹۸۶ء۔
(۳۶) جوش ملیح آبادی: "جوش بنام ساغر"، مرتبہ خلیق انجم، مونو مینٹل پبلشرز، دہلی، ۱۹۹۱ء۔
جوش ملیح آبادی: نقرِ اخلاص (مکاتیب جوش بنام میر عشرت حسین) مرتبہ ڈاکٹر صفدر حسین، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء۔
(۳۷) سعادت حسن منٹو: "منٹو کے خطوط ندیم کے نام"، مرتبہ احمد ندیم قاسمی، راولپنڈی، کتاب نما، ۱۹۶۶ء۔
(۳۸) رشید احمد صدیقی: خطوط "رشید احمد صدیقی"، جلد اول، کراچی، مرتبہ لطیف الزماں خاں، مجلسِ ادبیاتِ مشرق، ۱۹۸۸ء۔
رشید احمد صدیقی: "خطوطِ رشید احمد صدیقی" جلد دوم، مرتبین، مہر الٰہی ندیم، لطیف الزماں خاں، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۹۳ء۔
(۳۹) سید سجاد ظہیر: "نقوشِ زنداں" مرتبہ رضیہ سجاد ظہیر، دہلی، مکتبہ شاہراہ ۱۹۵۱ء۔
(۴۰) فیض احمد فیض: "صلیبیں مرے دریچے میں" مرتب مرزا ظفر الحسن کراچی، پاک پبلشرز لمیٹڈ، سنہ ندارد۔
فیض احمد فیض: "دامنِ یوسف"، ماورا، لاہور، سنہ ندارد۔
(۴۱) بہادر یار جنگ: "مکاتیب بہادر یار جنگ" مرتب مجید احمد فاروق، کراچی، بہادر یار جنگ اکادمی، ۱۹۸۴ء۔
(۴۲) جاں نثار اختر: خاموش آواز، کراچی، فرینڈز پبلشر، سنہ ندارد۔
(۴۳) شورش کاشمیری: "مکاتیبِ شورش بنام عبداللہ ملک"، لاہور، کوثر پبلشرز، ۱۹۷۸ء۔
(۴۴) ابنِ انشاء: "خط انشاجی کے"، مرتب ریاض احمد ریاض، لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۵ء۔
(۴۵) جوش ملسیانی: "مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا" مرتبہ کالیداس گپتا رضا، بمبئی، ونل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء۔
(۴۶) ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں: "مکتوباتِ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں"، جلد اول، طبع دوم، مرتبہ خالد محمود، حیدر آباد، زبیر پبلشرز، ۲۰۰۰ء۔
ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں: "مکتوباتِ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں"، جلد دوم، مرتبہ خالد محمود، حیدر آباد، زبیر پبلیشرز، ۱۹۹۹ء۔
(۴۷) قدرت اللہ شہاب: "شہاب نامے"، مرتبہ تسلیم احمد تصور، لاہور، سورج پبلشنگ، ۱۹۹۶ء۔
(۴۸) کشن پرشاد شاد: "رقعاتِ شاد"، حیدر آباد دکن، محبوب پریس، ۱۳۱۷ھ۔
(۴۹) شاد عظیم آبادی: "مکتوباتِ شاد عظیم آبادی"، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ادارۂ ادبیاتِ اردو، ۱۹۳۹ء۔
(۵۰) جلیل مانک پوری: "مکاتیب جلیل"، مرتبہ علی احمد جلیل، حیدر آباد، ادبی ٹرسٹ، ۱۹۸۲ء۔
(۵۱) مولانا حسرت موہانی: "مکتوباتِ رئیس الاحرار"، مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری، کراچی، موڈرن پبلشرز، ۱۹۷۸ء۔
(۵۲) مولانا عبیداللہ سندھی: "مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات" مرتب محمد اسلم، لاہور، ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۴ء۔

(۵۳) مولانا ظفر علی خاں : "مکاتیبِ ظفر علی خاں"، مرتب زاہد منیر عامر، لاہور، سنی پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء۔
(۵۴) قاضی احمد میاں : "خطوط قاضی احمد میاں"، مرتبہ سید الطاف علی بریلوی، کراچی، ادارۂ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجو کیشنل کانفرنس، سنہ ندارد۔
(۵۵) فراق گورکھپوری : "من آنم"، لاہور، ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۶۲ء۔
(۵۶) چودھری محمد علی ردولوی : "گویا دبستان کھل گیا"، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۷ء۔
(۵۷) علی سردار جعفری : "سردار جعفری کے خطوط"، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۱ء۔
(۵۸) ڈاکٹر وزیر آغا : "وزیر آغا کے خطوط اکبر حمیدی کے نام"، مرتب اکبر حمیدی، اسلام آباد، بٹر پبلیشرز، ۱۹۹۵ء۔
(۵۹) پروین شاکر : "پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام"، مرتب جاوید وارثی، کراچی، بساطِ ادب، ۱۹۹۷ء۔

☆☆☆

خلاصۂ تحقیق

خلاصہ تحقیق

اس مقالے کا مقصد امیر احمد امیر مینائی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۰ء) کے مکتوبات کا تحقیقی جائزہ پیش کرنا ہے۔ یہ مطالعہ باب وار ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوع مقالہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے۔

امیر مینائی کے مکتوبات پر تحقیقی نوعیت کا مفصل جائزہ اب تک پیش نہیں کیا گیا، گو کہ امیر پر پانچ سوانح عمریاں اور دو پی، ایچ، ڈی کے مقالات لکھے گئے ہیں، لیکن ان میں امیر کی مکتوب نگاری کے بارے میں جزوی طور پر محض اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ خیال کرنا چاہیے کہ ڈھائی ہزار کے لگ بھگ مکتوبات موجود ہونے کے باوجود اور سو سال گزر جانے کے بعد بھی، اردو کے اتنے بڑے محقق، عالم اور شاعر کے خطوط نظر انداز ہوتے رہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

۱۔ غالب، سرسید، شبلی اور اقبال کی مکتوب نگاری پر اتنی توجہ رہی کہ امیر کے خطوط پر نظر نہ جا سکی۔

۲۔ امیر کی مکتوب نگاری پر محققین کی نگاہ اس لیے بھی نہ ٹھہری کہ:

(الف) امیر کے خطوط کا ایک بہت بڑا غیر مطبوعہ ذخیرہ منظر عام پر نہ آ سکا۔

(ب) امیر کے خطوط کا مجموعہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان اور پھر پاکستان، نت نئی سیاسی، مذہبی اور ادبی تحریکات کی زد میں رہا، جس کے باعث ادبی ترجیحات تبدیل ہو گئیں۔ اس لیے اہل علم کی توجہ دیگر ادبی اور علمی کاموں کے ساتھ ساتھ اس بڑے شاعر کی مکتوب نگاری پر بھی نہ جا سکی۔

(ج) مجموعۂ مکاتیب کے شائع ہونے کے بعد بھی امیر کے خطوط مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے، لیکن یہ خطوط فاضلانِ ادب کی توجہ اس لیے اپنی طرف مبذول نہ کرا سکے کہ ہندوستان میں شائع ہونے والے رسائل پاکستان کے اور پاکستان میں شائع ہونے والے رسائل ہندوستان کے اُدباء کی دسترس میں نہیں تھے۔ الاماشاء اللہ

اس صورتِ حال کے باوجود جس حد تک، امیر کے خطوط میسر آئے، ہندوستان اور پاکستان میں ان پر قلم اٹھایا گیا۔ لیکن تفصیلی اور جامع مطالعے کی ضرورت باقی رہی۔ اس لیے کہ امیر اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیت تھے۔ دنیائے ادب میں شاعر، لغت نگار، تذکرہ نگار اور زبان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے ان کا مقام و مرتبہ متعین ہے۔ مگر ان کا رتبہ مکتوب نگاری ابھی غیر متعین ہے۔

اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھائی جائے، مناسب ہوگا کہ امیر کے علمی رتبے پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

امیر کا بہ حیثیت شاعر جائزہ لیا جائے، تو حیرت انگیز صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مسدس، مثنوی، لغت، رباعیات، واسوخت اور قطعات میں روایتی اور جدید موضوعات کے دل چسپ تجربے کیے ہیں۔ وہ اپنے دور کے باکمال شاعر تھے۔ جس رنگ میں چاہتے، شعر کہہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں میں، وہ اردو شاعری پر چھائے رہے اور بیسویں صدی کی ابتدائی چار دہائیوں میں ان کے تلامذہ۔

امیر کو اپنے عہد میں، معاصرین پر زبردست فوقیت حاصل تھی۔ ان کے معاصرین میں داغؔ دہلوی، جلالؔ لکھنوی، منیرؔ اور تسلیمؔ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے۔ یہ چاروں شعراء، رام پور میں امیر کے ساتھ رہے۔ ہر چند کہ امیر کی طرح انھیں بھی تمام اصنافِ شاعری پر قدرت حاصل تھی۔ لیکن وہ امیر

کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے۔ امیر کا اپنے معاصرین سے تقابل کیا جائے تو یہ نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ امیر کے معاصرین میں سے کسی نے ''نعت'' کی طرف خصوصی توجہ نہیں کی۔ جب کہ امیر صاحبِ دیوان نعت گو شاعر ہیں۔

۲۔ امیر کے معاصرین میں سے کسی نے تذکرہ نگاری نہیں کی۔ جب کہ امیر نے رام پور کے معروف وغیر معروف شعراء کا اہم تذکرہ مرتب کیا، جسے رام پور کی اہم علمی وادبی اور تاریخی دستاویز کا درجہ حاصل ہے۔

۳۔ امیر کے کسی معاصر نے فارسی نظم ونثر کا قابلِ ذکر ذخیرہ نہیں دیا۔ جب کہ امیر نے فارسی نثر، فارسی اردو لغت کے علاوہ ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔

۴۔ امیر کے کسی معاصر نے اردو کا کوئی اہم لغت مرتب نہیں کیا۔ جب کہ امیر جدید اردو لغت نویسی کے بانی ہیں۔

۵۔ امیر نے اساتذہ اردو کے متعدد دواوین کی ترتیب وتدوین اور تحشیہ کا کام انجام دیا۔ یہ اعزاز بھی ان کے کسی معاصر کو حاصل نہیں۔

۶۔ امیر نے متعدد گلدستوں کی نگرانی کی اور ایک اخبار ''سحر سامری'' کے مدیر رہے، امیر کے کسی معاصر کی ایسی کوئی خدمت ابھی تک سامنے نہیں آئیں۔

۷۔ امیر کے مقابلے میں کسی معاصر نے ''واسوخت نگاری'' پر توجہ نہیں کی، جب کہ امیر کے یہاں ایک مجموعے کے علاوہ بھی کئی بہترین واسوخت ملتے ہیں۔

۸۔ امیر نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مثنویات، قصائد، رباعیات اور قطعات تحریر کیے ہیں۔

۹۔ تلامذہ کی تربیت کا جو معیار، امیر نے متعارف کرایا وہ ان کا کوئی معاصر پیش نہ کر سکا۔

۱۰۔ دینی ادب اپنے معاصرین میں صرف امیر نے تحریر کیا۔

۱۱۔ مکاتیب کا جتنا بڑا ذخیرہ امیر نے فراہم کیا، اس کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں۔

۱۲۔ علم جفر ورمل سے متعلق رسائل صرف امیر نے تحریر کیے۔

۱۳۔ امیر اپنے دور کے بڑے شاعر ہی نہیں، بڑے نثار بھی تھے۔ یہ اعزاز بھی ان کے کسی اور معاصر کو حاصل نہیں۔

۱۴۔ علمی وادبی قابلیت کے علاوہ کردار کا جو بڑا پن، امیر کے یہاں ہے۔ وہ ان کے معاصرین کے ہاں شاذ وشاد ہے۔

امیر کا اپنے معاصرین سے یہ ایک سرسری موازنہ ہے۔ جس سے ان کی برتری ثابت ہے۔ یہ صورتِ حال تھی۔ اس کے باوجود ہے کہ ان کے صرف تیس فی صد علمی وادبی کارنامے منظرِ عام پر آ سکے۔ افسوس کہ امیر کا بہت سا کام ضائع ہو گیا اور بہت سا ابھی اشاعت کا منتظر ہے۔ ان میں صرف مکتوبات ہمیں حاصل ہو سکے ہیں۔ جن کی اہمیت وافادیت اس مقالے میں پیش کی گئی ہے۔

اردو شعراء اور ادباء کے مکتوبات کی تحقیق وتنقید کا جائزہ لیا جائے تو سب سے زیادہ غالبؔ کے خطوط پر لکھا گیا ہے۔ اتنا کہ اس کا احاطہ ممکن تو ہے۔ لیکن نہایت مشکل۔ سرسید، شبلی اور اقبال کے خطوط پر بھی فضلاء کرام نے خاص توجہ کی۔ ان مشاہیر کے مکتوبات کو یک جا بھی کیا گیا ہے۔ لیکن سائنٹی فیک انداز میں صرف غالب اور اقبال کے خطوط کو مرتب کیا جا سکا، غالب، شبلی اور اقبال کے خطوط کے محاسن اور ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے کتابیں بھی لکھی گئیں، لیکن ان میں سے کسی شاعر یا ادیب کے خطوط کا مفصل اور جامع مطالعہ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

اردو مکتوب نگاری پر دو پی، ایچ، ڈی کے مقالات بھی لکھے گئے ہیں۔ پہلا قیامِ پاکستان سے قبل، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے دہلی یونی ورسٹی

میں، تحریر کیا، جس کے کچھ حصے ہندوستان و پاکستان کے موقر رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر مبشر علی صدیقی نے لکھا یہ بھی ہندوستان ہی میں لکھا گیا البتہ شائع ہوا۔ الغرض اردو مکتوبات کی تحقیق و تنقید پر جو بھی کام ہوئے ہیں، وہ ہماری نظر میں ہیں۔ ان تمام کاموں کی روشنی میں مکتوباتِ امیر کے اس مطالعے کو مفید تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

امیر اور ان کی مکتوب نگاری پر چند ایک اعتراضات بھی کیے گئے ہیں۔ جن کا جواب مقالے کے مختلف ابواب میں اطمینان بخش طور پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان مکتوبات کی روشنی میں، اردو ادب کی تاریخ کے متعدد مخفی گوشے بھی سامنے لائے گئے ہیں اور اردو مکتوب نگاری میں امیر کے جائز مقام کی نشان دہی کی گئی ہے۔"

جائزہ اب ذیل میں باب وار اس مقالے کے خاص خاص نکات کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

باب اوّل:

اس باب میں امیر کی مکتوب نگاری کے آغاز و ارتقاء، ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہونے والے خطوط اور امیر کے غیر مطبوعہ ذخیرۂ مکتوبات کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

راقم ناچیز کی تحقیق کے مطابق امیر کی مکتوب نگاری ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔ لیکن ان کا پہلا خط یکم جولائی ۱۸۸۰ء کا سامنے آیا ہے۔ اس سے پہلے کے خطوط اشاعت کے لیے ترتیب دیے گئے تھے۔ لیکن گم ہو گئے۔ امیر کے خطوط سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ، علی گڑھ، شمارہ جنوری فروری ۱۹۰۷ء میں شائع کیے۔ جب کہ مکاتیب کا پہلا مجموعہ ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

امیر کے مکتوبات کی اشاعت کا تسلسل سو سال سے جاری ہے۔ اب تک بائیس مختلف جگہوں پر کل ''سات سو دو'' مکاتیب شائع ہوئے۔ ان میں بہت سے کئی بار شائع ہوئے۔ اور متعدد خطوط کہیں مکمل اور کہیں نامکمل شائع ہوئے۔ اس طرح اب تک اصل میں منظرِ عام پر آنے والے کل غیر مطبوعہ خطوط کی تعداد ''چار سو پانچ'' ہے۔ جو چھیانوے اشخاص کے نام ہیں۔ امیر کے یہ خطوط معاصر شعراء، تلامذہ، معروف علماء و فضلاء، نوابین اور علم و ادب کے قدر دانوں کے نام ہیں۔

اس باب میں امیر کے مکتوبات کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ بھی متعارف کرایا گیا ہے۔ جس میں ''سترہ سو'' مکتوبات ہیں۔ اس کی دریافت سے امیر کے بارے میں بہت سے انکشافات سامنے آئیں ہیں، جنہیں اس مقالے کے مختلف ابواب میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی ذخیرے سے پتا چلتا ہے کہ امیر کا آخری خط ۲۰ر جولائی ۱۹۰۰ء کا تحریر کردہ ہے۔

امیر کے یہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکاتیب اردو زبان و ادب کی تاریخ کا اہم سرمایہ اور امیر کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ یہ خطوط انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ، اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھنے والوں کے لیے بھی قابلِ قدر مواد فراہم کرتے ہیں۔

باب دوم:

امیر مینائی انیسویں صدی کے آخری دور میں استادی کے ایک اعلیٰ مرتبے پر فائز تھے۔ جس کی وجہ سے طالبانِ فن ہر روز شعر و سخن سے متعلق ان کے خیالات سے استفادہ کرنا عین سعادت خیال کرتے تھے۔ چناں چہ اس باب میں امیر کے علمی خیالات جو تذکیر و تانیث، اصلاحِ سخن، لغت اور بلاغت سے متعلق ہیں، خطوط سے علیحدہ کر کے پیش کیے گئے ہیں۔ امیر کے ان خیالات کا تقابل معاصرین کی لغات اور کتب و رسائل سے بھی کیا گیا ہے۔

امیر کو لسانی مسائل، تذکیر و تانیث، اصلاحِ سخن، لغوی تصریحات اور فصاحت و بلاغت سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان سے پہلے اور ان کے دور میں جو کتابیں ان موضوعات پر اردو اور فارسی میں قلم بند کی گئی وہ ان کی نظر میں تھیں اور امیر ان کتب کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ تھے۔ امیر نے لسانی تصریحات سے متعلق کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن امیر کے خطوط میں بکھرے ہوئے یہ خیالات ان کے دور میں لکھی جانے والی کتابوں کے مدِ مقابل رکھے جاسکتے ہیں اور ان خیالات وافادات کو یکجا کر کے کتابی صورت دی جائے تو کئی کتابیں تو بن سکتی ہیں۔

باب سوم

جس طرح باب دوم میں لسانی تصریحات کے حوالے سے مکتوبات امیر کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ اس باب میں اُسی انداز سے علمِ عروض سے متعلق نکات کو، نکاتِ سخن، علم القوافی اور فنِ تاریخ گوئی کے تحت استفادے کے لیے درج کیا گیا ہے۔ اس باب میں بھی امیر کے علمی خیالات وافکار کا تقابل معاصرین کی کتب سے کیا گیا ہے۔

امیر مینائی کا شمار اردو کے ان شعراء میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے زبان اور شاعری کی نوک پلک سنوارنے میں تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ یہ بات اپنے موضوع سے خاص دلچسپی کی بناء پر نہیں کہی گئی، بلکہ اس کی شہادت میں ڈھیر سارے خطوط پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جن میں امیر نے لسانی اور عروضی مسائل پر آزادانہ رائے دی ہے۔

امیر کا یہ ذخیرہ مکتوبات علمی معلومات کا خزانہ ہے۔ ان میں ایسے بصیرت افروز نکات پائے جاتے ہیں کہ جس کی مثال نہ تو ان کے دور میں ملتی ہے اور نہ ان کے بعد اور امیر پر لگایا گیا یہ اعتراض بھی دم توڑتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ صرف لکھنوی زبان ومحاورات ہی پر دسترس رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو زبان مزاج سے واقف تھے۔ اسی لیے جس رنگ میں چاہتے شعر کہہ لیتے۔ جب کہ ان کے معاصرین لکھنؤ اور دہلی کی دبستانی لڑائیوں میں محدود ہو کر رہے گئے تھے۔

اسی باب میں پیش کی گئی عروضی تصریحات اصل میں امیر کی وہ روایات ہیں، جس کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا، یوں اردو شاعری کے ارتقاء میں امیر کے علاوہ دبستانِ امیر نے بھی ایک ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔

اب ہم مکتوباتِ امیر کے ایک اور دل چسپ پہلو کی طرف آتے ہیں۔ وہ یہ کہ امیر سے پہلے اور ان کے دور میں علمِ عروض اور فنِ تاریخ گوئی پر قابلِ ذکر کتابیں شائع ہوئیں۔ امیر کے ان مکتوبات میں غیر محسوس طور پر ان کتابوں کی بازگشت ملتی ہے۔ اس باب میں ان شعری مسائل کو بھی شامل کیا گیا ہے، جو عہدِ امیر میں متنازع تھے۔ جن پر کتابیں اور رسائل لکھے گئے، امیر نے اس حوالے سے کوئی کتاب تحریر نہیں کی، لیکن ان مکتوبات میں اس دور کے علمی مباحث پر امیر کے جوابات ملتے ہیں۔ گویا امیر کے یہ علمی خطوط انیسویں صدی کی شعری تنقید کی تاریخ مکمل کرتے ہیں۔

باب چہارم

اس باب میں ''امیر اللغات''، ''دفترِ امیر اللغات'' کی تاریخ، اور امیر کے نظامِ لغت نویسی کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی ذیل میں ''دفترِ امیر اللغات'' سے وابستہ پینتیس افراد کے متعلق معلومات حواشی میں دی گئی ہیں۔ یوں اس باب میں اہلِ علم کا ایک چھوٹا سا تذکرہ بھی شامل ہو گیا ہے۔

راقم ناچیز کی تحقیق کے مطابق امیر مینائی جدید اردو لغت نویسی کے بانی ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اردو لغت نویسی کو ایک باقاعدہ منظم اور سائنٹی فیک نظام سے روشناس کرایا اور ایک مضبوط لائحہ عمل کے تحت ''دفترِ امیر اللغات'' کی بنیاد ڈالی۔ یہ اردو کا پہلا لغت ہے، جس کی ترتیب میں مولف کے علاوہ، دیگر

زبانوں کے لائق فائق علماء کا تعاون بھی حاصل کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ مسودہ تیار ہونے کے بعد ان علماء کو نظرِ ثانی کی دعوت دی جاتی تھی۔ آج ''اردو ڈکشنری بورڈ'' پاکستان، لغت نویسی کے جس نہج پر کام کر رہا ہے۔ وہ یقیناً ایک نہایت ترقی یافتہ نظام ہے۔ جس کو ''آکسفورڈ ڈکشنری'' کے منظم طریقے پر قائم کیا گیا ہے۔ ''امیر اللغات'' کے دفتر میں اس نظم و ترتیب اور اصول و قواعد کی ایک جھلک ایک صدی پہلے نظر آتی ہے۔

''امیر اللغات'' کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات مختلف کتب و رسائل میں ملتی ہے۔ لیکن ان سب کو یکجا کر کے بھی، امیر کی لغت نویسی پر ہم کوئی مضبوط رائے قائم نہیں کر سکتے۔ یا ادبی تاریخ کو مفصل معلومات فراہم نہیں کر سکتے۔ لیکن امیر کے یہ خطوط ''امیر اللغات''، ''دفتر امیر اللغات'' اور امیر کے نظامِ لغت نویسی کی تاریخ مرتب کرنے میں بھرپور معاونت کرتے ہیں۔ گویا ان مکاتیب میں امیر کا مکمل نظامِ لغت نویسی ملتا ہے۔

بابِ پنجم

اس باب میں چشمکوں کی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں شعراء کی معاصرانہ چپقلشوں کا جب بھی ذکر آتا ہے۔ تو ذہن میں فوری طور پر میر و سودا، مصحفی و انشا، ناسخ و آتش، غالب و ذوق، غالب اور حامیانِ قتیل، انیس و دبیر اور امیر و داغ کا نام آتا ہے۔ امیر کے ساتھ داغ ہی نہیں بلکہ جلال لکھنوی اور سید احمد دہلوی سے اختلافات کی بابت بھی لکھا گیا ہے۔ مگر صورتِ حال اس سے بہت مختلف ہے۔ مکتوباتِ امیر سے ان معاصرانہ چشمکوں کی یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ:

۱۔ داغ کے ساتھ امیر کے اختلافات کبھی نہیں رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر و داغ آپس میں بے حد انسیت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ یہ سارا قصہ امیر و داغ کی چشمکوں کا نہیں، بلکہ دونوں کے تلامذہ کی چپقلشوں کا ہے۔ جس نے ہمارے تاریخ نویسوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا۔ اس کے علاوہ امیر و داغ سے منسوب معرکہ آرائی میں دونوں کے شاگردوں کے علاوہ دبستانی معرکہ آرائی کے شوقینوں نے بھی امیر اور داغ کو ایک دوسرے کا حریف بنا کر پیش کیا ہے۔

۲۔ سید احمد دہلوی کے ساتھ بھی امیر کی معرکہ آرائی کبھی نہیں ہوئی۔ امیر اللغات شائع ہوئی، تو دہلی سے تعلق رکھنے والے، سید احمد دہلوی نے، امیر پر الزام لگایا کہ ''امیر اللغات''، ''ارمغانِ دہلی'' اور ''ہندوستانی لغت'' کا چربہ ہے۔ ''امیر اللغات'' صرف لکھنوی محاورات اور الفاظ تک محدود ہے۔ ''امیر اللغات'' میں جا بجا امیر نے اپنے اور لکھنوی شعراء کے اشعار سند میں دیے ہیں۔ سید احمد دہلوی کی طرف سے ڈیڑھ سال تک امیر کے خلاف مضامین لکھے گئے۔ امیر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور شاگردوں کو بھی سختی سے منع کیا کہ جواب نہ دیا جائے۔ اس لیے کہ یہ سارے الزامات حقیقت کے برخلاف تھے۔ البتہ سر سید احمد خان اور اکبر الہ آبادی نے امیر کی حمایت میں تبصرے تحریر کیے۔ اس طرح یہ معرکہ آرائی یک طرفہ رہی۔ بعد کے محققین نے سید احمد دہلوی کی ان حرکتوں کو دبستانی تعصب قرار دیا۔

۳۔ جلال لکھنوی کے ساتھ بھی امیر کے اختلافات کبھی نہیں رہے۔ یہ غلط فہمی ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی کتاب ''جلال لکھنوی'' سے پیدا کی۔ ڈاکٹر محمد حسن کے تمام الزامات بے بنیاد اور ان کی بدنیتی کا آئینہ ہیں۔ امیر صلح جو اور حقیقت پسند انسان تھے۔ وہ اپنے معاصرین سے کبھی معرکہ آراء نہیں ہوئے۔ یہ بات ان کے بکثرت مکاتیب سے ثابت ہے۔

بابِ ششم

اس باب میں شاگردوں کے ساتھ امیر کے تعلقات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان عوامل کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ جس کے باعث

امیر کا مسلکِ شاعری قابلِ پیروی قرار پایا اور تربیت کے ان اسرار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جس کی بدولت امیر کے تلامذہ ایک زمانے تک اردو شاعری پر چھائے رہے۔ اس کے بعد امیر کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے، جس کے سحر میں ہزاروں طالب علم گرفتار ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں پہلی مرتبہ ۳۱۵ شاگردوں کی ایک فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ امیر اور ان کے شاگردوں کے بارے میں یہ معلومات امیر کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط سے مستفاد ہیں۔

اگر امیر کے مکتوبات منظرِ عام پر نہیں آتے، تو امیر کے استادانہ مرتبے اور تلامذہ کی بابت، بہت سے گوشے تشنہ رہ جاتے ہمیں یہ کبھی پتا نہیں چلتا کہ امیر اپنے دور کے ایک باشعور استاد تھے، وہ تعلیمی نفسیات سے بھی آگاہ تھے اور علم کی فلاسفی سے بھی۔ وہ ادبی تاریخ بھی آشنا تھے اور ادبی رویوں سے بھی۔ وہ اپنی تمام تر علمی، ادبی اور سماجی حیثیتوں کے ساتھ شاگردوں کے درمیان رہتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امیر سوشل انجینئر تھے۔ لیکن ان کا انداز سماجی کارکنوں جیسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے شاگرد نامور ہوئے اور ان کا سلسلہ تلمذ آج بھی جاری و ساری ہے۔

باب ہفتم

اس باب میں مکتوباتِ امیر کی سوانحی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ امیر کی سوانح عمریوں میں امیر سے متعلق متعدد معلومات ادھوری ہیں۔ جنھیں یہ خطوط مکمل کرتے ہیں۔ اسی طرح مکاتیب میں امیر کی زندگی کی جو کڑیاں ملتی ہیں، انھیں سوانح عمریاں نتیجہ خیز بناتی ہیں۔ امیر کی سوانح عمریوں میں، ان کی زندگی کے اہم واقعات، اسفار اور خاندانی حالات ملتے ہیں۔ لیکن ان میں زمانی تسلسل جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ خطوط اس کمی کا ازالہ کرتے ہیں۔

امیر کی زندگی کے آخری بیس سال (۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۰ء) اہم ترین ہیں۔ یہ امر حوصلہ افزاء ہے کہ ہمیں جو مکتوبات دستیاب ہوئے ہیں وہ بھی اسی عرصے یعنی یکم جولائی ۱۸۸۰ء سے ۲۰ جولائی ۱۸۹۰ء کے ہیں۔ جن میں امیر کی زندگی کا مکمل زمانی تسلسل ملتا ہے۔

باب ہشتم

اس باب میں امیر کے خطوط کا تقابلی مطالعہ داغ دہلوی کے مکتوبات سے کیا گیا ہے۔ اردو مکتوب نگاری میں داغ کا رتبہ صرف اتنا ہے کہ وہ بڑے شاعر کے خطوط ہیں۔ جن میں ان کے مزاج کا مدوجزر ملتا ہے۔ مکتوب نگاری کی شان نہیں ملتی۔ جب کہ امیر اردو مکتوب نگاری میں متعدد نمایاں خوبیوں کی بدولت اہم مقام رکھتے ہیں۔

باب نہم

اس باب میں اردو مکتوب نگاری میں امیر کا مقام متعین کیا گیا ہے۔ اردو مکتوب نگاری کی تاریخ پونے دوسو سال پر محیط ہے۔ چناں چہ اس باب میں پونے دوسو سال کے چیدہ چیدہ چھیالیس مکتوب نگاروں پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے تا کہ امیر کی مکتوب نگاری کی انفرادیت سامنے لائی جاسکے۔

امیر کے خطوط کی شناخت خالصتاً علمی ہے۔ مجموعی طور پر امیر، اردو کے مکتوباتی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط سوانحی زندگی کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ، علمی حوالے سے بھی قابلِ ذکر مواد فراہم کرتے ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے وہ غالب اور سرسید کے درمیان نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جب کہ اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں امیرؔ، غالبؔ کے بعد دوسرے بڑے مکتوب نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔

مکاتیبِ امیر کے اس مفصل مطالعے سے جو فوائد حاصل ہوئے، انھیں باب وار پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مطالعے سے ایک بڑا

فائدہ یہ ہوا کہ امیر کے متعلق کچھ ایسے پہلو سامنے آئے ہیں، جن پر مزید کام ہونا چاہیے۔اس سے یقیناً تاریخِ ادب کو فائدہ ہوگا۔جن حوالوں سے اب امیر پر لکھا جانا چاہئے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ امیر کی نثر نگاری۔

۲۔ امیر کی شعری اصطلاحات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔

۳۔ امیر کی لسانی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔

۴۔ دبستانِ امیر کی ادبی اور لسانی خدمات کا مطالعہ۔

۵۔ امیر کی لغت نویسی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔

۶۔ انیسویں صدی کے اسلامی ادب میں امیر کا مقام ورتبہ۔

۷۔ برصغیر کے فارسی ادب میں امیر کا مقام۔

۸۔ انیسویں صدی کی اردو تذکرہ نگاری میں امیر کا کردار۔

۹۔ مکتوباتِ امیر مینائی کی ترتیب وتدوین۔

ان تجاویز پر مقالے کا اختتام کیا جاتا ہے۔

کتابیات

کتابیات

(۱) آرزو، سراج الدین علی خاں : "نوادر الالفاظ"، ۱۱۶۵ھ۔

(۲) آزاد، ابوالکلام : "غبار خاطر"، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۶۲ء۔

(۳) آزاد، ابوالکلام : "کاروانِ خیال"، مرتبہ عبدالشاہد شروانی، لاہور،، مکتبہ احباب، سنہ ندارد۔

(۴) آزاد، محمد حسین آزاد : "مکاتیبِ آزاد"، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل، لاہور، مجلس ترقی ادب۔ ۱۹۶۶ء۔

(۵) آزاد، محمد حسین : "مکتوباتِ آزاد"، طبع دوم، لاہور، مرغوب ایجنسی، سنہ ندارد۔

(۶) آزاد، نعیم الحق شیخ پوری : "حیات الشعراء"، میرپور خاص سندھ، بلدیہ میرپور خاص، ۱۹۶۹ء۔

(۷) آسی، غازی پوری : "عین المعارف"، کراچی، مکتبۂ رضویہ، ۱۹۸۸ء۔

(۸) آفاق بنارسی : "معین الشعراء"، لکھنؤ، صدیق بک ڈپو، ۱۹۲۷ء۔

(۹) آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر : "صہبائے مینائی"، ڈھاکہ، مکتبۂ عارفین، سنہ ندارد۔

(۱۰) آہ، ممتاز علی : "امیر مینائی" (سوانح)، لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء۔

(۱۱) ابنِ انشا : "خط انشاجی کے"، مرتب ریاض احمد ریاض، لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۵ء۔

(۱۲) ابوالاعلیٰ مودودی، سید، مولانا : "مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی"، جلد اول، مرتبہ عاصم نعمانی، لاہور، ایوانِ ادب، ۱۹۶۶ء۔

(۱۳) ابوالاعلیٰ مودودی، سید، مولانا : "مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی"، جلد دوم، مرتبہ عاصم نعمانی، لاہور، اسلامک پبلیکشنز، ۱۹۷۲ء۔

(۱۴) ابو سلمان الہندی : "امام الہند"، کراچی، "مکتبۂ اسلوب"، ۱۹۶۲ء۔

(۱۵) ابو محمد سحر، ڈاکٹر : "مطالعہ امیر"، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۴ء۔

(۱۶) اثر لکھنوی : "فرہنگِ اثر"، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔

(۱۷) احسان دانش : "تذکیر و تانیث"، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۰ء۔

(۱۸) احسان دانش : "اردو مترادفات"، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۰ء۔

(۱۹) احسن مارہروی، ڈاکٹر : "نمونۂ منثورات"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔

(۲۰) احمد رضا خاں بریلوی، امام : "مکتوباتِ امام احمد رضا خاں بریلوی"، مرتبہ پیر محمود احمد قادری، لاہور، مکتبہ نبویہ، ۱۹۸۶ء۔

(۲۱) احمد بریلوی، سید : "فرہنگِ آصفیہ"، طبع اول، دہلی، دفتر فرہنگ آصفیہ، ۱۹۱۸ء۔

(۲۲) احمد بریلوی، سید : "فرہنگ آصفیہ"، جلد اول، دہلی،، اردو اکادمی، ۱۹۷۴ء۔

(۲۳) احمد بریلوی، سید : "فرہنگ آصفیہ"، جلد دوم، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۷۴ء۔

(۲۴) احمد بریلوی، سید : "فرہنگ آصفیہ"، جلد سوم، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۷۴ء۔

(۲۵) احمد بریلوی، سید : "فرہنگ آصفیہ"، جلد چہارم، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۷۴ء۔

(۲۶) احمد میاں، قاضی: "خطوط قاضی احمد میاں"، مرتبہ الطاف علی بریلوی، کراچی، ادارہ تصنیف و تالیف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، سنہ ندارد۔
(۲۷) اختر، جاں نثار: "خاموش آواز"، کراچی، فرینڈز پبلشرز، سنہ ندارد۔
(۲۸) اختر شیرانی: "اختر و سلمٰی کے خطوط"، مرتب خادم حسین بٹالوی، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۷ء۔
(۲۹) اختر شیرانی: "سلمٰی اور اختر کے عشقیہ خطوط"، لاہور، داستانِ پبلی کیشنز، سنہ ندارد۔
(۳۰) اختر، واجد علی شاہ: "جوہر عروض"، لکھنؤ، سلطانی پریس، ۱۸۹۰ء۔
(۳۱) اختر، واجد علی شاہ: "تاریخ ممتاز"، مرتبہ ڈاکٹر محمد باقر، لاہور، اردو مرکز، ۱۲۵۲ھ۔
(۳۲) اشرف علی لکھنوی، مولوی: "مصطلحاتِ اردو"، لکھنو، مطبع نامی، ۱۸۹۰ء۔
(۳۳) اقبال: "کلیاتِ مکاتیب اقبال"، جلد اول، طبع چہارم، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی اردو، اکادمی، ۱۹۹۳ء۔
(۳۴) اقبال: "کلیاتِ مکاتیب اقبال"، جلد دوم، طبع دوم، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی اردو، اکادمی، ۱۹۹۳ء۔
(۳۵) اقبال: "کلیاتِ مکاتیب اقبال"، جلد سوم، طبع اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی اردو، اکادمی، ۱۹۹۳ء۔
(۳۶) اکبر الہ آبادی: "رقعاتِ اکبر": مرتبہ محمد نصیر ہمایوں، لاہور، قومی کتب خانہ، سنہ ندارد۔
(۳۷) اکبر الہ آبادی: "مکتوباتِ اکبر بنام مرزا سلطان احمد"۔
(۳۸) الم، میر مہدی حیدر آبادی: "گلشنِ تاریخ"، حیدر آباد دکن، مطبع فخری نظامی، ۱۳۱۳ھ۔
(۳۹) امیر احمد علوی: "طرۂ امیر"، لکھنؤ، انوار المطابع، ۱۹۲۸ء۔
(۴۰) امیر مینائی: "امیر اللغات"، حصہ اول، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۱ء۔
(۴۱) امیر مینائی: "خطوطِ منشی امیر احمد"، مرتب احسن اللہ ثاقب، علی گڑھ، اردو پریس، ۱۹۱۰ء۔
(۴۲) امیر مینائی: "مکاتیبِ امیر مینائی"، مرتب احسن اللہ ثاقب، لکھنؤ، مطبعہ ادبیہ، ۱۹۲۴ء۔
(۴۳) امیر مینائی: "امیر اللغات"، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء۔
(۴۴) انور سدید، ڈاکٹر: "اردو کی مختصر تاریخ"، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء۔
(۴۵) اوحد الدین، مولوی، "نفائس اللغات"، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۸۶۹ء۔
(۴۶) اوج، محمد جعفر: "مقیاس الاشعار"، لکھنؤ، جعفری پریس، ۱۲۹۲ھ۔
(۴۷) بال کند قصیر سکندر آبادی: "بدیع البدائع"، بلند شہر، دبیر پریس، ۱۸۷۰ء۔
(۴۸) بحر لکھنوی: "بحر البیان"، حیدری پریس، ۱۳۱۱ھ۔
(۴۹) بدر عالم، نواب: "رقعاتِ بدر"، مرتب حکیم سید محمد علی عرشی، حیدر آباد دکن، قاسم پریس، سنہ ندارد۔
(۵۰) بہادر یار جنگ: "مکاتیب بہادر یار جنگ"، مرتب مجید احمد فاروق، کراچی، بہادر یار جنگ اکادمی، ۱۹۸۴ء۔
(۵۱) بجر، غلام غوث: "فغانِ بجر"، ۱۳۰۹ھ۔
(۵۲) بجر، غلام غوث: "انشائے بجر"، مرتبہ انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی، آگرہ، مرتضائی پریس، ۱۹۴۰ء۔
(۵۳) پروین شاکر: "پروین شاکر کے خطوط نظیر صدیقی کے نام"، مرتب جاوید وارثی، کراچی، بساطِ ادب، ۱۹۹۷ء۔

(۵۴) جگر مراد آبادی : "جگر کے خطوط"، مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام، کراچی، مشہور آفسٹ پریس، ۱۹۷۱ء۔
(۵۵) جلال، ضامن حسین لکھنوی، سید : "کارآمد شعراء"، لکھنو، مطبع ریاضِ محمدی، ۱۲۹۳ھ۔
(۵۶) جلال ضامن حسین لکھنوی، سید : "سرمایہ زبان اردو، لکھنو، نول کشور پریس، ۱۲۹۸ھ۔
(۵۷) جلال، ضامن حسین لکھنوی، سید : "افادہ تاریخ"، لکھنؤ، مطبع جعفری، ۱۳۰۳ھ۔
(۵۸) جلال، ضامن حسین لکھنوی، سید : "گلشنِ فیض"، لکھنؤ، مطبع جعفری، ۱۳۰۴ھ۔
(۵۹) جلال، ضامن حسین لکھنوی، سید : "قواعد المنتخب"، لکھنؤ، مطبع قومی، ۱۳۱۰ھ۔
(۶۰) جلال، ضامن حسین لکھنوی، سید : "رسالہ تذکیر و تانیث"، لکھنؤ، مطبع گلزار محمدی، ۱۳۱۱ھ۔
(۶۱) جلیل، جلیل حسن : "سوانح امیر مینائی"، حیدر آباد، مطبع سیدی، ۱۳۴۷ھ۔
(۶۲) جلیل، جلیل حسن : "مکاتیبِ جلیل"، مرتبہ علی احمد جلیلی، حیدر آباد، ادبی ٹرسٹ، ۱۹۸۲ء۔
(۶۳) جوش ملسیانی : "مکتوباتِ جوش ملسیانی بنام رضا"، مرتبہ کالیداس گپتار ضا، بمبئی، ول پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء۔
(۶۴) جوش ملیح آبادی : "جوش بنام ساغر"، مرتبہ خلیق انجم، مونو مینٹل پبلشرز، دہلی، ۱۹۹۱ء۔
(۶۵) جوش ملیح آبادی : "نقد اخلاص" (مکاتیب جوش بنام میر عشرت حسین) مرتبہ ڈاکٹر صفدر حسین، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء۔
(۶۶) جوہر، محمد علی، مولانا : "خطوط محمد علی"، مرتبہ پروفیسر محمد سرور، دہلی، مکتبہ، جامعہ دہلی، ۱۹۴۰ء۔
(۶۷) چرنجی لال : "مخزن المحاورات"، دہلی، امپریل بک ڈپو، ۱۸۹۱ء۔
(۶۸) حاتم بیگ، مرزا : "بار عروض"، آگرہ، دبدبہ حیدری پریس، ۱۸۹۳ء۔
(۶۹) حالی، الطاف حسین : "مکاتیبِ حالی"، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، کراچی، اردو مرکز، ۱۹۵۰ء۔
(۷۰) حامد اللہ ندوی، ڈاکٹر : "لکھنؤ کی لسانی خدمات"، طبع اول، دہلی، مکتبہء جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء۔
(۷۱) حامد حسن قادری : "داستانِ تاریخ اردو"، طبع سوم، کراچی، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۱ء۔
(۷۲) حسرت موہانی : "مکتوباتِ رئیس احرار"، مرتبہ ابو سلمان شاہجہاں پوری، کراچی، موڈرن پبلشرز، ۱۹۷۸ء۔
(۷۳) حفیظ، عبدالحفیظ : "نغمہ آرزو"، حیدر آباد دکن، سید پریس، ۱۳۱۲ء۔
(۷۴) حکمت، عبدالحکیم، سید : "دبدبہ امیری"، پٹنہ، برقی مشین پریس، ۱۹۳۷ء۔
(۷۵) خورشید الاسلام : "تنقیدیں"، طبع سوم، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۷ء۔
(۷۶) داغ دہلوی : "انشائے داغ"، مرتب احسن مارہروی : دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء۔
(۷۷) داغ دہلوی : "زبان داغ"، مرتب رفیق مارہروی، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد۔
(۷۸) رام بابو سکسینہ : "تاریخ ادب اردو"، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۸۶ء۔
(۷۹) رشک، علی اوسط : "نفس اللغۃ"، حصہ اول، لکھنؤ، نیر پریس، ۱۳۱۹ء۔
(۸۰) رشید احمد صدیقی : "خطوط رشید احمد صدیقی"، جلد اول، مرتبہ لطیف الزماں خاں، مجلسِ ادبیاتِ مشرق، ۱۹۸۸ء۔

(۸۱) رشید احمد صدیقی : "خطوط رشید احمد صدیقی"، جلد دوم، مہر الٰہی ندیم، لطیف الزماں خاں، کراچی، رائل بک ڈپو کمپنی، ۱۹۹۳ء۔
(۸۲) رشید حسن خاں : "اردو املا"، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴ء۔
(۸۳) رعد، میر نادر علی : "گنجینہ تواریخ"، حیدر آباد، فخر نظامی، ۱۸۹۵ء۔
(۸۴) رفیق مارہروی، سید : "ہندوؤں میں اردو"، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، سنہ ندارد۔
(۸۵) ریاض خیر آبادی : "نثر ریاض خیر آبادی"، مرتبہ عقیل جعفری، حیدر آباد دکن، نفیس اکیڈمی، ۱۹۴۵ء۔
(۸۶) سبحان بخش : "محاوراتِ ہند"، دہلی، مجتبائی پریس، ۱۸۹۰ء۔
(۸۷) سجاد ظہیر، سید : "نقوشِ زنداں"، مرتبہ سجاد ظہیر، دہلی، مکتبہ شاہراہ، ۱۹۵۰ء۔
(۸۸) سحا، نظیر حسن خاں : "محبوب الشعراء"، دہلی، روز آنہ پریس، دہلی، ۱۹۰۰ء۔
(۸۹) سراج الحسن مودودی : "گورکھ دھندا"، ۱۸۸۵ء۔
(۹۰) سر سید احمد خان : "مکتوباتِ سر سید"، جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء۔
(۹۱) سعادت حسن منٹو : "منٹو کے خطوط ندیم کے نام"، مرتبہ احمد ندیم قاسمی، راول پنڈی، کتاب نما، ۱۹۶۶ء۔
(۹۲) سرفراز علی رضوی : "ماخذات احوال شعراء و مشاہیر، جلد سوم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷ء۔
(۹۳) سلمان ندوی، سید : "برید فرنگ، کراچی، مکتبہ الشرق، ۱۹۵۲ء۔
(۹۴) سلمان ندوی، سید : "سید سلمان ندوی کے خطوط عبد الماجد دریابادی کے نام"، جلد اول، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء۔
(۹۵) سوزاں، حسیب الدین : "گنج شائگاں"، کانپور، نول کشور پریس، ۱۸۹۹ء۔
(۹۶) سیماب اکبر آبادی، علامہ : "رازِ عروض"، طبع ہشتم، کراچی، مکتبہ سیماب، ۱۹۶۷ء۔
(۹۷) شاد عظیم آبادی : "مکتوباتِ شاد عظیم آبادی"، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ادارۂ ادبیاتِ اردو، ۱۹۳۹ء۔
(۹۸) شاد، کشن پرشاد : "رقعاتِ شاد"، حیدر آباد دکن، محبوب پریس، ۱۳۱۷ھ۔
(۹۹) شائق، الٰہی بخش : "آئینہ تواریخ"، ۱۸۹۴ء۔
(۱۰۰) شبلی نعمانی : "خطوطِ شبلی بنام زہرا بیگم و عطیہ فیضی، مرتبہ محمد امین و سید محمد یوسف قیصر، آگرہ، شمسی پریس، سنہ ندارد۔
(۱۰۱) شبلی نعمانی : "خطوطِ شبلی عورتوں کے نام"، مرتبہ محمد امین زبیری، لاہور، تاج کمپنی سنہ ندارد۔
(۱۰۲) شبلی نعمانی : "خطوطِ شبلی بنام آزاد مرتبہ ڈاکٹر سید محمد حسنین، پٹنہ، بہار، اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء۔
(۱۰۳) شجاعت علی سندیلوی، ڈاکٹر : تعارف تاریخ اردو، لکھنؤ، ادارۂ فروغِ اردو، ۱۹۶۲ء۔
(۱۰۴) شمس الرحمان : "اردو خطوط"، دہلی، کتابی دنیا، ۱۹۴۷ء۔
(۱۰۵) شوق، احمد علی، حافظ : "تذکرہ کاملانِ رام پور"، پٹنہ، خدا بخش جرنل شمارہ ۳۳۔۳۴۔۳۵۔
(۱۰۶) شوق، احمد علی، حافظ : "تاریخ کتاب خانہ"، رام پور، رضا لائبریری، ۱۹۹۸ء۔
(۱۰۷) شورش کاشمیری : "مکاتیب شورس بنام عبد اللہ ملک، لاہور، کوثر پبلشرز ۱۹۷۸ء۔

(۱۰۸) شہید، شہید حسین، بدایونی: "تذکرہ شعراء بدایوں"، حصہ اول، کراچی، مطبوعاتِ بدایوں، ۱۹۸۷ء۔
(۱۰۹) صفدر مرزاپوری: "مرقع ادب"، جلد اول، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۲۰ء۔
(۱۱۰) صفدر مرزاپوری: "مرقع ادب"، جلد دوم، لکھنؤ، دارالاشاعت صدیقی بک ڈپو، ۱۹۲۷ء۔
(۱۱۱) صفدر مرزاپوری: "مشاطۂ سخن"، حصہ اول، لکھنؤ، صدیقی بک ڈپو، ۱۳۳۶ھ۔
(۱۱۲) صفدر مرزاپوری: "مشاطۂ سخن"، حصہ دوم، لاہور، گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو، سنہ ندارد۔
(۱۱۳) صفیر بلگرامی: "رشحاتِ صفیر"، پٹنہ، مطبع احمد، ۱۳۰۱ھ۔
(۱۱۴) ظفر علی خاں، مولانا: "مکاتیبِ ظفر علی خاں"، مرتب زاہد منیر عامر، لاہور، سنی پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء۔
(۱۱۵) ظہیر الدین احمد خاں: "دو پیکر"، حیدرآباد دکن، شمسی پریس، ۱۹۰۰ء۔
(۱۱۶) عاشق، محمد مرتضٰی، لکھنوی، مرزا: "بہار ہند"، حیدرآباد دکن، شوکت جعفر، ۱۳۰۶ھ۔
(۱۱۷) عبادت بریلوی، ڈاکٹر: "غزل اور مطالعہ غزل"، کراچی انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۵ء۔
(۱۱۸) عبدالاسلام ندوی: "شعر الہند"، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۵ء۔
(۱۱۹) عبدالحق، مولوی: "مکتوباتِ بابائے اردو"، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۰ء۔
(۱۲۰) عبدالحق، مولوی: "مکاتیبِ عبدالحق"، مرتبہ جلیل احمد قدوائی، کراچی، مکتبہء اسلوب، ۱۹۶۳ء۔
(۱۲۱) عبدالحق، مولوی: "مکاتیبِ عبدالحق بنام محوی"، مرتبہ عبدالقوی دسنوی، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۰ء۔
(۱۲۲) عبدالحق، مولوی: "خطوط عبدالحق بنام آل احمد سرور"، مرتبہ آل احمد سرور، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء۔
(۱۲۳) عبدالماجد دریابادی، مولانا: "خطوط ماجدی"، کراچی، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، ۱۹۸۶ء۔
(۱۲۴) عبدالواسع: "غرائب اللغات"، ۱۱۵۹ھ۔
(۱۲۵) عبداللہ، سید: "زبدۃ الصنائع"، حیدرآباد دکن، سبحانی پریس، ۱۳۱۵ھ۔
(۱۲۶) عبیداللہ سندھی، مولانا: "مولانا عبیداللہ کے سیاسی مکتوبات"، مرتب محمد اسلم لاہور، ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۴ء۔
(۱۲۷) عرفان عباسی: "دبستانِ امیر مینائی"، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۵ء۔
(۱۲۸) عزیز جنگ ولا، نواب: "معیار فصاحت"، حیدرآباد دکن، عزیز المطابع، ۱۳۲۸ھ
(۱۲۹) عشق، غلامِ غوث، خواجہ: "عروضِ ارمغانِ عشق"، حیدرآباد دکن، اختر دکن پریس، ۱۳۰۵ھ۔
(۱۳۰) علی سردار جعفری: "سرداری جعفری کے خطوط"، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۱ء۔
(۱۳۱) غالب: "تتمہ برہانِ قاطع"، لکھنؤ، نول کشور پریس، سنہ ندارد۔
(۱۳۲) غالب: "مکاتیب غالب"، مرتب امتیاز علی خاں عرشی، بمبئی، مطبعہ قیمہ، ۱۹۳۷ء۔
(۱۳۳) غالب: "غالب کے خطوط"، حصہ اول، طبع دوم، مرتبہ خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۲ء۔
(۱۳۴) غالب: "غالب کے خطوط"، حصہ دوم، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء۔

(۱۳۵) غالب :"غالب کے خطوط"، حصہ سوم، مرتبہ خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۰ء۔
(۱۳۶) غالب :"غالب کے خطوط"، حصہ چہارم، مرتبہ خلیق انجم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۵ء۔
(۱۳۷) غلام مصطفےٰ، ڈاکٹر :"جامع القواعد"، لاہور،، مرکزی، اردو بورڈ، ۱۹۷۳ء۔
(۱۳۸) غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر :"مکتوباتِ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، جلد دوم، مرتبہ خالد محمود، حیدر آباد، زبیر پبلیشرز، ۱۹۹۰ء۔
(۱۳۹) غلام مصطفےٰ خان، ڈاکٹر :"مکتوباتِ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں"، جلد اول طبع دوم، مرتبہ خالد محمود، حیدر آباد، سندھ، زبیر پبلشرز، ۲۰۰۱ء۔
(۱۴۰) فراق گورکھپوری :"من آنم"، لاہور، ادارۂ فروغ اردو، ۱۹۶۲ء۔
(۱۴۱) فرقت، محمد حسین :"ام التواریخ"، لاہور، دہلی پنچ پریس، ۱۲۸۹ھ۔
(۱۴۲) فرقت، محمد حسین :"موجد التواریخ"، میرٹھ، شگفتہ پریس، ۱۳۰۱ھ۔
(۱۴۳) فیض احمد فیض :"دامنِ یوسف"، لاہور،، ماورا پبلشرز، سنہ ندارد۔
(۱۴۴) فیض احمد فیض :"صلیبیں مرے دریچے میں"، مرتب مرزا ظفر الحسن، کراچی، پاک پبلشرز لمیٹڈ، سنہ ندارد۔
(۱۴۵) قبول محمد، مولوی :"ہفت قلزم"، طبع دوم، لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور، ۱۲۳۰ھ۔
(۱۴۶) قدر، غلام حسنین، بلگرامی، سید :"قواعد العروض"، شامِ اودھ پریس، ۱۲۸۸ھ۔
(۱۴۷) قدرت اللہ شہاب :"شہاب نامے"، مرتبہ تسلیم احمد قصور، لاہور، سورج پبلشنگ ۱۹۹۶ء۔
(۱۴۸) قدرت نقوی، سید : مرتب "ہنگامہ دل آشوب"، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء۔
(۱۴۹) کامل قریشی : مرتبہ داغ دہلوی :"حیات اور کارنامے"، دہلی اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء۔
(۱۵۰) کریم الدین احمد، ڈاکٹر :"امیر مینائی اور ان کے تلامذہ"، لاہور، آئینہ ادب،، ۱۹۸۲ء۔
(۱۵۱) کنھیالال دہلوی :"بحر العروض"، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۸۷۲ء۔
(۱۵۲) کیفی، برجموہن دتاتریہ :"منثورات"، دہلی، دانش محل، ۱۹۴۵ء۔
(۱۵۳) کیفی، برجموہن دتاتریہ :"کیفیہ"، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء۔
(۱۵۴) لالہ سری رام :"خم خانہء جاوید"، جلد اول،
(۱۵۵) لالہ سری رام :"خم خانہ جاوید"، جلد سوم، دہلی، مخزن پریس، ۱۹۰۸ء۔
(۱۵۶) مادھو نرائن :"مخزن المحاورات"، دہلی، جوہر ہند پریس، ۱۸۸۶ء۔
(۱۵۷) محسن الملک، نواب :"مکاتیب نواب محسن الملک"، مرتبہ محمد امین زبیری مارہروی، آگرہ شمسی مشین پریس، سنہ ندارد۔
(۱۵۸) محمد اشرف علی لکھنوی، خواجہ :"دستور الشعراء"، لکھنؤ، نامی پریس، ۱۸۸۹ء۔
(۱۵۹) محمد بادشاہ، منشی :"فرہنگِ انندراج"، جلد دوم، لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۹۴ء۔
(۱۶۰) محمد بادشاہ، منشی، فرہنگ انندراج، جلد سوم، لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۹۲ء۔
(۱۶۱) محمد حسن، ڈاکٹر، جلال لکھنوی، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۶ء۔

(۱۶۲) محمد علی ردولوی، : "گویا دبستان کھل گیا"، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۷ء۔
(۱۶۳) محمد غیاث الدین : "غیاث اللغات"، کراچی، ایچ، ایم۔ سعید کمپنی، سنہ ندارد۔
(۱۶۴) محمد مہدی کمال، سید، حکیم : "دستور الفصحا"، لکھنؤ، یوسفی پریس، ۱۳۱۵ھ۔
(۱۶۵) محمود علی، سید : "منتہی العروض و تھۃ الشعراء"، دہلی، چشمہ فیض پریس، ۱۸۸۳ء۔
(۱۶۶) معین الدین احمد انصاری : "شبلی مکاتیب کی روشنی میں"، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء۔
(۱۶۷) میکش، سجاد علی شاہ : "یادگار امیر مینائی"، دہلی، مطبع رحمانی، ۱۹۰۳ء۔
(۱۶۸) میکش نہانوی : "تذکیر و تانیث"، دکن، اختر دکن پریس، سنہ ندارد۔
(۱۶۹) نادر، کلب حسین خاں، ڈپٹی : "تخیصِ معلی"، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۵ء۔
(۱۷۰) ناسخ، امام بخش : "کلیاتِ ناسخ"، جلد اول، مرتب یونس جاوید، لاہور،، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء۔
(۱۷۱) نثار احمد علوی، حکیم، "سخنورانِ کاکوروی"، کراچی، میخانہء ادب، ۱۹۷۸ء۔
(۱۷۲) نجم الغنی خاں، حکیم : "اخبار الصنادید"، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۱۸ء۔
(۱۷۳) نذیر احمد ڈپٹی : "موعظہ حسنہ"، مرتب پروفیسر افتخار احمد صدیقی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء۔
(۱۷۴) نظیر حسنین زیدی، سید : "تذکرہ منتخب روزگار سہسوان"، کراچی، مکتبہء مسعود، کراچی، ۱۹۸۵ء۔
(۱۷۵) نگہت، نیاز علی بیگ : "مخزن الفوائد"، ۱۸۸۶ء۔
(۱۷۶) نیاز فتح پوری : "مکتوباتِ نیاز، حیدر آباد دکن، مکتبہء ابراہیمیہ، سنہ ندارد۔
(۱۷۷) نیاز فتح پوری : "انتقادیات"، لکھنؤ، نگار بک ایجنسی، سنہ ندارد۔
(۱۷۸) نیر، نور الحسن، مولوی : "نور اللغات"، جلد اول ودوم، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء۔
(۱۷۹) نیر، نور الحسن، مولوی : "نور اللغات"، جلد سوم و چہارم، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء۔
(۱۸۰) واصف، محمد مہدی : "دلیل ساطع"، مدراس، مطبع مظہر العجائب، سنہ ندارد۔
(۱۸۱) وجاہت، وجاہت حسین، منشی : "اختلاف اللسان"، لاہور، رفاہ عام اسٹیم پریس، ۱۹۰۶ء۔
(۱۸۲) وزیر آغا، ڈاکٹر : "وزیر آغا کے خطوط اکبر حمیدی کے نام" مرتب اکبر حمیدی، اسلام آباد، بز پبلیشرز، ۱۹۹۵ء۔
(۱۸۳) وزیر الحسن سعید زبیری ہاشمی، سہسوانی : "تذکرہ نامورانِ سہسوان"، کراچی، راشد زبیر اکیڈمی، ۱۹۸۵ء۔
(۱۸۴) وقار الملک، نواب : "خطوط وقار الملک، مرتبہ مشتاق احمد، علی گڑھ، مسلم یونی ورسٹی، ۱۹۷۴ء۔
(۱۸۵) یاس لکھنوی، مرزا : "چراغِ سخن" (رسالہ عروض و قوافی) لکھنؤ، مطبع منشی نول کشور پریس، ۱۹۱۴ء۔
(۱۸۶) یکتا جودھپوری : بہار سخن، حیدر آباد سندھ، محبوب پریس، ۱۹۶۳ء۔
(۱۸۷) "المنجد"، دہلی، مرکزی ادارہ تبلیغ دینیات، سنہ ندارد۔
(۱۸۸) "منتخب اللغات"، کانپور، مطبع قیومی، ۱۹۰۴ء۔

رسائل :

ماہ نامہ "آج کل"، دہلی، اپریل ۱۹۵۴ء۔

سہ ماہی "اردو"، دہلی، جنوری ۱۹۴۷ء۔

"اردو ادب"، علی گڑھ، شمارہ ۴، ۱۹۶۲ء۔

"اردوئے معلی"، علی گڑھ، مارچ ۱۹۰۷ء۔

"ارمغانِ امیر"، محفلِ امیر، کراچی، شمارہ ۱، اکتوبر ۲۰۰۰ء۔

"الزبیر"، بہاول پور، "ادبی معرکہ نمبر"، ۱۹۶۷ء۔

ماہ نامہ الناظر، لکھنؤ، جون ۱۹۱۲ء۔

شعبہ جاتی مجلّہ "تحقیق"، شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی، شمارہ : ۳، ۴، ۵۔

"زمانہ"، کانپور، فروری ۱۹۰۶ء۔

"صحیفہ"، لاہور، شمارے : ۲۹، ۳۴، ۳۵، ۳۷، ۳۸۔

ماہ نامہ "قومی زبان"، کراچی، ۱۹۶۰ء۔

"معیار"، میرٹھ، تنقید نمبر، ۱۹۵۴ء۔

نقوش، لاہور : شخصیات نمبر حصہ دوم، مکاتیب نمبر حصہ اول، دوم۔ خطوط نمبر حصہ اول دوم۔ ادبی معرکہ نمبر، حصہ دوم، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء۔ شمارہ ۷۹، ۸۱، شمارہ ۱۴۲۔

"نگار"، لکھنؤ : نومبر ۱۹۵۰ء، جنوری فروری ۱۹۵۳ء (داغ نمبر) اکتوبر ۱۹۵۸ء۔

"نیرنگ" دہلی، امیر نمبر ۱۹۳۰ء۔

ہفت روزہ "ہماری زبان"، دہلی، یکم نومبر ۱۹۶۳ء۔

کتب خانے

اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی۔

انجمن ترقی اردو، کراچی۔

بیدل لائبریری، کراچی۔

سنٹرل لائبریری، بہاول پور۔

سنٹرل لائبریری، جامعہ پنجاب۔

سنٹرل لائبریری، جامعہ کراچی۔

سیمینار لائبریری، شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی۔ جامشورو۔

علامہ آئی آئی قاضی لائبریری، سندھ یونی ورسٹی۔ جام شورو۔

غالب لائبریری، کراچی۔

☆☆☆

A RESEARCH STUDY OF AMEER MINAI'S LETTERS

THESIS FOR Ph.D

WRITER.

SAYYED JAWED IQBAL

GUIDE

PROFESSOR EMERITUS
DR GHULAM MUSTAFA KHAN

CO-GUIDE

PROFESSOR FAHMIDA SHAIKH
CHAIRPERSON
UNIVERSITY OF SINDH

DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF SINDH

2002

CONCLUSION OF THE THESIS

The purpose of this thesis is to present a critical study of Ameer Ahmed Meenai's (1829 – 1900 AD) letters. But before discussing the subject in detail, it is necessary to throw light on the importance of the topic. A detailed study about the critical aspects of the letters of Ameer Meenai has not been present as yet. Although at least five biographies and two thesis of Ph. D have been written on Ameer, but in them we only find a partial mention of his letters. Ameer Meenai has written about two thousand five hundred letters. It is a pity that even after the passage of a century the letters of such a great critic scholar and poet have been ignored. Two reasons for the same are:

1. A great deal of attention was given to the letter writing of Ghalib, Sir Syed, Shibli and Iqbal and that's why Ameer's letters did not receive any attention.

2. The other reasons for ignoring his letter writing by the critics were

   a. A large number of unpublished letters of Ameer could not come into light.

   b. The collection of Ameer's letter was published in the year 1910 A D. After that first India and then the new country of Pakistan remained constantly under the influence of various political, religious and literary movements, due to which the literary priorities changed. Therefore, scholars didn't pay any attention to other literary and educational tasks along with the letter writing of this great poet.

   c. After the publication of his letters, they continued to find place in various magazines. But these letters could not draw the attention of the literary personalities because of the fact that most of the magazines published in Pakistan and India remained out of the literary figures of both the sides.

Despite all this environment, whatever number of letters of Ameer were available received some attention in India and Pakistan. But still the need of a detailed study was felt because Ameer was an extra-ordinary personality of his times. In the realm of literature his status as a poet, lexicographer, "Tazkara writer" and a philologist is well settled. But his status in the field of letter writing remains to be decided.

It will be in the fitness of the things that we should put a glance at the literary status of Ameer before discussing the matter further.

When we examine Ameer as a poet, a very strange situation comes to light. He made a lot of interesting experiments in traditional and new topics of Ghazal, Qaseeda, Mussadis, Mathanvi, dictionary, Rubbayat, Wasookht" (Ode) and couplets(Qitaat). He was an extra-ordinary poet of his age and could compose verses in various forms. That's one of the reason that he overshadowed others in urdu poetry during the last three decades of the 19^{th}

Century and his students during the first four decades of the 20^{th} century.. He was head and shoulder above his contemporaries, which included poets of repute like "Dagh Delhvi", "Jalal Lucknowi", "Munir" and "Tasleem". These four poets lived with Ameer in Rampur. Although they had full command over different genres of poetry, but they could not reach the heights achieved by Ameer. (Stature of Ameer). A comparison of Ameer with his contemporaries helps to reach the following conclusion:

1. None of Ameer"s contemporaries paid any special attention to "Na'at" writing, whereas Ameer has a complete Anthology of Na'at.

2. None of Ameer's contemporaries tried their hand on " Tazkara Writing ", whereas he compiled " Tazkara " of famous and ordinary poets of Rampur. This " Tazkara " is regarded as an important educational, literary and historical document of Rampur.

3. None of Ameer's contemporaries did anything worthwhile in Persian poetry and prose, whereas he has left a complete anthology of Persian poetry besides Persian prose and Persian urdu dictionary.

4. None of the Ameer's contemporaries compiled any dictionary of Urdu, whereas he is the pioneer of the modern urdu dictionary.

5. Ameer also compiled, edited, wrote foot-notes on many poetical works of Urdu poets, which is an honoure shared by none of his contemporaries.

6. Ameer supervised the publication of many literary magazines and was the editor of a newspaper titled "Sehar-e- Samri". There hasn't come to light such a service of any one of his contemporaries for the cause of literature.

7. In comparison to Ameer none of his contemporaries, has given any attention to "Wasokht" (Odes) writing, whereas, besides a complete book, he has to his credit the writing of some of the finest "Wasokht". (Odes).

8. Ameer has the distinction of writing / composing largest number of "Mathnaviat", "Qasaid", "Rubbayat" and couplets amongst his contemporaries.

9. Ameer introduced a standard of training of his students that his contemporaries could not present.

10. Ameer is the only writer amongst his contemporaries, who wrote religions literature.

11. None can compete Ameer so far the number of letters is concerned.

12. The magazines about "Ilam-e-Jaffar" and "Ramal" were written by Ameer only.

13. Ameer was not only a great poet but also a great prose writer. This is the honour, which others do not have.

14. Besides educational and literary ability, Ameer has the greatness of character, which his contemporaries has seldom.

This is only a summarily comparison of Ameer with his contemporaries, which proves his superiority. This state of affairs is based only on the fact that only 30% of his educational and literary achievement have come to light. It is a pity that a great deal of his literary work was destroyed and a lot is yet to be published. We have been able to lay our hands on his letters only and in this thesis their importance and utility has been given.

If a review of the research and criticism of letters of Urdu poets and writers is undertaken we find that maximum has been written on the letters of Ghalib to encompass which, if not impossible, is very difficult. Scholars have also given special attention to the letters of Sir Syed, Shibli and Iqbal. All their letters have also been compiled together. But only the letters of Ghalib and Iqbal have been arranged on scientific basis. Books have also been written to bring to lime light the qualities and importance of their letters, but uptill now we have not seen any detailed and comprehensive study of the letters of any poet or literary figure.

Two thesis have also been written on Urdu letter writing. The first was written before the establishment of Pakistan by Dr Khawaja Ahmed Farooqui in Delhi University. Some excerpts of the same were published in the esteemed magazines of India and Pakistan. The second thesis was written by Dr Mubashir Ali Siddiqui in India. In short all the works of research and criticism carried out is in one knowledge. In the light of these works, an effort has been made to make these letters more beneficial.

Some objections were also raised on Ameer and his letter writing. Answers to these objections is present in this thesis. Besides numerous hidden answers of the history of urdu literature have also been brought into light and the true place of Ameer in Urdu letter writing has been mentioned.

Now chapter-wise eye-bird view of the thesis is presented as under:

CHAPTER – I

In this chapter an introduction and review of the beginning and development of Ameer's letter writing the letters published in India and Pakistan, and the treasure of unpublished letter of Ameer has been given.

According to my humble research, the letter writing of Ameer started in 1870 AD. But his first letter cam to hand on first July 1880 AD. The letters prior to these were arranged for publication, but were lost. It was Moulana Hasrat Mohani who first published Ameer's letter in the issue of January and February 1907 Urdu-e-Mauala, Aliogarh whereas the first collection of letters was published in 1910 from Lucknow.

The publication of Ameer's letter has been taking place without any break for the last one hundred years. Uptil now seven hundred and two hundred letters have been published from twenty two different places.

Many of these letters were published many times and quite a lot number of letters were complete and another time incomplete were published. In this way the total number of the letters, which were discovered but remained unpublished, was about four hundred and five. These were written to ninety-six individuals. Ameer's letter are addressed to his contemporary poets, his students well known religious leaders, scholars rulers and fans of education and literature.

In this chapter a volume of Ameer's unpublished letters have also been introduced which includes one thousand and seven hundred letters. The discovery of these letters have revealed many aspects of Ameer's life, which have been presented in different chapters of this thesis. From this volume, we also come to know that the last letter written by Ameer is dated 20th July 1900.

The published and unpublished letters of Ameer are the important treasure of urdu literature and are a reflection of his personality. These letters are an excellent model of letter writing and provide worthwhile material for those, who intend to write the history of urdu literature.

CHAPTER - II

Ameer enjoyed the status of the most honoured teacher in the last era of the nineteenth century. Therefore the students of art thought it a privilege for themselves to listen to and benefit from his views. Hence the educational views of Ameer, which are about the "Tazkeer-o-Tanis" (Genders), "Islahe-Sukhan", "Dictionary" and vastness; have been presented separately from the letters. A comparison of Ameer's thought has also been made with the dictionary, books and magazines of his contemporaries.

Ameer had a deep appreciation of linguistic problems "Tazkeer-o-Taness", Islahi-Sukhan, Dictionary clarification and eloquence. The books

written on these subjects in Urdu and Parisian before and during his time were in his knowledge and Ameer was aware of their merits and demerits. Ameer has not written any book regarding linguistic clarification. But his thoughts on the subjects spread in his letters can be placed in contrast to written books and if compiled, these thoughts could make many books.

CHAPTER – III

As in chapter II a study of Ameer's letters have been presented with reference to the linguistic clarification, in this chapter, the points about "Ilam-e-Urooz" (scanning), under the title of "Nukat-e-Sukhan", "Ilam-e-Qawafi and art of writing history have been laid down for the benefits. A comparison of Ameer's thoughts and vision has been made with the books of his contemporaries.

Ameer Meenai is counted amongst those poets Urdu, who played a historical role in refining and beautifying the language and poetry. I have not said this due to my interest in the subject but a great deal of letters can be presented as a proof in which Ameer has given his views freely on linguistic and scanning problems. This store-house of the letters of Ameer is a treasure of educational knowledge. We find such points full of wisdom, the example of which is difficult to find either in his times and or before him and the objection that he could only use Lucknawi language and idioms seems to be vague. The fact is that he was well-versed with the temperament of Urdu and therefore could write verses in various forms, whereas his contemporaries remained confined to the conflict between the urdu of Lucknow and Delhi.

The scanning clarification which have been presented in this chapter are actually those traditions, which the students of Ameer carried formed. In this way, the school of Ameer rendered an unforgettable service in the development of Urdu poetry.

Another interesting aspect of Ameer's letters is that these contain imperceptibly the mention of many valuable books written on "Ilam-e-Urooz" and "The art of writing history". In this chapter the poetical problems, which were a cause of dispute, have also been included. Ameer didn't write any book in this regard, but in his letter we find his replies to educational discussion of the period. It transpires that the educational letters of Ameer complete the history of poetical criticism of nineteenth century.

CHAPTER – IV

This chapter deals with the history of "Ameer-ul-Lughat" and "Daftar Ameer-ul-Lughat" and the system of lexicography. In this context, information about thirty two individuals associated with the work of compiling "Daftar Ameer-ul-Lughat" have also been given in the footnotes and a brief mention about the schools have also been included. In my humble opinion Ameer is the pioneer of modern Urdu lexicography. He introduced an organized and

scientific system in the Urdu lexicography and laid the foundation of "Daftar Ameer-ul-Lughat as modus operandi. This was the first Urdu dictionary in the compilation of which the writer sought the help and cooperation of able and well-known scholars of other languages. Not only this, but after the preparation of documents the scholars were invited to vet the same. The manner in which the "Urdu Dictionary Board of Pakistan" is working today on lexicography is certainly a very well-developed system; which has been established on the pattern of "Oxford Dictionary". We can see a glimpse of this system, principles and laws in the office of Ameer-ul-Lughat".

Some selected information about "Ameer-ul-Lughat" is available in different books and magazines. But even if they are put together, we can neither draw strong conclusion on Ameer's lexicography nor can provide detailed information for literary history. But these letters help a lot in arranging the history of Ameer-ul-Lughat, Daftar-Amir-ul-Lughat and system of lexicography. So in these letters we find the complete system of lexicography of Ameer.

CHAPTER V

This chapter throws light on the professional jealousy of Ameer with his contemporaries. Whenever there is reference about this tussle (professional jealousy), our mind goes to the names of "Mir and Sauda", "Mus'hafi and Insha", Nasik and Aatash", and "Ameer and Dagh". Besides difference between Ameer and Dagh, the differences with "Jalal Lucknowi" and "Syed Ahmed Delhavi" have also been written but the situation is altogether different. The following facts come to light about the professional jealousy of Ameer with his contemporaries.

1. There were never any differences between Dagh and Ameer. The fact is that Ameer and Dagh had a great affinity between them and they respected each other very much. This whole story is not about their differences but the tussle between their students, which created misunderstanding amongst the historians. In addition to the sutdents of both the sides the people fond of "School differences" presented "Ameer and Dagh" as opponents.

2. Ameer has had never any dispute with Syed Ahmed Dehlvi. When "Ameer-ul-Lughat" was published, Syed Ahmed, who belonged to Dehli, accused Ameer and claimed that "Ameer-ul-Lughat" was the copy of "Armughan-e-Delhi" and "Hindustani Lughat". The dictionary was limited only to the use of words and idioms of Lucknow. Ameer quoted his own and verses of the poets of Lucknow in proof. Syed Ahmed Dehlvi also continued to write essay against Ameer for one and half year. Ameer didn't respond and strictly forbade his students to do so, because all these allegations were against facts. However, Sir Syed Ahmed Khan and Akbar Allahabadi wrote verses in support of Ameer.

In this way the confrontation remained one sided. The critics of the later age regarded the accusation of Syed Ahmed Dehlvi nothing but differences between "Schools of thoughts".

3. Similarly, there never existed any difference with "Jalal Lucknowi". This misunderstanding was created by Dr Muhammad Hassan through his book "Jalal Lucknowi". All the allegation of Dr Muhammad Hassan are baseless. Ameer was a peace-loving and realistic person. He never entered into any conflict against his contemporaries, which his letters bear testimony in abundance.

CHAPTER VI

In this chapter the relations of Ameer with his students have been discussed. Besides those factors have also been brought under discussion, which led the people to follow Ameer's "School of Poetry". Light has also been thrown on the ways and means by following which the students of Ameer overshadowed the Urdu poetry for a very long period. In addition to this those aspects of Ameer's personality have been revealed, in the magic of which thousands of his students remained captivated. Besides, a list of 223 students of Ameer has been included for the first time the sources of which are his published and unpublished letters.

If the letters of Ameer would have not come to light, then the status of Ameer as a teacher and many aspects about his students might have remained obscure and we would have never come to know that Ameer was a great teacher. He was aware of the educational psychology as well as the philosophy of education. He was well-verse with literary history and literary attitudes. He always lived amongst his students completely with his educational, literary and social status. The fact is that Ameer was a social engineer but his style of working was like social workers. This is the reason that many of his students earned a name for themselves and the chain of his students continues till today.

CHAPTER VII

In this chapter the biographical importance of Amer's letters has been brought to lime light. There are certain informations about Ameer's life, which are incomplete in his biographies. These letters complete them. So the missing chain which we find in these letter complete his biographies. The biographies written on Ameer, include important events of his life, travelogues and family environment. But in these biographies, there is a break off and on about time factor.

The last twenty years of his life from 1880 to 1900 AD are the most important one. It is a very encouraging factor that the letters written by Ameer also belong to this period i.e. First July 1880 to 20^{th} July 1900 AD, where we find the complete continuity of time factor.

CHAPTER VIII

In this chapter a comparative study of Ameer's letters with those of "Dagh" have been made. The position of Dagh's letter in Urdu letter writing is only to the extent that these are the letters of a great poet, which contain the rise and fall of his temperament and lack the splendour of letter writing. In contrast to this Ameer enjoys a great reputation due to so many prominent qualities of his letters.

CHAPTER IX

In this chapter, the status of Ameer in Urdu letter writing has been fixed. The history of Urdu letter writing is spread over a period of about one hundred and seventy five years. Views about forty-six selected and important letter writers have been expressed so that the individuality of Ameer in letter writing may be focused. The identity of Ameer's letter is purely educational. On the whole Ameer hold an important position in Urdu literature of letter writing. His letters, besides providing information about biography, also provide important material from the view-point of educational values. So far the style is concerned, he enjoys prominent position in between Ghalib and Sir Syed Ahmed. However in the history of Urdu letter writing Amer comes before us a great letter writer after Ghalib.

The main points, which came to light after a detailed study of Ameer's letter have been presented chapter-wise. In addition to this a great benefit that has accrued is that such aspects of Ameer's life have come to light, which needed to be explored. Therefore, the following topics have been suggested which would definitely enrich the history of literature.

1. Ameer as a prose writer.
2. A critical review of Ameer's poetic clarifications.
3. A study of literary and linguistic services of Ameer's school of thought.
4. A critical and research study of Ameer's lexicography.
5. A critical and research review of Ameer's linguistic services.
6. Ameer's status in the Islamic literature of 19th Century.
7. Ameer's status in the Persian literature of the sub-continent.
8. Ameer's role in urdu "Tazkarah writing" of 19th Century.
9. Arranging and editing the letters of Ameer Meenai.

With these suggestions this thesis concludes.
